فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1.	عرض مصنف	5
2.	آتش فشاں	11
3.	غیر ملکی مداخلت	53
4.	سنگین خدشات اور غافل قیادت	93
5.	گوادر-اصل مسئلہ کیا ہے؟	103
6.	بلوچ کون ہیں؟	121
7.	جغرافیہ اور انتظامی تقسیم	149
8.	بلوچستان کے مشہور شہر	163
9.	بلوچستان کے اولیائے کرام	171
10.	بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت	187
11.	جانے کس جرم کی پائی ہے سزا؟	215
12.	قائداعظمؒ اور بلوچستان	239
13.	زیارت میں قائداعظمؒ کے آخری ایام	247
14.	بلوچ سراپا احتجاج کیوں ہوئے؟	259
15.	سردار اکبر خان بگٹی کا ماضی اور حال	293
16.	سردار عطاء اللہ مینگل	351
17.	اب کون سی حجت باقی ہے؟	393

عرض مصنف

بلوچستان میرے لئے ہمیشہ ایک رُلا دینے والا موضوع رہا ہے۔ مجھے پہلی مرتبہ 80 کی دہائی میں کوئٹہ جانے کا موقعہ ملا۔ پھر یہ سلسلہ چلتا چلا گیا۔ جن دنوں گوادر پر بے نظیر بھٹو دورِ حکومت میں "امریکی قبضے" کی خبریں اُڑائی جارہی تھیں مجھے محترم مجید نظامی صاحب نے بطور خاص گوادر بھیجا جہاں میں نے اپنے چار روزہ قیام میں صرف وہ دلائل تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جو مجھے اس تلخ سچائی کا قائل کریں کہ ہمارے ارباب بست وکشاد نے آج تک سنجیدگی اور ایمانداری سے کب یہ چاہا ہے کہ بلوچستان پاکستان کا حصہ بنا رہے؟-- ممکن ہے آپ اسے میری "انتہا پسندی" سمجھیں لیکن میں ایمانداری سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ جن حالات سے بلوچستان کا عام شہری گزرتا ہے (یا اُسے گزارا جاتا ہے) اُن سے اگر پنجاب یا ملک کے کسی دوسرے صوبے کے عوام کو دوچار ہونا پڑتا تو اب تک نجانے کتنی مرتبہ ہم پر فوج کشی ہو چکی ہوتی۔ بغاوتوں کے مقدمات چلے ہوتے اور غداری کے فتوے ہماری پیشانیوں پر نقش کر دیئے جاتے۔ مجھے بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم کی یہ بات اکثر یاد آتی ہے (کئی صحافی ساتھی اس کے عینی شاہد ہیں) نوابزادہ صاحب نے ایک مرتبہ ہمارے ساتھ بلوچستان کے حوالے سے بات کرتے ہوئے سردار عطاء اللہ مینگل کی پاکستان سے محبت کے حوالے سے ایک ایسی بات کہی جس نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔

نوابزادہ نصر اللہ خان نے بتایا کہ ایک مرتبہ سردار عطاء اللہ مینگل نے ان سے کہا:

"نوابزادہ صاحب! ہمیں پاکستان سے بہت محبت ہے۔ اگر خدانخواستہ کبھی آپ نے پاکستان توڑا تو ہم بلوچستان کا نام پاکستان رکھ لیں گے۔"

سردار عطاء اللہ مینگل کی اس بات کی تصدیق مجھے 1994ء میں گوادر جا کر ہوئی جہاں پہنچنے کے لئے صرف کراچی سے ایک سڑک موجود تھی جس پر چلنے والے ٹرک 50 گھنٹے کی تگ و دو کے بعد گوادر پہنچتے تھے جس کے بعد اُن کے انجن اور ٹائر ''اوور ہال'' کیے جاتے تھے۔ دن میں ایک مرتبہ بجلی آتی تھی۔ پینے کا صاف پانی لوگ لکڑی کے بکسوں میں تالا لگا کر رکھا کرتے تھے۔ کوئٹہ سے گوادر پہنچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کراچی سے ایک فوکر دوسرے دن گوادر جایا کرتا تھا۔ تمام اشیائے ضرورت ایران سے سمگل ہو کر گوادر آتی تھیں جن میں کھانے پینے کی اشیاء، موٹر سائیکل پٹرول اور ڈیزل بھی شامل ہے اور یہی یہاں کا سب سے بڑا ذریعہ روزگار تھا یا پھر وہ ماہی گیر جو اپنی خستہ حال لانچوں میں سمندری لہروں سے لڑ جھگڑ کر سمندر سے اپنے حصے کا تھوڑا بہت رزق چھینا کرتے تھے۔۔ لیکن، ان لوگوں کی سیاسی بیداری کا عالم یہ تھا کہ تب بھی گوادر میں چار مضبوط جماعتیں موجود تھیں جن میں سے تین صوبائی بلوچ سیاسی جماعتیں اور چوتھی جماعت اسلامی۔

ہمارے سیاسی پنڈت یہ کہہ سکتے ہیں کہ تب ان لوگوں کو شاید اس بات کا علم نہیں ہوگا کہ گوادر مستقبل کا دوبئی یا ہانگ کانگ بننے والا ہے۔ لیکن ایسا کہنے والوں کی سیاسی بالغ نظری میرے نزدیک مشکوک ہے۔ انہیں شاید بلوچوں کی سیاسی بصیرت کا اندازہ نہیں۔۔ یا پھر وہ بلوچستان کے ماضی اور تاریخ سے واقفیت نہیں رکھتے کہ علم و ادب اور تاریخ و سیاست پر عبور رکھنے والے کیسے کیسے نابغہ روزگار یہاں ہمیشہ سے موجود رہے ہیں صرف خان آف قلات کی تبحر علمی اور کتب خانے کی مثال ہی اُن کے لئے کافی ہے۔ وہ بلوچ سردار جنہیں ہم مختلف القابات سے نوازتے آئے ہیں اور جب جی چاہے اُن پر کوئی فتویٰ داغ دیتے ہیں (یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اُن میں سردار خیر بخش مری، عطاء اللہ مینگل اور اُن کے صاحبزادے، نواب اکبر بگٹی وغیرہ شامل ہیں) لیکن آپ جانتے ہیں اُن کی تاریخ شناسی ناقابل چیلنج ہے۔ کتنے علوم پر دسترس ہے انہیں؟ عالمی سیاست پر وہ گھنٹوں بات کر سکتے ہیں جن میں سے ایک فقرہ بھی لایعنی یا بے مقصد نہیں ہوگا۔ علم و ادب کے لئے عالمی شہرت کے

حامل اداروں کے تعلیم یافتہ ہیں۔۔ بس اپنی روایات سے جڑے ہیں۔ اپنی تہذیب سے کٹ کر جینا انہیں پسند نہیں۔ منافقت، ریاکاری اور مروجہ سیاسی اخلاقیات سے نفرت کرتے ہیں۔ شاید اس لئے اُن کے لہجے میں تلخی اور کڑواہٹ نمایاں ہے اور شاید اسی لئے وہ معتوب بھی ہیں؟

اپریل 2005ء کو ایک پرائیویٹ چینل پر گفتگو کرتے ہوئے محترمہ عابدہ حسین نے جو سوئی میں بگٹی قبائل اور ایف سی کے درمیان ہونے والی معرکہ آرائی کے بعد پارلیمانی وفد کے ساتھ بلوچستان کا دورہ کرنے گئی تھیں، ایک ایسی بات کہہ دی جس نے ہر محب وطن کو تڑپا کر رکھ دیا۔ اس پروگرام میں اُن کے ساتھ عمران خان اور شیر افگن بھی موجود تھے۔ بیگم عابدہ حسین نے کہا کہ انہیں کوئٹہ اس تلخ تجربے سے گزرنا پڑا کہ ایک بریگیڈیئر صاحب کی گاڑی گزارنے کے لئے دونوں طرف سے ٹریفک روک دی گئی تھی۔ اور سوال کیا کہ اس طرح کی حرکات سے آخر ہم کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ بلوچ عوام کو کیا پیغام دے رہے ہیں کیونکہ یہ فتویٰ اُن کے پاس پہلے سے موجود ہے کہ فوج میں تو پنجابیوں کی اکثریت ہے؟ مجھے علم نہیں کہ یہ سلسلہ اس پروگرام کے آن ایئر جانے کے بعد بھی جاری ہے یا ختم کر دیا گیا لیکن سیکورٹی اور لاء اینڈ آرڈر کے بدترین حالات میں بھی ایسا عمل پاکستان کے لئے سم قاتل ہے۔ خدا کے لئے مشرقی پاکستان کی تاریخ کو فراموش نہ کیجئے اور تاریخ کی اس ستم ظریفی کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ یہ خود کو دہرایا کرتی ہے۔

چوہدری ظہور الٰہی مرحوم گجرات کے رہنے والے پنجابی پاکستانی تھے جنہوں نے سب سے پہلے 1974ء میں قومی اسمبلی میں بلوچستان پر ٹوٹنے والے قہر کے خلاف آواز بلند کی (اس کتاب میں اُن کی تقریر شامل ہے)۔ دو گھنٹے پر طویل اس تقریر میں انہوں نے روتے ہوئے بلوچستان کے حق میں صدائے احتجاج بلند کی۔ حکومتی ایوانوں کو جھنجھوڑا۔ اس کے بعد سے آج تک ایسی درجنوں مثالیں موجود ہیں جب پنجابی اہل دانش نے، سیاستدانوں نے، فنکاروں نے بلوچستان کے مسئلے پر مرکزی حکومت کو چیخ چیخ کر خبردار کیا۔ اپنے بلوچی بھائیوں کی کسمپرسی، مظالم، بے بسی اور حکومتی زیادتیوں کا رونا رویا۔ آج

چوہدری ظہور الٰہی کے صاحبزادے چوہدری شجاعت بھی نواب اکبر بگٹی کو منانے، بلوچستان کے لئے کچھ کر گزرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور یہ کتاب جو آپ پڑھنے جا رہے ہیں یہ بھی ایک پنجابی مسلمان پاکستانی نے اپنے بلوچستان سے محبت اور زیادتیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے اور ارباب بست وکشاد کو صورت حال کی سنگینی کا احساس دلانے کے لئے ہی تو لکھی ہے۔۔لیکن کیا وجہ ہے کہ معاملہ سندھ کا ہو، سرحد کا یا بلوچستان کا، گالی پنجابی کو دی جاتی ہے۔کیا یہ لمحہ فکریہ نہیں؟ المیہ نہیں؟

میری اپنے بلوچ بھائیوں اور اُن کے لیڈروں سے التجا ہے کہ خدا کے لئے ہمیں موردِ الزام نہ ٹھہرائیے۔ ہمیں آپ سے اُتنی ہی محبت ہے جتنی آپ کو بلوچستان سے ہے۔ ہم بھی آپ کی طرح مظلوم ہیں، مقہور ہیں، مجبور ہیں، آبادی میں غالب اکثریت ہمارا گناہ نہیں، ہمیں تاریخ کے جبر کا شکار مت کیجئے۔ ہمارے دل آپ کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔گولی آپ پر چلتی ہے، زخم ہمارے کلیجے پر لگتا ہے۔

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم

قارئین کرام! میں نے "بلوچستان کا آتش فشاں" لکھ کر تاریخ کا قرض اُتارنے کی کوشش کی ہے۔ میری پاکستان کے تمام "سفید پوش مظلوموں" اور غریبوں سے جن کی تعداد 95 فیصد سے زیادہ ہے درخواست ہے کہ وہ 5 فیصد براہمنی مزاج کے مالک حکمرانوں، بیوروکریٹوں، چوہدریوں، خانوں، وڈیروں اور سرداروں کے بہکاوے میں آکر ایک دوسرے پر دشنام طرازی نہ کریں۔ یہ ملک ہمارے آباواجداد نے لاکھوں جانوں، مال اور عزتوں کا نذرانہ دے کر بنایا تھا۔ اسے قائم رکھنا بھی ہم 95 فیصد لوگوں کی ذمہ داری ہے۔ میں نے اپنی اس حقیر کاوش کے ذریعے اپنی ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

طارق اسمٰعیل ساگر

اگست 2005ء لاہور

آتش فشاں

بلوچستان کے مسئلے پر جسے ہرگز نیا مسئلہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہماری حکومتوں کے ارباب اختیار کی طرف سے عموماً ایک ہی طرح کا تبصرہ تھوڑے ردوبدل کے ساتھ آج تک سامنے آتا رہا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ بلوچستان کا سرداری نظام اس مسئلے کی بنیاد ہے اور جب تک یہ نظام یہاں موجود ہے مسئلہ بھی جوں کا توں موجود رہے گا کیونکہ بلوچ سردار اپنے علاقوں میں کبھی تعمیر وترقی کے کام نہیں ہونے دیں گے۔غریب بلوچوں کے حالات نہیں سدھرنے دیں گے اس کے برعکس وہ حکومتوں کو بلیک میل کر کے ان سے رقم اینٹھتے رہیں گے اور جب کبھی حکومت نے ان کا جاری وظیفہ روکنے کی کوشش کی بلوچ سردار فوراً بندوقیں اٹھا کر پہاڑوں پر چڑھ جائیں گے۔

اس نوعیت کے سرکاری تبصرے آج نہیں بلکہ 1958ء سے سننے میں آ رہے ہیں۔کیا حکومتی موقف صحیح ہے؟ کیا واقعی بلوچ سرداروں کی بلیک میلنگ ہی تمام مسئلوں کی بنیاد ہے؟ ان سوالات کے جوابات تو آپ کو اس کتاب میں ملتے رہیں گے لیکن ایک بنیادی حقیقت جسے ہم میں سے کوئی ذی شعور نظر انداز نہیں کر سکتا یہ ہے کہ ہمارے ارباب اختیار نے بلوچستان کو بے رحمی کی حد تک نظر انداز کئے رکھا۔

کیا آپ اس سچائی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ بلوچستان 1947ء میں پاکستان کا حصہ صرف تین لوگوں کی جدوجہد سے بنا۔جی ہاں! تلخ ہی سہی لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ بلوچستان کو میر جعفر خان جمالی، مسعود کھدر پوش اور جناب نسیم حجازی نے ایک

جان لیوا اور اعصاب شکن لڑائی لڑنے کے بعد پاکستان کا حصہ بنایا تھا۔ قاضی عیسیٰ مرحوم نے
مسلم لیگ کے مقامی رہنما کی حیثیت سے اپنا جو کردار ادا کیا وہ بسا اوقات متنازعہ بن کر رہ
جاتا ہے۔ قاضی عیسیٰ کی حب الوطنی اور مسلم لیگ سے محبت اپنی جگہ لیکن انہوں نے عین اس
مرحلے پر بلوچ سرداروں کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا جب کانگریس اور اس کے مقامی
حواری کروڑوں روپیہ بلوچستان میں تقسیم کر کے اسے بھارت کا حصہ بنانے کی مہم آغاز کر
چکے تھے۔ قائداعظمؒ اپنی گوناں گوں مصروفیات اور انگریز ہندو گٹھ جوڑ کے خلاف ایک
اعصاب شکن لڑائی لڑ رہے تھے اور بلوچستان کی طرف اس انداز میں توجہ نہیں دے سکتے تھے
جس طرح پاکستان میں شامل ہونے والے دوسرے علاقوں پر دے رہے تھے لیکن یہ
حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ قائداعظم کو بلوچستان سے بہت محبت تھی اتنی محبت کہ اپنی
زندگی کے آخری ایام بھی انہوں نے بلوچستان کے ایک تفریحی مقام زیارت پر گزارنا احسن
جانا۔ بلوچستان کا مسئلہ کوئی آج کا پیدا کردہ نہیں البتہ گزشتہ صدی کے آخری عشرے میں
تیزی سے پیدا ہونے والی جغرافیائی تبدیلیوں نے اس خطے کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے خصوصاً
گوادر کی بندرگاہ اور مستقبل کے حوالے سے اس بندرگاہ کا کردار اتنی زیادہ اہمیت کا حامل ہے
کہ اب بلوچستان کے مسئلے کو ماضی کی طرح محض گفتند نشستند برخاستند کی طرح نظر انداز
نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہ آتش فشاں پھٹا تو خدانخواستہ ہماری سالمیت ہی نہ اس کی بھینٹ
چڑھ جائے۔

اس وقت بلوچستان میں جاری بلوچ قوم پرستی کی تحریک اور اس سے جڑی ہوئی
عسکری کارروائیاں پاکستان کی تاریخ میں اس قسم کی چوتھی تحریک ہے۔ اس سے پہلے
پچاس، ساٹھ اور ستر کی دہائی میں بلوچ قوم پرست بلوچستان کی خودمختاری اور سیاسی حقوق
کے لئے اسی قسم کی تحریکیں چلا چکے ہیں، جو پانچ چھ سال سے جاری ہیں۔ ان تحریکوں میں
گوریلا کارروائیاں بھی کی گئیں جبکہ جواب میں حکومت نے انہیں دبانے کے لئے فوجی
کارروائیاں بھی کیں، بلوچ رہنماؤں اور کارکنوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاریاں بھی کی
گئیں۔ قیام پاکستان کے بعد پہلی بلوچ قوم پرست تحریک خود خان آف قلات نے چلائی۔
خان آف قلات نے 1958ء میں خان محراب شہید (بڑے بلوچ قوم پرست رہنما) کی قبر

پر بلوچ رہنماؤں کو جمع کر کے قلات کی آزادی کا اعلان کیا اور اس کا پرچم لہرایا۔ اس موقع پر
بلوچ سرداروں نے ایک عزم کیا جسے بلوچ ثقافت میں اقرار کہا جاتا ہے۔ اس احتجاج کو
جواز بنا کر پاکستان میں 1958ء کا فوجی مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ 1958ء سے 1960ء
تک قلات کی جنگ پہاڑیوں میں چلتی رہی۔ پاکستانی فوج قلات کے علاقوں خضدار اور
سارانان میں بلوچوں سے لڑتی رہی۔ 1962ء میں جنرل ایوب خان نے بلوچ قوم پرست
سرداروں سے ایک معاہدہ کیا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دیں تو حکومت انہیں عام معافی دے گی۔
اس معاہدے کے تحت جب سردار پہاڑوں سے اترے تو جنرل ایوب کی حکومت نے قوم
پرستوں کو گرفتار کیا اور سزائیں دیں۔ سات آدمیوں کو پھانسی ہوئی۔ بلوچ قوم پرستوں کی
تحریک میں یہ واقعہ بڑے زخم کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جو انہیں پاکستان کی فوج اور مقتدر
طبقے سے لگا۔

اس واقعے کے فوری بعد ایوب خان کے متعارف کردہ بنیادی جمہوریت کے
نظام کے تحت قومی اسمبلی کے لئے 1962ء کے انتخابات ہوئے جس میں قلات سے سردار
عطاء اللہ اور کوئٹہ سے نواب خیر بخش مری منتخب ہوئے۔ ایوب خان کی حکومت نے بلوچ قوم
پرستوں کو 1963ء میں پھر گرفتار کیا۔ بلوچ تحریک کے موجودہ سرخیل نواب اکبر بگٹی، غوث
بخش بزنجو اور سردار عطاء اللہ مینگل کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے ساتھ ہزاروں بلوچ سیاسی
کارکنوں کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا۔ مری، بگٹی اور جھالاوان (خضدار) کے علاقوں میں
فوجی کارروائی 1969ء تک جاری رہی۔ یہ بلوچ قوم پرستوں کی پاکستان میں دوسری بڑی
تحریک تھی اس دوسری شدت پسند بلوچ تحریک کا خاتمہ جنرل ایوب کی جگہ لینے والی جنرل
یحیٰی خان نے بلوچ قوم پرستوں کو عام معافی دے کر کیا۔

اس پس منظر میں 1970ء کے عام انتخابات ہوئے جو ملک میں بالغ رائے دہی
کی بنیاد پر کرائے جانے والے پہلے انتخابات تھے۔ بلوچ اور پختون قوم پرستوں کی
جماعت عوامی نیشنل پارٹی نے پورے صوبے سے نشستیں بھاری اکثریت سے جیت لیں۔
مشرقی پاکستان سے الگ ہو جانے کے بعد پہلی بار بلوچ قوم پرست 1972ء میں
بلوچستان میں اقتدار میں آئے اور سردار عطاء اللہ مینگل نے وزارت اعلیٰ سنبھال لی۔ سردار

مینگل اب موجودہ قوم پرست تحریک کے تین بڑے قائدین میں نواب خیر بخش مری اور نواب اکبر بگٹی کے ساتھ شامل ہیں۔صرف ایک سال بعد 1973ء میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے مینگل کی حکومت کو برخاست کردیا۔ اس کے بعد نواب اکبر بگٹی صوبے کے گورنر بن گئے بھٹو دور میں بلوچ قوم پرست قائدین اور کارکنوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کی گئیں۔ان کے خلاف فوجی کارروائیاں کی گئیں جو 1970ء تک بھٹو حکومت کے خاتمے اور مارشل لاء کے نفاذ تک جاری رہیں جس طرح یحیٰی خان نے ایوب دور کے آپریشن کو بند کرکے بلوچ قوم پرستوں کو عام معافی دی تھی، جنرل ضیاءالحق نے بھی ان کے لئے عام معافی کا اعلان کیا۔

1988ء کے بعد پہلے نواب اکبر بگٹی نے منتخب وزیراعلیٰ کی حیثیت سے حکومت بنائی جسے برخواست کردیا گیا۔ بعد میں سردار عطاءاللہ مینگل کے صاحبزادے اختر مینگل نے حکومت بنائی تو اسے بھی برخواست کردیا گیا قوم پرستوں کا الزام ہے کہ فوج کے انٹیلی جنس ادارے بلوچ سرداروں اور قوم پرستوں کی حب الوطنی پر شک کرتے ہیں اور ان کے خلاف چھوٹے سرداروں کو پیسہ دے کر انہیں بلوچوں کا رہنما بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی بات بڑے بلوچ سردار نواب خیر بخش مری، سردار عطاءاللہ مینگل اور نواب اکبر بگٹی کی اسلام آباد کے خلاف لڑائی کی بنیاد بتائی جاتی ہے۔

بلوچستان کی موجودہ شورش کو سمجھنے کے لئے 1974ء میں قومی اسمبلی میں کی گئی چودھری ظہور الٰہی مرحوم کی یہ تقریر بہت اہمیت کی حامل ہے۔ذوالفقار علی بھٹو نے ان دنوں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت ختم کرکے بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم کردی تھی۔

جناب سپیکر! آج ہم بلوچستان سے متعلق رپورٹ پر بحث کررہے ہیں......اور بلوچستان کا مسئلہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بلوچستان میں حالات کی سنگینی مشرقی پاکستان سے کم نہیں۔

جناب والا! میں شروع ہی میں واضح کئے دیتا ہوں کہ بلوچستان کے احوال کو مشرقی پاکستان سے مشابہت دینے سے میرا مطلب ہرگز نہیں کہ بلوچستان میں علیحدگی کی کوئی تحریک چل رہی ہے۔آزاد یا گریٹر (Greater) بلوچستان بنانے کی کوششیں ہورہی

ہیں۔میرے خیال میں یہ صرف بلوچستان یا وہاں کے باشندوں کا مسئلہ ہی نہیں تمام ملک کی بقاء وسالمیت اور عوام کے مستقبل سے متعلق ہے۔اسی اہمیت کے پیش نظر بلوچستان کے ''سٹڈی ٹور'' سے واپس آتے ہی میں نے اس ایوان میں گزارش کی تھی کہ اس پر بحث میں دیر نہ کی جائے۔ بحث سینیٹ اور قومی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس میں کی جائے اور اس دوران وزیراعظم صاحب ایوان میں موجود ہوں۔

جناب والا! مجھے افسوس ہے بلوچستان کے پچیس تیس لاکھ انسانوں کی نمائندگی کرنے کے لئے آج بلوچستان سے قومی اسمبلی کے نمائندے اس ایوان میں موجود نہیں...... وہ سب بلاوجہ جیلوں میں بند ہیں۔آج اس ایوان میں بلوچستان کی صرف ایک نمائندہ معزز اور بہادر خاتون مسز جعفر موسیٰ بیٹھی ہیں۔

جناب سپیکر! میں اپنے آپ کو اس ایوان میں سب سے خوش قسمت اس لحاظ سے سمجھتا ہوں کہ جن مقامات پر اس ایوان کے اراکین بلکہ کمیٹی کے ممبران میں سے بھی کسی کو نہیں جانے دیا گیا، مجھے وہاں لے جایا گیا اور وہاں جاکر میں نے تمام واقعات وحالات کا جائزہ لیا۔مناسب تو یہ تھا کہ مجھے کم از کم چار گھنٹے دیئے جاتے تاہم اس تھوڑے سے وقت میں میں اپنی گزارشات پیش کروں گا۔

جناب والا! جس طرح بہار اور خزاں کے موسم آتے ہیں، ربیع اور خریف کی ہوائیں چلتی ہیں، جاڑے اور گرمیوں کا سورج بدلتا ہے اسی طرح انسانی دل کی شورشیں، روحوں کی بے قراریاں، انداز فکر، انسانی سوچ اور طرز عمل بھی بدلتا رہتا ہے۔بلوچستان میں میں نے جو کچھ دیکھا۔اس سے متاثر ہوکر آج اپنے اندر تبدیلی محسوس کررہا ہوں۔

آپ جانتے ہیں مختلف قسم کی جوہات جن میں ملک میں وسیع پیمانے پر جبر، تشدد اور ظلم کے واقعات بھی شامل تھے سے متاثر ہوکر جن اس ایوان میں ایسی تقریریں بھی کرتا رہا ہوں جن میں کئی الفاظ خاصے سخت ہوتے تھے۔ میں یہ بھی کرسکتا تھا کہ ایسے سخت الفاظ استعمال نہ کرتا مگر مجھے اعتراف ہے میں نے ایسا کیا......آج میری سوچ میں یہ تبدیلی آئی ہے کہ میں کوشش کروں گا میری زبان سے بلاوجہ کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جس سے کسی کی توہین ہوتی ہو۔میری دعا ہے اللہ تعالیٰ مجھے صراط مستقیم پر چلائے اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنا

فریضہ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ساتھ ہی یہ بھی دعا ہے کہ ہم سب بغیر کسی لالچ، ڈر، ذاتی پسند ناپسند کے ایک دوسرے کی جائز باتیں برداشت کرتے ہوئے اس ملک کی سلامتی، بقاء اور عوام کی بہتری کے لئے کام کریں۔

جناب والا! مجھے خوشی ہے وزیر اعظم بھی ایوان میں تشریف لے آئے ہیں ملک کے حالات ایسے ہیں کہ اگر ہم نے جو اس ملک کے سب سے بڑے ایوان کے اراکین ہیں آج مسائل کو حل کرنے میں ذرا سی بھی کوتاہی کی، غلطی کی تو انجام تباہی ہوگا...... اور تباہی صرف ہماری ہی نہیں آنے والی نسلوں کی بھی ہوگی اور وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ

اس چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ جو ہم کو دکھ تھے، بہت لا دوا نہ تھے

پہلے جو کچھ ہوتا رہا وہ کوتاہی تھی، غلطی تھی، غفلت تھی، مگر اب ہلاکت ہے اور ایسا کرنے کے لئے آج کی نوجوان نسل ہمیں اجازت نہیں دے گی۔

جناب والا! بلوچستان کے واقعات سے اب تمام دنیا واقف ہوگئی ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ۔

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

بلوچستان کے موجودہ حالات کا تعلق تین مسئلوں سے ہے۔ ایک سیاسی، دوسرا اقتصادی اور تیسرا انتظامی، جہاں تک بلوچستان کی اقتصادی حالت کا تعلق ہے مجھے انتہائی دکھ ہے کہ بلوچستان جو رقبے کے لحاظ سے اس ملک کا 48 فیصد ہے جہاں معدنیات اور دیگر وسائل کی کوئی کمی نہیں...... وہاں بسنے والوں کی حالت ناقابل بیان ہے۔

جناب والا! افسوس کا مقام ہے بلوچستان امیر ہے مگر بلوچ غریب ہیں، وہ اتنے غریب کہ میرے تصور تک میں نہ تھا کہ آج کی دنیا کے کسی گوشے میں اتنی غربت بھی ہو سکتی ہے...... جب میں کہوں کہ یہ غربت کی انتہا ہے تو اس کے کچھ معنی ہیں کیونکہ میں نے غربت کو انتہائی قریب سے دیکھا ہے۔

جناب سپیکر! وہ لوگ طوفان کے دردانگیز نتائج سے واقف نہیں ہو سکتے جو شام

کے وقت ساحل کے کنارے طوفان لہروں کا لطف اٹھانے چلے جاتے ہیں۔ طوفان کا حال تو وہ جانے جس خانہ ویراں کے گھر کی دیواروں کے ساتھ وہ لہریں ٹکراتی ہوں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ساری پونجی بہالے گئی ہوں۔

جناب والا! اور باتوں کے علاوہ کھانے کو سوکھی روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں ملتا۔ کوہلو جیل میں جو قیدی موجود تھے اور جو آتے جاتے تھے اور سارے علاقے میں جو انسان میں نے چلتے پھرتے دیکھے ان میں سے اس سردی کے موسم میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی شلوار قمیض کسی بھی لحاظ سے پہننے کے قابل ہو۔ یہ دونوں ضروری کپڑے اتنے پھٹے ہوئے اور پیوند لگے تھے کہ ان کو لباس نہیں کہا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے سرداروں کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ جناب والا! ماسوائے چار پانچ سرداروں کے تمام صوبے کے چھوٹے چھوٹے سرداروں اور وڈیروں کا بھی یہی حال ہے میں نے وہاں کے ایک وڈیرے کی قمیض اپنی قمیض سے بدلی اور وہ اس ایوان کے اراکین کو دکھانے لے آیا ہوں۔ آپ دیکھیں اس میں کتنے پیوند ہیں اور کیا اس کی ایک تار بھی سلامت ہے؟ (جذباتی انداز میں قمیض دکھائی) میں چاہتا ہوں ملک کے عوام کو خاص طور پر اس ملک کے سرمایہ داروں کو یہ پتہ چلے کہ جن لوگوں کے ساتھ ہم نے مساوات محمدی کا وعدہ کیا تھا ان کی حالت یہ ہے کہ ان کی مستورات بھی سر اور پاؤں سے ننگی ٹاٹ کے یا پھٹے پرانے کپڑے سے اپنا سر ڈھانپتی ہیں...... جبکہ تمہارے کتے بھی بستروں میں سوتے اور تمہارے سوٹ پیرس اور لندن سے سل کر آتے ہیں۔

جناب سپیکر! آپ جانتے ہیں جیلوں میں قیدیوں کے ساتھ ان کے ورثاء ملاقات کرنے آتے ہیں اور ملاقات کے لئے کچھ نہ کچھ دینے کیلئے لاتے ہیں میرے وہاں قیام کے دوران قیدیوں سے ملاقات کرنے کے لئے ماسوائے ایک واقعہ کے کوئی ملاقاتی نہیں آیا میں نے قیدیوں سے پوچھا ایسا کیوں ہے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ جھونپڑیوں میں، پہاڑوں میں رہتے تھے ملیشیا اور فوج والے ان کو پکڑ کر لے آئے اور ان کے بیوی بچے بھاگ کر معلوم نہیں پہاڑوں میں کہاں چلے گئے ہوں گے اور نہ جانے کس حال میں ہوں گے اگر ان کو رہا بھی کر دیا جائے تو وہ ان کو کم از کم ایک ماہ قبل ڈھونڈ نہ سکیں گے۔

ایک واقعہ جو دیکھ کر کانپ گیا، یہ تھا کہ ایک بوڑھی عورت جس کی عمر ستر بہتر سال ہوگی اپنے بیٹے سے جیل میں ملنے آئی وہ خاتون اس قیامت خیز سردی میں سر اور پاؤں سے ننگی اور پھٹے ہوئے کپڑے، شلوار قمیض پہنے تھی۔ اس کا بیٹا دوسرے قیدیوں کے ہمراہ میرے پاس بیٹھا تھا۔ وہ اپنے بیٹے سے مل کر چیخ چیخ کر پاگلوں کی طرح روئی اور پھر اپنی پھٹی قمیض کی آستین سے کچھ کھولنے لگی۔ میں نے سوچا شاید اپنے لخت جگر کو کچھ دے رہی ہے۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا جو کچھ وہ لے آئی، وہ چار پانچ انچ کا گندم کی روٹی کا ایک ٹکڑا اور مٹی سے آلودہ دو گاجریں تھیں۔ اس کے بیٹے نے میرے سامنے ایک مویشی کی طرح جسے کئی دنوں سے رہ نہ ملا ہو، ایک لمحے میں کھالیں۔

جناب والا! یہ ہے حالت ان لوگوں کی جنہیں ہم شرپسند کہتے ہیں جنہیں ہم یہاں بیٹھے ہوئے کہتے کہ غیر ملکی اشاروں پر آزاد بلوچستان بنانا چاہتے ہیں۔

جناب سپیکر! اور سنیئے، ان محب وطن پاکستانیوں کا حال جیل میں ڈیوٹی پر متعین نیوی کے ایک ملازم نے جو ڈیوٹی بھی پھٹے پرانے کپڑوں سے دے رہا تھا، مجھے اپنے ایک لڑکے سے ملایا جو کوئٹہ میں ایف اے میں پڑھتا تھا اور چھٹیوں میں گھر آیا تھا۔ مجھے اس نوجوان نے بتایا کہ اس کے باپ کو ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے اس تنخواہ سے گھر کے آٹھ افراد نے گزارا کرنا ہوتا ہے۔ تعلیم کے اخراجات وہ کوئٹہ میں چائے کی ایک دکان پر کام کر کے پورے کر رہا ہے اور آج کل چھٹیوں میں سڑک بنانے کے لئے مزدوری کر رہا ہے۔ اس طرح اس کا تمام خاندان گزارا کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آہستہ آہستہ اس کا چہرہ سرخ ہوتا گیا اور جناب سپیکر وہ کہنے لگا: ''آپ کہتے ہیں ہم شرپسند ہیں، آپ ہمیں خوشحال بنانے کے لئے سڑکیں بنانا چاہتے ہیں، سڑکیں بن جانے کے بعد بلوچستان سے معدنیات نکلیں گی کیا معدنیات پہلے نہیں نکل رہیں؟ کیا سوئی گیس بلوچستان سے نہیں نکلی؟ کیا آپ وجہ بیان کر سکتے ہیں؟ سوئی گیس جو ملک کے کونے کونے میں پہنچ چکی ہے تمام بلوچستان میں کسی جگہ اس گیس کا ایک چولہا کیوں نہ لگ سکا؟ کیا مساوات محمدی کا نعرہ صرف ہمیں بھوکا مارنے کے لئے لگایا گیا تھا؟ جناب سپیکر! ان تمام باتوں کا جواب میرے پاس نہ تھا کیونکہ میں آپ اور اس ایوان کے معزز اراکین یہ جانتے ہیں کہ اس ملک میں کیا

کچھ ہو رہا ہے؟ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ چاولوں کے پرمٹ لے کر ہمارے سرمایہ دار ایک ایک سودے میں چھبیس چھبیس کروڑ روپے کما رہے ہیں اور ہمارے علم میں یہ بھی ہے کہ وہی سرمایہ دار جہاز خرید کر ایک ایک سودے میں دس ملین ڈالر بطور کمیشن وصول کر رہے ہیں......
اور شاید آپ یہ بھی جانتے ہوں مگر اس ایوان میں تین چار معزز اراکین ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کے سرمایہ داروں کی بیگمات ''کرسچین ڈیئر'' کے پرفیوم کی شیشی جو 200 ڈالر کی پیرس سے آتی ہے اور جو یہاں تقریباً 4 ہزار روپے کی کاسٹ کرتی ہے منگوا کر صرف ایک تقریب کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ یہ ہے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی اسلامی مساوات جس کے لئے ہم نے یہ ملک بنایا تھا۔

جناب والا! مجھے یاد ہے ایک وقت تھا، جب سردار خیر بخش مری، سردار اکبر بگٹی اور سردار عطاء اللہ مینگل ایوبی دور میں جیل میں تھے۔ ایوب ہال میں ان اور بلوچستان کے عوام کا ذکر کرتے ہوئے جناب وزیراعظم صاحب نے جو اس وقت ایوان میں موجود ہیں، اس کی پروانہ کرتے ہوئے کہ وہ خود وزیر ہیں، ان لیڈروں کی اور بلوچستان کے عوام کی ہمدردی میں تقریر کی تھی۔ ان کا حال بیان کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

جناب والا! آج اس بڑھیا کو دیکھنے کے بعد، اس نوجوان کی باتیں سننے کے بعد بلوچستان کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور جو کچھ تمام ملک میں ہو رہا ہے اس کے پیش نظر آج وہی آنسو میری آنکھوں میں آگئے ہیں...... میں چاہتا ہوں جی بھر کر روؤں...... جس قدر چیخ کر نالہ فریاد کر سکتا ہوں، کروں۔ میری چیخیں ملک کی موجودہ عیش ونشاط کی فضا کو مکدر کر دیں۔ میری آہ وفغاں آج کے تمام عشرت کدوں کو ماتم کدہ بنا دے ہم سب کی آنکھیں بارش کے پانی کی طرح بہہ جائیں۔ ہمارے دل تنور کی طرح بھڑک اٹھیں اور ہماری غفلت کی بستی اس طرح اجڑے کہ پھر کبھی آباد نہ ہو۔ ہم اپنے فرض کو پہچانیں اور اس ملک میں صحیح معنوں میں مساوات محمدی لائیں آج بلوچستان کے عوام ہمارے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

جناب سپیکر! جہاں تک بلوچستان کے سیاسی حالات کا تعلق ہے، میں وقت کی کمی کے پیش نظر اس معزز ایوان کا زیادہ وقت نہ لوں گا کیونکہ آپ سب سیاسی حالات سے واقف ہیں۔

جناب والا! جب پاکستان بنا تو بلوچستان کے عوام، جو قائداعظم کا ساتھ دینے میں کسی طرح بھی پیچھے نہ تھے، کے ساتھ وعدہ کیا گیا کہ بلوچستان کو بہت جلد صوبے کا درجہ دیا جائے گا، مگر قائداعظمؒ کی بے وقت وفات کے بعد کافی عرصے تک ایسا نہ کیا گیا۔ 1958ء بلوچستان میں فوجی کارروائی کی گئی اور خان آف قلات جو آج گورنر بنایا گیا ہے، کو گرفتار کر کے لاہور میں نظر بند کر دیا گیا...... نواب نوروز خان بلوچ جو اپنے ساتھیوں سمیت پہاڑوں پر چلے گئے تھے کو حکومت پاکستان نے پیشکش کی کہ اگر وہ ہتھیار رکھ کر واپس آ جائیں اور اپنے آپ کو حکومت کے حوالے کر دیں تو انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔

انہوں نے وہ پیشکش مان کر خود کو حکومت کے حوالے کر دیا مگر ہم نے وعدہ خلافی کر کے ان کو، ان کے دو بیٹوں اور چار دوسرے ساتھیوں کو سکھر جیل میں تختہ دار پر لٹکا دیا۔ ایوب خان کے دور میں جب مختلف وجوہات کی بناء پر ون یونٹ کے خلاف نفرت بڑھی، تو حکومت نے بلوچستان کے عوام کو اسلحہ جمع کرانے کا حکم دیا۔ اس حکم نے جلتی پر تیل کا کام کیا کیونکہ اسلحہ ان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اسلحہ توڑ کر حکام کے حوالے۔ سردار عطاء اللہ مینگل، میر غوث بخش بزنجو اور سردار اکبر خان بگٹی وغیرہ کو گرفتار کر لیا گیا کچھ لوگ پہاڑوں پر جا کر لڑتے رہے۔ آخر بات صلح کرتے ہی بنی۔

جناب والا! جب بلوچستان کے منتخب عوام کی حکومت بنی تو ہم نے یہاں بیٹھ کر بلا چون و چرا ان کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں میں وقت کی کمی کے باعث تفصیل میں نہیں جا سکتا۔

جناب سپیکر! پہلے اس حکومت کو بدنام کرنے کیلئے پنجابی ملازموں کو وہاں سے نکلوایا گیا آپ کو یاد ہوگا اس مقصد کے لئے نتھیا گلی میں گورنرز کانفرنس ہوئی، جس میں گورنر پنجاب نے کہا تھا کہ پنجابی ملازمین کو فوراً وہاں سے بھیج دیں اور یقین دلایا کہ وہ ان کو پنجاب میں لے لیں گے...... مگر وہ بیچارے جن کو چلتے وقت اس وقت کے وزیراعلیٰ سردار

عطاء اللہ مینگل نے الوداعی دعوت دے کر رخصت کیا آج تک مارے مارے پھرتے ہیں پھر بلوچستان کی صوبائی حکومت کے راستے میں ہر طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ پھر لندن پلان بنا اور بگٹی صاحب لندن سے پاکستان آ گئے۔ عراقی اسلحہ اسکینڈل بنا جس کے متعلق اب تمام لوگوں کو پتہ چل گیا ہے کہ وہ کیا تھا؟...... مگر اس کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ عراقی اسلحہ کسی شرپسند کے ہاں سے تو وزیر داخلہ برآمد نہیں کر سکے۔ صرف اس کی برآمدگی میرے گھر، گجرات سے ریڈیو پر سنائی گئی۔ اس کے بعد وہ مجھے بھی آج تک نہیں دکھایا گیا۔

آخر 15 فروری 1973ء کو صوبائی حکومت جسے دو تہائی ممبروں کی حمایت حاصل تھی، توڑ دی گئی بگٹی صاحب کو صوبے کا گورنر بنا دیا گیا اور لوگوں کو حساب کا ایک نیا فارمولا سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ 9 کا ہندسہ 12 کے ہندسے سے بڑا ہوتا ہے۔

سردار خیر بخش مری، سردار عطاء اللہ مینگل، ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ، میر غوث بخش بزنجو، سینیٹر محمود عزیز کرد، سینیٹر زمرد حسین، میر گل خان نصیر، امیر الملک مینگل اور حنیف بلوچ وغیرہ کو پکڑا اور جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ آج بھی دو ہزار سے زائد بلوچ جن میں سیاسی رہنما، طالب علم اور مزدور شامل ہیں جیلوں میں مختلف قسم کی تکالیف برداشت کر رہے ہیں۔

سردار شیر محمد مزاری جن سے میری پہلی بار کراچی جیل میں ملاقات ہوئی، جو صحیح معنوں میں محب وطن پاکستانی ہیں، 1972ء کے آخر میں لندن سے واپسی پر اپنے گھر پہنچے۔ 28 فروری کو آپ کو کوہلو میں وائرلیس پر پیغام ملا کہ بی میں وزیراعظم صاحب کی گارڈن پارٹی میں شریک ہوں لیکن اگلے دن یکم مارچ کو وہ "جنرل شیروف شرپسندوں کے لیڈر" بن گئے اور ان کو اپنے گھر سے گرفتار کر کے ایوبی دور کی طرح اخباروں میں تصاویر شائع کرا دی گئیں۔ مختلف قسم کے تشدد کے بعد اور باوجود اس بات کے کہ ان پر کوئی جرم ثابت نہیں کیا جا سکا، جیل میں پڑے ہیں۔

جناب سپیکر! جب مارچ کے آغاز میں باقاعدہ فوجی کارروائی شروع ہوئی تو کچھ لوگ ڈر، غصے اور نفرت کی بناء پر قریبی پہاڑیوں میں چلے گئے اور اپنی فوج کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئے...... مگر جناب والا! 1962ء میں ان لوگوں کے پہاڑوں پر جانے، اپنی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے اور اب پہاڑوں پر جا کر اپنے ملک کی حکومت

اورفوج کے خلاف ہتھیار اٹھانے میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس وقت سرداروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اور اپنا اسلحہ نہ دینے کے لئے وہ لوگ پہاڑوں پر گئے تھے..... مگر آج نفرت، غصے اور عوامی حقوق کی پامالی کی وجہ سے پہاڑوں پر جا کر لڑنے پر مجبور ہوئے۔

جناب والا! یہی وجہ ہے بلوچستان کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ کوئٹہ کے ایک دفتر کا ایک چپڑاسی خالد نامی ایک جگہ پر کمان کر رہا ہے اور اس کے ماتحت بڑے بڑے سرداروں کے لڑکے لڑ رہے ہیں۔

جناب سپیکر! ہمارے لئے گو شاید یہ کوئی بڑی بات نہ ہو، مگر بلوچستان میں اس سے قبل اس سپرٹ کا مظاہرہ کبھی نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ موجودہ گورنر کا حقیقی بھتیجا اور بھانجا بھی دوسرے نوجوانوں کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ جناب والا! میں وزیراعظم اور اس ایوان کے معزز اراکین سے استدعا کروں گا کہ وہ سوچیں آخر یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔

جناب والا! میں آپ کی وساطت سے ایک اور چیز اس معزز ایوان کے معزز اراکین کے نوٹس میں لانا چاہتا ہوں کہ اگر حکومت کو ہٹانا ہی مقصود تھا تو پھر بھی کچھ دیر اور نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلمائے اسلام کی حکومت وہاں رہنے دی جاتی۔ چونکہ لوگوں کے اقتصادی مسائل حل نہیں ہو رہے تھے وہاں کے عوام خود بخود اس حکومت کے خلاف ہو جاتے اور شاید سیاسی حملے سے ہی وہ حکومت نہ رہتی اور اس تباہ کن کارروائی کی ضرورت پیش نہ آتی۔

جناب سپیکر! میں آپ سے یہ گزارش کروں گا کہ بلوچستان کے مسئلے کے فوری طور پر سیاسی طریقے سے حل کیا جائے اور سیاسی حل صرف یہی ہے کہ اکثریتی پارٹی کی حکومت بحال کر دی جائے تمام اسیروں کو فوری طور پر رہا کیا جائے، بلوچستان کے عوام کی حالت دیکھ کر ان کی امداد کے لئے اس ملک کے وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے فوراً وہاں جائیں۔ وہ بیگمات جنہوں نے سوشل ورک میں مہارت حاصل کی وہ وہاں بھی جائیں اور دیکھیں وہاں انسانیت کی کیا حالت ہے؟ مرکزی حکومت بلوچستان کے طلبہ کی خاص طور پر مدد کرے۔ سروسز کے معاملے میں پڑھے لکھے نوجوانوں کو خصوصی مراعات دی جائیں۔

جناب والا! آپ حیران ہوں گے باوجود اس امر کہ بلوچستان کے پڑھے لکھے نوجوان ملک کے دوسرے نوجوانوں سے کسی طور پر بھی کم بہادر اور جفاکش نہیں، انہیں فوج میں کمشن نہیں دیا جاتا اور جب سے پاکستان بنا ہے ایک بلوچ بھی افواج پاکستان میں کمشنڈ افسر بھرتی نہیں کیا گیا۔

جناب والا! ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہماری غلطیوں کی وجہ سے بلوچستان کے نوجوانوں کے جذبات مشتعل ہو چکے ہیں۔ ہمیں بے چین نوجوانوں کے بارے میں زیادہ سنجیدہ رویہ اختیار کرنا چاہئے بھوکے آدمی پر غصہ غالب آ جاتا ہے اور اگر اس کے مزاج میں نفرت کا عنصر بھی شامل ہو جائے تو وہ باغی ہو کر خوفناک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ایسی صورت میں اپنے آپ سے بغاوت کرتا ہے اور آخر پاگل ہو کر مذہب سے بھی بغاوت کر دیتا ہے لیکن جناب والا! ملک کا تعلیم یافتہ نوجوان غم و غصے سے مغلوب ہو نہ ہو، بغاوت پر مائل ہو نہ ہو، ہر مہذب حکومت کا فرض ہے ہر شہری کو اس کی صلاحیت کے مطابق تعلیم دلوائے اور مناسب روزگار مہیا کرے۔

جناب والا! اب ہمیں غداری کے سرٹیفکیٹ جاری کرنے بند کر دینا چاہئیں، اب تک ہم بہت کچھ کر چکے ہیں۔ اس ملک میں جس کسی نے چاہے وہ ایک فرد ہو یا طبقہ یا گروہ یا سیاسی جماعت، حکومت کے خلاف حق کی آواز اٹھائے، چاہے وہ پاکستان کی خاطر سب کچھ لٹا کر ہندوستان سے آیا ہو، محب وطن پٹھان ہو یا بلوچ، ہم نے انہیں کبھی غداری، کبھی شرپسند اور کبھی تخریب پسند ہونے کا لقب عطا فرمایا اور جناب والا! کیا آپ جانتے ہیں ان کے بچے بچے کی زبان پر اب کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں۔

ہے طعنہ تخریب چمن اہل چمن پر
صیاد پہ لیکن کوئی الزام نہیں ہے
میں نے ہی تو مے خانے کو مے خانہ بنایا
میرے ہی مقدر میں کوئی جام نہیں ہے

جناب والا! بلوچستان کے عوام ہم سے زیادہ بہادر، جفاکش اور محب وطن ہیں۔ مجھے حال ہی میں بلوچستان کی سرزمین پر قتل کروا دینے کی سازش بھی کی گئی۔ جہاں تک

میری اطلاع ہے، قتل کروانے کی سازش میں وزیراعظم صاحب کا ہاتھ نہ تھا، مگر بلوچستان والوں نے اس سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ باہر سے آئے ہوئے ہر شخص کو خواہ وہ ان کا مخالف ہو، اپنا مہمان سمجھتے ہیں۔ مہمان نوازی کے سلسلے میں ان کے بڑے پکے اصول ہیں، جن کی وہ سختی سے پابندی کرتے ہیں۔

جناب والا! مایوسی اکثر اوقات سرکشی کی صورت اختیار کر لیتی ہے لیکن اس کا یہ علاج نہیں کہ اسے قوت سے دبایا جائے۔ اس سے تو وہ اور شدت سے ابھرتی ہے۔ اس کا علاج ان اسباب کا ازالہ ہے جن سے یہ حالات پیدا ہوئے اور اس کے لئے ہمیں اپنا انداز فکر اور اپنی سوچ بدلنا ہوگی۔ میں وزیراعظم صاحب کی ایک تقریر جو انہوں نے ایوب ہال میں 13 اپریل 1963ء کو مسٹر محبوب الحق کی تقریر کے جواب میں کی، کے چند الفاظ پڑھ کر سناتا ہوں۔

''ضرورت تو اس بات کی ہے کہ پاکستان بھر کے لوگ ہر سطح پر امور مملکت میں کسی نہ کسی طرح حصہ لے رہے ہوں...... اہم بات یہ ہے کہ ہمیں صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے حقائق پسندی سے کام لینا چاہئے۔ اگر بعض لوگ کم مستعد ہیں تو بھی انہیں قومی ترقی میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہئے تاکہ وہ اس بات پر فخر کر سکیں کہ وطن عزیز کی شادمانی اور خوشحالی میں ان کا بھی ہاتھ ہے...... وہ صرف فائدہ اٹھانے والے ہی نہ ہوں کسی فیصلے یا کارروائی کے نتیجے میں محض فائدہ حاصل کر لینا ہی کافی نہیں۔ اس فیصلے اور کارروائی میں حصہ لینا لازمی ہے، جس کے عمدہ نتائج نکلتے ہیں۔''

جناب والا! میں اپنے معزز دوست پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ وہ حالات و واقعات کا جائزہ حقیقت پسندی سے لیں۔ اس کے بغیر سوچنا، بولنا یا کچھ کرنا مفید نہ ہوگا۔ ہمیں پاکستان کے ہر حصے اور ہر خطے کو مساوی درجہ دینا چاہئے۔ کمتری اور برتری کے معیار کو مدنظر رکھ کر سوچنا مناسب نہیں۔

جناب والا! ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر میں اس ایوان کے تمام معزز اراکین اور وزیراعظم صاحب سے خاص طور پر التجا کروں گا کہ آج ہمیں اپنی ذاتی نفرت و کدورت اور پسند و ناپسند کی پروا نہ کرتے ہوئے نہایت ٹھنڈے دل سے اس مسئلے کو حل

کرنا چاہئے۔ ملک اب مزید کسی خرابی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کو صحیح معنوں میں اسلامی جمہوریہ پاکستان بنائیں اور ایسا کرنا حزب اختلاف اور حکومتی پارٹی دونوں کی ذمہ داری ہے۔ حزب اختلاف کو چاہئے کہ دیانتداری سے برائی کی نشاندہی کرے اور حکومتی پارٹی کا فرض ہے، جائز تنقید برداشت کرے۔

جناب والا! وزیراعظم صاحب یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ ایک اسلامی مملکت کے سربراہ ہیں اور اسلام کی تاریخ یہ ہے کہ منصور عباسی جس کے خوف سے لوگ گھروں میں بیٹھے کانپتے تھے، ایک دن کعبہ کا طواف کر رہا تھا آواز آئی کوئی شخص دعا مانگ رہا ہے: ''خدایا! میں تیرے آگے دعا کرتا ہوں کہ ظالم غالب آ گیا ہے اور حق اور حقداروں کے درمیان رکاوٹ بن گیا ہے۔'' منصور نے پلٹ کر دیکھا، اس خیال سے شاید وہ شخص اسے پہچانتا نہیں، پوچھا ''وہ کون ہے جس کا ظلم رکاوٹ بن گیا ہے۔'' جواب آیا: ''تیرا وجود اور تیری حکومت۔'' مگر جناب سپیکر! منصور عباسی نے یہ نہ کیا کہ اسے ڈی پی آر کے تحت جیل بھجوا دو، بلکہ اسی وقت سجدے میں گر کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کی سلطنت میں ایسے حق گو افراد موجود ہیں۔

جناب سپیکر! حکومت کی طرف سے کہا جاتا ہے حکومت عوام کی بہتری کے لئے سرداری نظام کو ختم کرنا چاہتی ہے اور یہ گڑ بڑ اس کا ردعمل ہے۔ جناب والا، ایسا ہرگز نہیں کیونکہ سرداری نظام ختم کرنے کے لئے تو سب سے پہلے سردار عطاء اللہ مینگل کی حکومت نے باقاعدہ ریزولیشن پاس کی، جو آج تک اسلام آباد میں ردی کے ٹوکروں میں پڑی ہے اور وفاقی حکومت نے اس پر کچھ عمل نہیں کیا۔ یہ اچھا سرداری نظام ختم ہو رہا ہے کہ سردار عطاء اللہ مینگل کو ہٹا کر سردار اکبر بگٹی اور جام لسبیلہ کو لایا جائے اور سردار اکبر بگٹی کو ہٹا کر سردار خان آف قلات کو گورنر بنا دیا جائے۔

جناب سپیکر! بلوچستان کے اقتصادی امور اور سیاسی حالات کے متعلق میں نے عرض کر دیا۔ مجھے دوسرے محترم قائدین نے اپنی اپنی تقریر کا وقت دیا جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ اب بلوچستان کے انتظامی حالات کے متعلق مختصراً عرض کروں گا۔ بقول مولانا ظفر علی خانؒ۔

زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے
خود اپنی ہی رعایا سے پڑا ہو جس کو ٹکرانا

جناب والا! جتنا خرچ وہاں فوج پر ہو رہا ہے اس سے بہت کم خرچ کر کے انہی لوگوں کو سمجھا کر ان کا تعاون حاصل کر کے بغیر کسی جانی نقصان کے اور اتنی نفرت پیدا کرنے کے حالات کو ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ترقی اور خوشحالی کے نام پر بھائی کا سینہ بھائی کی گولی سے چھلنی ہو رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا سردار عطاء اللہ مینگل نے کہا تھا: ''ہمیں بھائی کو مارتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اور بھائی کے ہاتھوں مرتے ہوئے بھی۔''

جناب سپیکر! میں پنجاب کے معزز اراکین سے خاص طور پر گزارش کروں گا کہ بلوچستان کے رہنے والوں کی تاریخ بہت مختلف ہے وہ کبھی بھی تشدد کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے فرض کریں گزشتہ تاریخ کے برعکس انہیں دبا بھی لیا جائے تو بھی جناب والا! آگ کے شعلے تو بجھ سکتے ہیں راکھ کے ڈھیر میں چنگاریاں دبی رہتی ہیں اور ہوا کے ایک جھونکے سے بھڑک اٹھتی ہیں۔ میں اس سلسلے میں جناب وزیراعظم صاحب کی ایک تقریر جو انہوں نے 17 نومبر 1963ء کو قومی اسمبلی میں کی تھی، کے چند فقرے عرض کرتا ہوں:

''ریاست جموں و کشمیر میں عوام کو طاقت سے دبایا جا رہا ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا، یہ اخلاقیات سے گری ہوئی بات ہے۔ یہ انسانی قدروں کے سراسر خلاف ہے اس لئے کسی سے تشدد اور جبر سے بات منوائی نہیں جاتی لوگوں پر جس قدر تشدد کیا جائے گا، وہ اسی شدت سے تشدد کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے جتنا ظلم بڑھے گا۔ اس سے کئی گنا زیادہ مزاحمت بڑھے گی۔''

جناب سپیکر! فرانسیسی ضرب المثل ہے کہ جو گولی چل چکی وہ آدھے راستے سے واپس نہ آئے گی، اس کے لئے تم کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرو!

جناب والا! جو عمارت سالوں میں نہیں بن سکی، اسے چند دنوں میں ڈھا دینے میں ہم کیوں اتنے بیباک ہو گئے ہیں؟ میں آخر میں پھر عرض کروں گا ہمیں اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ خاص طور پر پنجاب کے معزز اراکین سوچیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ اگر ان کی زبانیں اس ایوان میں نہیں کھل سکتیں تو کم از کم اپنی پارٹی کی میٹنگ میں تو

ان امور پر دیانتداری سے اظہار خیال کریں میں تو پنجاب کے صوفی شاعر فرید کے بقول اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔

کوک فریدا کوک جیویں راکھا جوار
جد تک ٹانڈا نہ ڈگی، کردا رہیں پکار

جون 2005ء کے روزنامہ پاکستان کے سنڈے میگزین 'زندگی' کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان مسلم لیگ (ن) کی معروف رہنما اور رکن قومی اسمبلی محترمہ تہمینہ دولتانہ نے بلوچستان کی تازہ صورت حال اور ماضی میں پیدا ہونے والے کرائسس کے حوالے سے کہا تھا۔

س: بلوچستان میں سرکاری ایجنسیوں، فوج، مقامی آبادی اور قبائلی سرداروں کے درمیان محاذ آرائی کی کیفیت ہے، تصادم بھی ہو چکا ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ڈیرہ بگٹی وغیرہ میں جو کچھ ہوا، اس صورت حال میں وہاں دانا آپریشن کی طرح کے کسی آپریشن کی گنجائش ہے؟

ج: دیکھیں جی وہاں پر وانا آپریشن سے ہٹ کر تو کچھ نہیں ہوا۔ بے قصور لوگوں کو مارا گیا ہے ان کو ان کے حق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ وہ اپنے علاقے کے لئے کچھ مانگ رہے ہیں ٹھیک ہے آپ نے گوادر پورٹ بنایا، یہ بڑی اچھی بات ہے لیکن اگر یہاں روزگار کے مواقع نکلتے ہیں تو گوادار کے لوگوں کو ملنے چاہئیں کیونکہ وہ وہاں کے رہنے والے ہیں۔ یہ نہیں کہ آپ پورٹس بنا دیں، سڑکیں بنا دیں اور دوسری جگہوں سے لوگوں کو لا کر یہاں بٹھا دیں۔ یہ چیز ان کے اندر تلخی پیدا کر رہی ہے جس طرح ہندوستان میں ہوا ہے کہ بعض مسلم اکثریتی علاقوں میں انہوں نے ترقیاتی کام کئے پھر وہاں پر دوسری جگہوں سے لوگوں کو لا کر آباد کیا۔ مقامی آبادی کی ترقی کے لئے کچھ نہ کیا اس طرح کی پالیسیوں سے لوگ غریب کے غریب رہ جاتے ہیں یہی پوزیشن بلوچستان میں ہے اور سندھ میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ کراچی کی بندرگاہ بنی، کراچی کو ترقی ملی لیکن اندرون سندھ کے رہنے والے اس کے ثمرات سے محروم رہے کراچی میں پاکستان کے مختلف خطوں سے لوگ آ بسے میں یہ نہیں کہتی کہ دوسرے

شہروں یا صوبوں سے لوگ کراچی ایسی جگہوں پر نہ آئیں لیکن مقامی آبادی کو تو اس ترقی سے حصہ ملنا چاہئے۔ بلوچستان میں کئی علاقوں میں انسان اور جانور ایک جگہ پانی پیتے ہیں بلکہ کئی جگہ تو پانی ہے ہی نہیں۔ وہاں سڑکیں نہیں۔ میں کئی بار کوئٹہ گئی ہوں بلوچستان کے چھوٹے شہروں تک گئی ہوں ہم کار کے ذریعے چاغی گئے راستے میں ایسا بھی ہوا کہ کوئی سڑک نہیں تھی۔ ہم ریت پر چل رہے تھے کہا گیا کہ یہی سڑک ہے میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں ڈویلپمنٹ ہونی چاہیے وہاں سڑکیں اور سکول بننے چاہیں ٹیکنیکل سکول ہونے چاہیں تاکہ لوگوں کو روزگار کے مواقع میسر آئیں ان کا احساس محرومی دور ہو۔ بلوچستان میں جو حالات ہوئے ہیں کہ تصادم میں لوگ مارے گئے، ان کی لاشیں اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی اور جو زخمی تھے وہ طبی امداد سے محرومی کی وجہ سے وہیں پر مر گئے اس وقت بڑی خوفناک صورت حال ہے ہم لوگوں نے اس کو اسمبلی میں اٹھایا۔ اس پر بات کی اور میں نے وہاں تقریر میں کہا کہ ہم وہاں پر ARD اور MMA کا وفد لے کر جائیں گے اس کے بعد پارلیمانی گروپ بنایا گیا جس میں حکومت اور اپوزیشن دونوں تھے، پھر وہ سب کے سب وہاں گئے اس طرح مذاکرات اور بات چیت کا ایک راستہ ہموار ہوا جس کے بعد ہی شجاعت صاحب وہاں جا سکے ان سے پہلے تو وہ ملنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ان کے دل اتنے دکھی تھے غم بہت شدید تھا لیکن ہمارے وہاں جانے سے جو بریک تھرو ہوا اس کے بعد انہوں نے اپنے دروازے کھولے اور مذاکرات کا آغاز ہوا۔

س: کیا چودھری شجاعت یا مشاہد حسین یہ مسئلہ حل کر سکیں گے، کیا جنرل مشرف کو ان سرداروں سے خود مذاکرات نہیں کرنے چاہیں؟

ج: ہندوستان جو ابھی ماضی قریب تک ہمارا دشمن ملک تھا اور اس کی موجودہ پوزیشن کے بارے میں پرویز مشرف تو کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ دشمنوں کے ملک میں تو آپ جاتے ہیں ان سے ملتے ہیں ان سے مذاکرات کرتے ہیں اگر اپنوں کو کوئی تکلیف ہے ان سے کوئی ناراضگی ہے تو اپنوں کو ملتے وقت آپ کو کیوں ہتک محسوس ہوتی ہے۔ پاکستان پاکستانیوں کا ہے۔ یہاں کا ہر شہری معزز شہری ہے اکبر بگتی صاحب کا

پاکستان میں بڑا اہم کردار ہے۔ وہ بلوچستان کے سابقہ گورنر بھی رہے ہیں۔ بلوچ تو ووٹ ڈال کر پاکستان کے ساتھ ملے تھے ان کی تو جتنی عزت کریں کم ہے۔ اگر انہیں کوئی تکلیف محسوس ہو رہی ہے تو اس کا ازالہ کیا جائے۔ جنرل صاحب اس وقت سارے اختیارات کے مالک ہیں اگر کسی کو ناراضگی ہے کسی کو تکلیف پہنچی ہے تو آپ کو اس کے پاس جانے میں کوئی شرمندگی نہیں ہونی چاہئے۔ ہم سیاسی لوگ ہیں اگر خدانخواستہ کسی کو ہم سے کوئی تکلیف پہنچے تو ہم سیدھے اس کے گھر جاتے ہیں یہی تو مسئلہ ہے کہ ایک فوجی سمجھتا ہے کہ اس نے جو حکم دیا ہے، اس کے مطابق چلا جائے جو اس حکم کے مطابق نہیں چلے گا۔ وہ اس کا دشمن ہو جائے گا۔ یہ پاکستان ہمارا ہے اس میں بسنے والے سب لوگ ہمارے بہن بھائی ہیں ہمارے اپنے ہیں اور اپنوں کے ساتھ پرائیوں جیسا سلوک نہیں کیا جاتا۔

س: اگر آپ کی پارٹی برسراقتدار ہوتی اور اس کے دور میں ایسا مسئلہ پیدا ہوتا تو آپ اسے کس طرح حل کرتے؟

ج: سیاسی لوگ ہمیشہ سیاسی طریقہ کار اختیار کرتے ہیں اور وہ مذاکرات کا طریقہ ہوتا ہے انسان بولتا ہے، بات کرتا ہے ہمارے ہی دور میں بلوچستان میں تقسیم کار ہوئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ صوبوں کے معاملات کو اس طرح چلایا جائے گا۔ فیڈرل گورنمنٹ کے پاس یہ پاور ہوگی، صوبوں کے پاس یہ ہوگی۔ ہمارے دور میں ہی گوادر پورٹ کا پروگرام بنا۔ ابھی پچھلے دنوں میں کوئٹہ گئی تو وہاں لوگ کہنے لگے کہ میاں صاحب کو کہہ دو کہ کوئٹہ ان کا اپنا شہر ہے وہ بار بار کوئٹہ آتے تھے انہیں بلوچستان کا جتنا فکر تھا ہمیں پتہ ہے ہم ان سے محبت کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ بلوچستان کی ترقی میں ان کا کیا کردار ہے۔ گوادر پورٹ، نیشنل ہائی وے، موٹر ویز، سڑکوں کا جال، پانی کا پروگرام، ٹیکنیکل کالجز کا قیام وغیرہ یہ سب میاں صاحب کی بلوچستان اور پسماندہ علاقوں سے دلچسپی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میں بلوچستان میں تھی وہ کہنے لگے کہ ہمارا صوبہ سب سے بڑا ہے لیکن ہمیں سب سے پیچھے رکھا جاتا ہے اور ہمارے احساس محرومی میں اضافہ کیا جاتا ہے یہ ہمارے دس

مطالبات ہیں میاں صاحب کے علم میں لائیں کہ ہمارے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے میں ان کے دس مطالبات لے کر میاں صاحب کے پاس گئی کہنے لگے بس یہی کچھ مانگا ہے؟ سب پورا کر دو۔

مارچ 2002ء میں سابقہ وفاقی وزیر عبدالحفیظ پیرزادہ نے اس حوالے سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں کہا تھا۔

س: بلوچستان میں فوجی ایکشن ایک غلط اقدام تھا کیا آپ اس غلطی کو تسلیم کرتے ہیں؟

عبدالحفیظ پیرزادہ: غلطیاں تو ہم سے ہوئی ہیں ناں، اگر یہ غلطیاں نہ ہوتیں تو ہمیں یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ وہ سب اوورری ایکشن تھا لوگ کہتے ہیں کہ دیکھیں جی ایک طرف تو حکومت آئین بنوا رہی ہے اور دوسری طرف بنیادی حقوق معطل کر دیئے گئے لیکن دیکھا جائے تو بنیادی حقوق تو پہلے سے ہی معطل تھے جو ایوب خان نے 1965ء کی جنگ میں کیئے تھے۔ اس کے بعد ان حقوق کو کسی نے بحال نہیں کیا تھا لیکن یہ ضرور تھا کہ اس سے آئین کی روح کو دھچکا لگا۔ دوسرے یہ کہ آپ دیکھیئے کہ اس وقت پیپلز پارٹی کی Homogeneous حکومت نہیں تھی۔ صوبہ سرحد سے ہمارا صرف ایک ممبر تھا، چھ سات بندے قیوم خان کے تھے جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) ہمارا سپورٹر تھا، ہمیں ان کے احساسات کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا لیکن بنیادی حقوق معطل کرنے میں قیوم خان نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا جو اس وقت وزیر داخلہ تھے ان کے ذہن میں یہ تھا کہ عدلیہ نے اس حکومت کو تسلیم نہیں کیا ہے خاص طور پر پنجاب میں اور صوبہ سرحد میں وہاں کے چیف جسٹس صاحبان پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ خاص طور پر مولوی مشتاق کا ذکر ہوتا تھا، غلام صفدر شاہ کا ذکر ہوتا تھا کچھ اوورری ایکشن بھی تھا لہٰذا انہوں نے بنیادی حقوق معطل کر دیئے۔

س: آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ بلوچستان کے فوجی ایکشن میں بھٹو صاحب کا اتنا کردار نہیں جتنا قیوم خان کا تھا؟

عبدالحفیظ پیرزادہ: دونوں کا تھا دیکھیں حتمی طور پر تو بھٹو صاحب کی ہی ذمہ داری بنتی ہے۔

(سہیل وڑائچ۔ ''پنجاب سے نفرت کیوں؟'' ص 203)

لاوا پھٹتا ہے

صدر جنرل پرویز مشرف کے اقتدار سنبھالنے کے بعد انتخابات کے نتیجے میں جو اسمبلی وجود میں آئی اس میں مذہبی جماعتوں کے اتحاد ایم ایم اے کو بہت اہمیت حاصل رہی۔ مگر ایم ایم اے، ایل ایف او، کے معاملے پر حکومت کا ساتھ نہ دیتی (خواہ اس کی وجوہات کچھ بھی رہی ہوں) تو شاید مرکز میں حکومت ہی نہ بن پاتی۔ بہرحال ایم ایم اے نے خلوص نیت اور ملکی مفاد میں یہ بھاری پتھر اٹھایا تھا جس کا نتیجہ ان کی توقعات کے برعکس برآمد ہوا اور صدر جنرل پرویز مشرف نے وردی اتارنے سے انکار کر دیا جس پر حکومت اور ایم ایم اے میں اختلافات پیدا ہوئے جن کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

ایل ایف او کے معاملے پر ایم ایم اے نے حکومت کے خلاف ملکی سطح پر ایک احتجاجی مہم چلانے کا فیصلہ کیا اور 18 دسمبر 2003ء تک حکومت کی طرف سے آئینی پیکج میں ناکامی کے بعد مہم کا آغاز ملتان سے کر دیا ملتان سے ڈیرہ غازی خان تک طویل ریلی نکالی گئی جس کے بعد ڈیرہ غازی خان میں حکومت کے خلاف جلسہ ہوا اس کے بعد سے معاملہ ملک کے دوسرے شہروں تک پھیلتا گیا۔

بلوچستان میں صورت حال بڑی دلچسپ تھی کیونکہ یہاں مسلم لیگ (ق) اور ایم ایم اے کی مخلوط حکومت تھی۔ ممتاز سیاسی مبصر ڈاکٹر مجاہد چشتی نے ہفت روزہ اخبار جہاں کے شمارہ 29 دسمبر 2003ء تا 4 جنوری 2004ء اس صورت حال پر ایک سیاسی تبصرہ بعنوان ''ایم ایم اے کیا بلوچستان میں حکومت مخالف تحریک چلا سکے گی'' لکھا جس میں وہ لکھتے ہیں۔ حکومت اور متحدہ مجلس عمل کے مابین ایل ایف او کے معاملے پر مذاکرات کے کئی راؤنڈ ہوئے اور قومی اسمبلی میں اس سلسلے میں 18 دسمبر کو آئینی پیکج پیش کرنے کا معاہدہ نہ ہونے

کے بعد متحدہ مجلس عمل نے ملتان سے ڈیرہ غازی خان تک ریلی اور ڈیرہ غازی خان میں احتجاجی جلسے سے حکومت کے خلاف اپنی ملک گیر احتجاجی مہم شروع کر دی ہے مگر بلوچستان جو متحدہ مجلس عمل کا مضبوط گڑھ ہے اور یہاں مسلم لیگ (ق) اور متحدہ مجلس عمل کی مخلوط حکومت ہے، اسپیکر بلوچستان اسمبلی، سینئر صوبائی وزیر سمیت کئی اہم ترین وزارتیں متحدہ مجلس عمل کے پاس ہیں۔ ایم ایم اے حکومت کے خلاف تحریک کے سلسلے میں مکمل خاموشی رہی اور ایم ایم اے کی احتجاجی تحریک کے پہلے تین چار روز تک بلوچستان بھر میں نہ تو کہیں احتجاج ہوا نہ ہی کسی علاقے سے جلسہ، جلوس کی اطلاعات ملیں اور نہ ہی صوبائی دارالحکومت میں اپوزیشن کے جلسے جلوس پر کوئی پابندی عائد کی گئی۔ احتجاجی تحریک کے حوالے سے متحدہ مجلس عمل کی صوبائی قیادت گومگو کی کیفیت کا شکار رہی۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ احتجاجی تحریک سے قبل ہی متحدہ مجلس عمل سے تعلق رکھنے والے تمام صوبائی وزراء صوبے کے مختلف علاقوں کے دوروں پر چلے گئے تھے جبکہ سینئر صوبائی وزیر مولانا عبدالواسع وفاقی دارالحکومت میں مقیم تھے اور انہوں نے وزیر اعلیٰ بلوچستان میر جام محمد یوسف، صوبائی وزیر خزانہ احسان شاہ کے ہمراہ وزیر اعظم میر ظفر اللہ جمالی سے بھی ملاقات کی جس میں باخبر ذرائع کے مطابق مولانا عبدالواسع نے وزیر اعظم کو یہ یقین دلایا کہ صدر مملکت کو اسمبلیوں سے اعتماد کا ووٹ لینے کے سلسلے میں وہ بلوچستان میں صدر مملکت کے حق میں ووٹ دینے کے لئے اپنی مرکزی قیادت کو رضامند کر لیں گے اور بلوچستان میں مخلوط حکومت کو کامیابی سے چلایا جائے گا۔

بلوچستان میں متحدہ مجلس عمل کے اس محتاط رویے کے بارے میں وفاقی دارالحکومت کے باوثوق ذرائع کا کہنا ہے کہ وزیر اعظم میر ظفر اللہ جمالی نے وزیر اعلیٰ بلوچستان میر جام یوسف کو صاف صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ وہ متحدہ مجلس عمل سے تعلق رکھنے والے اپنی کابینہ کے اراکین کو بتا دیں کہ اگر انہوں نے حکومت کے خلاف کسی تحریک میں حصہ لیا تو انہیں بلوچستان میں مخلوط حکومت سے الگ کر دیا جائے گا خواہ اس کے نتیجے میں بلوچستان میں مسلم لیگ (ق) کی مخلوط حکومت ختم ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ متحدہ مجلس عمل کے رہنما اور بلوچستان کے سینئر وزیر مولانا عبدالواسع نے وزیر اعظم میر ظفر اللہ خان جمالی سے ملاقات کے دوران اپنے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ متحدہ مجلس عمل کی

جانب سے بلوچستان میں احتجاجی تحریک شروع نہ کرنے کے سلسلے میں جب متحدہ مجلس عمل کے مرکزی رہنما اور جمعیت علماء اسلام (فضل الرحمان) گروپ کے صوبائی صدر رکن قومی اسمبلی مولانا محمد خان شیرانی اور جماعت اسلامی بلوچستان کے صدر مولانا عبدالحق ہاشمی سے رابطہ کیا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ ایم ایم اے بلوچستان کا فی الحال احتجاج کا کوئی پروگرام نہیں ہے اس سلسلے میں ہم مرکزی رہنماؤں کی ہدایات کے منتظر ہیں۔ متحدہ مجلس عمل نے موجودہ حکمرانوں کے خلاف فی الحال مرکزی سطح پر احتجاجی تحریک شروع کی ہے بلوچستان میں ہم نے احتجاجی تحریک کا ابھی تک کوئی پروگرام نہیں بنایا ہے اور جیسے ہی مرکز کی جانب سے ہمیں احتجاجی تحریک شروع کرنے کے لئے ہدایات ملیں گی ہم احتجاجی تحریک شروع کر دیں گے۔ اس سلسلے میں متحدہ مجلس عمل کے صوبائی رہنما اور صوبائی وزیر اطلاعات و بلدیات حافظ حسین احمد شرودی کا کہنا ہے کہ متحدہ مجلس عمل کی قیادت کی جانب سے اگر ہمیں وزارتیں چھوڑنے کی ہدایات ملی تو ہم ایک لحہ ضائع کئے بغیر اقتدار سے الگ ہو جائیں گے ہمارے لئے وزارتیں کوئی معنی نہیں رکھتی ہیں ہم اپنی جماعت کے ایک اشارے پر وزارتوں سے الگ ہو سکتے ہیں بہر حال اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ متحدہ مجلس عمل کی صوبائی مخلوط حکومت میں شمولیت کے باعث بلوچستان میں ایم ایم اے کے لئے حکومت کے خلاف تحریک شروع کرنا آسان بات نہیں ہے، وزارتوں نے یقیناً تحریک شروع کرنے کے سلسلے میں متحدہ مجلس عمل کی قیادت کے پاؤں جکڑ دیئے ہیں۔

حکومت اور متحدہ مجلس عمل کی ایل ایف او کے سلسلے میں سیاسی رسہ کشی میں کون جیتتا اور کون ہارتا ہے اور کسے کیا ملتا ہے یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا مگر اس دوران مسلم لیگ (ق) بلوچستان میں صوبائی اسمبلی اور متحدہ مجلس عمل قومی اسمبلی کی ایک نشست سے ہاتھ دھو بیٹھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں سپریم کورٹ کے فل بنچ نے متحدہ مجلس عمل سے تعلق رکھنے والے رکن قومی اسمبلی حاجی گل محمد دوٹر اور مسلم لیگ (ق) سے تعلق رکھنے والے رکن صوبائی اسمبلی عبدالغفور کو صوبائی الیکشن ٹریبونل سے نااہل قرار دیئے جانے والے حکم پر عملدرآمد روک دیا ہے۔ صوبائی الیکشن ٹریبونل کے جج جناب جسٹس اختر زمان نے ڈاکٹر کلیم اللہ اور صادق عمرانی کی دو الگ الگ انتخابی پٹیشن پر رکن قومی اسمبلی گل محمد اور رکن

قومی اسمبلی عبدالغفور کی اسمبلی کی رکنیت کے لئے نااہل قرار دے دیا۔ پشتونخواہ میپ کے رہنما ڈاکٹر کلیم اللہ نے رکن قومی اسمبلی کی بی اے کی ڈگری کو چیلنج کیا تھا جس کا متعلقہ ایجوکیشن بورڈ نے ریکارڈ عدالت عالیہ میں پیش کیا جس پر فاضل جج نے ان کی ڈگری کو جعلی قرار دیتے ہوئے ان کی اسمبلی کی رکنیت ختم کر دی۔ مسلم لیگ (ق) کے رکن صوبائی اسمبلی عبدالغفور کے خلاف پیپلز پارٹی کے رہنما صادق عمران نے پٹیشن داخل کی جس میں ان کو بی اے کی ڈگری کو چیلنج کیا گیا تھا اور الیکشن ٹریبونل نے ان کی ڈگری کو بھی جعلی قرار دیتے ہوئے انہیں نااہل قرار دے دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سے قبل پشتونخواہ میپ سے تعلق رکھنے والے رکن صوبائی اسمبلی نسیم ترپالی کو سرکاری ملازم ہوتے ہوئے صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے پر نااہل قرار دے دیا تھا اور ان کے نااہل قرار دینے کے اس حکم کو بھی سپریم کورٹ نے معطل کر دیا تھا۔ سپریم کورٹ میں تو انتخابی پٹیشنوں کی سماعت ہوتی رہتی ہے اور یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ اسمبلیاں اپنی مدت پوری کر لیتی ہیں اور مقدمات کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ بلوچستان کے انتخابی ٹریبونل میں اس وقت بھی کئی مقدمات زیر سماعت ہیں جن میں اکثر کی بنیاد یہی جعلی ڈگریاں ہیں اور لگتا یہ ہے کہ اگلے دو تین ماہ میں جعلی ڈگریوں کی بنیاد پر صوبائی و قومی اسمبلی کا انتخاب لڑنے والے مزید اراکین اسمبلی نااہل قرار پائیں گے۔

قومی و صوبائی امور کے ان ایشوز کے درمیان جبکہ پاکستان کو دہشت گردی کے حوالے سے خطرات کا سامنا ہے اور صدر جنرل پرویز مشرف تک کو نشانہ بنانے کی ناکام سازش ہو چکی ہے ایسے میں بلوچستان میں ہفتہ رفتہ پاکستان کے خلاف دہشت گردی اور سازشوں کے لحاظ سے ایک نہایت ہی سنگین ہفتہ تھا اور پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں اور مسلح افواج کی جانب سے بروقت کارروائی کر کے ان تمام سازشوں کو ناکام بنا دیا گیا ہے سب سے پہلے تو کوئٹہ چمن شاہراہ پر خوجک پاس کی شیلا چیک پوسٹ پر فرنٹیئر کور کے عملے نے ایک گاڑی سے دس بوریوں پر مشتمل پانچ سو کلوگرام بارود کی آٹھ ہزار کارتیج اور سینکڑوں میٹر فیوز وائر قبضہ میں لے لیا اور ٹرک ڈرائیور اور کلینر کو گرفتار کر لیا۔ بارود کی اس بھاری مقدار کو اگر قبضہ میں نہ لیا جاتا تو تو جانے یہ دھماکا خیز مادہ کہاں کہاں تخریبی کارروائیوں کے لئے استعمال کیا جاتا کیونکہ متعلقہ حکام کا یہ کہنا ہے کہ یہ بارود پاکستان میں تخریبی کارروائیوں

کے لئے لایا جا رہا تھا۔ شیلا باغ چیک پوسٹ پر پکڑے جانے والے اس بھاری آتش گیر مادہ کے ساتھ ہی بلوچستان کے صوبائی دارالحکومت کوئٹہ میں دہشت گردی اور تخریب کاری کی ایک اور گھناؤنی سازش کا انکشاف ہوا جس کا مقصد صوبائی دارالحکومت کے سینکڑوں شہریوں کو ہلاک کرنا تھا۔ تفصیلات کے مطابق پاکستان آرمی کو یہ اطلاعات ملیں کہ بعض دہشت گرد صوبائی دارالحکومت کے آبنوشی کے ذخائر میں کہ جہاں سے تقریباً دو لاکھ افراد کو پینے کا پانی فراہم کیا جاتا ہے زہر ملانے کا ارادہ رکھتے ہیں جس کے بعد متعلقہ ادارے فوری طور پر حرکت میں آ گئے اور انہوں نے تمام حفاظتی اور ضروری اقدامات کر لئے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ جانے کس طرح یہ خفیہ اطلاع چھپ نہیں سکی اور شہر کی بعض مساجد تک یہ اعلان کر دیا گیا کہ کوئٹہ کے پینے کے پانی میں زہر ملا دیا گیا لہٰذا شہری یہ پانی استعمال نہ کریں۔ مساجد سے اعلان اور افواہوں نے پورے علاقے کے لوگوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا لوگوں نے پانی پینا تک چھوڑ دیا مگر ان اعلانات اور افواہوں کے پھیلنے کے چند گھنٹوں کے اندر اندر پاکستان آرمی کے حکام نے فوری طور پر پانی کا کیمیکل ٹیسٹ کرایا اور اسے ہر لحاظ سے صاف قرار دے دیا۔ اس واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان دشمن عناصر اور دہشت گرد اب ملک و قوم کو نقصان پہنچانے کی غرض سے کن خطوط پر سوچ رہے ہیں اور وہ اب دہشت گردی اور تخریب کاری کے لئے روایتی طریقوں سے ہٹ کر کارروائیاں کرنا چاہتے ہیں۔

دہشت گردی کی ان کارروائیوں کو بروقت روکنے کے ساتھ پاکستان کے خلاف ایک اور سازش اس وقت ناکام ہو گئی کہ جب پاکستانی حکام کو یہ خفیہ اطلاع ملی کہ دو فرانسیسی صحافی جوئیل مارک اور ژاں پال جن کے پاس کوئٹہ آنے کا ویزہ تک نہیں ہے چمن اور پاک افغان سرحد پر واقع دوسرے علاقوں میں دیکھے گئے ہیں اور انہوں نے یہاں کے پہاڑوں پر ایسی فلمیں بنائی ہیں جن میں مقامی باشندوں اور دوسرے لوگوں کو اسلحہ سمیت پہاڑوں سے اترتے دکھایا گیا ہے اور ان فلموں اور تصاویر کے ذریعے یہ تاثر دینا تھا کہ پاکستان اب بھی طالبان کا گڑھ ہے اور یہاں طالبان کے تربیتی کیمپ ہیں ان صحافیوں کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ انہوں نے طالبان کے سربراہ ملا محمد عمر سے انٹرویو بھی لیا ہے۔ فرانسیسی صحافیوں کی ان

پاکستان دشمن کارروائیوں کی خفیہ ادارے مکمل نگرانی کرتے رہے اور کوئٹہ سے کراچی پہنچنے سے قبل ہی ان کو گرفتار کر کے ان سے قبضے سے یہ فلمیں اور تصاویر برآمد کر لی گئیں جنہیں پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کے لئے استعمال کرنا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ فرانسیسی صحافی اس سے قبل 12 اکتوبر 2003ء کو بھی پاکستان آئے تھے اور یہاں سے وہ واپس بھارت گئے تھے۔ 7 دسمبر کو وہ دوبارہ پیرس سے پاکستان آئے اور ان کا اصل ٹارگٹ کوئٹہ اور چمن تھے بہرحال ایک ہفتے کے اندر اندر تخریب کاری، دہشت گردی اور پاکستان کے خلاف سازشوں کے نئے انداز نے قومی سلامتی سے متعلق اداروں کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کر دیا ہے اور ہمیں خاصا محتاط رہنا ہوگا۔

بلوچستان میں صورت حال مخدوش ہو رہی تھی اور اسلام آباد میں تشویش بڑھ رہی تھی کہ معاملات اب کیا رخ اختیار کریں گے ان حالات میں صدر جنرل پرویز مشرف نے بلوچستان کے عوام کے لئے ایک زبردست پیکج تیار کیا اور بلوچستان پہنچ گئے۔ صدر جنرل پرویز مشرف 15 دسمبر کو بلوچستان کے دو روزہ دورے پر صوبائی دارالحکومت کوئٹہ پہنچے ان کے دورے کوئٹہ کا اصل مقصد کمانڈ اینڈ اسٹاف کالج میں زیر تربیت ملکی و غیر ملکی فوجی افسران سے خطاب تھا۔ صدر جنرل پرویز مشرف ایسے وقت بلوچستان کا دورہ کر رہے تھے کہ جب صرف پانچ دن قبل صوبائی دارالحکومت کے مرکزی علاقے میزان چوک میں اس فوجی ادارے کے ایک ٹرک کو نامعلوم دہشت گردوں نے اپنا نشانہ بنایا تھا اور جس کے نتیجے میں بارہ معصوم اور غریب محنت کش اپنی قیمتی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے ان حالات میں یہ سمجھا جا رہا تھا کہ شاید صدر جنرل پرویز مشرف اس مرتبہ کمانڈ اینڈ اسٹاف کالج میں روایتی خطاب نہیں کریں گے مگر جنرل پرویز مشرف نے ان روایات کو دہرایا یہ اور بات ہے کہ ان کے دورہ کے دوران بلوچستان کی تاریخ کے سخت ترین حفاظتی اقدامات دیکھنے میں آئے اور صدر مملکت کا دورہ کوئٹہ چھاؤنی تک محدود رہا اس طرح بلوچستان کی 32 سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ جب کوئی سربراہ صوبائی دارالحکومت آیا ہو اور اس نے گورنر ہاؤس کا رخ نہ کیا ہو اور کسی عوامی یا سیاسی تقریب میں شرکت نہ کی ہو۔ بہرحال یہ تو صدر جنرل پرویز مشرف کا ذاتی جرات مندانہ فیصلہ تھا کہ وہ کوئٹہ آ گئے ورنہ تو سیکورٹی و خفیہ ایجنسیاں تو کسی طرح بھی

صدر جنرل پرویز مشرف کے دورہ کوئٹہ کے حق میں نہیں تھیں۔ بلاشبہ کوئٹہ اس وقت صدر جنرل پرویز مشرف کے لئے سب سے ہائی رسک ایریا ہے۔ کمانڈ اینڈ اسٹاف کالج میں خطاب کے دوران صدر جنرل پرویز مشرف کے ایشو پاک بھارت تعلقات، پاکستان کی ایٹمی قوت ہونا کے ساتھ ساتھ دہشت گردی کے خاتمے میں پاکستان کا کردار تھا مگر اورماڑہ میں مکران کوسٹل ہائی وے کے ذکر کے دوران صدر جنرل پرویز مشرف کا رویہ خاصا جارحانہ تھا اور انہوں نے بلوچستان میں ترقی کے مخالفین اور قوم پرستوں کو خوب کھری کھری سنائیں اور کرش کرنے کی دھمکی دی۔ صدر جنرل پرویز مشرف جو اقتدار سنبھالنے کے بعد بلوچستان کی ترقی اور پسماندگی دور کرنے پر خصوصی توجہ دے رہے ہیں اور انہوں نے ہمیشہ بلوچستان کے معاملات کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنے پر زور دیا ہے اور بلوچستان کو ماضی میں نظر انداز کرنے پر یہاں کے عوام سے معافی بھی مانگی ہے اس مرتبہ ان کا رویہ بالکل ہی مختلف تھا شاید اورماڑہ میں کوسٹل ہائی وے کے افتتاح کے موقع پر صدر جنرل پرویز مشرف کے ذہن میں بلوچستان میں دہشت گردوں کی جانب سے مسلح افواج کے افراد کو ٹارگٹ بنانا اور گوادر میں کار بم دھماکے میں چینی انجینئروں کے جاں بحق ہونے جیسے واقعات گردش کر رہے تھے۔

جنرل پرویز مشرف نے اورماڑہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قوم پرست بلوچستان کے عوام کو گمراہ کر کے اپنی سیاست کو چمکانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں مگر یہاں کے عوام ترقی مخالف عناصر کے عزائم ناکام بنا دیں گے۔ اگر بلوچستان کی ترقی کی مخالفت کرنا قومی پرستی ہے تو یہ بلوچ قوم کے ساتھ سنگین مذاق ہے ایسے لوگوں کو قوم پرست کہنے کی بجائے اینٹی قوم پرست کہنا جائز ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے انکشاف کیا کہ بلوچستان میں بعض دہشت گردوں کا سراغ لگا لیا گیا ہے جو تخریبی اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہیں ایسے ملک اور سماج دشمن عناصر اور دہشت گردوں کو کچل دیا جائے گا قانون نافذ کرنے والے ادارے ان کی جڑوں تک پہنچ چکے ہیں۔ عوامی فلاح و بہبود کے منصوبوں میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو جان لینا چاہئے کہ ان کے دن گنے جا چکے ہیں۔

صدر نے کہا کہ وزیرستان کی طرح بلوچستان میں بھی دہشت گرد زیادہ دیر تک نہیں چھپ سکیں گے اور نہ ہی ان کی تخریبی کارروائیوں کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ انہیں کچل دیا جائے گا صدر جنرل پرویز مشرف کا کہنا تھا کہ بلوچستان کے عوام کے احساس محرومی کا خاتمہ میری حکومت کی پالیسی ہے۔ میں بلوچستان کا حق سب سے پہلے دینا چاہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ پی ایس ڈی پی میں بلوچستان کی ترقی کے لئے 20.3 ارب روپے رکھے گئے ہیں جو باقی تمام صوبوں کو ملنے والی رقم سے زیادہ ہے۔ گوادر ڈیپ سی پورٹ، مکران کوسٹل ہائی وے سے علاقہ میں معاشی انقلاب آئے گا گوادر آج دنیا کے نقشے میں اہم مقام حاصل کر چکا ہے۔ افغانستان اور وسطی ایشیا کی تجارت اس بندرگاہ سے ہوگی اور گوادر کو ملک کے دیگر علاقوں اور ہمسایہ ممالک کے ساتھ ملایا جائے گا۔ جنرل پرویز مشرف نے اس موقع پر اعلان کیا کہ بڑے ڈیم پاکستان کی ضرورت ہیں اور یہ ڈیم ضرور بنائے جائیں گے اس طرح گوادر ڈیپ سی پورٹ کے پہلے مرحلہ کی تکمیل کے بعد کہ جو بلوچستان کے قوم پرستوں کی تمام تر مخالفتوں کے بعد اپنے وقت سے پہلے مکمل ہوئی اب حکومت اور قوم پرستوں کے درمیان دوسرا معرکہ صوبہ سرحد میں کالا باغ ڈیم کے ایشو پر ہوگا۔

اور ماڑہ میں صدر جنرل پرویز مشرف نے مکران کوسٹل ہائی وے کا افتتاح کیا تو وزیر اعظم شوکت عزیز کے دورہ عوامی جمہوریہ چین کے دوران گوادر ڈیپ سی پورٹ اور بلوچستان کے دوسرے میگا پروجیکٹس کا چرچا رہا شاہراہ قراقرم کے بعد گوادر ڈیپ سی پورٹ پاک چین دوستی کی دوسری بڑی علامت بن گئی اور جس طرح شاہراہ قراقرم کی تعمیر میں کئی چینی کارکنوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ دیا اس طرح گوادر ڈیپ سی پورٹ کی تعمیر میں اور بنیادوں بھی چینی انجینئروں کا لہو شامل ہے گوادر ڈیپ سی پورٹ کی تعمیر کے خلاف دوست اور دشمن سب ہی شامل تھے اور ان سب کی یہ خواہش تھی کہ یہ بندرگاہ تعمیر نہ ہو مگر چینی انجینئروں اور کارکنوں نے یہ بندرگاہ اپنی مقررہ مدت سے پہلے پوری کر لی اور 25 دسمبر کو یہ بندرگاہ آپریشن کے لئے پاکستانی حکام کے حوالے کر دی جائے گی جبکہ وزیر اعظم جمہوریہ چین مارچ میں اس بندرگاہ کا باقاعدہ افتتاح کریں گے۔ وزیر اعظم شوکت عزیز کے حالیہ دورہ چین کے دوران پاکستان اور چین کے مابین گوادر کی بندرگاہ کی توسیع کے لئے معاہدہ

پر بھی دستخط ہوئے ہیں جس کے تحت گوادر ڈیپ سی پورٹ میں بھاری بحری جہازوں کے لنگر انداز ہونے کے سلسلے میں سہولتیں فراہم کرنے کے لئے چینل کو مزید گہرا کیا جائے گا اور اس کے لئے عوامی جمہوریہ چین 40 ملین ڈالر قرضہ دے گا پاکستان نے سینڈک (چاغی) میں سونے، چاندی، تانبہ کے پروجیکٹ میں بھی مزید بیس سال کی توسیع پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ سینڈک کا پر سلور گولڈ پروجیکٹ وہی منصوبہ ہے جسے پاکستانی بیوروکریسی نے بیرونی ممالک کے اشاروں پر نا قابل عمل قرار دے دیا تھا اور اس وقت کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو اس کے افتتاح سے روک دیا تھا مگر چینی ماہرین نے اس منصوبہ کو اسکریپ کے ڈھیر میں تبدیل ہونے سے بچایا! اور آج یہاں سے لاکھوں ڈالر سالانہ کی آمدن ہو رہی ہے اس دورے کے دوران دونوں ممالک کے دوران آزادانہ تجارت اور پاکستان میں چین کے لئے مخصوص صنعتی زون بنانے کا بھی فیصلہ ہوا ہے اس طرح بلوچستان میں دہشت گردی کی کارروائیاں جن کا ایک بڑا مقصد گوادر میں ملکی وغیر ملکی سرمایہ کاری کو روکنا ہے اس طرح ملک دشمن قوتوں کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہو جائے گا اور عوامی جمہوریہ چین گوادر میں سرمایہ کاری کرنے اور یہاں کے ایکسپورٹ پراسیسنگ زون میں صنعتیں لگانے والا پہلا ملک ہوگا اور چینی جب کسی کام کا ارادہ کر لیں تو اسے انجام تک پہنچا کر ہی رہتے ہیں۔

صدر جنرل پرویز مشرف نے جو عندیہ ظاہر کیا تھا اس میں بہت حد تک حقیقت پائی جاتی تھی اور ظاہر ہے صدر کی طرف سے یہ بیان ایجنسیوں کی طرف سے ملنے والی رپورٹس کی بنیاد پر دیا گیا ہوگا۔ اس دوران اچانک ہی بلوچستان خصوصاً کوئٹہ میں دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بلوچستان لبریشن آرمی کے نام سے ایک نام نہاد گروپ کی خبریں بھی سامنے آنے لگیں جو ہر تخریبی کارروائی کی ذمہ داری قبول کرنے لگا تھا اس مرحلے پر ایک انگریزی معاصر میں چھپنے والی ایک رپورٹ کے کچھ مندرجات ملاحظہ فرمائیں۔

بلوچستان کے حالات میں بگاڑ پیدا کرنے کے لئے گزشتہ چھ ماہ میں پچاس کروڑ روپے کا اسلحہ افغانستان سے بلوچستان سمگل کیا گیا ہے اب تک سوئی اور ڈیرہ بگٹی میں اہم تنصیبات اور مقامات پر سولہ سو کے قریب حملے ہو چکے ہیں جن میں 25 کلومیٹر تک مار کرنے والے ملٹی بیرل لانچر بھی استعمال ہوئے ہیں۔

ڈیرہ بگٹی میں سنگسیما کے مقام پر ایک تازہ واقعہ میں فرنٹیئر کور کے قافلے پر مسلح افراد نے حملہ کر کے پانچ اہلکاروں کو ہلاک اور متعدد کو زخمی کر دیا ہے وزیر داخلہ آفتاب احمد شیر پاؤ کے مطابق مسلح افراد نے 150 راکٹ فائر کئے اس افسوسناک واقعہ سے بلوچستان کی صورت حال مزید بگڑ گئی۔ شر پسند عناصر کی طرف سے یہ کارروائی ایسے وقت پر کی گئی جب بلوچستان کے بارے میں پارلیمانی کمیٹی کئی ہفتوں کے تعطل کے بعد اسلام آباد میں دوبارہ اپنی تجاویز مرتب کر رہی تھی جسے اس واقعہ کے بعد ملتوی کر دیا گیا۔ چوہدری شجاعت نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ واقعہ کمیٹی کے خلاف سازش ہے کیونکہ بلوچستان کے سیاسی حل کے لئے جب بھی کمیٹی کا اجلاس ہو، یہ عناصر تخریبی کارروائیوں کے ذریعے اس عمل کو سبوتاژ کر دیتے ہیں۔

مری کیمپ سے دریافت ہونے والے ٹارچر سیلوں نے بھی ان سرداروں کے اصل چہرے سے پردہ ہٹا دیا ہے۔ یہ ٹارچر سیل ان معصوم بلوچوں پر ہونے والے ظلم وتشدد کی داستانیں سنا رہے ہیں جنہوں نے ان سرداروں کی تابع فرمانی سے انکار کیا تھا۔ یہ سردار کافی عرصے سے بلوچستان کے عوام کا استحصال کر رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے کسی بھی مزارعے یا ملازم کا بیٹا پڑھ لکھ کر کسی بھی لحاظ سے ان کے مقابل آ جائے۔ وہ نہیں چاہتے کہ بلوچی عوام کو وہ سہولیات میسر آئیں جو انہیں اور ان کی اولاد کو میسر ہیں اور وہ نوابوں کی سیاست کھونا نہیں چاہتے وہ صرف یہ چاہتے کہ جس طرح ان کے آباؤ اجداد نے اس علاقے کے لوگوں کو زیر نگین بنائے رکھا آج کے جدید دور میں بھی ان کی نوابی قائم رہے اور وہ علاقے کے عوام پر حکومت کرتے رہیں۔ لہٰذا وہ مختلف حیلے بہانے سے اپنے ہی عوام کو حکومت اور مقامی انتظامیہ کے خلاف بڑھکا کر بلوچستان میں ہونے والے ترقیاتی منصوبوں کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

بھارتی خفیہ ایجنسی را پاکستان میں افغانستان کی طرح وار لارڈ کلچر کے فروغ کے لئے سرگرم عمل ہے تاریخ گواہ ہے کہ بھارت نے پاکستان کی سلامتی کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ہمیشہ مقامی ایجنٹوں کی مدد سے پاکستان کے خلاف اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہا۔ بھارت کے توسیع پسندانہ عزائم بھی کسی سے ڈھکے چھپے

نہیں۔ 1994ء میں پاکستان کے جوابی ایٹمی دھماکوں کے بعد اکھنڈ بھارت کا خواب خاک میں مل گیا تو اس نے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی نئی پالیسی پر عمل شروع کر دیا یعنی براہ راست حملے کے بجائے فرقہ واریت، صوبائیت اور دوسرے منفی جذبات اور نفرتوں کے بیج بو کر پاکستان کو اندرونی طور پر اس قدر کمزور کر دیا جائے کہ وہ اس کے لئے آسانی سے تر نوالہ بن جائے اس پس منظر میں دیکھا جائے تو دشمن کا سب سے پہلا ہدف عوام اور فوج میں نفرت کا بیج بونا ہے۔ بھارت کی طرف سے اس طرح کی بالواسطہ مداخلت کوئی نئی بات نہیں لیکن ان دنوں مقامی افراد کی مدد سے ماضی کی نسبت اس میں کافی شدت آ گئی ہے۔

افواج پاکستان کے وقار کو مسخ کرنے کے لئے یہ عناصر بڑی شدت سے سرگرم عمل ہیں۔ بلوچستان میں کیپٹن حماد کو ڈاکٹر شازیہ کیس میں ملوث کرنے کی کوشش بھی اسی سازش کی ایک کڑی ہے جسے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے مقامی ایجنٹوں کی مدد سے خوب اچھالا گیا۔ ڈی ایس جی کے ڈاکٹر حماد کا ڈی این اے ٹیسٹ کے علاوہ دو مرتبہ مکمل طبی معائنہ بھی ہوا لیکن ان کے خلاف اس کیس میں ملوث ہونے کے کوئی شواہد نہ مل سکے۔ ڈاکٹر شازیہ نے بھی شناخت پریڈ کے دوران کیپٹن حماد کو بے قصور قرار دیا جس سے یہ مکروہ گھناؤنی سازش اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔ جس پر محب وطن حلقوں نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ دشمن کی ان چالوں کو سمجھا جائے وہ اپنے مذموم ہتھکنڈوں کے ذریعے پاک فوج کو بدنام کرنے، عوام اور فوج کے رشتے میں دراڑ ڈالنے پاکستان میں وار لارڈ ازم کلچر کو فروغ دینے اور فرقہ واریت کے عفریت سے ہماری یکجہتی اور اندرونی استحکام کو نقصان پہنچا کر پاکستان کو افغانستان جیسی صورت حال سے دوچار کرنا چاہتا ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہم سب قومی یکجہتی کا مظاہرہ کریں اور قومی سلامتی کو مقدم رکھتے ہوئے دشمن کی تمام مذموم کوششوں کو خاک میں ملا دیں۔

(روزنامہ دی نیوز)

بلوچستان کی کشیدگی میں مسلسل اضافہ ہونے لگا اور حکومت کی طرف سے پہلی مرتبہ کھل کر یہ بات سامنے آئی کہ اس شورش میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہے۔ بلوچستان کے وزیراعلیٰ جام محمد یوسف نے کوئٹہ میں ایک اہم پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں کو بتایا کہ بھارتی ایجنسی ''را'' کے بلوچستان کے تخریب کاری میں ملوث ہونے کے ثبوت سامنے آگئے ہیں۔ انہوں نے دستاویزی ثبوت بھی پریس کانفرنس میں پیش کئے اور بتایا کہ ہرات اور قندھار کے بھارتی قونصلیٹ گمراہ نوجوانوں کو سرحدی علاقوں میں واقع کیمپوں میں تربیت دے کر پاکستان میں دھکیل رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت نے گرفتار تخریب کاروں سے حاصل کردہ اسلحہ کی نمائش کی اور اس کی تفصیلات سے بھی آگاہ کیا۔

اس صورت حال پر میں نے ''مراۃ العارفین'' کے شمارہ فروری 2005ء میں ایک شذرہ سپرد قلم کیا جس میں لکھا۔ ''بلوچستان کے وزیراعلیٰ جام یوسف نے انکشاف کیا کہ بلوچستان میں دہشت گردی اور تخریب کاری کی جو وارداتیں ہو رہی ہیں، ان میں ہندوستان کی خفیہ ایجنسی را ملوث ہے جس نے اپنے کارندوں کے کئی کیمپ قائم کر رکھے ہیں۔ یہ کارندے بلوچستان کے ہی باشندے ہیں، جنہیں بڑی بڑی تنخواہیں دی جا رہی ہیں۔ وزیراعلیٰ کا یہ انکشاف بے بنیاد نہیں ہو سکتا اس کی روشنی میں سمجھ لینا چاہئے کہ بلوچستان کو علیحدہ کروانے کی سازش کے پیچھے تنہا ہندوستان نہیں بلکہ وہ مغربی طاقت بھی ہے کہ جس کی نظریں پہلے سے بلوچستان کی ساحلی پٹی پر لگی ہوئی ہیں۔ خلیج کے علاقے پر اپنا کنٹرول مستحکم کرنے کے لئے اس مغربی طاقت کو بلوچستان کے ساحلی علاقوں میں فوجی اڈے درکار ہیں۔ گوادر کی بندرگاہ پر کنٹرول قائم کرنا اور عوامی جمہوریہ چین کو اس بندرگاہ سے دور رکھنا اس مغربی طاقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ بلوچستان اور سندھ میں حالات بگڑنے سے پہلے اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک بہتر اور موثر خارجہ پالیسی کے ذریعے ناراض طاقتوں کے ساتھ کوئی ایسی مفاہمت کر لی جائے کہ انہیں پاکستان کے خلاف کوئی سازش کرنے کی حاجت نہ رہے۔

جہاں تک بھارتی مداخلت کا سوال ہے تو بھارت دوستی اور عشق کا بخار شاید اس بات پر اترنے لگا ہے اور پاکستانی سرحدوں کے ساتھ ساتھ بھارتی انٹیلی جنس ''را'' نے پاکستان کے خلاف جو سازشوں کے جال پھیلائے ہیں وہ بھی بے نقاب ہو رہے ہیں۔ جام یوسف نے بتایا ہے کہ ''را'' نے پاکستانی سرحدوں کے ساتھ ساتھ بلوچی نوجوانوں کو ورغلا کر

پاکستان کے خلاف تخریب کاری کے تربیتی کیمپ قائم کر رکھے ہیں اور وہاں سے تربیت حاصل کرنے والے نوجوان ہی بلوچستان میں شورش کر رہے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ بھارت نے پاکستان کی مغربی سرحدوں کے ساتھ ساتھ قندھار جلال آباد، پکتیا وغیرہ میں اپنے قونصلیٹ کھولے ہیں اور پاکستان کی سرحدوں سے ملنے والے تقریباً تمام افغانستان اضلاع سے پاکستانی سرحدوں کے نزدیکی انتہائی پسماندہ اور غیر آباد علاقوں میں جہاں عام حالات میں بھی تجارت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ شراب خانے، قہوہ خانے، میوزک سنٹر اور این جی اوز کا جال بچھا دیا ہے جہاں سے پاکستان میں تخریب کاری کی جا رہی ہے۔ یہ کوئی ایسی صورت حال نہیں جس سے پاکستانی حکومت آگاہ نہ ہو یقیناً ہماری ایجنسیوں نے اس پر نظر بھی رکھی ہو گی لیکن حیرت انگیز طور پر بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے تربیت یافتہ ایجنٹوں اور ان کی تخریب کاریوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔''

تخریب کاروں نے اس دوران سوئی گیس کی پائپ لائنوں کو بطور خاص اپنا نشانہ بنا رکھا تھا اور وہ ان پر مسلسل حملے کر رہے تھے جن کا کسی حد تک سیکورٹی فورسز دفاع بھی کر رہی تھیں۔ اس دوران اچانک سوئی گیس فیلڈ کے ہسپتال میں کام کرنے والی ایک لیڈی ڈاکٹر شازیہ خالد کے ساتھ جنسی درندگی کے واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا جس پر میں نے ماہنامہ مراۃ العارفین شمارہ مارچ 2005ء کو ''وطن کی فکر کر ناداں'' کے عنوان سے لکھا۔

''بدقسمتی سے پاکستان کو اندر اور باہر سے نقصان پہنچانے کے لئے طاغوتی طاقتوں نے سمجھوتہ کر لیا ہے اور اس کا ثبوت ایک طرف تو بین الاقوامی خصوصاً امریکی پریس میں پاکستان کے خلاف مسلسل زہریلا پراپیگنڈہ اور امریکہ کو ایران کے بعد پاکستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دلانے کی بھرپور مہم ہے اور دوسری طرف بلوچستان میں ناراض عناصر کا غیر ملکی ایجنسیوں کے ہاتھوں کھلونا بن کر اپنے ہی ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔ بلوچستان کے مسئلے کو سمجھنے کے لئے معاصر ہفت روزہ اخبار جہاں کی 14 فروری کی اشاعت میں محترم نذیر لغاری صاحب کی ڈائری بلا تبصرہ پیش خدمت ہے۔

''سوئی میں مظلوم خاتون ڈاکٹر شازیہ خالد کی آبروریزی کا واقعہ اپنے ردعمل کی جامعیت کے اعتبار سے نئے واقعات کے ظہور کا سبب بنتا جا رہا ہے۔ 1984ء میں سرسید کالج کی معصوم طالبہ منی بس کے حادثے میں جاں بحق ہوئی تھی تو کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ

یہ واقعہ کراچی شہر کا سیاسی منظر نامہ تبدیل کر کے رکھ دے گا۔ ایسے واقعات پر عوامی ردعمل بالعموم محض ایک واقعہ پر ناراضگی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ عوام کی مجموعی ناراضگی گنبد بے در کے کسی روزن سے دھوئیں کی لکیر کی مانند ظاہر ہوتی ہے بلکہ اسے سیلاب سے پہلے بچاؤ بند کے کمزور حصوں پر پانی کے دباؤ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

ملک میں جمہوری عمل کے باعث ریاستی اسٹیبلشمنٹ کے طاقتور عناصر انتہائی معمولی نوعیت کے عوامی معاملات کو عوامی سطح پر حل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ جب لوگوں کے تنازعات کی عدالتی کارروائی کے بغیر شاہانہ جرگوں میں طے کرنے کی روش عام ہو، جہاں ایک صوبے کے وزیراعلیٰ اپنے صوبے کے چیف سیکرٹری اور دیگر اعلیٰ حکام کے ہمراہ جرگوں کا انعقاد کرتے ہوں اور جہاں دوسرے صوبے کے وزیراعلیٰ چیف منسٹر ہاؤس میں جرگہ منعقد کرتے ہوں وہاں انصاف کے لئے عدالتی عمل کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔

ڈاکٹر شازیہ نے ایک طویل ای میل پیغام میں اپنے اوپر بیتنے والے ستم کی روداد بیان کی ہے یہ ہولناک واقعات دردمند دل رکھنے والے ہر شخص کو رلا دینے کے لئے کافی ہیں۔ ڈاکٹر شازیہ کے خط کے متن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ قارئین کے مطالعہ کے لئے پیش کیا جارہا ہے۔

”میں ان ہزاروں عورتوں کی طرح اس معاشرے کی بھینٹ چڑھی، وہ مظلوم عورت ڈاکٹر شازیہ خالد ہوں جس کی عزت و آبرو کے چرچے پوری دنیا میں عجیب انداز سے کئے جارہے ہیں۔ دنیا اسے کن نظروں سے دیکھ رہی ہے، میری عقل اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتی کہ ان باتوں کو سمجھ سکوں۔ دنیا نے میری عزت کو ہزاروں رنگ دیئے لیکن حقیقت سے کوئی آگاہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ میری اور میری فیملی کی خاموشی بھی ہے کیونکہ میں ایک مذہبی فیملی سے تعلق رکھتی ہوں اور ہم اپنی عزت کو سرعام نیلام نہیں کرنا چاہتے۔

جون 2003ء کو مجھے پی پی ایل میں میڈیکل آفیسر سوئی فیلڈ ہسپتال میں مقرر کیا گیا اس دوران مجھ سے میرے شوہر کے پیشے کے بارے میں پوچھا گیا تھا جب میں نے بتایا کہ خالد پٹرولیم انجینئر ہیں تو اس بات پر خاص زور دیا گیا کہ ہم میاں بیوی کو ملازمت کے لئے ترجیح دیتے ہیں۔ آپ اپنے شوہر کو مطلع کریں کہ وہ ہم سے میٹنگ کرلیں میرے لئے اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہوسکتی تھی کہ دوسرے دن ہی انہوں نے خالد کو انٹرویو

کے لئے کال کر دی۔ خالد نے 45 منٹ کا انٹرویو دیا اور باہر نکلتے ہی بہت خوش اور پرامید نظر آرہے تھے انہیں ایچ آر والوں نے یہ کہا کہ اگر ہم آپ کو سوئی فیلڈ میں جاب دیں تو کیا آپ راضی ہوں گے تو انہوں نے جواب دیا کہ میری بیوی آپ کے پاس جاب کر رہی ہے۔ ہم دونوں کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہوگی۔ مگر افسوس کہ میرا تقرر کرنے کے بعد میرے شوہر کا تقرر کرنا پی پی ایل والے بھول گئے۔ خالد کی ملاقات کراچی میں چیف میڈیکل آفیسر عثمان سے کرائی گئی۔ انہوں نے خالد سے کہا کہ شازیہ ہماری بیٹی کی طرح ہے اور انہوں نے میری سیکورٹی کے بارے میں ہر طرح کی یقین دہانی کرائی۔

شروع میں مجھے نرسنگ ہوسٹل میں کمرہ دیا گیا کچھ عرصے کے بعد مجھے ایک بنگلے میں منتقل کر دیا گیا کچھ دن بعد ایک اور ڈاکٹر سعدیہ بھی وہاں شفٹ کی گئیں جو بعد میں استعفیٰ دے کر چلی گئیں۔ میں نے سی ایم او اور سینئر ڈاکٹر صائمہ کو کافی دفعہ کہا کہ مجھے نرسنگ ہاسٹل شفٹ کر دیں، مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے لیکن سی ایم او نے یہ کہہ کر میری درخواست رد کر دی کہ آپ ڈاکٹر ہیں اور آپ کا پروفیشن اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ آپ کسی نرس کے ساتھ رہیں۔

پی پی ایل کے ایچ آر ڈی کے عملے کو میں نے دو سال فالو کیا کہ خالد کو جاب دے دیں چاہے وہ ٹرینی انجینئر کی ہو یا ایڈمن میں کوئی جاب ایچ آر والوں نے مختلف بہانے بنائے۔ خالد کو بعد میں چین کی ایک کمپنی میں جاب مل گئی اور وہ 9 نومبر 2004ء کو لیبیا چلے گئے۔ 2 جنوری کو میری چھٹیاں باقی تھیں لیکن ڈاکٹروں کی کمی کی وجہ سے میری چھٹیاں منسوخ کر دی گئیں۔ دو جنوری کو مجھے آن کال ڈیوٹی پر بھیجا گیا میں ہسپتال کے احاطے میں واقع اپنے گھر سے ڈیوٹی پر گئی۔ ہسپتال کے مرکزی دروازے پر سیکورٹی گارڈز کی چوکی ہے اور پوری سوئی فیلڈ میں جگہ جگہ ڈی ایس جی کی چوکیاں ہیں اور سیکورٹی بہت زیادہ ہے اور رات گئے وہ پورے ہسپتال کا راؤنڈ بھی لگاتے ہیں۔ میں تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اپنے گھر واپس آگئی اور مختلف کام کرنے کے بعد میں تقریباً دس بجے اپنے کمرے میں آگئی اور کمرے کا دروازہ بھی لاک کر دیا میں نیند میں تھی کہ مجھے لگا کہ میرے سر کے بال کھینچ رہے ہیں میں نے اس کو خواب سمجھا لیکن جب بال زور سے کھینچے گئے تو میری آنکھ کھل گئی اور اس نے میرے گلے کو اس شدت سے دبایا کہ میں سوچ رہی تھی کہ وہ مزید دباتا تو شاید......

خدا نے مجھے جتنی قوت عطا کی تھی میں نے مزاحمت کی میں مدد کے لئے پکارتی

رہی اور اپنے ایک ہاتھ سے برابر میں پڑے ہوئے فون کو اٹھانا چاہا کہ کسی کو کال کر سکوں لیکن اس نے ریسور مجھ سے چھین لیا اور میرے سر میں بہت زور سے مارا فون کی تار میرے گلے میں ڈال دی اور اسے کھینچنے لگا۔ بہت مارا پیٹا میری گردن سے خون بہنے لگا۔ آخر جب اتنی اذیتوں کے بعد بھی میں اس کے قابو میں نہ آئی تو اس نے مجھے کہا کہ اب اگر تم نے شور مچایا تو باہر سے امجد کو بلا لوں گا لیکن میں اسے اللہ رسولؐ کے واسطے دیتی رہی اس کی ماں بہنوں کے واسطے دیئے لیکن اس نے کہا کہ میری کوئی ماں بہن نہیں ہے۔

اس کمینے نے میری زندگی تباہ کر دی مجھے معاشرے میں رسوا کر دیا، میری چادر اتار دی کاش کہ میں اس دن مر جاتی تو کسی کا سامنا تو نہ کرنا پڑتا۔ اس نے مجھ پر بہت تشدد کیا میری آنکھوں پر میری نماز کا دوپٹہ باندھ دیا اور سب کچھ ہونے کے بعد کہا کہ اب بتاؤ پیسے اور سونا کہاں رکھا ہوا ہے میں نے کہا کہ میری الماری میں سب کچھ رکھا ہوا ہے لیکن تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اس نے کہا کہ وہ صبح جائے گا میں خاموش ہو کر اللہ کو یاد کرتی رہی اگر میں ذرا سی بھی حرکت کرتی تو وہ مجھے مارتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر شور کیا تو میں تمہیں اپنے ساتھ پٹ فیڈر لے جاؤں گا میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں میں تمہیں کہیں بھی مروا سکتا ہوں۔ اس دوران فجر کی اذان ہو گئی اس کے بعد بھی وہ کافی دیر کمرے میں رہا اس دوران باہر بھی جاتا رہا اور کسی سے باتیں بھی کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی لیکن میں نے اٹھنے کی ہمت نہیں کی بعد میں اللہ کے بھروسے پر اٹھی اپنے بندھے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں سے دوپٹہ ہٹایا فون کرنے کی کوشش کی تو وہ کٹا ہوا تھا میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے میں نے بہت مشکل اور کوشش سے اپنے ہاتھ کھولے میں باہر نکلی تو دروازہ باہر سے لاک تھا میں نے کوریڈور میں موجود کھڑکی کی طرف سے لاک کھولا اور بھاگتی ہوئی نرسنگ سکول میں گئی اور چیختی چلاتی رہی وہاں موجود سسٹر سکینہ نے دروازہ کھولا اور باقی لوگوں کو بھی اطلاع دی۔ مجھ پر الزام ہے کہ میں نے اپنا واقعہ کسی کو نہیں بتایا کیا میں اس وقت یہ اعلان کرتی کہ میرے ساتھ کیا ہوا کیا میرے جسم سے بہتا خون میرے کپڑے اور میرے الفاظ کہ وہ کمینہ شخص میرے ساتھ پوری رات رہا گواہی نہیں دے رہے تھے۔

میں پی پی ایل کے افسروں سے سوال کروں گی کہ خدانخواستہ ان کی بیٹیوں کے ساتھ (اللہ سب کی ماں بیٹیوں کی حفاظت کرے) ایسا ہوتا تو کیا وہ ایک ایک کو بتاتے، کیا

مسٹر سمیع اللہ نے یہ نہیں بتایا کہ میرے کمرے سے کیا کیا شواہد ملے ہیں میں نے اس سے کہا کہ میرے بھائی اور بھابی کو کراچی سے بلا دیں تو کیا سی ایم او نے یہ نہیں کہا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ کیا اس نے ایک پیپر پر دستخط نہیں کرائے کہ جلدی جلدی اس کاغذ پر سائن کرو ورنہ پولیس آ رہی ہے ہم تمہیں نیند کا انجکشن لگا دیتے ہیں وہ واپس چلے جائیں گے کیا مجھے دو دن سسٹر سکینہ کے گھر پر نہیں رکھا گیا، کیا وہ یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ میرے سر پر خون جم گیا تھا اور میرے جسم سے جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا کیا سوئی ہسپتال میں کوئی لیبارٹری نہیں تھی جہاں میڈیکل کروایا جاتا؟ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ بس تھوڑی دیر بعد مجھے انجکشن دیتے رہے۔ جس سے میں مکمل طور پر بے ہوش تو نہیں ہوئی لیکن نیم خوابیدہ ہو جاتی تھی۔

تین جنوری کو پانچ بجے تقریباً مجھے خفیہ طریقے سے ایمبولینس میں سوئی سے کندھ کوٹ لایا گیا اور اگلے دن صبح کراچی میں ایک پاگلوں کے ہسپتال میں شفٹ کر دیا گیا۔ اصغر سائیکلوجیکل ہسپتال میں مجھے ایک نرس کے حوالے کر دیا گیا جبکہ میں نے کہا کہ مجھے نفسیاتی ماہر کی نہیں بلکہ فزیشن کی ضرورت ہے میں نے کہا کہ مجھے چھوڑ کر مت جائیں لیکن وہ لوگ چلے گئے۔ رات کو تقریباً 8 بجے میرے گھر والے مجھے گھر لے گئے وہاں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ ڈاکٹر شازیہ کو ریپ کر کے مار دیا گیا ہے۔

گھر آنے کے بعد ساری فیملی نے مجھے سپورٹ کیا میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ خودکشی کر لوں گی میں نے لیبیا میں خالد کو فون کیا اور ان کی کمپنی نے ہنگامی طور پر میرے شوہر کو کراچی پہنچا دیا۔ اس سے پہلے پی پی ایل کے کارکنوں نے دو بار میرے بھائیوں سے تاثرات معلوم کرنے کے لئے ہوٹل بلایا جس میں انہوں نے ایم ڈی منصف رضا سے ملنے کی پیشکش کی لیکن پھر کہا کہ وہ شہر سے باہر ہیں۔ لیکن خود ہی ان کے منہ سے نکل گیا کہ وہ کراچی میں مصروف ہیں۔ جنرل منیجر افتخار نے میرے بھائی کو کہا کہ جو بات بھی کرنی ہے جلد کریں میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ اس دوران میری فیملی کو یہ بھی کہا گیا کہ یہ ہماری کمپنی اور آپ کی عزت کا معاملہ ہے، اس کو صرف ایک ڈکیتی کی واردات بتانا چاہئے ورنہ کمپنی اور آپ کی عزت خاک میں مل جائے گی اس بات کو دبا دیں تو اچھا ہوگا۔

خالد کے کراچی آنے کے بعد ہماری ملاقات وزیر اعلیٰ سندھ سے کرائی گئی میری بوڑھی ماں بھی ہمارے ہمراہ تھیں کہ میں تمہیں انصاف دلاؤں گی۔ مگر میری بوڑھی ماں کو کیا

پتہ کہ جوتم اپنے سر سے دوپٹہ اتار کران کے قدموں میں رکھ رہی ہو ایسے ہزاروں دوپٹے
روزانہ بیچے جاتے ہیں ان کے لئے یہ معمولی چیز ہے۔ٹریبونل میں میرابیان لیا گیا اور 15
دن میں انصاف دلانے کا یقین دلایا گیا ہمیں تحفظ دینے کا بھی یقین دلایا گیا لیکن ہم کسی
بھی چیز سے مطمئن نہیں ہیں۔پورے پاکستان میں اس خبر کو سیاسی رنگ دے دیا گیا ہے مگر
کسی نے کوئی ہمدردی نہیں کی۔ہم نے گورنمنٹ سے انصاف کی اپیل کی ہے مگر پورا مہینہ
گزر چکا ہے ہمیں انصاف نہیں ملا۔

میرے شوہر بے روزگار ہو گئے میرا کیریئر تباہ ہو گیا ہے ہماری عزت جاتی رہی
لیکن حکومت نے نرم لہجے میں کہے گئے الفاظ کے علاوہ کچھ بھی نہیں کیا۔پی پی ایل کے کسی
بھی ممبر نے ہم سے رابطہ نہیں کیا شاید ان کو ایسا ہاتھ ہی نہیں ملا ہو گا کہ شفقت سے میرے سر
پر رکھ سکتے۔کوئی ایسی چادر نہیں ملی ہو گی جو میری بچی کھچی عزت بچانے کے کام آتی۔

میرا میل کرنے کا مقصد صرف سچائی بتاتا ہے میڈیا میں جو غلط بیان آرہے ہیں وہ
ہمارے دلوں کو مزید مایوس کر دیتے ہیں لیکن کوئی جرگہ بٹھاتا ہے، کبھی کوئی مجھے کاری قرار
دے دیتا ہے خدارا مجھے معاف کیجئے گا میں سامنے نہیں آنا چاہتی آپ سے یہ ایک بہن کی
درخواست ہے کہ آپ میرے دل کی آواز لوگوں کو بتا دیں کم سے کم لوگوں کو سچائی کا پتہ
چلے۔اللہ حافظ۔اپنی بہن اور قوم کی بیٹی جس کو ساری اذیتوں کا سامنا ہے دعا کیجئے گا ہر ماں
بیٹی کے حق میں دعا کیجئے گا جو اس معاشرے میں پیدا ہو چکی ہے یا ہونے والی ہے۔

"اگر ہمارے حکمرانوں میں غیرت ایمانی کی ایک رتی بھی موجود ہے تو ہمارا یہ
سوال ہے کہ اس بیان کے بعد انہیں اور کس طرح کی شہادت درکار ہے کیونکہ اکبر خان بگٹی
کی طرف سے یہ بیان تسلسل سے دیا جا رہا ہے کہ حکومت نے شازیہ کیس پر پردہ ڈالنے کے
لئے بلوچستان کے مسئلے کو ہوا دی ہے اور اب تو یہاں تک کہا جا رہا ہے کہ حکومت نے بارشوں
کی آڑ میں ایک مخصوص دن پر ڈیم بھی خود ہی توڑے ہیں۔خدارا صورت حال کی سنگینی
احساس کیجئے اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے۔

(ماہنامہ مراۃ العارفین، مارچ 2005ء

ڈاکٹر شازیہ خالد کے مسئلے کو حیرت انگیز طور پر سردار اکبر خان بگٹی کی طرف
بہت اچھالا گیا اور اسے بلوچوں کی غیرت پر حملہ قرار دیا گیا۔اس دوران مارچ 2005ء

آغاز میں کوئٹہ میں قوم پرست تنظیموں کا ایک اجتماع ہوا جس میں جدید اسلحہ کی نمائش کی گئی
اور بلوچستان لبریشن آرمی کا پرچم لہرایا گیا اس کے ساتھ ہی ڈیرہ بگٹی میں صورت حال تیزی
سے بگڑنے لگی اور اچانک قبائلیوں نے جن کا تعلق سردار اکبر خان بگٹی سے تھا ایف سی کے
سامنے مورچے سنبھالنے شروع کر دیئے کسی بھی لمحے کچھ بھی ممکن تھا اور 17 مارچ کو یہ حادثہ
بھی ہو گیا۔17 مارچ کو بلوچستان کی کشیدگی سنگین رخ اختیار کر گئی۔واقعات کی لمحہ بہ لمحہ
تفصیل کچھ یوں ہے۔

10-30 بجے صبح......ڈیرہ بگٹی سے پانچ کلومیٹر دور سنگسیلا موڑ پر 150 قبائلیوں کا
کمانڈنٹ بمبور رانفلو کے قافلہ پر حملہ۔

11......ایف سی قلعہ ڈیرہ بگٹی پر راکٹوں سے حملہ اور فائرنگ، آدھے گھنٹے کے
اندر 125 راکٹوں سے حملہ۔

11-30 فرنٹیئر کور کا نواب بگٹی کے قلعہ اور حملہ آوروں پر جوابی نشانہ۔

11-35......وزیراعلیٰ بلوچستان میر جام محمد یوسف فرنٹیئر کور ہیڈ کوارٹر کوئٹہ پہنچ
گئے، فائرنگ کا سلسلہ رکوانے کی کوششوں کا آغاز۔

12-00......سوئی سے 200 جوانوں پر مشتمل کمک سنگسیلا موڑ روانگی۔

1.30......سیز فائر کی پہلی ناکام کوشش۔

2-30......سیز فائر کی دوسری ناکام کوشش۔

4-15......سیز فائر کی تیسری ناکام کوشش

7-30......سیز فائر اکا دکا فائرنگ کا سلسلہ ساری رات جاری رہا۔اس مرحلے پر
اکبر بگٹی کی ذاتی فوج اور فرنٹیئر فورس (ایف سی) کے درمیان بڑا خونریز تصادم ہوا جس کی
سرکاری طور پر وجہ یہ بتائی گئی کہ قبائلیوں نے ایف سی کے ہیڈ کوارٹر کو گھیرے میں لے لیا تھا
اور اپنی دانست میں ان کی کمک کے راستے بند کر دیئے تھے جس پر ایف سی کو کارروائی کرنی
پڑی جس میں 70 لوگوں کی ہلاکت کی خبر سامنے آئی جس میں 32 وہ ہندو تھے جو ڈیرہ بگٹی
میں رہتے تھے۔

ڈیرہ بگٹی میں سیکورٹی فورسز اور قبائلیوں کے مابین تصادم میں یہاں رہائش پذیر
ہندو برادری کے 32 افراد ہلاک ہوئے جن میں زیادہ تعداد خواتین اور بچوں کی تھی۔نواب

اکبر بگٹی اور قبائلیوں کا کہنا تھا کہ یہ ہندو نواب بگٹی کے قلعہ کے اندر واقع مندر میں ''ماتا جی'' کی پوجا کر رہے تھے کہ ان پر راکٹ آ کے گرا جس کے نتیجہ میں وہ اپنی قیمتی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے جبکہ آئی جی ایف سی میجر جنرل شجاعت ضمیر ڈار کا کہنا تھا کہ ایف سی نے کبھی پر امن شہریوں پر فائرنگ نہیں کی۔ یہ افراد مسلح افراد کے ڈمپ کئے ہوئے بارود میں آگ لگنے سے ہلاک ہوئے ہیں۔ گورنر بلوچستان اویس احمد غنی کا بھی کہنا تھا کہ ہندو برادری کے افراد دھماکہ خیز مادہ پھٹنے سے ہلاک ہوئے ہیں، راکٹ لگنے کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ راکٹ کا حملہ ہوتا تو اس کے عمارت میں داخلہ ہونے کا ضرور نشان ہوتا۔

ہندوؤں کی ہلاکت ایک ایسا معمہ تھا جسے حل کرنے کے لئے زیادہ سر کھپائی کی ضرورت نہیں تھی ظاہر ہے یہ حرکت پاکستان کو عالمی سطح پر بدنام کرنے بھارت اور پاکستان کے درمیان جاری مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کے لئے کی گئی تھی لیکن آج تک اس بات کی سمجھ نہیں آسکی کہ حکومت اصلیت جاننے کے باوجود اسے بے نقاب کیوں نہیں کرتی؟

یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایف سی نے ہندوؤں کو نشانہ بنایا ہوگا۔ ایسے ممکن بھی نہیں تھا۔ ڈیرہ بگٹی میں سیکورٹی فورسز اور بگٹی قبیلہ کے افراد کے مابین ہونے والی مسلح جھڑپوں کے بعد فرنٹیئر کور نے سوئی پولیس کے پاس 162 افراد کے خلاف مقدمہ درج کرایا جن میں نواب اکبر بگٹی، سردار براہمدغ بگٹی، دس وڈیرے اور 150 دوسرے افراد شامل ہیں۔ بلوچستان نیشنل پارٹی کے جنرل سیکرٹری حبیب جالب کے مطابق ان قبائلی شخصیات کے خلاف زیر دفعہ 147, 148, 324,302 اور 109 مقدمات درج کئے گئے۔ جبکہ حکومت بلوچستان کے ترجمان رزاق بگٹی کا کہنا تھا کہ حکومت بلوچستان مسائل کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنا چاہتی ہے اس لئے ڈیرہ بگٹی میں یہ فوج بھیجی گئی ہے اور نہ نواب بگٹی کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا۔ ڈیرہ بگٹی میں سیکورٹی فورسز اور قبائلیوں کے مابین مسلح تصادم کے بعد وفاقی وزیر داخلہ آفتاب احمد شیر پاؤ نے سوئی اور ڈیرہ بگٹی کے لئے حکومت کی سات نکاتی حکمت عملی کا اعلان کیا جس کے تحت:

(1) سیاسی عمل پوری طرح جاری رہے گا تا کہ بلوچستان کے عوام کی ترقی و بہبود کا کام جاری رہے اور جو لوگ سیاسی عمل و بات چیت کو ناکام بنانا چاہتے ہیں ان کے عزائم پورے نہ ہو سکیں۔

(2) کسی کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دیں گے اور حکومت کی بہر صورت مکمل عملداری قائم کی جائے گی۔

(3) اگر قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اہلکاروں پر فائرنگ کی گئی تو سیکورٹی فورسز اس کا بھرپور جواب دیں گی۔

(4) تمام اہم اور حساس تنصیبات کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے گی۔

(5) صوبہ میں ترقیاتی کاموں اور میگا پراجیکٹس پر کسی رکاوٹ کے بغیر کام جاری رہے گا۔

(6) ڈیرہ بگٹی سے انخلاء کے الٹی میٹم کا بھرپور جواب دیا جائے گا اور حکومت علاقہ میں تمام شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کو یقینی بنائے گی۔

(7) سوئی کو فرنٹیئر کور کی جگہ فوجی حفاظت میں دے دیا جائے گا۔

اس دوران حکومت کی طرف سے ڈاکٹر شازیہ خالد کیس پر انکوائری جاری رہی سردار اکبر بگٹی اس جنسی حملے کا الزام ایک کیپٹن پر لگا رہے تھے جسے دوسرے لوگوں کے ساتھ شناختی پریڈ میں ڈاکٹر شازیہ خالد کے سامنے لایا گیا لیکن ڈاکٹر شازیہ خالد نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا حیرت کی بات یہ ہے کہ اسے خود پر جنسی حملہ کرنے والوں کی شناخت بھی یاد نہیں رہی تھی اس دوران اچانک خبر سامنے آئی کہ ڈاکٹر شازیہ خالد اور ان کے خاوند لندن پہنچ گئے ہیں جہاں انہیں سیاسی پناہ مل جائے گی۔ اس صورت حال پر میں نے مراۃ العارفین شمارہ اپریل 2005 میں لکھا۔

''بلوچستان کا مسئلہ حساس سے اب انتہائی خطرناک نوعیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر شازیہ کو اس کے خاوند سمیت لندن پہنچا دیا گیا ہے اور دنیا بھر کا پریس اپنے انداز سے تبصرے کر رہا ہے۔

ڈیرہ بگٹی میں سنگسیلا کے مقام پر سوئی جانے والے فرنٹیئر کور کے قافلے پر بڑی تعداد میں مسلح افراد کے حملے کے بعد فریقین میں کئی گھنٹے تصادم ہوا جس میں اپوزیشن کے ذرائع کے مطابق 70 افراد جاں بحق اور 200 زخمی ہوئے۔ وزیر داخلہ آفتاب احمد شیر پاؤ نے ایک نجی ٹی وی سے گفتگو کرتے ہوئے ایف سی کے پانچ اہلکاروں کے جاں بحق ہونے کی تصدیق کی ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ ڈیرہ بگٹی کے تصادم میں 150 راکٹ استعمال ہوئے۔ بلوچستان کے سابق وزیر اعلیٰ اکبر بگٹی نے 50 ہلاکتوں کی تصدیق کرتے ہوئے کہا

کہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مقامی آبادی پر فائر کھولا گیا، میرے گھر پر بھی حملہ ہوا جس میں ٹارگٹ میں تھا لیکن معجزانہ طور پر بچ گیا جبکہ ایک شخص ہلاک اور دو زخمی ہوئے۔ ہلاک شدگان میں نواب اکبر بگٹی کا سیکرٹری بھی شامل ہے۔

ڈیرہ بگٹی میں تصادم کا تازہ ترین افسوس ناک واقعہ اس وقت پیش آیا جب بلوچستان کے بارے میں پارلیمانی کمیٹی کئی ہفتوں کے تعطل کے بعد اسلام آباد میں دوبارہ اپنی تجاویز مرتب کر رہی تھی اور توقع کی جا رہی تھی کہ بلوچستان کے بحران کا کوئی سیاسی حل تلاش کر لیا جائے گا۔ تصادم کی اطلاعات آنے کے بعد نہ صرف بلوچستان کمیٹی کا اجلاس شور شرابے کی نذر ہو گیا بلکہ قومی اسمبلی میں بھی حکومت کی حلیف جماعت متحدہ قومی موومنٹ نے احتجاج کرتے ہوئے واک آؤٹ کیا۔ اپوزیشن نے اس موقع پر نئی پارلیمانی پارٹی کے قیام کا مطالبہ کیا جو بلوچستان کے تازہ ترین حالات معلوم کر کے ایوان کو آگاہ کرے۔

ڈیرہ بگٹی میں فرنٹیئر کور اور بلوچ قبائل میں تصادم کی نوبت کیسے آئی اس بارے میں دونوں فریق الگ الگ دعوے کر رہے ہیں۔ فرنٹیئر کور کے ذرائع کا دعویٰ ہے کہ ایک ہزار افراد نے ایف سی کے قافلے پر حملہ کیا اور ایف سی کے کمانڈنٹ کرنل فرقان سمیت 40 اہلکار تا حال قبائلیوں کے گھیرے میں ہیں اور ان کو گھیرے سے نکالنے کے لئے باضابطہ طور پر فوج طلب کی گئی ہے۔ وزیر داخلہ آفتاب شیر پاؤ نے ایف سی پر شرپسندوں کے حملے کی تصدیق کرتے ہوئے پچاس افراد کی ہلاکت کی اطلاعات کو مسترد کر دیا ہے البتہ یہ تسلیم کیا ہے کہ ایف سی کی جوابی فائرنگ سے ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کسی قسم کا آپریشن نہیں ہوا، دفاعی کارروائی ناگزیر تھی جبکہ اکبر بگٹی سمیت بلوچ رہنما باقاعدہ فوجی آپریشن کی دہائی دے رہے ہیں۔ چار جماعتی بلوچ یکجہتی اتحاد نے جمعرات کو پیش آنے والے سانحہ کے خلاف سات روز کے سوگ کا اعلان کیا ہے۔

حکومت اور اپوزیشن میں سے موقف خواہ کسی کا بھی صحیح ہو، اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں ہو سکتی کہ بلوچستان میں صورت حال ایک بار پھر بگڑ گئی ہے اور دونوں طرف سے ہلاکتوں کے بعد اشتعال میں اضافہ ہوا ہے جس سے نہ صرف بلوچستان میں قیام امن کی حکومتی کوششوں کو نقصان پہنچے گا بلکہ چودھری شجاعت حسین کی قیادت میں کام کرنے والی کمیٹی کی مشکلات بھی بڑھ گئی ہیں اور فوجی آپریشن کے امکانات بھی نظر آنے لگے ہیں۔

صدر جنرل پرویز مشرف تو بلوچستان کے مسئلے پر کوئی واضح بات کرنے سے گریزاں ہیں البتہ وزیر اعظم شوکت عزیز، مسلم لیگ کے صدر چودھری شجاعت حسین، گورنر بلوچستان اویس غنی اور وزیر اعلیٰ بلوچستان جام یوسف ایک سے زائد بار قوم کو یہ یقین دہانی کرا چکے ہیں کہ صوبے میں فوجی آپریشن نہیں ہوگا اور مسائل کا سیاسی حل تلاش کر لیا جائے گا۔ تازہ واقعہ ممکن ہے ایف سی کے قافلے پر فائرنگ کا شاخسانہ ہو لیکن صوبائی اور مرکزی حکومت میں سے کوئی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ اس پیچیدہ اور گھمبیر مسئلے سے نمٹنے کے لئے اس نے اب تک نہ تو کوئی فیصلہ کن، موثر اور قابل عمل اقدام کیا ہے اور نہ پارلیمانی کمیٹی کی ان سفارشات پر عملدرآمد کی ضرورت محسوس کی ہے، جن کے بارے میں چودھری شجاعت حسین اور گورنر بلوچستان اویس غنی کا دعویٰ ہے کہ انہیں صدر جنرل پرویز مشرف منظور کر چکے ہیں یہ سہل انگاری دانستہ ہے یا روایتی انداز فکر کی آئینہ دار، دونوں صورتوں میں ملک و قوم کے لئے نقصان دہ ہے۔ اگر حکومت نے اب تک ان مسائل کا کوئی پائیدار حل تلاش کر کے موثر اقدامات کئے ہوتے تو شاید اس قدر زیادہ جانی نقصان کی نوبت نہ آتی اور امریکی وزیر خارجہ کنڈ ولیزا رائس کی اسلام آباد موجودگی کے دوران ظہور پذیر ہونے والے اس واقعہ کی وجہ سے عالمی سطح پر پاکستان کو بدنامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔

زیر تعمیر گوادر بندرگاہ جہاں چین موجود ہے کی سٹریٹیجک اہمیت اور ایران کی ہمسائیگی کی وجہ سے بلوچستان اس وقت عالمی سازشوں کا مرکز بن چکا ہے۔ گورنر بلوچستان کا یہ بیان ریکارڈ پر ہے کہ گزشتہ چھ ماہ کے دوران افغانستان سے پچاس کروڑ روپے کا اسلحہ بلوچستان سمگل ہوا جبکہ سوئی اور ڈیرہ بگٹی میں حساس تنصیبات اور اہم مقامات پر 1578 حملے ہوئے۔ ان واقعات میں ملٹی بیرل راکٹ استعمال ہوئے۔ 25 کلومیٹر تک مار کرنے والے اس راکٹ کا توڑ ایف سی یا پولیس کے پاس نہیں۔

ممتاز دفاعی تجزیہ نگار حمید گل نے بلوچستان کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ امریکہ کی اجازت اور علم کے بغیر پچاس کروڑ کا اسلحہ افغانستان سے بلوچستان کیسے پہنچ گیا۔ انہوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ ہم بلوچستان کے واقعات کی پشت پناہی کرنے والے دشمن کا نام تک زبان پر نہیں لا سکتے۔ یہ سانحہ ظاہر ہے کہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا حصہ ہے اگر اس کا مقصد کسی فوجی آپریشن کی راہ ہموار کرنا

ہے تب بھی اس کی سنگینی میں کلام نہیں ہوسکتا ہے عین ممکن ہے کہ بلوچستان کے بارے میں پارلیمانی کمیٹی کے کام سے ناخوش عناصر نے اسے ناکام بنانے کے لئے یہ کھیل کھیلا ہو کیونکہ چودھری شجاعت حسین پارلیمنٹ میں کھل کر یہ کہہ چکے ہیں کہ ان کے کام میں رکاوٹ ڈالی جا رہی ہے جس پر سابق وزیراعظم میر ظفر اللہ خان جمالی نے کہا تھا کہ چودھری صاحب کھل کر ان قوتوں یا عناصر کا نام لیں جو پارلیمانی کمیٹی کے راستے میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔

گزشتہ روز پارلیمانی کمیٹی کا اجلاس ختم ہونے پر چودھری شجاعت حسین نے ایک بار پھر کہا ہے کہ ڈیرہ بگٹی کا واقعہ کمیٹی کے خلاف سازش ہے۔تاہم انہوں نے سازشی عناصر کے بارے میں نہیں بتایا کہ وہ حکومت کی صفوں میں موجود ہیں یا قوم پرستوں کے ساتھ مل کر سیاسی عمل کو سبوتاژ کرر ہے ہیں۔بہتر ہے کہ اب چودھری صاحب قوم کو بتا ہی دیں کہ ان کا اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے۔

بعض حلقے بلوچستان کی صورت حال کو ایران، امریکہ تنازعہ سے منسلک کرتے ہیں حالیہ بدامنی کو ان قوتوں کی کارستانی قرار دیتے ہیں جو ایک طرف تو گوادر میں چین کی موجودگی سے خوش نہیں اور دوسری طرف پاکستان سے ایران کے خلاف اسی طرح کا تعاون چاہتی ہیں جس طرح کا تعاون افغانستان میں ملا۔وجوہات کچھ بھی کیوں نہ ہوں، بلوچستان جیسے حساس صوبے میں حساس تنصیبات اور ایف سی پر حملے انتہائی افسوس ناک اور تشویش انگیز ہیں جبکہ جوابی ردعمل کے طور پر اگر کوئی مقامی شہری ریاستی اداروں کی گولی کا نشانہ بنتا ہے تو یہ بھی قومی نقصان ہے اس بناء پر حکومت کا فرض ہے کہ اب کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر قوم کو بلوچستان میں متحرک پاکستان دشمن عناصر اور ان کے بیرونی سرپرستوں کے بارے میں جملہ تفصیلات سے آگاہ کرے۔

(ماہنامہ مراۃ العارفین، اپریل 2005ء)

❖■❖■❖

غیر ملکی مداخلت

بلوچستان کے واقعات چیخ چیخ کر یہاں ہونے والی غیر ملکی مداخلت کی نشاندہی کرر ہے تھے ڈیرہ بگٹی میں 18 مارچ کے سانحے کے بعد صدر جنرل پرویز مشرف نے کہا:

”بلوچستان کے حالات میں سو فیصد بیرونی ہاتھ ملوث ہے وار لارڈز کی مالی مدد کی جاتی ہے اس سے وہ اسلحہ خریدتے ہیں۔بلوچستان میں ہمسایہ ممالک ملوث ہوسکتے ہیں۔“

(اخبار جہاں 28 مارچ تا 3 اپریل 2005ء)

صدر مملکت کے اس بیان کے بعد کہ خدانخواستہ بلوچستان میں مشرقی پاکستان جیسی صورت حال نہیں ہے میں نے اپنے مضمون میں لکھا۔صدر جنرل پرویز مشرف کا یہ کہنا کہ بلوچستان میں بنگال جیسی صورت حال نہیں ہے، اپنی جگہ بالکل درست ہے مگر گزشتہ تین چار سالوں سے یہاں بم دھماکوں، راکٹ فائرنگ اور اہم قومی تنصیبات کو نشانہ بنانے کا سلسلہ جاری ہے اور اب کھلے عام آزاد بلوچستان اور پاکستان سے الگ ہونے کی جو باتیں کی جارہی ہیں، اس سے ہر محب وطن شخص پریشان نظر آتا ہے اور ہفتہ رفتہ کے دوران یہاں جو کچھ ہوا وہ حکومت اور سیاستدانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔دہشت گردی اور تخریب کاری کی وارداتوں کی اس فضا میں پہلے تو ڈیرہ بگٹی میں قبائلیوں اور فرنٹیئر کور کے مابین تصادم ہوا اس سے اگلے روز 18 مارچ کو بلوچستان میں چار بم دھماکے ہوئے جن میں سے دو صوبائی دارالحکومت کوئٹہ اور دو تربت میں ہوئے۔ریلوے اسٹیشن اور بی و

مشکاف کے درمیان بم دھماکے ہوئے جن میں دو افراد ہلاک اور 9 زخمی ہوئے۔ ٹرینوں میں یہ بم ڈبے کے باتھ رومز میں رکھے گئے تھے ورنہ اگر یہ بم ڈبے کے اندر سواریوں کے درمیان ہوتے تو یقیناً مرنے والوں کی تعداد درجنوں میں ہوتی۔ ٹرینوں کو نشانہ بنانے کے بعد صوبائی دارالحکومت سے 300 کلومیٹر دور ضلع جھل مگسی کے شہر فتح پور شریف میں 19 مارچ کو رات ساڑھے گیارہ بجے بزرگ صوفی رکھیل شاہ کے عرس کے موقع پر جبکہ ہزاروں زائرین میں لنگر تقسیم کیا جا رہا تھا ایک خوفناک بم دھماکہ ہوا جس میں 63 افراد ہلاک اور 80 زخمی ہو گئے۔ بلوچستان کی تاریخ میں دہشت گردی کی کسی بھی واردات میں مرنے والوں کی یہ سب سے بڑی تعداد ہے۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ اس کی زد میں آنے والوں کے جسم کے ٹکڑے اڑ کے قریبی درختوں اور عمارتوں پر لٹک گئے اور 17 لاشیں جل کے ناقابل شناخت ہو گئیں۔ ہلاک ہو جانے والوں کے ورثاء اپنے پیاروں کو ان کے پہنے ہوئے کپڑوں، جوتوں، ٹوپی اور دوسری اشیاء سے شناخت کر کے دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔
اگرچہ تادم تحریر کسی نے ان دھماکوں کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ تاہم پولیس اس واردات کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہی ہے جس میں گدی نشین فتح پور شریف سید صادق علی شاہ کی ذاتی دشمنی فرقہ وارانہ دہشت گردی کی کوئی کارروائی یا دہشت گردی کی کارروائی کے ذریعے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانا بھی ممکن ہے۔ دہشت گردی کی اس کارروائی کے بارے میں اگرچہ یہ کہا جا رہا ہے کہ ایک خودکش بم حملہ تھا جس میں حملہ آور کے بھی پرخچے اڑ گئے تاہم ماہرین بم ڈسپوزل کا کہنا تھا کہ یہ خودکش حملہ نہیں بلکہ ٹائم بم تھا۔ گورنر بلوچستان اویس احمد غنی نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ فتح پور شریف کا دھماکہ خودکش حملہ نہیں تھا بلکہ یہ ٹائم بم تھا اور دھماکہ کی جگہ سے ٹائمر ملا ہے۔

بہرحال اس بم دھماکے کی کوئی بھی وجوہات ہوں لیکن اب یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ دہشت گرد جو اس سے قبل ویران اور بے آباد علاقوں میں بم دھماکے کیا کرتے تھے یا ان کا نشانہ چند مخصوص لوگ تھے اب انہوں نے عام آبادی کو بھی اپنا نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت درگاہ میں ہونے والا بم دھماکہ اور چلتن ایکسپریس کی بوگیوں میں بم دھماکے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سے قبل قوم پرستوں

کی جانب سے یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر ان کے لوگوں کو نشانہ بنایا گیا تو وہ اس کا بدلہ لیں گے اور ایک کے بدلے چار کو نشانہ بنائیں گے لہٰذا بعض حلقے دہشت گردی کی اس تازہ اور سنگین لہر کو ڈیرہ بگٹی میں قبائلیوں اور سیکورٹی فورسز کے درمیان ہونے والے مسلح تصادم اور اس میں مبینہ طور پر 70 افراد کی ہلاکت کا ردعمل بتا رہے ہیں مگر کہیں سے بھی اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملا ہے کہ دہشت گردی کے یہ واقعات ڈیرہ بگٹی کے واقعات کے ردعمل کا نتیجہ ہیں۔
بہرحال یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کے جان و مال کے تحفظ اور دہشت گردی کی کارروائیوں کی روک تھام کے لئے ہر ممکن اقدامات کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ خفیہ ایجنسیوں کی کارکردگی کو بھی بہتر بنایا جائے مگر جس بات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ بلوچستان کے مسائل اور معاملات کا فوری حل نکالا جائے میگا پراجیکٹس کے بارے میں بلوچ قوم پرستوں کے جو تحفظات ہیں انہیں دور کیا جائے اور اس سلسلے میں تاخیر نہ کی جائے کیونکہ ہر آنے والے دن کے ساتھ مسائل مزید الجھتے اور پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں اور ملک دشمن قوتیں یہ نہیں چاہتی ہیں کہ بلوچستان کا مسئلہ حل ہو۔

گورنر بلوچستان اویس احمد غنی نے کہا کہ حکومت ڈائیلاگ پر یقین رکھتی ہے یہی صحیح راستہ ہے۔ تشدد کے عمل سے گریز کرنا چاہئے کیونکہ اس میں سب کا نقصان ہے۔
نت نئے ایشو کھڑے ہونے کی اس فضا میں پارلیمانی کمیٹی 21 مارچ سے روزانہ بلوچستان کے معاملات کا جائزہ لے کر سفارشات کو آخری شکل دے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم پرست بھی کمیٹی کا بائیکاٹ ختم کر کے کچھ لو اور کچھ دو کی بنا پر بلوچستان کے مسئلہ کو حل کریں۔ ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی نیا ایشو اٹھ کھڑا ہو یا کھڑا کر دیا جائے کیونکہ ملک دشمن قوتیں نہیں چاہتی ہیں کہ بلوچستان کا مسئلہ حل ہو۔ گوادر ڈیپ سی پورٹ کام کرے اور غیر ملکی سرمایہ کار یہاں آ کے سرمایہ کاری کریں۔

اسلام آباد میں بلوچستان کے مسئلے کے حل کے سلسلے میں قائم ہونے والی پارلیمانی کمیٹی اپنی سفارشات کو آخری شکل دینے میں مصروف تھی تا کہ بلوچستان کو سیاسی بحران سے نکالا جا سکے کہ ایسے میں ڈیرہ بگٹی میں فرنٹیئر کور اور بگٹی قبیلہ کے مابین مسلح تصادم ہو گیا جس میں فرنٹیئر کور کے 10 جوان جاں بحق اور 30 زخمی جبکہ نواب اکبر بگٹی کے مطابق

بگٹی قبیلہ کے 70 افراد ہلاک ہوئے جن میں ہندو برادری سے تعلق رکھنے والے 32 مرد خواتین اور بچے شامل تھے۔ فائرنگ کے اس واقعہ کا ملک بھر میں سخت ردعمل دیکھنے میں آیا۔ قومی اسمبلی کے اجلاس میں اپوزیشن اور ایم کیو ایم نے بطور احتجاج واک آؤٹ کیا۔ بلوچستان کے مسئلہ کے سلسلہ میں پارلیمانی کمیٹی کا اجلاس جو سفارشات کو آخری شکل دینے کے لئے ہو رہا تھا ملتوی کر دیا گیا۔ بلوچستان اسمبلی کا اجلاس بھی اپوزیشن کی درخواست پر ملتوی کر دیا گیا اور متحدہ مجلس عمل کے قائد اور جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمان نے دھمکی دی کہ بلوچستان میں اگر فوجی آپریشن جاری رہا تو متحدہ مجلس عمل صوبائی حکومت سے الگ ہو جائے گی جبکہ بلوچستان اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کچکول علی ایڈووکیٹ کا کہنا تھا کہ ڈیرہ بگٹی میں آگ و خون کا کھیل شروع کر دیا گیا ہے۔ حکمرانوں کا یہی رویہ رہا تو ہم اسمبلیاں چھوڑ دیں گے۔ جمہوری وطن پارٹی، بلوچستان نیشنل پارٹی نیشنل پارٹی، حق نواز پر مشتمل چار جماعتی اتحاد نے ڈیرہ بگٹی میں مبینہ آپریشن کے خلاف سات روزہ سوگ منانے اور احتجاجی جلسوں و مظاہروں کا اعلان کیا اور بلوچستان اسمبلی کے سامنے مظاہرہ کیا۔ ڈیرہ بگٹی میں اس وقت یہ صورت حال ہے کہ حالات سخت کشیدہ ہیں پورا شہر خالی ہو چکا ہے بگٹی قبیلہ کے لوگ اور فرنٹیئر کور کے جوان مورچہ بند ہیں اور دونوں فریق ایک دوسرے پر الزام لگا رہے ہیں کہ انہوں نے ڈیرہ بگٹی کے راستے بلاک کر رکھے ہیں جس سے علاقہ میں راشن اور اشیائے خورد و نوش کی قلت پیدا ہو گئی ہے۔ نواب اکبر بگٹی جو بگٹی قبائل اور فرنٹیئر کور کے مابین تصادم کے دوران بال بال بچے ہیں۔ انہوں نے اب اپنی روایتی بیٹھک اور ٹھکانہ تبدیل کر لیا ہے۔ نواب اکبر بگٹی کا کہنا ہے کہ وہ اپنی بیٹھک میں وڈیروں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور انہوں نے جیسے ہی سیٹلائٹ فون پر بات چیت شروع کی، ایک راکٹ ان کی چھت پر سے ہوتا ہوا کمرے میں آ کے پھٹا جس سے وہ بال بال بچے جبکہ ان کے ساتھ بیٹھا ایک وڈیرہ شیر بگٹی ان کے پرائیویٹ سیکرٹری رفیق بگٹی اور دوسرے افراد شدید زخمی ہوئے۔ جمہوری وطن پارٹی کا کہنا تھا کہ نواب بگٹی پر گائیڈ میزائل کے ذریعے حملہ کیا گیا ہے مگر دفاعی مبصرین نے اسے غلط قرار دیا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ ڈیرہ بگٹی میں بگٹی قبائل اور فرنٹیئر کور کے مابین مسلح تصادم کس طرح

شروع ہوا اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ سانحہ سوئی اور ڈاکٹر شازیہ گینگ ریپ کے واقعہ کے بعد یوں تو پہلے ہی سوئی اور ڈیرہ بگٹی میں خاصی کشیدگی پائی جاتی تھی اور ہزاروں مسلح بگٹی و مری قبائلی علاقہ میں مورچہ بند تھے مگر اس کشیدگی میں اس وقت اضافہ ہو گیا جب ڈیرہ بگٹی میں فرنٹیئر کور اور قبائلیوں میں تصادم سے تین دن قبل بگٹی قبائل نے سنگسیلا میں واقع بمبور رائفلز کے قلعہ کی واٹر سپلائی لائن کاٹ دی ابھی اس مسئلہ پر گفت و شنید کا سلسلہ جاری تھا کہ 17 مارچ کو صبح ساڑھے دس بجے فرنٹیئر کور کے کمانڈنٹ کرنل عرفان، ڈی سی او عبدالصمد لاسی فرنٹیئر کور کے ایک قافلہ کے ہمراہ ڈیرہ بگٹی سے سوئی جا رہے تھے کہ انہیں سات گاڑیوں میں سوار 150 سے زیادہ بگٹیوں نے ڈیرہ بگٹی سے پانچ کلومیٹر دور سنگسیلا موڑ پر روکا اور چھوٹے ہتھیاروں سے حملہ کر دیا۔ آئی جی ایف سی میجر جنرل شجاعت ضمیر ڈار کے مطابق اس حملہ کے دوران ایف سی کے تین اہلکار ہلاک اور سات زخمی ہو گئے۔ ایف سی کے جوانوں نے بھی پوزیشن سنبھال کے جوابی فائرنگ شروع کر دی جبکہ اسی دوران ڈیرہ بگٹی میں بھی فرنٹیئر کور کے قلعہ پر راکٹوں سے حملہ کیا گیا، فائرنگ کی گئی اور آدھے گھنٹے کے اندر 150 راکٹ فائر کئے گئے۔ فرنٹیئر کور کے جوانوں نے نہایت ہی محتاط انداز میں اس کا جواب دیا اور ان ہی ٹھکانوں کو نشانہ بنایا جہاں سے یہ راکٹ برسائے جا رہے تھے۔ آئی جی ایف سی کا کہنا تھا کہ پچھلے دو ماہ سے دس مرتبہ مسلح افراد نے ایف سی کے قافلوں پر حملے کئے ہیں لیکن ہم نے صرف ان حملوں کو روکنے پر اکتفا کیا اور جوابی کارروائی نہیں کی۔

سنگسیلا موڑ پر بگٹی قبائل اور فرنٹیئر کور کے درمیان تصادم ہوا فرنٹیئر کور کے کمانڈنگ ڈی سی او 40 افسر اور جوان حملہ آوروں کے محاصرے میں آ گئے۔ کرنل مجید کی قیادت میں ایف سی کے 200 جوان انہیں بچانے کے لئے پہنچے مگر انہیں بھی خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ مسلح تصادم کی اطلاع ملتے ہی صوبائی دارالحکومت سے سیز فائر کی کوششوں کا آغاز ہو گیا۔ وزیر اعلیٰ جام محمد یوسف خود فرنٹیئر کور کے ہیڈ کوارٹر پہنچے اور انہوں نے نواب بگٹی سے رابطہ کیا۔ ڈیڑھ بجے سیز فائر کا فیصلہ ہوا مگر یہ کوشش ناکام رہی پانچ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن قبائلیوں کا کہنا تھا کہ جب تک انہیں نواب اکبر بگٹی حکم نہیں دیں گے وہ لڑائی نہیں روکیں گے بالآخر رات آٹھ بجے سیز فائر ہوا اور ایف سی اپنے محاصرے میں آئے افسروں

اور جوانوں کو نکالنے میں کامیاب ہوئی رات دو بجے تک یہ آپریشن مکمل ہو چکا تھا قبائلیوں نے فائرنگ اکبر بگٹی کے حکم پر ہی روکی ورنہ سیز فائر ممکن ہی نہیں تھا سیز فائر کے بعد نواب اکبر بگٹی کا کہنا تھا کہ ڈیرہ بگٹی کی آبادی کو اچانک نشانہ بنایا گیا۔ شہر پر فائرنگ کا سلسلہ دو ڈھائی بجے تک جاری رہا اور 50 افراد جاں بحق اور 150 زخمی ہوئے۔ فائرنگ کا زیادہ زور میرے گھر اور بیٹھک پر تھا اس کوشش میں ہندو محلہ بھی زد میں آیا۔ ہم نے اپنے دفاع میں فائر کیا تو فرنٹیئر کور کے تمام مورچوں سے ڈیرہ بگٹی پر توپ خانے اور مارٹر کے علاوہ بھاری اسلحہ سے فائر کھول دیا گیا۔ شہر بھر کی تمام آبادی کو بلا امتیاز نشانہ بنایا گیا۔ نواب بگٹی کا کہنا تھا کہ جنرل صاحب نے پہلے بھی یہ کہا تھا کہ ہم ایسے ہٹ کریں گے کہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ کہاں سے ہٹ کیا گیا۔ ہمارے عوام کے خلاف اس کے مطابق عمل کیا جا رہا ہے وہ مار رہے ہیں اور ہم مر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہم مزاحمت کر رہے ہیں اور اپنے دفاع کی کوشش کر رہے ہیں۔ نواب بگٹی نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ حملے میں پہل قبائل نے نہیں کی۔

بہر حال دونوں فریقوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے حملے میں پہل نہیں کی۔ ویسے بلوچستان کے معاملات میں جس طرح بیرونی قوتیں ملوث ہیں اور یہاں بیرونی ممالک سے جدید اسلحہ اور روپیہ آ رہا ہے اس کی روشنی میں ممکن ہے کہ کسی تیسرے فریق نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہو۔ گورنر بلوچستان اویس احمد غنی نے انکشاف کیا کہ ایف سی کے ایک زخمی جوان نے بتایا کہ اس پر جن دو افراد نے فائرنگ کی انہوں نے ایف سی کی یونیفارم پہن رکھی تھی یہ ایک تشویشناک بات تھی کیونکہ حکومت کو فروری 2005ء میں اس کے ثبوت مل چکے تھے جب انٹیلی جنس ایجنسی نے رحیم یار خان کے ایک ٹیلر ماسٹر کو گرفتار کیا جس نے بتایا کہ اسے ایف سی کی دو سو یونیفارم کے لئے ڈیرہ بگٹی لایا گیا تھا۔"

27 مارچ 2005ء کو میں نے اس حوالے سے ایک تجزیاتی رپورٹ لکھی جو سنڈے میگزین جنگ میں شائع ہوئی۔ بلوچستان کا مسئلہ سنگین صورت حال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وفاقی وزیر داخلہ آفتاب احمد خان شیرپاؤ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ صوبے میں امن و امان اور سیکورٹی کے معاملات زیادہ تسلی بخش نہیں ہیں اب تک کی اطلاعات کے مطابق اکبر بگٹی کی نجی فوج کے 3 سے 5 ہزار مسلح افراد ایف سی قلعہ کے گرد مورچے قائم کر چکے ہیں جس

سے ایک بڑے تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے خود گورنر بلوچستان نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ صوبہ میں ایک بڑے تصادم کا خطرہ ہے۔ ڈی سی او عبدالصمد نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ صورت حال کشیدہ ہے حتیٰ کہ بگٹی قبائل نے نہ صرف مورچے بنا رکھے ہیں بلکہ نئے مورچے بھی بنائے جا رہے ہیں۔

ادھر بزرگ سیاستدان اور پونم کے سربراہ عطاء اللہ مینگل نے واضح طور پر کہا ہے کہ جارحیت کا حق دنیا کا کوئی قانون کسی فوج کو نہیں دیتا۔ انہوں نے یہ بھی الزام لگایا ہے کہ حکومت نے اپنی کمزوریاں چھپانے کے لئے بلوچ قبائل کا رابطہ بعض بیرونی طاقتوں سے جوڑ لیا ہے۔ حکومت کے اس قسم کے رویے سے حالات تصادم کی طرف جا رہے ہیں اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو غیر ملکی حکومتیں صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھائیں گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ لیگی قیادت نے ہماری بات کا مثبت جواب نہیں دیا لہٰذا بندوق کی نوک پر مذاکرات نہیں ہو سکتے۔

دوسری طرف صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے بلوچ قبائل کو مشورہ دیا ہے کہ وہ قانون کا احترام کریں اور حالات سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ حکومت بلوچستان کا معاملہ سیاسی انداز سے حل کرنا چاہتی ہے حکومت نے مذاکرات کے دروازے کبھی بند نہیں کئے تاہم قانون کا احترام سب پر لازم ہے۔ صدر پاکستان کے علاوہ وزیراعظم شوکت عزیز نے کہا ہے کہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو وہ تنازعہ حل کروانے کیلئے خود ڈیرہ بگٹی جائیں گے۔ انہوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ بلوچستان میں کوئی فوجی آپریشن نہیں ہو رہا تاہم ملک کی بقاء سلامتی اور قومی تنصیبات کی حفاظت میں حکومت ذرہ برابر غفلت نہیں کرے گی۔

اسی مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات شیخ رشید نے کہا کہ بگٹی جنگجو بن کر سامنے آئے ہیں اسی لئے اب وہ سیاستدان نہیں رہے۔ قومی اسمبلی میں اپوزیشن کے مختلف اعتراضات کے جواب میں شیخ رشید نے کہا کہ انہوں نے حکومت کو اعتماد میں لے کر خلوص نیت سے بات کی تھی۔ میں پھر کہتا ہوں کہ بلوچی ہماری انا، ہماری شان ہیں ہمیں ان پر فخر ہے کیونکہ انہوں نے پاکستان کے ساتھ شمولیت کا فیصلہ کیا تھا تاہم

حکومت کے نوٹس میں یہ بات آئی ہے کہ کچھ لوگوں کو گوادر کی تعمیر سے خطرہ ہے نہ کہ سوئی گیس میں کوئی مسئلہ ہے۔

بلوچستان کے مسئلے پر حکومت کے موقف میں بہت حد تک سچائی نظر آتی ہے کیونکہ کوئی بھی حکومت دانستہ طور پر سیاسی گڑبڑ کر کے اپنے لئے پریشانی یا مصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتی اور یہ بھی درست ہے کہ حکومت کے لئے اولیت ملک کی سالمیت اور بقا ہے جبکہ دیگر معاملات جزوی نوعیت کے ہیں مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کہ اگر بگٹی قبائل سوئی گیس یا ڈاکٹر شازیہ کیس کو بنیاد بنا کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو اس کے پس پردہ کچھ دوسرے عزائم یا عوامل ہو سکتے ہیں حکومت کے مخالفین کا یہ بھی خیال ہے کہ جب سے امریکہ کی نائب وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس پاکستان کا چکر لگا کر گئی ہیں تب سے بلوچستان کے مسئلے میں شدت آ گئی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے سابق امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کے آنے کے بعد وانا میں دہشت گردوں کے خلاف کارروائی میں تیزی آ گئی تھی گویا ان عناصر کا خیال ہے کہ جب بھی امریکی عہدیدار پاکستان آتے ہیں اس کے بعد اچانک حساس علاقوں میں حکومت کی کارروائیاں تیز ہو جاتی ہیں مگر یہ سب مفروضوں پر مبنی ہے جبکہ حقیقت کا اس سے کوئی خاص تعلق نہیں۔

ماضی کی تاریخ شاہد ہے کہ ہم نے قومی معاملات کو اسی طرح سے بگاڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1971ء میں ملک دولخت ہو گیا۔ ہمارے ہاں مریض کا اصل مرض ڈھونڈنے اور اس کا علاج کرنے کی بجائے سرجن آپس میں لڑائی لڑنا شروع کر دیتے ہیں ایسے میں مریض پر کیا گزرے گی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ابھی وانا آپریشن کے اثرات ختم نہیں ہوئے بلوچستان کی صورت میں ایک نیا ''وانا'' سامنے آ گیا ہے لہٰذا اس نازک مرحلے پر اگر ارباب بست وکشاد اور متعلقہ فریقین نے قومی مسائل کو ہوش کے بجائے جوش سے طے کیا تو اندیشہ ہے خاکم بدہن ہم ایک نئے قومی المیے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔

بلوچستان کے موجودہ تنازعہ کو حل کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہاں معاشی اقتصادی حالات، تہذیبی پس منظر اور ماضی میں ہونے والے تنازعات کے بارے میں بھی کچھ جان لیا جائے تا کہ مسئلہ کے حل میں آسانی ہو سکے اس وقت بلوچستان میں جو بھی امن

وامان کی صورت حال ہے یا حکومت اور بلوچ سرداروں کے ساتھ جو مذاکرات چل رہے ہیں وہ اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے جب تک کہ تنازعہ کی اصل وجہ سامنے نہیں آتی اس وقت حکومت کا موقف یہ ہے کہ بلوچ سردار اور قوم پرست گروہ حکومت کے لئے دانستہ طور پر مسائل کھڑے کر رہے ہیں جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ بلوچ سردار علاقہ میں معاشی و اقتصادی ترقی کے خلاف ہیں جبکہ دوسری جانب قوم پرستوں کا کہنا ہے کہ حکومت مسلح افواج کو بلوچستان میں مستقل طور پر رکھنے کے لئے اس قسم کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔ بلوچ دانشور اللہ بخش بزدار نے گزشتہ دنوں اپنے ایک بیان میں کہا کہ قبائلی سردار جب اقتدار میں ہوتے ہیں تو ان کو حقوق اور مسائل یاد نہیں رہتے مگر جب وہ اقتدار سے محروم ہو جاتے ہیں اختیارات ان کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں تو وہ لوگوں کے مسائل اور مصائب کو کیش کروانے کی مہم پر نکل پڑتے ہیں۔ دانشور اللہ بخش بزدار کا کہنا ہے کہ کہ مقامی سردار اختر مینگل ابھی تک چاغی پہاڑوں کے دامن میں بسنے والے لوگوں سے کئے گئے حکومتی وعدوں پر ماتم کناں ہیں جہاں پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کیا تھا مگر حکومت نے ان مصیبت زدہ لوگوں کے لئے کوئی فلاحی کام نہیں کیا اگر کوئی قبائلی نظام کے مسائل، تنازعات اور پیچیدگیوں کو دیکھنا چاہتا ہے تو اسے کوہلو (Kohlu) ضلع میں جانا چاہئے جہاں مری قبیلے کے چیف اور ان کے مخالفین علاقے کی ترقی کے لئے ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں جس سے مزید معاملات خراب ہو رہے ہیں۔ حکومت نے ریاست کو بجلی اور سوئی گیس کی سہولیات بہم پہنچانے کے لئے جو تنصیبات قائم کر رکھی ہیں ان پر راکٹوں سے حملے ہو رہے ہیں حتیٰ کہ زیر تعمیر سڑکوں اور کوئلے کی کانوں کو بم بلاسٹنگ کے ذریعے اڑایا جا رہا ہے اگرچہ اس قسم کے حملوں کی ذمہ داری کسی نے قبول نہیں کی تاہم بلوچ پیپلز لیبریشن فرنٹ (BPLF) گروپ کا دعویٰ ہے کہ وہ اس قسم کے واقعات کی ذمہ داری قبول کرتا ہے فرنٹیر کانسٹیبلری پوسٹس کے ساتھ ساتھ سڑکوں پر نصب بجلی کے کھمبوں اور چھوٹے چھوٹے ڈیموں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے اس کی ذمہ داری بھی (BPLF) نے ہی قبول کی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابھی تک علاقے میں کسی قسم کے انفراسٹرکچر پر کام نہیں کیا گیا جس کے سبب کاروبار زندگی معطل ہو کر رہ گیا ہے مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ 1987ء میں کوہلو ٹاؤن

میں بجلی کے جو پول نصب کیئے جا رہے تھے اس دوران بعض نامعلوم عناصر نے واپڈا کی ٹیم کے ارکان پر راکٹ فائر کیئے اس حملے میں 6 افراد ہلاک ہوئے اور واپڈا کی ٹیم کے ارکان نے اس وقت تک کام جاری رکھنے سے انکار کر دیا تھا جب تک کہ کوہلو کے ڈپٹی کمشنر نے خود کام کی تکمیل کے لئے واپڈا ٹیم کی نگرانی کی ہامی نہ بھر لی۔

اسی طرح Tambo زرعی طور پر ایک زرخیز علاقہ ہے جہاں سیب، بادام، گندم اور پٹ سن بہت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ حال ہی میں حکومت نے تمبو اور کوہلو ٹاؤن کو آپس میں ملانے کے لئے علاقہ میں سڑک تعمیر کرنے کا منصوبہ شروع کیا ہے تاہم اس منصوبے کو اس وقت تک روک دیا گیا تاوقتیکہ کانوں میں بم دھاکوں سے ہونے والی خرابیوں کو دور نہیں کر دیا جاتا۔

صورت حال یہ ہے کہ مری قبائل کے لوگوں کی اکثریت کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ بدستور پسماندہ زندگی بسر کرتے رہیں اور باہر کی دنیا کے دروازے اپنے اوپر بند رکھیں یہ لوگ اب بھی مٹی گارے، پتھروں اور درختوں کی شاخوں سے بنائے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں میں رہتے ہیں جو بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں گھرے ہوئے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ مری قبائل اس وقت زندگی کی بنیادی سہولتوں مثلاً پانی بجلی اور گیس سے بھی محروم ہیں شرم اور ظلم کی مزید انتہا یہ ہے کہ پانی کے گندے جوہڑوں سے انسان اور جانور ایک ساتھ پانی پیتے ہیں جس کے سبب علاقہ میں جان لیوا وبائی امراض پھوٹ پڑے ہیں جبکہ اس قسم کی بیماریوں کی روک تھام کے لئے حکومت کی طرف سے کوئی بندوبست نہیں جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہاں آمدورفت کے لئے سڑکیں اور راستے ناپید ہیں اگر کسی مریض کو کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو اسے دشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزار کر ڈیرہ غازی خان یا ملتان کے ہسپتالوں میں لے جانا پڑتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ کوہلو میں کوئی ہسپتال نہیں ہے وہاں اس وقت 35 بستروں کا سول ہسپتال موجود ہے مگر اس میں ضروری طبی سہولتیں اور شاف نہیں ہے۔ ہسپتال کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر صاحب جان مری کا کہنا ہے کہ میڈیکل آفیسرز کی دس منظور شدہ آسامیوں میں سے 6 ابھی تک خالی پڑی ہیں۔ اسی طرح اسسٹنٹ ڈاکٹروں کی 8 آسامیوں میں سے 5 لیڈی میڈیکل آفیسرز کی آسامیاں خالی

پڑی ہیں۔ پروفیشنل لوگ یہاں آنے سے اس لئے کنی کتراتے ہیں کیونکہ علاقہ میں امن وامان کی صورت حال انتہائی خراب ہے۔ ڈاکٹر صاحب جان مری کا کہنا ہے کہ ہسپتال میں ایک بھی لیڈی ڈاکٹر نہیں صرف دو پیشہ ور دائیاں ہیں جو ڈیلیوری کیسوں کی نگرانی کرتی ہیں اس طرح لیبارٹری ٹیکنیشنز بھی کسی کوالیفائیڈ ڈاکٹر کے بغیر خود ہی ٹیسٹوں کی رپورٹیں تیار کرتے ہیں۔

کوہلو ٹاؤن میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے الگ الگ ہائی سکولز تو موجود ہیں مگر وہاں پر سٹاف نہیں ہے۔ ٹاؤن میں لڑکوں کا کالج تو موجود ہے مگر لڑکیوں کا کوئی کالج نہیں۔ مقامی حکومت کے زیر انتظام قصبے میں ایک گرائمر سکول تو کام کر رہا ہے مگر اس کا پرنسپل امن وامان کی خراب صورت حال کے سبب پریشان ہے۔ حال ہی میں کچھ کوالیفائیڈ ٹیچرز بھی پریشانی کے عالم میں نوکری چھوڑ کر وہاں سے جا چکے ہیں۔ پرنسپل کا کہنا ہے کہ انہوں نے متعدد بار اخبارات میں اساتذہ کی بھرتی کے لئے اشتہارات بھی دیئے مگر پنجاب سے تربیت یافتہ کوالیفائیڈ ٹیچرز اس لئے یہاں آنا پسند نہیں کرتے کہ علاقہ میں امن وامان نہیں ہے اور بم بلاسٹنگ ہو رہی ہے۔ قبائلی لوگ ابھی تو نواب مری کی بتائی کہانیاں ہی سن رہے ہیں اور خود کو تسلیاں دے رہے ہیں جبکہ علاقہ کے جاگیردار علاقہ کی دولت پر جھپٹ رہے ہیں۔ رب نواز غازی جو کہ مقامی جاگیردار ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہم نے کئی بار سڑکیں تعمیر کرنے کی کوشش کی مگر اس کی اجازت نہیں ملی بلکہ اب تو حکومت بگٹی ایریا سے گیس بھی سوئی سے دور لے جا رہی ہے پچھلے کئی عشروں سے مقامی لوگوں کو سوئی کی مد میں حکومت کی طرف سے کوئی فائدہ نہیں ہوا لہٰذا اب حکومت کو اپنی شرائط پر یہاں سے تیل، گیس کے ذخائر نکالنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس وقت مری قبائل تین خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ نواب خیر بخش مری کے بزرگوں کو برطانوی دور میں ان کی ماضی کی خدمات پر سر کا خطاب دیا گیا۔ دوسرے قبائل جن کو اس قسم کی مراعات اور فوائد حاصل ہوئے ان میں بگٹی، مزاری اور لغاری قبائل شامل ہیں۔ مری چیف کا ہیڈ کوارٹر کوہلو ضلع کے علاقہ کوہان میں واقع ہے۔ بجرانی قبائل کی اکثریت کوہلو Mawand اور ملحقہ علاقوں میں رہتی ہے جبکہ Lohranis نثا وادی میں رہتے ہیں۔ کاہان سب سے زیادہ پسماندہ علاقہ ہے جہاں کوئی سکول یا صحت کی سہولت

دستیاب نہیں ہے۔ کاہان کا علاقہ وہ ہے جہاں چند ماہ پہلے کوئٹہ کے صحافیوں کے ایک گروپ کو دہشت گردوں کے تربیتی کیمپوں میں دکھایا گیا تھا جیسا کہ 1970ء میں ہوا تھا اور مریوں نے پہاڑوں کے دامن میں پوزیشنیں سنبھال لی تھیں اور بلوچستان کے مسئلے پر نیشنل عوامی پارٹی اور حکومت کے مابین معاہدے پر احتجاج کیا تھا۔ شیر محمد بجرانی اور میر ہزار خان بجرانی اس وقت کمانڈرز تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سوشلزم کا بہت چرچا تھا اور دائیں بازو کے عناصر بلوچوں کی مسلح جدوجہد پر اثر انداز ہو رہے تھے مگر روس کے ٹوٹنے کے بعد ناگزیر وجوہات کی بناء پر افغانستان میں مجاہدین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ نے افغان حکومت کو مجبور کیا کہ وہ مری قبائل کو واپس آنے کی اجازت دیں۔

میر ہزار خان کا خیال ہے کہ بلوچستان کے مسئلے کا اصل حل یہ ہے کہ وہاں کے قبائل جو روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں ان کے لئے مخلصانہ کوششیں کی جائیں۔ بگٹیوں کا کہنا ہے کہ حکومت بلوچستان کے قبائل اور قبائلی نظام کا خاتمہ چاہتی ہے۔ بگٹی قبائل کا تنازعہ اس کی تازہ مثال ہے۔ بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ حکومت ان قبائل کو ایک دوسرے سے لڑوا کر انہیں مارنا چاہتی ہے۔ میر ہزار خان کا کہنا ہے کہ حکومت کو اس لمحہ مثبت کردار ادا کرنا چاہئے اور اگر وہ قبائلی عوام کا دل جیتنا چاہتی ہے تو اسے یہ سب کچھ کرنا ہوگا۔ میر ہزار خان نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں کہا کہ وہ مشروط طور پر حکومت کی حمایت کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ حکومت بھی اپنی طرف سے خیر سگالی کا مظاہرہ کرے۔ علاقہ میں سکول، سڑکیں بنائی جائیں صحت کے یونٹ قائم کئے جائیں علاقہ میں جو قدرتی وسائل اور معدنیات نکل رہی ہیں اس سے مقامی لوگوں کی معاشی حالت بہتر کی جائے قدرتی وسائل کی 5 فیصد رائلٹی ان مری قبائل کی فلاح پر خرچ کی جائے جو دوسرے علاقوں میں اپنی جائیدادیں اور کاروبار چھوڑ کر یہاں ہجرت کر کے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت کو فوری طور پر کم از کم ایک ہزار ملازمتوں کا بندوبست کرنا چاہئے تاکہ علاقے میں بیروزگاری کم کی جا سکے اس کے ساتھ ساتھ دیگر معاملات کو بھی سلجھانا چاہئے حکومت کو بلوچستان کے پسماندہ اور متاثرہ علاقوں میں آ کر ترقیاتی کاموں کی رفتار بڑھانی چاہئے۔ اس وقت حکومت اور بلوچ سرداروں کے مابین جو تنازعہ چل رہا ہے اس کے بنیادی محرکات اور عوامل تلاش کرنے چاہئیں۔ جب

حکومت اپنی طرف سے یہ تمام ضروری اقدامات کر لے گی تب اس امر کا فیصلہ ہوگا کہ حکومت بلوچستان میں جو ایکشن لے رہی ہے وہ غلط ہے یا درست ہے لیکن اگر یکطرفہ طور پر دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہے تو لامحالہ اس کا فائدہ تیسرا فریق ہی اٹھائے گا جو کوئی بیرونی طاقت بھی ہو سکتی ہے اور وہ اندرونی عناصر بھی جو پاکستان کا استحکام اور سلامتی نہیں چاہتے اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ بلوچستان کے مسئلے کو بہترین قومی مفاد میں ترجیحی بنیادوں پر حل کرنا چاہئے۔ اس مرحلے پر حکومت کی طرف سے ایک اچھا قدم اٹھایا گیا جب ایک پارلیمانی وفد چودھری شجاعت کی سربراہی میں ڈیرہ بگٹی پہنچا جس میں مشاہد حسین سید بھی شامل تھے اس وفد کی طرف سے نواب اکبر بگٹی کو کچھ ضمانتیں دی گئی اور کچھ وقت بھی لیا گیا اور یہ امید پیدا ہوئی کہ اب صورت حال شاید نارمل ہو جائے۔ چینی وزیراعظم کا دورہ پاکستان نزدیک آ رہا تھا اور یہ باور کیا جاتا تھا کہ وہ خود گوادر پورٹ کا افتتاح کریں گے لیکن ان حالات کو دیکھ کر یہ خدشات بھی سر اٹھانے لگے تھے کہ شاید سیکورٹی کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر انہیں گوادر نہ بھیجا جائے (بعد میں بدقسمتی سے یہ خدشات صحیح ثابت ہوئے)۔

4 تا 10 اپریل 2005ء کے ہفت روزہ اخبار جہاں میں ڈاکٹر چشتی مجاہد نے اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا:

"بلوچستان کی موجودہ نازک صورت نے پورے ملک کی سیاست کو ہائی جیک کر لیا ہے اور اس وقت ملکی سیاست بلوچستان کے معاملات کے گرد گھوم رہی ہے۔ پورے ملک کے سیاسی، عوامی و حکومتی حلقوں کی نظریں بلوچستان کی جانب لگی ہوئی ہیں کہ جہاں ایک ایشو ابھی ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا ایشو کھڑا ہو جاتا ہے۔ ڈیرہ بگٹی میں ابھی آگ و خون کے کھیل کے بعد معاملات سلجھانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں کہ ایسے میں عوامی جمہوریہ چین کے وزیراعظم وین جیاباؤ کے دورہ پاکستان سے صرف گیارہ دن قبل گوادر میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ کوسٹ گارڈز کے رویہ کے خلاف مشتعل مظاہرین نے کئی دکانوں کو نذر آتش کر دیا، سڑکوں پر ٹائر جلا کر رکاوٹیں کھڑی کیں اور شہر میں مکمل شٹر ڈاؤن رہا چینی وزیراعظم کو اپنے دورہ پاکستان کے دوران گوادر ڈیپ سی پورٹ کا افتتاح بھی کرنا تھا مگر گوادر کی صورت حال

اور قوم پرستوں کے رویے کے بعد اب نظر یہی آ رہا ہے کہ شاید چینی وزیر اعظم گوادر نہ جائیں۔

ڈیرہ بگٹی میں آگ و خون کی بارشیں اور 80-70 قیمتی جانوں کے ضائع ہونے کے بعد علاقے میں کشیدگی ختم ہوگئی ہے۔ حکومت اور نواب اکبر بگٹی کے مابین مذاکرات کا دوسرا بلکہ تیسرا راؤنڈ کامیاب رہا ہے، جس میں صرف اور صرف سوئی و ڈیرہ بگٹی قبیلے کے معاملات پر غور کیا گیا جبکہ بلوچستان کے دوسرے ایشوز پر بات چیت نہیں ہوئی لہٰذا بلوچستان کے مسئلہ پر پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار ہے۔ ڈیرہ بگٹی میں سیکورٹی فورسز اور بگٹی قبائل کے درمیان 17 مارچ کو ہونے والے مسلح تصادم کے بعد وہاں کا دورہ کرنے والی پارلیمانی وفد جس کی قیادت سینیٹر محمد علی درانی کر رہے تھے اور اس میں اپوزیشن اور حکومتی اراکین اسمبلی شامل تھے وہاں سے ناکام اور ناراض واپس لوٹا بلکہ پارلیمانی کمیٹی کے اراکین تو وفاقی دارالحکومت میں ہونے والے اجلاس میں بھی پارلیمانی کمیٹی کے سربراہ چودھری شجاعت سے ناراض ہو گئے کیونکہ انہوں نے اپنی اور نواب اکبر بگٹی کے مابین ہونے والی ملاقات میں ہونے والے سمجھوتے کی تفصیلات بتانے سے انکار کر دیا تھا۔

پارلیمانی کمیٹی کے دورہ ڈیرہ بگٹی کے دوران نواب اکبر بگٹی نے کمیٹی میں شامل حکومتی اراکین سے بات چیت ہی نہیں کی اور انہوں نے تصفیہ کرانے کی تمام کوششوں کو رد کر دیا۔ 50 منٹ کی ملاقات میں نواب اکبر بگٹی نے حکومتی اراکین کے سوالات کے جوابات بھی نہیں دیئے تاہم انہوں نے اپوزیشن اراکین سے بات چیت کی اور ان کے سوالات کے جوابات دیئے۔ اس موقع پر نواب اکبر بگٹی کا کہنا تھا کہ وہ نہ تو حکومت کو کوئی پیغام دیں گے اور نہ ہی کوئی مطالبہ کریں گے کیونکہ پیغام یا مطالبہ ہمیشہ کمزور لوگ کرتے ہیں اور ہم کمزور نہیں ہیں۔ پارلیمانی کمیٹی کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ کمیٹی ابھی تک کچھ کرنے میں ناکام رہی ہے اور کوئی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی ہے، تاہم چودھری شجاعت حسین اور مشاہد حسین نیک نیتی اور خلوص دل سے کام کر رہے ہیں لیکن وہ با اختیار نہیں جب تک با اختیار لوگ اس حوالے سے بات چیت نہیں کریں گے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس ملاقات کے دوران نواب اکبر بگٹی نے یہ اشارہ ضرور دے دیا تھا کہ وہ با اختیار لوگوں سے بات چیت

کرنے کو تیار ہیں اور اس سلسلے میں انہیں چودھری شجاعت اور مشاہد حسین سید پر اعتماد بھی ہے چنانچہ پارلیمانی وفد کی وفاقی دارالحکومت واپسی کے بعد چودھری شجاعت حسین نے ٹیلی فون پر نواب اکبر بگٹی سے رابطہ قائم کیا اور ان سے کہا کہ وہ مکمل مینڈیٹ اور اختیارات کے ساتھ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے نواب اکبر بگٹی کو یقین دہانی کرائی کہ بلوچستان میں کوئی فوجی آپریشن نہیں ہوگا۔ اس کے جواب میں نواب اکبر بگٹی کا کہنا تھا کہ ہم محاذ آرائی نہیں چاہتے ہیں لیکن صرف باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں میں با مقصد مذاکرات کرنے کو تیار ہوں۔

چنانچہ 24 مارچ 2005ء کو مسلم لیگ کے صدر چودھری شجاعت حسین اور مشاہد حسین ڈیرہ بگٹی پہنچے جہاں ان کے اور نواب اکبر بگٹی کے مابین چار گھنٹے طویل مذاکرات ہوئے جس میں معاملات افہام و تفہیم سے حل کرنے پر اتفاق ہوا۔ ملاقات کے دوران نواب اکبر بگٹی نے وفاقی حکومت کے بارے میں اپنے گلے شکوے اپنے خلاف الیکٹرونک میڈیا سے کئے جانے والے پروپیگنڈہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ سینیٹر مشاہد حسین اور چودھری شجاعت حسین کو وہ اپنا ہمدرد سمجھتے ہیں۔

باخبر ذرائع کا کہنا تھا کہ اس ملاقات میں مسلم لیگی قائدین نے نواب اکبر بگٹی کو وفاقی حکومت کی جانب سے ایک پیکج پیش کیا جس کے مطابق سوئی میں نہ فوجی چھاؤنی قائم کی جائے گی اور نہ ہی گیس کی تنصیبات کی حفاظت کی ذمہ داری فوج سے لے کر دوبارہ ایف سی کے سپرد کی جائے گی البتہ وہ صدر جنرل پرویز مشرف سے ملاقات میں اس مسئلے کو طے کر سکتے ہیں۔ ملاقات میں جن نکات میں اتفاق پایا گیا ان میں فرنٹیئر کور اور بگٹی قبائل 17 مارچ سے پہلے کی پوزیشن پر واپس جائیں گے۔ ڈیرہ بگٹی اور سوئی ڈیرہ بگٹی شاہراہ سے چوکیاں اور مورچے ختم کر دیئے جائیں گے۔ علاقے میں پرائیویٹ آرمی کے تاثر کو ختم کیا جائے گا۔ سوئی ڈیرہ بگٹی شاہراہ کو عام ٹریفک کے لئے کھول دیا جائے گا۔ علاقے میں نواب اکبر بگٹی کی تجویز پر تعلیمی و طبی سہولتوں کی فراہمی، سڑکوں کی تعمیر اور دوسرے فلاحی پروگراموں کے لئے فنڈز دیئے جائیں گے۔ تمام ترقیاتی منصوبوں میں مقامی افراد کو ترجیحی بنیادوں پر ملازمتیں دی جائیں گی۔ کسی بھی مسئلے پر تنازع پیدا ہونے کی صورت میں کوئی بھی فوری

کارروائی کرنے سے قبل مسلم لیگی قیادت حکومت سے یہ معاملہ افہام وتفہیم سے حل کرنے کے لئے کہے گی۔ حکومت کی جانب سے نواب اکبر بگٹی کے مخالف بگٹی قبائل کی سرپرستی اور انہیں فنڈز کی فراہمی کا سلسلہ بند کیا جائے گا اور نواب اکبر بگٹی کے خلاف الیکٹرونک میڈیا پر کردار کشی کا سلسلہ بند کیا جائے گا۔

چودھری شجاعت، نواب اکبر بگٹی اور مشاہد حسین تینوں نے ملاقات میں طے پانے والے سمجھوتے کی سفارشات کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس سلسلے میں تین دن تک کسی کو کچھ نہ بتانے کی قسم اٹھائی ہے ڈیرہ بگٹی میں ملاقات کے بعد چودھری شجاعت حسین اور مشاہد حسین سید نے وفاقی دارالحکومت میں صدر جنرل پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز سے ملاقات کی اور اس سلسلے میں اہم فیصلوں کی منظوری لی اور ان کا کہنا تھا کہ ڈیڈ لاک ختم ہو گیا ہے۔ ملاقات کے بعد صدر جنرل پرویز مشرف نے ایوان صدر میں مسلم لیگ اور اتحادی جماعتوں کے اراکین پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم بلوچستان کے مسئلے کا فوری حل چاہتے ہیں اس سلسلے میں چودھری شجاعت کی کوششیں قابل تعریف ہیں، انہیں حکومت کا پورا مینڈیٹ حاصل ہے البتہ کسی کو قانون ہاتھ میں لینے اور قومی تنصیبات کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں دیں گے اور نہ ہی حکومت سرداروں سے بلیک میل ہو گی۔ بلوچستان کا مسئلہ سیاسی طور پر حل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ کسی کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت دی جائے اور بلوچستان میں ترقیاتی عمل جاری رہے گا۔ بعدازاں الیکٹرونک میڈیا کے نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے صدر جنرل پرویز مشرف کا رویہ اور بھی سخت تھا، ان کا کہنا تھا کہ بلوچستان میں 78 میں سے صرف 3 سردار گڑبڑ کر رہے ہیں جبکہ باقی سردار حکومت کے حامی ہیں۔ صورت حال خراب کرنے والوں کو باہر سے امداد مل رہی ہے۔ بلوچستان کے مسئلے کی اصل جڑیں سردار بگٹی، مینگل اور مری ہیں جو سردار سے زیادہ وار لارڈ ہیں۔

حکومتی حلقوں کی جانب سے نہایت ہی نرم اور نہایت ہی سخت رویوں کے درمیان چودھری شجاعت حسین اور مشاہد حسین سید مذاکرات کے آخری راؤنڈ کے لئے جب دوبارہ ڈیرہ بگٹی پہنچے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ملاقات سے قبل تمام معاملات طے پا گئے

ہیں کیونکہ ڈیرہ بگٹی کے بازار جو 17 مارچ سے بند تھے اس دن وہاں کی رونقیں بحال ہو چکی تھیں اس ملاقات میں حکومت کی نمائندگی چودھری شجاعت حسین اور مشاہد حسین نے کی جبکہ دوسری جانب سے مذاکرات میں نواب اکبر بگٹی، سردار علی شیر مزاری، براہمدغ بگٹی اور تابش بگٹی نے حصہ لیا۔ تین گھنٹے سے زیادہ دیر تک جاری رہنے والی اس ملاقات میں سوئی ڈیرہ بگٹی میں امن وامان کی بحالی اور فورسز کی تعیناتی سمیت دیگر مسائل کے حل کے لئے تین رکنی مانیٹرنگ کمیٹی تشکیل دینے کا فیصلہ کیا گیا جس میں دونوں طرف کا ایک ایک نمائندہ اور ایک غیر جانبدار نمائندہ ہو گا جس کے لئے نواب اکبر بگٹی نے مشاہد حسین کا نام تجویز کیا بہرحال مانیٹرنگ کمیٹی کے قیام سے یہ بات واضح ہو گئی کہ سب معاملات طے پا گئے ہیں۔ اگرچہ سمجھوتے کے بارے میں مکمل خاموشی طاری تھی مگر یہ سمجھوتہ وہی ہے کہ جس کا تذکرہ اس سے قبل کیا جا چکا ہے۔

ڈیرہ بگٹی میں ہونے والی لڑائی کا پس منظر اور پیش منظر اب کھل کر سامنے آ چکا ہے ہمارے ہاں بدقسمتی سے دو ہی طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو کسی بھی مسئلے کے ایک پہلو کو اپنی عینک سے دیکھتے ہیں ایک رائے قائم کرتے ہیں اور اس پر جم جاتے ہیں خواہ ان کی رائے حقائق سے مطابقت رکھے یا نہ رکھے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو مخالف رائے میں اتنی ہی شدت اختیار کر چکا ہے گویا ہم دو انتہاؤں پر رہنے والے لوگ ہیں۔ بلوچستان کے حوالے سے بھی ہماری رائے کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کچھ لوگ اسے ''سرداروں کی بلیک میلنگ اور غیر ملکی مداخلت سمجھتے ہیں اور کچھ کا خیال ہے کہ حکومت جان بوجھ کر یہاں کے حالات بگاڑے رکھتی ہے تاکہ مقامی سیاسی جماعتوں کو استحکام حاصل نہ ہو یہ لوگ حکومت کے مظالم بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں لیکن ایک تیسرا اور قلیل تعداد نقطہ نظر بھی ہے جو حقائق کے بہت نزدیک سمجھا جاتا ہے۔

جن دنوں نواب اکبر بگٹی اور حکومت کے درمیان معرکہ آرائی کی پریشان کن خبریں آ رہی تھیں ان دنوں میں ائر مارشل (ر) ایاز احمد خان نے بلوچستان کے حوالے سے ایک مضمون لکھا جس کا مطالعہ سوچ سے کئی نئے دریچے در کرتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

''نواب بگٹی نے ڈیرہ بگٹی میں سیکورٹی فورس کے 30 سپاہیوں اور افسروں کے

ساتھ سرکاری اہلکاروں اور ان کی بیویوں، بچوں کو ضلع میں محصور کر رکھا ہے۔ نواب بگٹی کے غصیلے طیش آمیز اور متضاد بیانات سے بلوچستان کی صورت حال الجھن اور ممکنہ تصادم کا پیش خیمہ بنتی جا رہی ہے۔ بگٹی قبائلی لشکر اور فرنٹیئر کور 17 مارچ صبح آٹھ بجے بگٹی ملیشیا کے 200 جنگجو نے گھات لگا کر ایف سی کے سات ٹرکوں کے کارواں پر حملہ کر دیا اور 8 سپاہیوں کو ہلاک اور متعدد کو زخمی کیا۔ ایف سی نے جوابی کارروائی کی جو بھرپور لڑائی کی شکل اختیار کر گئی۔ ایک ہزار مزید بگٹی ملیشیا کی کمک سے بگٹی جنگجوؤں کا پلہ بھاری رہا۔ ایف سی کے 300 سپاہی، آفیسر بال بچوں سمیت بگٹیوں کی حراست اور قلعہ میں محصور ہیں اور ان کی جان کو شدید خطرہ ہے۔ ڈی آئی جی ایف سی کے بقول بگٹی ملیشیا نے 150 راکٹ اور ہزاروں گولیاں چلائیں جبکہ اکبر بگٹی کے بقول ایف سی نے مارٹر گولے برسائے۔ ایک بگٹی کے مکان پر گرا 62 بگٹی ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے۔ بگٹی نے تین ہزار سرکاری اہلکاروں کو ڈرا دھمکا کر ڈیرہ بگٹی سے نقل مکانی پر مجبور کر کے شہر بدر کر دیا ہے۔

22 مارچ کو پارلیمانی کمیٹی کے 15 ارکان خصوصی طیارے سے سردار اکبر بگٹی کو مل کر زمینی حقائق اور ممکنہ حل کی بات کرنے گئے تھے اس پارلیمانی ہائی پاور وفد میں حکومت کی طرف سے مہناز رفیع، نثار میمن، ڈاکٹر محمد علی بروہی، وفاقی وزیر طاہر اقبال اور محمد علی درانی تھے جبکہ اپوزیشن سے اسد اللہ بھٹو، تہمینہ دولتانہ، مولانا شجاع الملک، حافظ حسین احمد، خواجہ سعد رفیق، رؤف مینگل، شیری رحمان، نوید قمر اور اقبال میمن تھے۔ سوئی سے پارلیمانی کمیٹی کو گاڑیاں خود چلانے پر مجبور کیا گیا۔ راستے میں انہیں ڈرانے کے لئے مسلح بگٹی جنگجوؤں کو جگہ جگہ کھڑا کر دیا گیا اور رکاوٹیں ہٹانے پر مجبور کیا گیا۔

میٹنگ میں سردار بگٹی کا رویہ سخت گیر تھا۔ یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اکبر بگٹی نے حکومتی نمائندوں سے بات چیت کرنے سے انکار کر دیا تاہم اپوزیشن کے ارکان سے بات چیت کی اور ان کے سوالات کے جواب دیئے بگٹی نے کہا کہ ہم کمزور نہیں ہیں۔ بگٹی لشکر کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ ہے اور ان کے جاں نثار اس کے لئے جان قربان کرنے کو تیار ہیں مگر اکبر بگٹی کا خودکش رویہ عقل اور دانش مندی کے متضاد ہے۔ بگٹی کا غصہ اور غرور غیر دانشمندانہ ہے۔ بگٹی پاک فوج کو دشمن سمجھتا ہے۔

اکبر بگٹی نے کہا ''17 مارچ کے اصل ملزمان کی گرفتاری کے بعد ہی مذاکرات ہو سکتے ہیں۔ میں حکومت سے کوئی مطالبہ اور مذاکرہ نہیں کروں گا اور کوئی درخواست نہیں دوں گا یہ کمزور لوگوں کا کام ہے'' حقیقت تو یہ ہے کہ 17 مارچ کا اصل ملزم اکبر بگٹی ہے جس کی شہ اور حکم پر بگٹی ملیشیا نے پرامن ایف سی کارواں پر حملہ کر کے آٹھ معصوم سپاہیوں کو ہلاک اور بیشتر کو زخمی کر دیا۔ ایف سی کی جوابی فائرنگ ایک دفاعی عمل تھا ہلاک شدگان کے لئے فاتحہ خوانی اور دعا پڑھنے پر بگٹی نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ سرکاری فاتحہ خوانی نہیں کر سکتا۔ بگٹی نے پارلیمانی کمیٹی پر تنقید کی اور کہا ''پارلیمانی کمیٹی بالکل ناکام ہے۔ چودھری شجاعت حسین اور مشاہد حسین نیک نیت مگر بے اختیار ہیں یہاں وسائل پر وفاق کا قبضہ ہے اور ہمارا حق چھینا جا رہا ہے حالات ایسے تھے کہ پارلیمانی وفد نے اکبر بگٹی کے سامنے کوئی تجویز پیش نہیں کی۔ دورہ ناکامیاب رہا۔

بلوچستان کے موجودہ بحران کے سیاسی حل کی تلاش ایک خواب بنتا جا رہا ہے۔ بلوچستان کے حالات ابتر ہو چکے ہیں مگر حکومت شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دبائے بیٹھی ہے۔ بگٹی اور بلوچستان نیشنل آرمی کی سرکشی اور حملوں نے چودھری شجاعت حسین صاحب کی پارلیمنٹری کمیٹی کی سست کارروائی بے معنی بنا دی ہے۔ کمیٹی کی سفارشات کا عمل کچھوے کی رفتار سے چل رہا ہے جبکہ خون خرابہ تیز ہو رہا ہے۔ نواب اکبر بگٹی باغی قبائل اور بلوچستان نیشنل آرمی کی سر عام حمایت اور مدد کر رہے ہیں۔ 11 جنوری کو سوئی گیس پلانٹ پر بگٹی شر پسندوں نے 600 کے لگ بھگ راکٹ اور مارٹر گولے پھینکے۔ کیا اتنی بڑی تعداد میں راکٹ لانچر نواب اکبر بگٹی کے اسلحہ خانے سے سپلائی کئے گئے تھے؟ راکٹ اور میزائلوں کے ساتھ ساتھ پی پی ایل کی تنصیبات پر 1400 گولیاں شیل برسائے گئے یہ کہاں سے آئیں؟ بگٹی لشکر اتنے بڑے پیمانے پر سوئی گیس پلانٹ پر اکبر بگٹی کی اجازت اور حکم کے بغیر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ بگٹی حملہ آوروں کی قیادت نواب بگٹی کے بیٹے اور پوتے نے کی تھی۔ حکومت کی طرف سے ایف آئی آر تو درج ہوئی مگر کچھ فوجی نفری کو سوئی میں تعینات کرنے کے علاوہ باغیوں کے خلاف حکومت نے کوئی موثر کارروائی نہیں کی۔ صوبائی اور فیڈرل حکومت مخالفین کے دباؤ میں رہی جو ممکنہ فوجی آپریشن کا پراپیگنڈا کر کے عوام میں سراسیمگی

اور نفرت پھیلانے میں کامیاب نظر آرہے تھے۔ حکومت کی طرف سے ایک برس گزرنے کے باوجود بلوچستان کے لئے کسی پلان کا اعلان نہیں ہوا۔

سردار اکبر بگٹی کے بقول قبائل ڈاکٹر شازیہ کی بے حرمتی پر مشتعل ہو گئے تھے

نواب اکبر بگٹی نے پریس کو کہا کہ بگٹی قبائل کا ردعمل جائز اور واجب تھا۔ بگٹی بلوچوں کا غصہ اور غضب ایک خاتون پر جنسی حملہ پر تھا جو ان کی برداشت اور غیرت کو قابل قبول نہیں تھا۔ بگٹی اور بلوچ روایات، کلچر، معاشرتی اور سماجی دستور عورت پر حملے کو قبائل کی عزت و وقار اور غیرت پر حملہ تصور کرتے ہیں۔ ''ہماری تاریخ اس کی گواہ ہے کہ عورت اور مویشیوں کی حفاظت کے لئے ہم اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔'' نواب اکبر خان بگٹی کا بیان بلوچ اور بگٹی قبائل کی غیرت اور اعلیٰ درجے کے کردار اور سیرت کی عکاسی کرتا ہے۔

اخلاقی لحاظ سے بگٹی قبائل کے غم وغصہ پر تنقید ممکن نہیں، مگر پی پی ایل پلانٹ اور گیس پائپوں پر اندھادھند گولہ باری اور 1400 گولیاں برسا کر متعدد معصوم لوگوں کو ہلاک کرنا، قومی اثاثوں کو تباہ و برباد کرنا اور ملک اور قوم کو اربوں کا نقصان پہنچانا نہ صرف سراسر مجرمانہ حرکت ہے بلکہ ملک اور قوم سے ظلم اور غداری کے مترادف ہے اس سنگین واردات کی ذمہ داری بلوچستان لبریشن آرمی نے فوراً قبول کر لی تھی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بی ایل اے کو اکبر بگٹی کی حمایت حاصل ہے۔ اکبر بگٹی کی مدد اور حمایت کے بغیر وہ اتنے بڑے پیمانے پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔

سوئی پر بگٹی اور بی ایل اے کی بمباری کے بعد صوبہ بھر میں سرکشی کی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اکبر بگٹی نے اپنے لشکر کی جنگی مہارت اور جدید ہتھیاروں میں مہارت کے بارے میں متعدد بیانات دیئے ہیں ان کا یہاں بیان کہ وہ جنگ کے لئے تیار ہیں اور فوج کے ساتھ جنگ میں بگٹی اپنی جنگی قوت اور مہارت کا ثبوت دیں گے۔ ''جنگ میں ہمارا نقصان ہوگا مگر فوج کا نقصان بھی ہوگا، ہماری ہلاکتیں زیادہ ہوں گی مگر فوج کی بھی کم نہیں ہوں گی، فوج کے پاس بہتر ہتھیار اور تربیت ہے مگر ہمارے پاس بھی ہتھیار ہیں'' یہ الٹی میٹم ملک اور فوج کے خلاف بغاوت کا کھلا اعلان ہے۔ بگٹی لشکر اور بی ایل اے کے پاس بھاری مقدار میں جدید اسلحہ ہے اور اس اسلحے کو استعمال کرنے کی تربیت اور مہارت بھی ہے۔ گورنر

بلوچستان اویس غنی کے بقول پچھلے چھ ماہ میں 50 کروڑ روپے کا اسلحہ افغانستان سے بلوچستان کے اندر سمگل ہوا ہے اتنے بڑے پیمانے پر جدید اور خطرناک اسلحہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سمگل کرکے بغاوت و انقلاب برپا کرنے کے منصوبے پر دشمنان قوم عمل پیرا ہیں حکومت بے حس ہے۔

بلوچستان لبریشن آرمی اور دیگر باغی تنظیموں کے ٹریننگ کیمپوں کے بارے میں صوبائی حکومت اور اخبارات کئی بار انکشاف کر چکے ہیں مگر صوبائی حکومت نے باغیوں کے فوجی ٹریننگ کیمپوں کو بند کرنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ گورنر اویس غنی کے بقول سوئی اور دیگر اہم تنصیبات پر 1575 حملے ہو چکے ہیں۔ ان حملوں میں دشمن نے ملٹی بیرل راکٹ بھی چلائے ہیں جو 25 کلومیٹر تک مار کر سکتے ہیں۔ روس اور افغانستان سے لئے ہوئے ملٹی بیرل راکٹ سسٹم کا توڑ نہ فرنٹیئر کور کے پاس ہے اور نہ بلوچستان کانسٹیبلری کے پاس۔ حکومت بلوچستان واضح کرے کہ اتنے بڑے پیمانے پر اسلحہ کی سمگلنگ روکنے کے لئے کیا اقدام کئے گئے۔ بارسوخ بلوچ سردار اور بی ایل اے پچھلے کئی برسوں سے افغانستان اور دوسرے ممالک سے بڑے پیمانے پر صوبے میں اسلحہ سمگل کرتے رہے ہیں اور صوبائی اور فیڈرل حکومت تماشائی بنی دیکھ رہی تھی۔ آج یہ ملک دشمن عناصر اتنا اسلحہ اور ہتھیار اکٹھا کر چکے ہیں کہ صوبائی اور فیڈرل حکومت، افواج پاکستان اور فرنٹیئر کور کو للکار رہے ہیں۔ ہر روز دھماکے کر کے عوام کو ہلاک کرتے ہیں، حساس تنصیبات کو اڑا دیتے ہیں، ریلوے گاڑیوں اور پٹڑیوں کو دھماکوں سے اڑاتے ہیں۔ 17 مارچ 2005 کو 200 کے قریب بگٹی جنگجوؤں نے بھنور رائفلو کے ساتھ ٹرکوں پر مشتمل قافلے پر ڈیرہ بگٹی سے چار میل کے فاصلے پر راکٹوں اور کلاشنکوف رائفلوں سے حملہ کر دیا۔ 40 ایف سی کے سپاہیوں میں سے آٹھ کو ہلاک کر ڈالا۔ وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ ایف سی کی نفری پر بگٹی دہشت گردوں نے 150 راکٹ داغے، جوابی کارروائی میں دونوں اطراف سے کمک پہنچ گئی۔ بھنور رائفلو اور ایف سی کا دعویٰ ہے کہ ایک ہزار کے قریب دہشت گردوں نے فرنٹیئر کور کو گھیرے میں لے لیا۔ فرنٹیئر کور کے کمانڈر کرنل فرقان بھی گھیرے میں آ گئے، جوابی کارروائی کے بعد صورت حال نے بھرپور لڑائی کی شکل اختیار کر لی۔ میجر جنرل شجاعت ظہیر ڈار نے پریس کانفرنس کو

بتایا کہ پہلے روز فریقین میں فائرنگ 10 گھنٹے جاری رہی بگٹیوں نے راکٹ مارٹر شیلز اور میزائل استعمال کئے، دوسرے روز بھی جھڑپیں جاری رہیں پریس اطلاع کے مطابق ایف سی کے 8 سپاہی ہلاک ہوگئے جبکہ 29 بگٹی مارے گئے ہمایوں مری کے بقول 19 مارچ کی شام تک 60 افراد ہلاک اور 400 زخمی ہو چکے تھے۔ نواب بگٹی نے سیٹلائٹ فون پر کہا کہ لڑائی میں 56 افراد جاں بحق اور 150 زخمی ہوئے ہیں۔ ایف سی کے مبصر نے کہا کہ بگٹی راکٹ مندر میں جالگا اور دو ہندو ہلاک ہوئے ایف سی کے پاس بھاری ہتھیار نہیں تھے جبکہ نواب بگٹی نے کہا کہ مارٹر گولے ان کے گھر میں گرے اور وہ ٹارگٹ تھے۔

یہ کہنا کہ ایف سی نے بلاوجہ فائر کھول دیا لغو بیانی اور جھوٹ نظر آتا ہے، بگٹی جنگجو ایف سی کے قافلے پر اچانک شب خون ماریں، یہ ایک دہشت گردی کا عمل ہے اور اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

فوج اور فرنٹیئر کور کے خلاف الزام تراشی، لغو بیانی اور پراپیگنڈا بلوچستان لبریشن آرمی، بارسوخ سرداروں اور بغض رکھنے والے ملک دشمن عناصر کا مشغلہ بن گیا ہے۔

بلوچستان کانسٹیبلری کے خلاف بلوچ سیاستدانوں کا پراپیگنڈا اور دروغ بیانی، کذب اور نفرت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ مذموم سیاسی مقاصد کے لئے پراپیگنڈا ہے۔ ایف سی یعنی بلوچستان کانسٹیبلری بہترین تربیت یافتہ اور پیشہ ور سیکورٹی فورسز ہے پاکستان بھر میں ایف سی اندرونی سیکورٹی کے فریضہ پر پچھلے پچاس سالوں سے بہترین خدمت انجام دے رہی ہے اس کے سپاہی جے سی او اور آفیسر صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان کے پختون ہیں۔ بلوچستان کے پختون ہونے کے حوالے سے انہیں بلوچستان سے وہی محبت ہے جو ایک بلوچ کو ہے صوبائی حکومت اور حکومت پاکستان کا قصور یہ ہے کہ ایف سی میں بلوچ نمائندگی کم ہے ریکروٹنگ سنٹرز کی شکایت ہے کہ بلوچ نوجوان بھرتی کے لئے نہیں آتے کچھ ہفتے پہلے فیڈرل حکومت کی طرف سے اعلان ہوا تھا کہ سولہ ہزار بلوچ نوجوانوں کو ایف سی میں فوری بھرتی کیا جائے گا۔ بلوچ نوجوانوں کی ایف سی میں بھرتی جلد از جلد ہونی چاہئے تاکہ بلوچ عوام کی شکایات کا کہ ایف سی اور فوج میں بلوچوں کی نمائندگی نہیں ہے ازالہ کیا جاسکے۔

بلوچ سرداروں اور سیاست دانوں کو جھوٹ اور لغو بیانی سے پرہیز کرنا چاہئے۔

پارلیمنٹ اور سینٹ میں بلوچ نمائندے بات بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں۔ سینیٹر ثناء اللہ بلوچ نے مختلف سیمیناروں میں اعداد وشمار غلط بتائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بلوچستان میں چھیالیس چھاؤنیاں ہیں اور مزید چھاؤنیوں کی ضرورت نہیں ہے جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کے نام بتائیں تو وہ کوئٹہ اور خضدار کے سوا کسی اور چھاؤنی کا انکشاف نہ کر سکے۔ بلوچستان میں سوئی کوہلو اور گوادر میں فوجی اور ایف سی کی چھاؤنیاں جلد از جلد بننی چاہیں تاکہ لاقانونیت اور دہشت گردی پر قابو پایا جاسکے دہشت گردی کا طوفان اب سر کے اوپر سے گزر رہا ہے۔ سیاسی افہام وتفہیم اور سیاسی عمل اپنی جگہ درست ہے مگر جب سیاست بندوق کی نالی سے چلائی جائے، فوج اور سیکورٹی فورسز کو للکارا جائے، صوبائیت کو ہوا دی جائے فوجی قافلوں پر حملے کئے جائیں حساس تنصیبات کو بم دھماکوں سے اڑا دیا جائے، تو اس شدت پسند ماحول کو طبعی حالت میں لانا اور مجرموں کو قانون کے کٹہرے میں کھڑا کرنا نہایت ضروری ہے۔ لاقانونیت میں مذاکرات بے اثر ہوں گے۔

نواب بگٹی کے الٹی میٹم کو نظر انداز کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ ڈی سی او ڈیرہ بگٹی نے بیان دیا ہے کہ نواب بگٹی نے ڈیرہ بگٹی میں کام کرنے والے تمام سرکاری ملازمین کو ڈیرہ بگٹی سے فوراً نکل جانے کا حکم دیا اور خبردار کیا ہے کہ اگر فوری طور پر سرکاری ملازمین ڈیرہ بگٹی سے نہ نکلے تو وہ کسی بھی صورت حال کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت ضلع میں تین ہزار سے زائد سرکاری ملازمین تعینات ہیں اس دھمکی کے بعد سرکاری ملازمین نے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ڈیرہ بگٹی سے نقل مکانی شروع کر دی ہے۔ فرنٹیئر کور کے دستے سرکاری ملازمین کو نکالنے کے لئے سیکورٹی فراہم کر رہے ہیں اور ان کی گاڑیوں میں انہیں محفوظ جگہوں پر لے جایا جارہا ہے ڈی سی او عبدالصمد لاسی نے سیٹلائٹ فون پر بتایا کہ بگٹی قبائلیوں نے بھاری اسلحہ سمیت پہاڑوں پر مورچے سنبھال لئے ہیں جہاں سے وہ سڑکوں پر سے گزرنے والی بسوں اور گاڑیوں کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ ڈیرہ بگٹی اور نواحی علاقوں میں بگٹی شرپسندوں نے مزید 9 چوکیاں قائم کر لی ہیں دوسری طرف کرنل فرقان کمانڈنٹ ٹھمور رائفلز نے بتایا کہ ایف سی نے دفاع کے لئے تمام انتظامات مکمل کر لئے ہیں اور کسی بھی ناخوشگوار صورت حال سے نمٹنے کے لئے حکمت عملی تیار کر لی ہے مگر اب ڈیرہ بگٹی کا ضلع

حالت جنگ میں ہے دیگر اطلاعات کے مطابق شر پسند، دہشت گرد اور بی ایل کے جنگجو نواب بگٹی کی مدد کے لئے ڈیرہ بگٹی پہنچ رہے ہیں یہ خبر تشویشناک ہے۔

21 مارچ 2005ء کی اطلاع کے مطابق فوج نے ڈیرہ بگٹی اور سوئی کا کنٹرول سنبھال لیا ہے، ان چوکیوں پر فوجی تعینات کر دیئے گئے ہیں۔ ایف سی اور فوجی سڑکوں پر گشت کر رہے ہیں، رینجرز، ایف سی اور پولیس بھی ہے دوسری طرف پورے بلوچستان سے باغی قبائل اور گوریلے بھی ڈیرہ بگٹی پہنچ گئے ہیں۔ ایف سی کمپاؤنڈ میں ڈی سی او کمانڈنٹ ایف سی اور 300 جوان محصور ہیں، ہیلی کاپٹرز سے اسلحہ کی فراہمی جاری ہے۔ گورنر بلوچستان نے نواب اکبر بگٹی کو کہا ہے کہ ناکہ بندی ختم کریں، اس وقت ڈیرہ بگٹی شہر اور ضلع پر سردار بگٹی کا قبضہ ہے۔ چودھری شجاعت حسین نے بگٹی کے ساتھ ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا ہے مگر بگٹی سردار نے اکڑ کر جواب دیا کہ قبیلے کے مسائل دیکھ کر بات کروں گا۔ اکبر بگٹی کی منفی سوچ حیران کن ہے۔ رؤف مینگل اور اچکزئی نے اپنے بیانات میں کہا ہے کہ سیاسی کارکن رہا کیے جائیں۔ مار جھاڑ میں مذاکرات ممکن نہیں۔ گورنر کا بیان کہ حکومت اکبر بگٹی سے منفی سوچ کی توقع نہیں رکھتی معنی خیز ہے۔ گورنر اویس غنی نے کہا کہ اکبر بگٹی کو صورت حال کا مکمل علم نہیں ہے چونکہ دونوں اطراف لڑائی یا جنگ کے لئے صف آرائی ہو رہی ہے، حالات کو صبر و تحمل کی طرف لے جانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ موجودہ خطرناک حالات میں چودھری شجاعت حسین کی مذاکرات کی کاوش قابل تعریف ہے مگر پارلیمنٹ کی کمیٹی ؛ ب وقت ضائع کر چکی ہے۔ مذاکرات پر بلوچ رہنماؤں کی مشروط آمادگی ایک مثبت کامیابی ہے، بلوچ اور حکومت مخالف سیاستدانوں کو آگ سے نہیں کھیلنا چاہئے۔ حکومت اور پاکستانی فوج کی نیت اور آپریشن نہ کرنے کے وعدے کو غلط اور جھوٹے فتوے دے کر عوام کو نہ ورغلائیں ممبران قومی اسمبلی یعنی بلوچستان اور حزب اختلاف کے سینٹر صاحبان ذمہ داری سے بیانات دیں اور حکومت کے خلاف بدنیتی کے بیانات سے گریز کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کے سرداروں، سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کے مطالبات کی فہرست بہت لمبی ہے اگر بلوچستان کے ساتھ ماضی میں انصاف نہیں ہوا تو اس کی تمام ذمہ داری موجودہ حکومت پر ڈالنا غلط ہے۔ بلوچستان کے ساتھ ناانصافی کرنے

والوں میں یہاں کے سرداروں کا بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے اپنے علاقوں میں تعلیم اور ترقی کی راہ میں ہمیشہ روڑے اٹکائے ہیں۔ آج ساری قوم بلوچوں کے ساتھ ہے، اس موقع کو بندوقیں چلا کر ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ سردار اکبر بگٹی اور دوسرے بارسوخ سردار صاحبان جنگ کے بجائے امن کی بات کریں۔ نواب اکبر بگٹی، دانشمند اور تجربہ کار سیاستدان ہیں، حال ہی میں انہوں نے بگٹی قبائلیوں کو سختی سے ہدایت کی ہے۔ ''وہ فوج کے ساتھ تصادم میں پہل نہ کریں'' تاہم اگر حکومت کی طرف سے حملہ ہوا تو اس کا پوری قوت سے جواب دیا جائے'' چونکہ ڈیرہ بگٹی میں فوجی سپاہیوں کے ساتھ اسلحہ سے لیس قبائلیوں کا گشت بھی جاری ہے اس دوران معمولی غلطی سے آتش فشاں پھٹ سکتا ہے۔ سردار بگٹی کی ریاست کے اندر ایک اور ریاست کا تصور پاکستان کے لئے نہایت خطرناک ہے۔ بی ایل اے اور سردار بگٹی کے لشکر کو جب تک غیر مسلح نہیں کیا جاتا بلوچستان میں امن ممکن نہیں ہے۔ اس طرح بلوچستان لبریشن آرمی کو فوراً ایک دہشت گرد اور مجرم گروہ قرار دے کر پابندی لگانی ہوگی۔ سیکورٹی فورس کو مکمل آزادی دینی ہوگی کہ اس دہشت گرد ٹولے کا فوری قلع قمع کرے اس کے ساتھ ساتھ صوبائی حکومت کو مکمل اختیار دیا جائے تاکہ صوبے میں ترقی کا کام بھرپور طریقے سے ہو اور بلوچ نوجوانوں کو ترجیح اور مراعات دے کر صوبے میں بے روزگاری ختم کی جائے گوادر میں تمام آسامیوں پر پڑھے لکھے بلوچ نوجوانوں کو لگایا جائے اس وقت اپوزیشن کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا، مگر اگر سردار صاحبان اور ان کے حواری منفی سیاست اور جنگی جنون کو خیرباد نہیں کہتے تو یہ ممکن نہ ہوگا اور بلوچستان جنگ اور تاریکی کے اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔

(بشکریہ روزنامہ خبریں 26 مارچ 2005ء)

10 اپریل 2005ء کو روزنامہ خبریں کے سنڈے میگزین نے تازہ ترین حالات پر جمہوری وطن پارٹی کے سیکرٹری اطلاعات سینیٹر امان اللہ کندرانی کا انٹرویو شائع کیا ان کا نقطہ نظر بھی اس مسئلے کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا ملاحظہ فرمائیں۔ زعیمہ

بلوچستان آج کل ایک بار پھر کشیدگی کا شکار ہے۔ صوبہ کی تازہ ترین صورتحال پر بات چیت کے لئے جمہوری وطن پارٹی کے سیکرٹری اطلاعات اور سینیٹر امان اللہ کندرانی سے

ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔ یہ نشست پارلیمنٹ لاجز میں ان کی رہائش گاہ پر ہوئی، جمہوری وطن پارٹی کے سربراہ نواب اکبر بگٹی ہیں۔ اس نشست میں امان اللہ کنررانی سے ہونے والی گفتگو قارئین کے لئے پیش کی جا رہی ہے۔

س: ڈیرہ بگٹی میں پیدا ہونے والی کشیدگی کے اسباب کیا ہیں؟

امان اللہ: 17 مارچ کو ڈیرہ بگٹی میں جو خون کا کھیل کھیلا گیا، اس میں 70 کے قریب لوگ ہلاک ہوئے جس میں 33 ہندو بھی تھے جبکہ 50 ہزار لوگ اس واقعہ کے بعد ڈیرہ بگٹی اور 20 ہزار سوئی سے نقل مکانی کر گئے ہیں۔ ایک قیامت برپا کر دی گئی تھی اور سوئی سے ایک ہی راستہ ڈیرہ بگٹی کو جاتا ہے وہ بھی بند کر دیا گیا تھا، جس کے بعد شہر میں راشن کی قلت پیدا ہو گئی۔ پہلے لوگ بارشوں کی وجہ سے شدید متاثر تھے، پھر ان کا راستہ بھی بند کر دیا گیا تھا جو کچھ ڈیرہ بگٹی میں ہوا وہ افسوسناک ہے۔ لیکن اب حکومت نے جو مذاکرات کا عمل شروع کیا ہے، اس سے ڈیرہ بگٹی اور سوئی کے عوام میں حکومت کی جانب سے جو اچانک حملے کا خوف تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔

س: نواب اکبر بگٹی اور حکومت کے درمیان مذاکرات کو خفیہ رکھا جا رہا ہے؟

امان اللہ: نواب اکبر بگٹی اور حکومت کے درمیان بات چیت کو اس لیے خفیہ رکھا گیا ہے کہ کسی کی جیت اور کسی کی ہار کا کوئی تاثر پیدا نہ ہو اور نہ ہی کوئی سیاسی پوائنٹ سکور کرے۔ عوام کا اعتماد بحال ہو اور جو لوگ نقل مکانی کر کے گئے ہیں، وہ واپس آ جائیں۔ معاملات طے ہو جائیں۔ کسی کی فتح اور کسی کی شکست والی کوئی بات نہ ہو۔

س: ڈاکٹر شازیہ خالد نے کہا کہ قبائلی سردار میرے واقعہ پر سیاست نہ کریں؟

امان اللہ: 3,2 جنوری کو جو واقعہ پیش آیا اس کی صورتحال کچھ یوں ہے کہ جس علاقہ میں واقعہ ہوا اس تمام علاقہ کے اردگرد آہنی باڑ لگی ہوئی ہے۔ 1400 لوگوں کی آبادی ہے۔ 500 آدمی سکیورٹی فورسز کے تھے جبکہ ہسپتالوں کی اپنی سکیورٹی بھی ہے اور سکیورٹی میں آرمی کے لوگ شامل ہیں۔ یہ واقعہ ایک کمزور عورت کے ساتھ طاقتور کی زیادتی کے خلاف لوگوں کا ردعمل ہے۔ ہم تو کمزور کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر احتجاج کر رہے ہیں۔ بلوچستان میں معاشرتی فضا پورے پاکستان سے مختلف ہے اور

اس فضا میں یہ غیر معمولی واقعہ تھا۔ فوجیوں کی نگرانی میں سکیورٹی ہو رہی تھی، اگر اس واقعہ میں کوئی سویلین ملوث ہوتا تو پھانسی پر چڑھا دیا جاتا۔

س: صدر جنرل پرویز مشرف کا موقف ہے کہ بلوچستان میں 3 سردار ہیں جو ترقی نہیں چاہتے، عوام ان کے ساتھ نہیں ہیں؟

امان اللہ: بلوچستان کی نمائندگی یہی تین سردار کرتے ہیں۔ اگر یہ غیر مقبول لوگ ہیں تو صدر کیوں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ 1970ء میں نیپ کی قیادت میں 3 سرداروں کو عوام کا مینڈیٹ ملا وہ آج بھی برقرار ہے۔ پاکستان میں 1970ء کے بعد ہونے والے تمام الیکشن میں دھاندلی ہوئی اور کوئی الیکشن کا عمل شفاف نہ تھا، لہٰذا جو شفاف انتخابات ہوئے، اس میں عوام نے بلوچ سرداروں کو مینڈیٹ دیا جو آج تک برقرار ہے۔ ان بلوچ سرداروں نے ہمیشہ بلوچوں کی نمائندگی کی ہے۔ ان لوگوں نے کبھی بلوچستان میں رہنے والے پشتونوں کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ بلوچستان میں بلوچ عوام آج بھی ان 3 سرداروں کے ساتھ ہیں۔

س: نواب اکبر بگٹی پر پرائیویٹ آرمی رکھنے کا الزام بھی لگایا جا رہا ہے؟

امان اللہ: بلوچستان کے 27 اضلاع میں سے آئین کے آرٹیکل 246 کے تحت 5 اضلاع کی قبائلی حیثیت ہے جن میں ڈیرہ بگٹی، کوہلو، ژوب، لورالائی اور چاغی شامل ہیں اور آئین کے آرٹیکل 246 کے تحت ان علاقوں پر پاکستان کا کوئی قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا ہے، جب تک صدر ان علاقوں کے لیے کوئی الگ قانون کی توسیع نہ کریں اور اسی وجہ سے ان اضلاع میں کوئی ٹیکس اسلحہ ٹیکس، گاڑی رجسٹریشن یا انکم ٹیکس نافذ نہیں ہے۔ وہاں لوگ صدیوں سے آباد ہیں اور صدیوں سے ان کے پاس اسلحہ ہے، کیونکہ اس آرڈیننس آنے سے قبل یہاں اسلحہ رکھنا جرم نہ تھا، ڈیرہ بگٹی کی آبادی 2 لاکھ ہے، وہاں پر ہر شخص کے پاس اسلحہ ہے، کلاشنکوف ہے۔ اگر جنرل صاحب ان لوگوں کو پرائیویٹ آرمی کا نام دیتے ہیں تو دیتے رہیں لیکن ڈیرہ بگٹی میں کوئی پرائیویٹ آرمی نہیں ہے۔

جون 1992ء میں نواب اکبر بگٹی کا بیٹا شہید ہوا تو نواب اکبر بگٹی ڈیرہ بگٹی گئے

اور وہاں کے قبائلی لوگوں نے رضاکارانہ طور پر نواب اکبر بگٹی کی حفاظت کا انتظام کیا
ہے۔1992ء میں اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان جب نواب اکبر بگٹی کے پاس فاتحہ
خوانی کے لیے گئے تو یہ مسلح لوگ موجود تھے، جسے پرائیویٹ آرمی کا نام دیا جا رہا ہے۔ غلام
اسحاق خان کے ڈیرہ بگٹی جانے سے قبل ان کو سکیورٹی کلیئرنس نہیں دی جا رہی تھی، مگر نواب
اکبر بگٹی سے بات کرنے کے بعد غلام اسحاق خان سرکاری گارڈ کو چھوٹ کر ان ہی مسلح لوگوں
کی نگرانی میں ڈیرہ بگٹی گئے تھے جبکہ خفیہ ایجنسیوں نے ان کو ریڈ الرٹ کر دیا تھا۔ پھر میاں
نواز شریف وزیر اعظم کی حیثیت سے ڈیرہ بگٹی گئے اور ان کے ساتھ بھی مسلح قبائلی لوگ ہی
تھے۔ ظفر اللہ جمالی وزیر اعظم کی حیثیت سے گئے، ان کے ساتھ بھی سرکاری گارڈ نہیں تھے،
بھی مسلح قبائلی تھے۔ اسی طرح آئی ایس آئی کا چیف جاوید ناصر اور اس کے بعد کور کمانڈر کوئٹہ
عبدالقادر بلوچ بھی ان ہی مسلح قبائلی لوگوں کی نگرانی میں ڈیرہ بگٹی گئے تھے۔ نواب اکبر بگٹی
نے 1992ء میں سرکاری سطح کے لوگوں کو آنے سے منع کر دیا تھا۔ وہاں کے قبائلی لوگ ہی
مسلح ہیں۔ یہ کوئی انڈیا سے نہیں آئے جو محمد علی درانی کہتے ہیں کہ نجی فورسز موجود ہے پھر
نواب اکبر بگٹی جب صدارت کے لیے فاروق لغاری کو ووٹ دینے کے لیے آئے تو یہ نجی
فورسز کے لوگ ساتھ تھے۔ یہ تو ذاتی حفاظت کے لیے ہیں، ان کو بلا جواز پرائیویٹ آرمی کا
نام دے کر ڈیرہ بگٹی میں حکومت مسلح فورسز تعینات کر رہی ہے۔ نواب اکبر بگٹی کے پاس کوئی
پرائیویٹ آرمی نہیں ہے۔

س: بلوچ سرداروں کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ یہ گوادر کی ترقی نہیں چاہتے ہیں؟

امان اللہ: پہلے تو میں آپ کو بتا دوں کہ صدر مشرف نے میڈیا کے نمائندوں سے بات چیت
کرتے ہوئے ٹی وی پر کہا ہے کہ نواب اکبر بگٹی بلوچستان کی بات چھوڑیں۔ وہ ذاتی
مراعات کی بات کریں۔ حکومت ان کو مراعات دینا چاہتی ہے لیکن نواب اکبر بگٹی
بلوچستان کے مسائل کی بات کرتے ہیں۔ ہمارا موقف ہے کہ این ایف سی ایوارڈ ک
نظام فرسودہ ہو چکا ہے، اب وسائل صوبوں کو دیئے جائیں۔ صوبوں کے وسائل مرکز
میں آ جائیں تو ٹھیک ہے اور اگر صوبے اپنے وسائل خود اپنے پاس رکھیں تو غداری ہو
جاتی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کیا صوبے پاکستان نہیں ہیں۔ ہم اسلام آباد ختم

کرنے کی بات نہیں کرتے، فوج کا دفاع کے لیے ہونا ضروری ہے، خارجہ امور اور
کرنسی بھی وفاق کے پاس ہو، باقی سب کچھ صوبوں کو دے دیا جائے، اس سے
صوبوں کی شکایات بھی ختم ہو جائیں گی اور پنجاب سے بھی گلہ نہیں کریں گے۔ اگر
صوبوں کے وسائل صوبوں کو دے دیئے جائیں اور پھر بھی بلوچستان کے عوام غریب
ہی رہے تو ہم خدا کی مرضی سمجھ کر قبول کر لیں گے۔ دنیا میں اسرائیل اور پاکستان عوام
نے اپنی مرضی سے بنایا ہے، باقی ملکوں کو فتح کیا گیا ہے مگر پاکستان کی حفاظت نہ ہو
سکی اور بنگلہ دیش بن گیا، اب سرحد، سندھ سے بھی وہی آوازیں آ رہی ہیں، لہٰذا اب
اس انداز میں وفاقی نظام نہیں چل سکتا ہے۔ جہاں تک گوادر کا معاملہ ہے تو ہم گوادر
میں ایسی ترقی نہیں چاہتے جس سے بلوچ کی شناخت ہی ختم ہو جائے اور گوادر
بلوچوں کے پاس ہی نہ رہے۔ آنے والے اکثریت میں ہو جائیں۔ ہمیں اسلام آباد
والوں کی ترقی کی ضرورت نہیں ہے۔ صوبوں کو حقوق دیئے جائیں۔ ہم خود اپنی ترقی
کے منصوبے بنائیں گے۔ ہمارے ساتھ چین کمیونسٹ ملک ہے، اس نے 23
صوبوں کو خود مختاری دے رکھی ہے۔ 6 صوبے 101 ممالک سے براہ راست تجارت
کرتے ہیں امریکہ کی کئی ریاستیں بھی ایسا ہی کر رہی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں مگر
ہمارے حکمران صوبوں کے وسائل پر وفاق مضبوط کرنا چاہتے ہیں مگر ایسا نہ ہو کہ لوگ
وفاق کے دفاع سے پیچھے ہٹ جائیں، لہٰذا ہمارا مطالبہ ہے کہ ملک میں حقیقی
جمہوریت ہو، سینٹ کو با اختیار ادارہ بنایا جائے۔

س: آپ کی جماعت اے آر ڈی کا حصہ ہے، کیا اے آر ڈی اور ایم ایم اے کے درمیان
مشترکہ جدوجہد کرنے پر اتفاق ہو سکتا ہے؟

امان اللہ: ایم ایم اے اور اے آر ڈی کے درمیان مشترکہ جدوجہد کرنے پر اتفاق رائے کا
کوئی امکان نہیں ہے۔ ایم ایم اے نے 17 ویں ترمیم پر حکومت کا ساتھ دیا اور 12
اکتوبر 1999ء کے بعد ہونے والے تمام غیر آئینی اقدامات کو آئینی بنا دیا۔ جس
کے بعد سارا ملک ایم ایم اے ناراض ہے۔ اس میں تعلیم کی پابندی، تیسری بار
وزیر اعظم بننے پر پابندی اور عدل و انصاف بھی ختم ہو گیا۔ ایم ایم اے والے جنرل

مشرف کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ہم نے اس کی مخالفت کی تھی، ویسے بھی اے آر ڈی کا موقف ہے کہ ایم ایم اے ریاستی اداروں کی بی ٹیم ہے، لہٰذا ان کے ساتھ مشترکہ جدوجہد کرنے بارے اتفاق رائے کا امکان نہیں ہے۔اس کے علاوہ جنرل مشرف نے ایم ایم اے کے ساتھ وردی اتارنے کا وعدہ کیا جو پورا نہیں کیا مگر جنرل مشرف سے قبل جنرل ضیاء الحق نے خانہ کعبہ میں قرآن اٹھایا تھا کہ 90 دن میں الیکشن کروائے گا اور دس سال پورے کر گیا۔

س: کیا چودھری شجاعت حسین کی قیادت میں قائم کمیٹی مسائل حل کرا سکتی ہے؟

امان اللہ: نواب اکبر بگٹی کو ان لوگوں پر ذاتی طور پر اعتماد ہے اور اگر چودھری شجاعت حسین کو فری ہینڈ دیا گیا تو معاملات ملک اور قوم کے بہترین مفاد میں حل ہو جائیں گے اور اگر اس کمیٹی پر دباؤ برقرار رہا تو پھر ہم افسوس ہی کر سکتے ہیں۔بلوچستان میں وقتی امن کو دائمی امن نہیں سمجھا جا سکتا۔پارلیمانی پارٹی کا دورہ جس میں حکومت اور اپوزیشن دونوں کے لوگ شامل تھے اور چودھری شجاعت اور مشاہد حسین پر مشتمل کمیٹی سے سردار اکبر خان بگٹی کے مذاکرات کے بعد شدت سے اس رپورٹ اور پیکج کے نافذ ہونے کا انتظار تھا جس کے بعد یہ باور کیا جا رہا تھا کہ حالات انشاء اللہ سدھر جائیں گے۔ابھی تک اکادکا تخریب کاری کے واقعات کا سلسلہ جاری تھا لیکن اس دوران صدر جنرل پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز نے بلوچستان کا دورہ کیا اور دونوں نے عوامی جلسوں سے خطاب کے دوران یہ کوشش کی کہ بلوچستان کے عوام کا غصہ (خواہ اس کی وجہ کچھ بھی رہی ہو) ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جائے اس کے لیے وہاں ترقیاتی کاموں کا آغاز بیروزگاری اور غربت کے خاتمے کے لیے ٹھوس اقدامات درکار تھے جن کے وعدے بھی کیے گئے۔

ممتاز سیاسی مبصر ڈاکٹر چشتی مجاہد نے صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا۔

بلوچستان گزشتہ دو تین سالوں سے اندرونی و بیرونی سازشوں کی زد میں ہے اور اس دوران یہاں بم دھماکوں، راکٹ فائرنگ اور دہشت گردی کی جتنی وارداتیں دیکھنے میں آئی ہیں، قیام پاکستان کے بعد پہلے 56 سالوں میں دیکھنے میں نہیں آئیں۔اس بات

میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ بلوچستان اس وقت وی وی آئی پی شخصیات کے لیے ہائی رسک ایریا بن چکا ہے۔گوادر ڈیپ سی پورٹ اپنی تعمیر کے آغاز ہی سے امریکہ اور بھارت سمیت پاکستان کے بعض دوست ممالک کی نظروں میں کھٹک رہی ہے۔بندرگاہ پر کام کرنے والے چینی انجینئروں کو اس پروجیکٹ پر کام کرنے سے روکنے کے لیے انہیں کار بم کے ذریعے نشانہ بھی بنایا گیا مگر یہ سازشیں بھی گوادر ڈیپ سی پورٹ کی تعمیر کو نہیں رکوا سکیں اور بندرگاہ کی تعمیر کا پہلا مرحلہ اپنی مقررہ مدت سے پہلے گزشتہ سال نومبر میں مکمل ہو گیا اور اب اس بات کا انتظار تھا کہ اپریل میں جب عوامی جمہوریہ چین کے وزیراعظم وین جیاباؤ پاکستان کے دورہ پر آئیں گے تو وہ صدر جنرل پرویز مشرف کے ہمراہ گوادر ڈیپ سی پورٹ کا رسمی افتتاح کریں گے۔مگر سکیورٹی رسک کے باعث عوامی جمہوریہ چین کے وزیراعظم گوادر ڈیپ سی پورٹ کا افتتاح نہیں کر سکیں گے۔

باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ بلوچستان کے مختلف علاقوں میں آگ وخون کی بارش برسانے والی قوتیں گوادر کو ایک مرتبہ پھر اپنا نشانہ بنانا چاہتی تھیں، اس لیے حکومت پاکستان نے اپنے معزز مہمانوں کے جان و مال کو سب سے زیادہ فوقیت دی اور مناسب یہ سمجھا کہ گوادر ڈیپ سی پورٹ کے افتتاح کے معاملے کو فی الحال نہ چھیڑا جائے۔وزارت خارجہ اس سلسلے میں مختلف آپشنز پر غور کر رہی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سلسلے میں کوئی تقریب وفاقی دارالحکومت ہی میں منعقد کر لی جائے۔ویسے گوادر ڈیپ سی پورٹ کی افتتاحی تقریب ایک ایسے وقت میں ملتوی کی گئی ہے کہ جب خفیہ ایجنسیوں کو یہ رپورٹ بھی ملی کہ افغانستان سے 25 جاسوس اور دہشت گرد پاکستان میں داخل ہوئے ہیں۔ان اطلاعات کے بعد ان غیر ملکی دہشت گردوں کی گرفتاری کے لیے تمام سکیورٹی اداروں کو ہائی الرٹ کر دیا گیا ہے۔

ہفتہ رفتہ کے دوران صدر جنرل پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز دونوں نے بلوچستان کا دورہ کیا۔وزیراعظم شوکت عزیز تو لسبیلہ کے دورہ پر جہاں انہوں نے ایک چینی فرم کی جانب سے کان کنی کے علاقے کے لیے تعمیر کی جانے والی سڑک کا سنگ بنیاد رکھنے کے علاوہ جلسہ عام سے خطاب کیا اور میرین وزرعی یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔صدر مملکت جنرل پرویز مشرف نے کوئٹہ، قلات اور ژوب کا تین روزہ دورہ کیا۔صدر مملکت

ایسے وقت صوبہ کے دورہ پر آئے کہ جب ملک بھر کی طرح پورا بلوچستان بھی شٹر ڈاؤن اور پہیہ جام ہڑتالوں کی زد میں تھا بلکہ ہڑتالوں کے سلسلے میں تو اس دوران بلوچستان میں مسلسل تین دن ہڑتالوں کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا۔ پہلی ہڑتال تو 31 مارچ کو پونم کی اپیل پر ہونے والی پہیہ جام ہڑتال تھی، جو صوبہ کی تاریخ میں ہونے والی سب سے کامیاب ترین ہڑتال تھی۔ اس دن واقعی پہیہ جام رہا اور پونم کے رہنماؤں اور کارکنوں نے نہ تو میڈیکل سٹورز اور تندور کھلنے دیئے اور نہ ہی سائیکلیں اور گدھا گاڑیاں سڑکوں پر آنے دیں۔ ایک گورنر بلوچستان اویس احمد غنی تھے کہ جنھوں نے شدید دھمکیوں کے باوجود اس پہیہ جام ہڑتال کی پروانہ کی اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت چیئر مین ہائر ایجوکیشن کمیشن ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کے ہمراہ پشین گئے جہاں انہوں نے ورچوئل یونیورسٹی کے کیمپس کا افتتاح کیا۔ کوئٹہ سے پشین جاتے ہوئے مظاہرین نے گورنر بلوچستان کے خلاف نعرے لگائے اور پشین کے قریب ایم ایم اے سے تعلق رکھنے والے صوبائی وزیر اطلاعات مطیع اللہ آغا کی گاڑی پر پتھراؤ بھی کیا، جس سے ان کی گاڑی کے شیشے ٹوٹ گئے اور دو افراد معمولی زخمی ہوئے۔ پہیہ جام ہڑتال کے دوران جلاؤ گھیراؤ کے واقعات میں صوبائی دارالحکومت میں 25 افراد زخمی ہوئے اور زبردستی دکانیں بند کرانے کے الزام میں 150 افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ پونم نے یہ ہڑتال گوادر ڈیپ سی پورٹ سمیت بلوچستان کے میگا پراجیکٹس، کالا باغ ڈیم اور بلوچستان میں فوجی چھاؤنیوں کی تعمیر کے خلاف کی تھی۔ پونم کی ہڑتال کے اگلے روز انجمن تاجران نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے شٹر ڈاؤن ہڑتال کی جبکہ دو اپریل کو متحدہ مجلس عمل کی ملک گیر ہڑتال کے سلسلے میں پورے بلوچستان میں شٹر ڈاؤن ہوا، اگرچہ یہ پونم کی طرح ایک کامیاب ہڑتال نہیں تھی لیکن شٹر ڈاؤن تو مکمل تھا البتہ پہیہ کہیں نہ کہیں چلتا رہا اور اسی دوران نامعلوم افراد یا ایم ایم اے کے کارکنوں نے ایئر پورٹ پر سینیٹر روشن خورشید بروچہ کی گاڑی پر فائرنگ کی۔ وہ تو گاڑی میں موجود نہیں تھیں البتہ ان کے شوہر معمولی زخمی ہوئے اور گاڑی کے شیشے بھی ٹوٹ گئے۔ سینیٹر روشن خورشید بروچہ نے متحدہ مجلس عمل سے تعلق رکھنے والے سینئر وزیر مولانا عبدالواسع سے اس کا گلہ بھی کیا جس پر مولانا عبدالواسع نے گاڑی کی مرمت کے اخراجات ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

ویسے بلوچستان میں متحدہ مجلس عمل کی یہ ہڑتال اس لحاظ سے یقیناً دلچسپ تھی کہ حکومت والے خود حکومت کے خلاف ہڑتال کر رہے تھے۔ متحدہ مجلس عمل کی ہڑتال کے روز وزیر اعلیٰ میر جام محمد یوسف کی جانب سے جب صدر مملکت جنرل پرویز مشرف کے اعزاز میں دیئے جانے والے ظہرانہ میں شرکت کے لیے سینئر صوبائی وزیر مولانا واسع اور دوسرے وزراء وزیر اعلیٰ ہاؤس پہنچے تو صحافیوں نے ان سے یہ دریافت کیا کہ آج تو ان کی پہیہ جام ہڑتال ہے پھر وہ یہاں کیسے آئے ہیں؟ جس پر ان کا کہنا تھا کہ وہ یہاں پیدل آئے ہیں۔ بہر حال متحدہ مجلس عمل کی اپیل پر کوئٹہ میں ہونے والی شٹر ڈاؤن پہیہ جام ہڑتال کے دوران توڑ پھوڑ پر پولیس نے سو سے زیادہ افراد کو گرفتار کر لیا اور اب یہ پتہ نہیں کہ ان افراد کے خلاف بھی انسداد دہشت گردی کی عدالت میں مقدمے چلائے جائیں گے یا انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ متحدہ مجلس عمل کے رکن قومی اسمبلی اور جمعیت علمائے اسلام کے ضلعی امیر مولانا نور محمد نے ہڑتال کے اگلے روز کوئٹہ میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اپنے کارکنوں کی گرفتاری کی مذمت کی اور انہیں فوراً رہا کرنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے پولیس اور مقامی انتظامیہ کے خلاف ہفتہ ناراضگی منانے کا اعلان کیا کہ جس کے دوران جلوس نکالے جائیں گے اور احتجاجی مظاہرے منعقد ہوں گے۔

ہڑتالوں کی اس ہیٹ ٹرک کے دوران صدر جنرل پرویز مشرف کے دورہ بلوچستان کا ذکر ہوتا رہا، جس کے دوران انہوں نے قلات اور ژوب میں بڑے بڑے جلسہ عام سے خطاب کیا اور اس دوران بلوچستان میں میگا پراجیکٹس کے مخالفین، قوم پرستوں اور سرداروں کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا اور ساتھ ہی انہوں نے یہ واضح کیا کہ حکومت بلوچستان کے مسائل آپریشن سے نہیں، مذاکرات سے حل کرنا چاہتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ سابقہ ادوار میں بلوچستان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر میں نے معافی مانگی۔ اب بھی کہتا ہوں کہ بلوچستان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ موجودہ حکومت اس کا ازالہ کر رہی ہے اور گزشتہ تین چار سالوں میں گوادر ڈیپ سی پورٹ، میرانی ڈیم، کوسٹل ہائی وے، کچی کینال، سبکزئی ڈیم، قلات اور زیارت کو گیس کی فراہمی سمیت صوبہ میں جس انداز میں ترقیاتی کام شروع ہوئے ہیں، اس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ اگلے پانچ سالوں

میں صوبہ میں تعلیم پر 15 ارب روپے خرچ ہوں گے۔ صوبے میں پہلے ایک یونیورسٹی تھی اب چھ جامعات ہیں۔ میں صوبائی خودمختاری کا حامی ہوں اور بلوچستان کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینا چاہتا ہوں مگر کچھ لوگ نہیں چاہتے کہ بلوچستان ترقی کرے یہاں کے لوگوں کی پسماندگی دور ہو۔ میں ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھتا ہوں مگر وہ بریک پر پاؤں رکھ دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ این ایف سی میں صوبوں کو زیادہ حصہ ملے گا اور جس ضلع سے گیس، تیل، معدنیات نکالی جائیں گی، اس ضلع کو بھی صوبہ کے ساتھ ساتھ رائلٹی میں حصہ ملے گا۔ ژوب کے جلسہ عام میں جنرل پرویز مشرف نے بلوچستان کے سرداروں اور نوابوں کو خوب کھری کھری سنائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بلوچستان کسی نواب یا چند سرداروں کا نہیں بلکہ بلوچوں اور پشتونوں کا مشترکہ گھر ہے۔ کسی فرد یا گروہ کو بلوچستان کے نام پر سیاست نہیں کرنے دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ وہ نواب اور سردار جو بلوچستان کے گورنر رہ چکے ہیں، انہوں نے اپنے دور اقتدار میں بلوچستان کے عوام کے لیے کچھ نہیں کیا، اب وہ صرف اپنے علاقوں تک محدود ہو گئے ہیں اور اپنے ہی لوگوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ ان ہی سرداروں اور نوابوں کی وجہ سے بلوچ در بدر ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سردار اپنے علاقے تک محدود ہیں، انہیں پورے صوبے کی بات کرنے کا حق نہیں ہے۔

تادم تحریر ڈیرہ بگٹی میں حالات اگرچہ پرسکون ہیں مگر نواب اکبر بگٹی کا کہنا ہے کہ ڈیرہ بگٹی کے حالات بدستور کشیدہ ہیں۔ دونوں طرف کے مورچہ بند لوگ ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں۔ نواب بگٹی نے جنرل پرویز مشرف کے دورہ ژوب کے دوران کہے سرداروں اور نوابوں کے بارے میں ریمارکس کا بھی سخت نوٹس لیا ہے اور اس کا صدر جنرل پرویز مشرف کے لہجے ہی میں جواب دیا ہے۔ نواب اکبر بگٹی کا کہنا ہے کہ جنرل پرویز کی بلوچستان کے سرداروں کو ان کے حلقے تک محدود رکھنے کی خواہش جرنیلی ہے۔ پاکستان میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے، جس کے تحت کوئی کسی کی روزمرہ زندگی اور اس کی سیاست میں اس کو محدود کر دے۔ یہ ملک کسی کی خواہش کے تحت نہیں چل سکتا۔ کسی بھی بلوچ کو کہیں بھی کوئی مسئلہ یا تکلیف ہوگی تو ہم سے جس قدر ہو سکا اپنا کردار ادا کریں گے۔ ہماری روح ان کے ساتھ ہوگی۔ ہم سے کوئی یہ حق نہیں چھین سکتا۔ ہم کسی کی خواہش پر خود کو محدود نہیں کریں گے۔

(بشکریہ ہفت روزہ اخبار جہاں 11 تا 17 اپریل 2005ء)

3 مئی 2005ء کو یہ خبر شائع ہوئی کہ پارلیمانی کمیٹی برائے بلوچستان نے اتفاق رائے سے بلوچستان کی ترقی کے لیے مشاہد حسین سید کی سربراہی میں قائم ذیلی کمیٹی کی تمام سفارشات منظور کر لی ہیں یہ سفارشات بلوچستان کے بارے میں قائم آئینی کمیٹی کی رپورٹ آنے کے بعد قومی اسمبلی میں منظوری کے لیے پیش کی جائیں گی۔ اخبارات کا کہنا تھا کہ ڈیرہ بگٹی، سوئی اور دیگر مقامات سے چیک پوسٹیں ختم کی جائیں گی۔ گیس رائلٹی کے معاملے پر کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ حکومت بلوچستان اور وزارت پٹرولیم 30 جون سے پہلے گیس رائلٹی کے سلسلے میں تمام بقایا جات کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کرے گی اور حکومت دسمبر 2005ء سے پہلے گیس رائلٹی کی مد میں واجب الادا رقم بلوچستان کو ادا کرے گی۔ پارلیمانی کمیٹی کا اجلاس مسلم لیگ کے صدر چودھری شجاعت حسین کی صدارت میں ہوا۔ اجلاس میں متحدہ مجلس عمل، مسلم لیگ (ن) اور دیگر پارٹیوں کے ارکان نے شرکت کی جبکہ پیپلز پارٹی پارلیمنٹرین کے ارکان نے اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ اجلاس کے بعد مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل مشاہد حسین سید نے بریفنگ دیتے ہوئے کہا کہ میری سربراہی میں قائم ذیلی کمیٹی کی 31 سفارشات متفقہ طور پر منظور کی گئی ہیں اور اپوزیشن کے تحفظات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ایک ایک نقطے پر اجلاس میں کھل کر بحث کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ اجلاس میں محنت، اوقاف، ماحولیات سمیت 29 محکموں کو کنکریٹ لسٹ سے نکال کر صوبوں کے حوالے کرنے کی سفارش کی گئی ہے نیز بلوچستان کے عوام کو وفاق میں ملازمتوں کا 5.7 فیصد کوٹہ دیا جائے گا اور خالی اسامیوں کو مشتہر کیا جائے گا اور گوادر کے لوگوں کو ملازمتوں میں ترجیح دی جائے گی۔ نچلے گریڈ کے لیے کوئی تعلیمی قابلیت نہیں ہوگی۔ اعلیٰ تکنیکی پوسٹوں پر بھرتی کنٹریکٹ کی بنیاد پر ہوگی۔ گوادر کے کل ریونیو میں سے 7 فیصد بلوچستان کو دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ کوئٹہ، گوادر اور سوئی کے لیے خصوصی ترقیاتی پیکج کی بھی منظوری دی گئی ہے اور اس پیکج پر فوراً عملدرآمد کرایا جائے گا۔ ضلع گوادر میں سماجی ترقی کے لیے حکومت تین ارب روپے کے ترقیاتی پیکیج کا اعلان کرے گی۔ مسلم لیگ (ن) کے اسحاق ڈار نے کہا کہ گوادر میں پرائیویٹ سیکٹر کو دی گئی زمینوں کے کنٹریکٹ منسوخ کیے جائیں اور بلوچستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی قائم کی جائے۔ اپوزیشن کے بعض لوگوں نے مطالبہ کیا کہ گوادر کو صوبے

کے حوالے کیا جائے اور فوجی چھاؤنیاں نہ بنائی جائیں تاہم اجلاس میں اپوزیشن کے مطالبے پر 584 چیک پوسٹیں ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اپوزیشن نے مطالبہ کیا کہ گوادر میں صوبے کے شیئرز 60 فیصد کئے جائیں اور ایف سی کو منشیات اور اسلحہ کی برآمدگی تک محدود رکھا جائے۔ اجلاس میں گوادر میں ہاؤسنگ سوسائٹیوں پر نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ جس کمپنی کے ساتھ کام کرنے کا معاہدہ ہوگا وہ علاقے میں 5 فیصد سرمایہ کاری کرنے کی پابند ہوگی اور جس علاقے میں تیل یا گیس ملے اس کا 15 فیصد حصہ مقامی آبادی کی بہبود پر خرچ کیا جائے گا۔ دریں اثناء وسیم سجاد نے بین الصوبائی ہم آہنگی اور آئینی امور کے بارے میں کمیٹی کو اپنی رپورٹ پیش کر دی جبکہ پارلیمانی کمیٹی برائے بلوچستان میں سینیٹر دلاور عباس کا گیس رائلٹی اور گیس ڈویلپمنٹ سرچارج کا فارمولا بھی منظور کرلیا گیا ہے اور دلاور عباس کے فارمولے کے تحت بلوچستان کو سالانہ گیس رائلٹی کی مد میں ڈیڑھ ارب روپے سے زائد دیا جائے گا۔ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ بلوچستان کے بارے میں آئینی کمیٹی کی سفارشات کی حتمی شکل دینے کے لیے ایک ڈرافٹ کمیٹی بنائی جائے گی۔ آئینی امور پر سفارشات کے لیے کمیٹی کا اجلاس آج پھر ہوگا۔

(بحوالہ۔ روزنامہ خبریں 3 مئی 2005ء)

آئینی کمیٹی کی سفارشات کا کیا حشر ہوا؟ اس کا تذکرہ تو آگے آئے گا لیکن 29 مئی 2005ء کو میں نے بلوچستان کی صورت حال کے حوالے سے لکھا۔

اے آر ڈی کا وفد مخدوم امین فہیم، تہمینہ دولتانہ، نواب زادہ منصور علی خان اور دیگر رہنماؤں کے ساتھ جب ڈیرہ بگٹی گیا تھا تو وفد کو نواب اکبر بگٹی نے سارے متاثرہ علاقے دکھائے تھے اور حکومتی کارروائیوں کی تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔ ڈیرہ بگٹی میں اے آر ڈی کے مرکزی رہنماؤں سے مذاکرات کے دوران نواب اکبر بگٹی نے واضح سیاسی موقف اختیار کیا تھا کہ اے آر ڈی ہمارا تحفظ نہیں کرسکتی اور نہ ہی ہم اے آر ڈی سے کوئی توقع رکھتے ہیں۔

نواب اکبر بگٹی کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ اقتدار کے چہروں کی تبدیلی چاہتے ہیں، آپ کی سیاست یہ ہے کہ ایک وزیراعظم کو تبدیل کرکے دوسرے وزیراعظم کو لایا جائے، لیکن ہم صوبائی حقوق چاہتے ہیں، سینیٹ میں ہماری پارٹی کی طرف سے جو

صوبائی خودمختاری کا بل پیش کیا گیا تھا، اس پر عملدرآمد چاہتے ہیں۔

اے آر ڈی کے رہنما اس وقت خاموش ہوگئے، جب اکبر بگٹی نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا، ”میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ڈیرہ بگٹی ہمارے زخموں کو دیکھنے آئے ہیں، لیکن آپ بےنظیر بھٹو اور نواز شریف کو واپس لانے کے لیے جنرل پرویز مشرف کے پاؤں پکڑنے کے لیے بھی تیار ہیں، آپ ہمارے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔“ تاہم نواب اکبر بگٹی کو احساس ہے کہ وہ ایک پیچیدہ، حساس اور خطرناک جنگ میں مصروف ہیں۔ ریاستی ڈھانچے کے تمام ادارے انہیں محاصرے میں لیے ہوئے ہیں۔

پیپلز پارٹی کے پہلے دور اقتدار میں اکبر بگٹی نے گورنر شپ قبول کرکے بلوچستان کے خلاف آپریشن میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ آج بھی عطاءاللہ مینگل کے حامی کہتے ہیں کہ ہم جب بھی مینگل صاحب کی آنکھوں میں جھانکتے ہیں تو اسد مینگل کی قبر کی تلاش کی خواہش نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حکومت کی غلطیوں نے اکبر بگٹی کو بلوچوں کا متفقہ لیڈر بنا دیا ہے۔ وہ اب تاریخ کا قرض اتارنا چاہتے ہیں۔ اسلام آباد کے فوجی مراکز اور اکبر بگٹی کے درمیان سیاسی رابطے سرانجام دینے والے الٰہی بخش سومرو کا کہنا ہے کہ بھٹو مرحوم ذہین تھے کہ انہوں نے اکبر بگٹی اور دوسرے بلوچ سرداروں کو ساتھ ملا کر بلوچوں کے خلاف آپریشن کیا تھا۔ موجودہ حکومت کی غلط پالیسی کے نتیجے میں تمام بلوچ سردار اسلام آباد کے مخالف ہوگئے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اپنی بیٹی بےنظیر بھٹو کے نام آخری خط میں لکھا تھا کہ آپریشن کے دوران راولپنڈی میں انہوں نے اکبر بگٹی کو سزائے موت سے بچانے کے لیے نیم بےہوشی میں دعائیں مانگی تھیں، لیکن یہ بھی المیہ ہے کہ بھٹو کی پھانسی کے موقع پر ان بلوچ رہنماؤں نے خوشی کا اظہار کیا تھا، جو بھٹو دور کے آپریشن کا ہدف بنے تھے۔

نواب اکبر بگٹی نے اے آر ڈی اور دیگر سیاسی جماعتوں سے ملاقاتوں کے بعد تمام بلوچ رہنماؤں کے متفقہ سیاسی پلیٹ فارم کی تشکیل کی تجویز دیتے ہوئے اپنی سیاسی جماعت جمہوری وطن پارٹی کی تحلیل کی پھر پیشکش کی ہے۔

کیا سارے بلوچ سردار اکبر بگٹی کے ساتھ ہیں؟ اس کا فیصلہ تو آنے والے وقت

کرے گا، تاہم نواب اکبر بگٹی نے ڈیرہ بگٹی کو بلوچستان کی تحریک مزاحمت کے سیاسی مرکز میں تبدیل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور تمام بلوچ اس وقت سیاسی ذہنی اور فکری طور پر ان کے ساتھ ہیں۔ نواب اکبر بگٹی نے فیصلہ کن سیاسی جنگ لڑنے کا جو عہد کیا ہے اس میں ان کی سیاسی صلاحیتوں کے علاوہ بلوچستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے کردار کو بھی بڑا دخل ہے۔

گزشتہ سال بی بی سی ٹیلی ویژن نے نواب اکبر بگٹی کی ''آتشی خندق'' کے بارے میں ایک خصوصی رپورٹ ٹیلی کاسٹ کی تھی۔ اس رپورٹ میں اس آتشی خندق کو دکھایا گیا تھا، جہاں نواب اکبر بگٹی کے حکم پر کسی بھی ملزم کو آگ کے انگاروں پر چلایا جاتا ہے۔ آتشی خندق کی روایت پہلے مکران کے رند بلوچوں اور دیگر بلوچ قبیلوں میں بھی تھی، لیکن اب فقط بگٹی قبیلے میں یہ روایت موجود ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ نواب اکبر بگٹی خود سیاست کی آتشی خندق میں کود گئے ہیں، یہ ان کا بہت بڑا امتحان ہے۔ انہوں نے قبیلے کے سردار کی حیثیت سے ہزاروں بگٹیوں کو آگ کے انگاروں پر چلایا تھا۔ تاریخ کا سفر دیکھئے کہ وہ قومی سیاست میں ''آتشی خندق'' پر پورے بلوچستان کو لے کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ یہ تاریخ کا جبر ہے یا بلوچستان کے قبائلی نظام کا انہدام، یہ فیصلہ ہونے کا وقت بھی شاید آپہنچا ہے۔

ڈیرہ بگٹی میں ایک مخصوص کھیت ہے جہاں کچی زمین پر ایک مخصوص خندق کھودی جاتی ہے۔ جب بھی بگٹی قبیلے کا کوئی فرد جرم کرتا ہے تو پھر بگٹی قبیلے کی روایات کے مطابق سردار نواب اکبر بگٹی کی ہدایت پر اسے آگ سے گزارا جاتا ہے، یہ آتشی خندق قبائلی روایات کے تحت دو فٹ چوڑی، ڈیڑھ فٹ گہری اور اکیس فٹ لمبی ہوتی ہے۔ آتشی خندق کے لیے ایک مخصوص قسم کے کھوڑ درخت کی لکڑی کو استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مخصوص لکڑی بہت جلد آگ پکڑ کر دہکتے ہوئے کوئلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بگٹی قبیلے کی روایات کے تحت صدیوں سے اس ''نظام انصاف'' پر عمل کیا جا رہا ہے جو بنیادی طور پر اپنی نوعیت کی پوری دنیا میں واحد ''آتشی عدالت'' ہے۔ جب آتشی خندق کو دہکایا جاتا ہے تو اطراف میں بگٹی مسلح افراد جدید رائفلیں لے کر کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ اس امر کا مظہر ہوتا ہے کہ ملزم راہ فرار اختیار نہ کر سکے۔ آتی خندق کے پاس ہی سوتی قالین پر نواب اکبر بگٹی خود مسلح محافظوں کی

معیت میں بیٹھے رہتے ہیں پہلے قبیلے کے معززین ملزم کے تلووں کو دیکھتے ہیں کہ اس کے پاؤں صحت مند ہیں اور وہ انگاروں پر چلانے کے قابل ہے۔ اس کے بعد نواب اکبر بگٹی خود اپنے ہاتھ سے قرآن شریف کا ایک نسخہ اور ناشپاتی کے درخت کے سات پتے مسجد کے امام کو دیتے ہیں، وہ آتشی خندق کے کے گرد چکر لگاتے ہوئے آیات قرآن شریف پڑھتے ہیں۔ آخری چکر پر امام مسجد مغرب کی طرف منہ کر کے ملزم کا نام لے کر اللہ تعالیٰ سے آسمان کی طرف چہرہ کر کے استدعا کرتے ہیں کہ اگر ملزم بے قصور ہے تو اسے آگ سے محفوظ رکھ اور اگر اس نے سنگین جرم کیا ہے تو اس کے پاؤں جل جائیں۔ اس کے بعد ناشپاتی کے درخت کی سات پتیاں آتشی خندق میں پھینکی جاتی ہیں اور آتشی خندق کے نزدیک دو بکریاں ذبح کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ملزم کو آتشی خندق سے گزارا جاتا ہے۔

نواب اکبر بگٹی اپنی زندگی کے ایک بڑے امتحان اور تاریخ کی آتشی خندق سے گزارے جا رہے ہیں۔ اپنے صاحب زادوں سلیم بگٹی کی موت اور بلال بگٹی کے قتل کے بعد بھی نواب اکبر بگٹی نے بھرپور سیاسی اعتماد کا ثبوت دیا ہے۔ مقتدر طاقتیں نواب اکبر بگٹی کو ڈیرہ بگٹی تک محدود رکھنے میں ناکام نظر آتی ہیں۔ ٹیلی فون کا رابطہ منقطع ہو جانے کے باوجود بھی نواب اکبر بگٹی کی آواز پوری دنیا میں گونج رہی ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی کی پروفیسر میری این ویوز نے بلوچستان میں ڈیڑھ سال قیام کرنے کے بعد اس صوبے کے بارے میں تحقیق کی تھی۔ ساڑھے پانچ سو صفحات پر مبنی یہ تحقیقی مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ اس نے آتشی خندق کے متعلق اکبر بگٹی سے پوچھا تھا۔ لاہور کے ایچی سن کالج سے تعلیم حاصل کرنے والے بلوچستان کے سابق گورنر و وزیر اعلیٰ اکبر بگٹی نے امریکی پروفیسر سے کہا تھا ''شیخ سعدی کہتے ہیں کہ تم پیدا ہو کر بوڑھے ہو جاتے ہو، مہد سے لحد تک علم حاصل کرتے ہو اور علم کی کھوج میں نکلتے ہو۔ علم کی تلاش کرتے ہو، علم کے متعلق گہرائی پر سوچتے ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم کی گہرائیوں کو کوئی نہیں پا سکتا۔ میں بھی اسی طرح آتشی خندق کی آگ کی تفصیل اور حقیقت بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میں تو خود چاہتا ہوں کہ کوئی اہل علم مجھے بتائے کہ یہ سب کیا ہے؟''

ڈیرہ بگٹی میں ایک قیدی کی طرح محصور نواب اکبر بگٹی نے برسوں کے بعد پوری

دنیا کی توجہ اپنی طرف مرکوز کروالی ہے۔ وہ انسانی المیوں کی گہرائی کو سمجھنے لگے ہیں۔ وہ ملکی سیاست کے نشیب و فراز سے واقف ہیں اور پاکستان میں اقتدار کے سیاسی کھیل کے تضادات سے بھی آگاہ ہیں۔ تاریخ کی ''آتشی خندق'' پر اکبر بگٹی یکسوئی اور توجہ کے ساتھ بلوچستان کے تمام سرداروں کو ساتھ لے کھڑے ہوگئے ہیں۔ ماضی کو نظر انداز کر کے زندگی کی آخری سیاسی جنگ نواب اکبر بگٹی پوری قوت اور ہمت سے لڑ رہے ہیں۔ اکبر بگٹی نے اہل قلم کے ساتھ مل کر جنگ لڑی ہے، ملک کے اہم پریس کلبوں میں پریس کانفرنس کر کے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے 1973ء میں اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ دیا تھا، مگر آج پوری اسٹیبلشمنٹ اس ''باغی سردار'' کے خلاف ہے۔

بلوچستان کے تمام سردار ماضی کے اختلافات نظر انداز کر کے ڈیرہ بگٹی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ملک کی تمام سیاسی جماعتیں اکبر بگٹی سے ہمدردی رکھتی ہیں۔ یہ اکبر بگٹی صاحب کی سیاسی فراست ہے یا ملک کی سیاسی صورتحال کا جبر؟ ایک بلوچ سیاست داں نے کہا ہے کہ ہمارا مقابلہ ایک فوجی ادارہ سے ہے، ہم مار نہیں سکتے لیکن مر ضرور سکتے ہیں۔ یہ ہی جملہ عطاءاللہ مینگل نے ڈیرہ بگٹی کے سانحے سے قبل اپنی تقریر میں کراچی پریس کلب کے باہر کہا تھا۔

سنگین خدشات اور غافل قیادت

ہم اس کرہ ارض پر بسنے والے واحد ایسے ملک سے تعلق رکھتے ہیں جس کی قیادت نے شاید ہی کبھی تاریخ یا اپنے ماضی سے سبق سیکھنے کی کوشش کی ہو۔ البتہ ماضی کے حوالے سے ایک دوسرے پر الزامات، حال کے حوالے سے خود کو عقل کل اور ٹرانسپرنٹ قرار دینا اور مستقبل کے حوالے سے ناقابل یقین ڈینگیں ہانکنا ہمارا قومی طرز عمل بنتا جا رہا ہے۔

بلوچستان کے حوالے سے قائم ہونے والی ایک پارلیمانی کمیٹی نے تین چار ماہ کی عرق ریزی کے اور متعلقہ عناصر سے طویل مذاکرات اور مشاورت کے بعد اس مسئلے کے حل کی کچھ راہیں تلاش کیں لیکن انہیں بھی شاید داخل دفتر کر دیا گیا۔ اس صورت حال سے تنگ آ کر سینیٹر پروفیسر خورشید احمد نے بلوچستان، سلگتے مسائل غافل قیادت کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس کا مطالعہ تاریخ اور پاکستانیات کے طالبعلم کے لیے لازم ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ تاریخ سے سبق کم ہی لیا جاتا ہے اور ہر دور میں مغرور اور خودسر حکمران وہی غلطیاں دہراتے چلے جاتے ہیں، جن کے سبب ان کے پیش رو عبرت کا نشان بنے تھے۔ یہ مقولہ کہ ''جب روم جل رہا تھا تو نیرو بانسری بجانے میں مشغول تھا'' ضرب المثل بن گیا چنانچہ ہر دور کے نیرو اپنی اپنی دلچسپی کے شغل میں منہمک نظر آتے ہیں اور جلتے در و دیوار انہیں اپنے خواب غفلت سے بیدار کرنے میں ناکام رہتے

ہیں۔ ہماری اپنی خود پسند قیادت کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔

مشرقی پاکستان میں بھی آئینی اداروں کے کردار کو تسلیم کرنے سے انکار کے نتیجے میں محرومی اور بے چینی کا لاوا پک رہا تھا، تو اس وقت کا فوجی حکمران اسے "چند شر پسندوں کی بغاوت" قرار دے کر اعلان کر رہا تھا کہ "میں ہتھیاروں کی زبان استعمال کر کے سب کو سرنگوں کر لوں گا"۔

جن اہل دانش نے اس کو مشورہ دیا کہ ہتھیاروں کی زبان نہیں، دلیل کا ہتھیار استعمال کرو تو اس نے اسے کمزوری اور بزدلی قرار دے کر رد کر دیا اور پھر اسی سال 16 دسمبر کو قائداعظم کے پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ آج ایک دوسرا فوجی حکمران پھر طاقت کی زبان استعمال کرنے کی باتیں کر رہا ہے۔ اور "شر پسندوں کو سخت کاروائی کا انتباہ" دے رہا ہے، سیاسی قیادت جو حالات کی نزاکت کو محسوس کرتی ہے اور مسئلے کا سیاسی حل نکالنا چاہتی ہے افسوس ہے کہ وہ کمزوری، غفلت اور وقت گزاری کی مرتکب ہو رہی ہے۔ پارلیمنٹ موجود ہے مگر اسے اس مسئلے پر بحث کرنے اور اس کا حل نکالنے کی اجازت نہیں۔ ایک پارلیمانی کمیٹی نے تین چار مہینے تگ ودو اور تمام متعلقہ عناصر سے کامیاب مذاکرات کے ذریعے مسئلے کے حل کی کچھ واضح راہیں تلاش کیں، مگر اس کا کام بھی معرض خطر میں ہے......

آخر اس دلدل سے نکلنے کی کیا راہ ہے؟ مستقبل پر بات کرنے سے پہلے صحیح صورت حال، اصل مسائل اور ان کا حل کے نقشہ راہ پر گفتگو ہو جائے تو پھر شاید سنگ ہائے راہ سے نجات کا راستہ بھی نکالا جا سکے۔

بلوچستان پاکستان کے رقبے کا 45 فیصد اور آبادی کے تقریباً 6 فیصد پر مشتمل ہے۔ تقریباً 900 کلومیٹر کا ساحلی علاقہ اور ایران اور افغانستان سے سینکڑوں کلومیٹر کی مشترک سرحد ہے۔ تیل، گیس، کوئلے اور دوسری قیمتی معدنیات سے مالا مال ہونے کے باوجود اس وقت یہ ملک کا غریب ترین صوبہ ہے۔ بلوچ اور پشتون، آبادی کا تقریباً 88 فیصد ہیں اور آپس میں برابر برابر ہیں، جب کہ باقی 12 فیصد وہ آبادکار (settlers) ہیں جو آہستہ آہستہ اس سرزمین کا حصہ بن چکے ہیں۔ قبائلی نظام اب بھی مضبوط ہے اور اس کی روایات معاشرے کی شناخت ہیں۔ معاشی ڈھانچہ نا ہونے کے برابر ہے اور آبادی کے

دور دراز علاقوں تک پھیلے ہونے کی وجہ سے مواصلات اور سہولتوں کی فراہمی کا کام مشکل اور نسبتاً مہنگا ہے۔ جو سہولت دوسرے صوبوں میں مثال کے طور پر ایک کروڑ روپے کے خرچ سے میسر آ سکتی ہے صوبہ بلوچستان میں تین سے چار گنا زیادہ اخراجات درکار ہیں۔ اس بنیادی حقیقت کو کسی حکومت نے محسوس نہیں کیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وسائل کی فراہمی کا کام کبھی بھی اس صوبے کے لیے انصاف اور ضروریات کی بنیاد پر نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان میں، دیہی علاقے میں غربت پاکستان کی اوسط غربت سے تقریباً دگنی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ وہ گیس جو سوئی سے نکل کر کراچی سے پشاور تک روشنی اور حرارت فراہم کر رہی ہے خود سوئی کی 99 فیصد آبادی اور بلوچستان کی 95 فیصد آبادی اس کی روشنی اور تمازت سے محروم ہے۔

موجودہ حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس صوبے کے لیے کئی بڑے منصوبے (mega projects) اور ڈھائی ہزار کے قریب دوسرے ترقیاتی منصوبے زیر تکمیل ہیں اور چھ سال میں 120 ارب روپے اس کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ میرانی ڈیم، گوادر پورٹ اور مکران ہائی وے پر کام اس کا کارنامہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے باوجود بلوچستان میں نفرت اور بے چینی کی لہریں کیوں اٹھ رہی ہیں؟ عالم یہ ہے کہ 2003ء اور 2004ء کے دو سال میں 1529 راکٹ فائر کیے گئے ہیں، 113 بم دھماکے ہوئے ہیں، تین چینی انجینئر ہلاک ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ 100 سے زیادہ افراد اب تک جاں بحق ہو چکے ہیں اور کئی سو زخمی۔ بگٹی علاقے کا محاصرہ ہے، ڈاکٹر شازیہ کا المناک واقعہ رونما ہوا ہے اور جب سوئی گیس کی رسد متاثر ہوتی ہے، اور یہ بار بار ہوئی ہے تو ملک کو روزانہ نقصان 15 سے 20 کروڑ روپے کا ہوتا ہے۔ انسانی جانوں کا ضیاع سب سے بڑا المیہ ہے جس کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔

یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ کیا یہ محض چند سرداروں کی سرکشی شرارت ہے جو اپنے ذاتی فائدے کی خاطر صوبے کو یرغمال بنائے ہوئے ہیں؟ کیا اس میں بیرونی ہاتھ ملوث ہے کہ بھارت کے اپنے عزائم ہیں اور وہ گوادر بندرگاہ کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ امریکہ کی اپنی سوچ ہے اور بلوچستان میں چین کے عمل دخل پر وہ مضطرب ہے۔ گوادر ہو یا سینڈک، ہر

جگہ اسے چینیوں کا کردار نظر آتا ہے۔ ایران کے حوالے سے امریکہ کے خفیہ اداروں کا کردار اور بلوچستان کی سرزمین سے خلق کے مجاہدین کے احیا کے اشارے مل رہے ہیں جن کو قوم پرست کہا جاتا ہے، ان کے اپنے اہداف ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ان سب نظریات اور تصورات میں کچھ نہ کچھ صداقت بھی ہو سکتی ہے لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ مخالف قوتیں حالات کو اسی وقت استعمال کر سکتی ہیں جب ان کے لیے حالات سازگار ہوں اور بگاڑ موجود ہو اور مسائل کو بروقت اور صحیح طریقے پر حل کرنے کی کوشش نہ کی جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ بس قوت کے ذریعے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

مجھے پچھلے سال بلوچستان کے حالات کا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کرنے اور صوبے کے چند اہم مقامات کا تفصیلی دورہ کرنے، بچشم خود حالات کا مشاہدہ کرنے اور درجنوں ذمہ دار افراد سے حقائق کو جاننے اور مسائل کو سمجھنے کا موقع ملا۔ جہاں مجھے یقین ہے کہ آج بھی تمام معاملات سیاسی عمل اور افہام و تفہیم کے ذریعے حل ہو سکتے ہیں، وہیں میرا یہ احساس اور بھی قوی ہو گیا ہے کہ کچھ برسراقتدار قوتیں مسائل کو حل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں بلکہ انہیں مزید الجھانے اور بگاڑنے کے درپے ہیں۔ اس کی نمایاں ترین مثال وہ پارلیمانی کمیٹی ہے جس کا اعلان چودھری شجاعت حسین نے اپنی وزارت عظمیٰ کے مختصر دور میں کیا تھا اور جو اس حیثیت سے ایک منفرد کمیٹی تھی کہ اس میں پارلیمنٹ کی تمام سیاسی جماعتیں شریک تھیں بشمول قوم پرست جماعتیں، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس میں برسراقتدار جماعتیں اور اس کے حلیفوں کے نمائندوں کی تعداد 16 تھی، جب کہ حزب اختلاف سے متعلق نمائندوں کی تعداد 22 تھی۔ یہ کمیٹی 17 اکتوبر 2004ء کو قائم ہوئی اور اسے 90 دن میں اپنا کام مکمل کر لینا تھا۔

اس پارلیمانی کمیٹی نے مزید دو کمیٹیاں قائم کیں: ایک سینیٹر وسیم سجاد کی سربراہی میں جس کا کام دستوری معاملات پر سفارشات مرتب کرنا تھا۔ مجھے دوسری کمیٹی میں کام کرنے کا موقع ملا اور مجھے خوشی ہے کہ اس کمیٹی نے کھلے دل سے اور صرف ملک کے مفاد میں اپنی پوری کارروائی کی اور جماعتی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر، ملک کے مفاد اور انصاف کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اپنی متفقہ سفارشات مرتب کیں جن کو 5 جنوری 2005ء کو آخری

شکل دے دی گئی لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ سفارشات آج تک پارلیمنٹ کے سامنے باضابطہ طور پر نہیں آسکی ہیں، ان پر عمل درآمد کی بات تو دور کی چیز ہے۔ اس عرصے میں (مارچ 2005ء) کے سنگین واقعات رونما ہوئے جن کے نتیجے میں حالات مزید بگڑ گئے اور اس وقت طوفان کچھ تھما ہوا ہے مگر لاوہ پک رہا ہے اور حکمران اپنی ''راج ہٹ'' پر نازاں اور کمیٹی کے ارکان اس تغافل پر نالاں ہیں۔

یہ کہنا محال ہے کہ کمیٹی اپنی رپورٹ کب اور کس طرح پیش کر پاتی ہے لیکن ہماری نگاہ میں وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی ذمہ داری پر اس نقطۂ نظر اور ان سفارشات کے جوہر کو بیان کر دیں جو کمیٹی کی اکثریت کی سوچ کی نمائندگی کرتی ہیں اور جس کو ایک متعین شکل دینے میں دوسرے ارکان کے ساتھ راقم نے بھی ایک واضح کردار ادا کیا ہے۔ ہمیں اس بات کو بھی ریکارڈ پر لانے میں کوئی تردد نہیں کہ سینیٹر مشاہد حسین سید اور خود چودھری شجاعت حسین کا رویہ مثبت رہا، البتہ ہمارے بار بار کے اصرار کے باوجود، وہ معاملات کو آگے بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں، معلوم نہیں کیوں؟

ہماری نگاہ میں مسئلے کے حل کے لیے سب سے پہلے چند بنیادوں کا تعین اور چند حقائق کا ادراک ضروری ہے اور ہم نے یہی چیز کمیٹی سے تسلیم کروانے کی کوشش کی:

1۔ مسئلے کا کوئی فوجی حل ممکن نہیں۔ مسئلہ سیاسی ہے اور اس کا حل بھی سیاسی ہو سکتا ہے۔

2۔ مسئلے کے حل کے لیے تمام متعلقہ عناصر کو افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کرنا ہو گا اور کوشش کرنا ہو گی کہ مکمل اتفاق رائے اور بصورت دیگر اکثریت کے مشورے سے معاملات کو طے کیا جائے۔

3۔ یہ اصول تسلیم کیا جانا چاہیے کہ محض ''مضبوط مرکز'' کا فلسفہ غلط اور انصاف کے اصولوں کے منافی ہے۔ ''مضبوط مرکز'' اسی وقت ممکن ہے جب صوبے مضبوط ہوں اور کامل ہم آہنگی سے ایک دوسرے کے لیے مضبوطی کا ذریعہ اور وسیلہ بنیں۔ اب توجہ کے اصل محور کو مرکز سے صوبوں کی مضبوطی سے اس انداز سے منتقل ہونا چاہیے کہ مضبوط صوبے مضبوط مرکز کی راہ ہموار کریں۔ مرکز اور صوبوں میں dichotomy کی جگہ مفاہمت، ہم آہنگی اور mutuality کا رشتہ ہونا چاہیے۔ 1973ء کے

دستور کا بھی یہی تقاضا تھا جسے پورا نہیں کیا گیا۔

4۔ چوتھا بنیادی اصول یہ ہے کہ جس طرح زنجیر کی مضبوطی کا انحصار اس کی کمزور ترین کڑی پر ہوتا ہے، اسی طرح ملک کی مضبوطی کے لیے بھی ضروری ہے کہ کمزور اور غریب طبقے کو اتنا مضبوط کیا جائے اور اس سطح پر لایا جائے کہ سب برابر کی مضبوطی اور خوشی حالی کے مقام پر آ جائیں۔ دوسرے الفاظ میں سب انصاف کے حصول کمزور کو مضبوط بنانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں۔ انصاف نام ہی توازن اور برابری کا ہے اور یہی چیز آج تک ہماری معاشی منصوبہ بندی اور سیاسی پالیسی میں مفقود رہی ہے۔

5۔ اس پورے عمل میں اصل اہمیت افراد، علاقے، صوبے اور پوری قوم کے حقوق کا تحفظ اور سیاسی اور معاشی عمل میں تمام عاملین کی بھرپور شرکت اور کارفرمائی کو حاصل ہے۔ فرد واحد کی حکومت یا محض ایک خاص گروہ اور مقتدر گروہ کے ہاتھوں میں قوت اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت کا ارتکاز خرابی کی جڑ ہے۔ مسئلہ معاشی ہے مگر اس سے بھی زیادہ صوبوں کے اپنے وسائل پر اختیار اور سیاسی اور معاشی فیصلوں میں شرکت اور ترجیحات کے تعین کی قدرت کا ہے۔ منہ بند کرنے کے لیے کچھ گرانٹس یا مراعات کے دے دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ ملکیت، اختیار اور اقتدار اور فیصلوں میں شرکت کے انتظام کو ازسرنو مرتب کرنا اصل ضرورت ہے۔

6۔ اس سلسلے میں فوج کا کردار بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ فوج کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف اور صرف دفاع وطن کی ذمہ داری سول حکمرانی کے تحت انجام دے۔ ساری خرابیوں کی جڑ سیاسی اور اجتماعی معاملات میں فوج کی مداخلت اور ایک مقتدر سیاسی قوت بن جانا ہے۔ چھاؤنیوں کی ضرورت اگر ملک کے دفاع اور سلامتی کے لیے ہے تو وہ مسئلہ میرٹ پر طے ہونا چاہیے لیکن اگر لوگوں کو یہ خطرہ ہو کہ یہ چھاؤنیاں سول نظام کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے ہیں تو پھر اس کے نتیجے میں سول عناصر اور فوجی قوت کے درمیان کش مکش ناگزیر ہو جاتی ہے۔ فوج کے سوچنے کا انداز (mind-set) سول نظام سے بہت مختلف ہے اور دونوں کا اپنے اپنے حدود میں رہ کر تعاون ہی ملک کے نظام کی صحت کی ضمانت ہوسکتا ہے۔ تحکمانہ انداز بگاڑ پیدا کرتا

ہے، اس سے خیر رونما نہیں ہوسکتا، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ کمیٹی فوجی چھاؤنیوں کے قیام کے بارے میں احتیاط کا مشورہ دے رہی ہے مگر فوج کے ترجمان کیا زبان استعمال کر رہے ہیں، جب کہ 27 جنوری 2005ء کے ڈان میں فوج کے ایک کرنل صاحب کا سوئی میں فوجی چھاؤنی کے بارے میں اس طرح کا اعلان اصلاح احوال کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہے؟

''ہم یہاں آئے ہیں اور ہم نے پاکستان آرمی کو الاٹ شدہ 1400 ایکڑ زمین پر قبضہ حاصل (We have taken over) کر لیا ہے۔ ہم یہاں جلد ہی ایک چھاؤنی تعمیر کریں گے جو اس علاقے کی ضرورت ہے۔ آج آپ کو یہاں صرف ریت کے ٹیلے نظر آئیں گے لیکن ایک بہت ہی مختصر مدت میں چھاؤنی کی تعمیر کی جائے گی اور ریت کے تودے سرسبز زمین میں تبدیل ہو جائیں گے۔''

یہ وہی منطق ہے جس کا اظہار برطانوی سامراج کی افواج اور حکمران کیا کرتے تھے کہ ہم نے مقبوضہ علاقوں کو ترقی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ ترقی بلاشبہ مطلوب ہے مگر اس انداز میں کہ رشتہ حاکم اور محکوم کا نہ ہو بلکہ سب کے فیصلے سے اور سب کی شراکت سے معاملات طے ہوں۔ وسائل پر اختیار بھی آزادی کا لازمی حصہ ہے۔ محض سبزہ اگانا اور روٹی دینا ترقی کا معیار نہیں۔

ان اصولوں کی روشنی میں کمیٹی کے ارکان کی اکثریت نے جو تجاویز دی ہیں، ان میں چند اہم یہ ہیں۔

اول: حقیقی صوبائی خود مختاری کے تقاضے پورا کرتے ہوئے دستور میں مرقوم مشترک فہرست (concurrent list) کے 46 موضوعات میں سے 29 کو فی الفور صوبوں کے سپرد کر دیا جائے، باقی 17 اگلے پانچ سال کے اندر اندر منتقل کر دیے جائیں۔ دستور کی مرکزی فہرست کے دوسرے حصے میں جو موضوعات ہیں وہ آئندہ کے لیے مشترک فہرست میں شامل کر دیے جائیں۔ نیز مشترک معاملات کی کونسل (Council of Common Interest) کو ایک موثر ادارہ بنایا جائے اور اس کی شش ماہی نشستوں کو دستوری طور پر لازم قرار دیا جائے۔ اس کا اپنا سیکرٹریٹ

ہوتا کہ یہ دوسروں کی مہربانی پر زندہ نہ رہے۔

دوم: سیاسی فضا کو خوش گوار بنانے کے لیے ہر طرح کے عسکری تشدد کا راستہ بند کیا جائے، مذاکرات سے معاملات طے کیے جائیں، اور جو سیاسی کارکن گرفتار ہیں، ریاستی اور سیاسی ان کی رہائی کا اہتمام کیا جائے۔

سوم: صوبے کو اپنے وسائل پر اختیار دیا جائے اور مرکز سے جو وسائل منتقل ہوتے ہیں، ان میں انصاف اور ضرورت کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس سلسلے میں گیس اور معدنیات کی رائلٹی کو نئے فارمولے کی روشنی میں انصاف کے مطابق مقرر کیا جائے۔

چہارم: معاشی ترقی کے ثمرات کو علاقے کے عوام تک پہنچانے کا بندوبست ہو۔ اس کے لیے تجویز کیا گیا ہے کہ معدنی وسائل کو دریافت کرنے اور ترقی دینے والی کمپنیوں کے لیے لازم کیا جائے کہ وہ اپنی کل سرمایہ کاری (investment) کا کم از کم پانچ فیصد علاقے کے لوگوں کی تعلیم، صحت اور دوسری سہولتوں کی فراہمی کے لیے استعمال کیا جائے، نیز معدنیات کی ترقی کے بعد ان کمپنیاں کے نفع کا 15 فیصد اس علاقے کی ترقی کے لیے صرف کیا جائے۔

پنجم: صوبے میں تعلیم، صحت، پانی کی فراہمی، بجلی اور گیس کی فراہمی وغیرہ کا خصوصی اہتمام کیا جائے اور ملازمتوں پر مقامی آبادی اور صوبے کے لوگوں کو ترجیح دی جائے، اور یہ سب کام میرٹ کی بنیاد پر انجام دینے کے لیے مقامی آبادی کی تعلیم، پیشہ ورانہ تربیت اور ہنر سکھانے کا انتظام کیا جائے۔

ششم: فرنٹیئر کور اور کوسٹل گارڈ کو صرف ساحلی علاقوں اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے مختص کیا جائے اور ان کا سول کردار ختم کیا جائے۔ نیز اسمگلنگ روکنے کے نام پر جو 500 سے زیادہ چوکیاں قائم کر دی گئی ہیں، ان کو ختم کیا جائے۔ اسمگلنگ روکنے کا کام فرنٹیئر کانسٹیبلری اور کوسٹل گارڈ سے نہ لیا جائے بلکہ یہ ایکسائز ڈیپارٹمنٹ کی ذمہ داری ہو۔ اسی طرح فوجی چھاؤنیوں کا معاملہ سیاسی بحث و مناقشے کا حصہ نہ ہو اور صرف دفاعی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر میرٹ پر فیصلہ کیا جائے۔ فی الحال ان کے قیام کو ملتوی کر دیا جائے تاکہ بہتر فضا میں صحیح فیصلے ہو سکیں۔

ہفتم: گوادر پورٹ کی اتھارٹی کو فوری طور پر کراچی سے گوادر میں منتقل کیا جائے۔ اس میں صوبے کو مناسب نمائندگی دی جائے، اس کی ترقی کے پورے پروگرام میں صوبے کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ علاقے کے لوگوں کو ان کا حق ملے، زمینوں پر باہر والے قبضہ کر کے علاقے کی شناخت کو تبدیل نہ کر دیں اور جو متاثرین ہیں ان کو قریب ترین علاقے میں آباد کیا جائے۔ نیز اراضی کے بڑے بڑے قطعے جس طرح فوج، نیوی اور دوسرے بااثر افراد اور اداروں نے ہتھیا لیے ہیں ان کو سختی سے روکا جائے اور انصاف پر مبنی شفاف انداز میں پورے علاقے کا ماسٹر پلان از سر نو تیار کیا جائے۔

ہشتم: بلوچستان میں بلوچوں اور پشتونوں کے درمیان توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ صوبے کے تمام علاقوں اور باسیوں کی منصفانہ اور متوازن ترقی کے تقاضے بہرصورت پورے ہونے چاہییں۔ خصوصیت سے خشک سالی کی بنا پر جو علاقے گزشتہ آٹھ برس سے متاثر ہیں ان کی ترقی اور تلافی کا اہتمام کیا جائے۔

نہم: بلوچستان میں نظم و نسق کے روایتی انتظام کو جس میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت مقامی لیوی کو حاصل ہے، برقرار رکھا جائے اور اس کی ترقی کا اہتمام کیا جائے نہ کہ اس کو ختم کر کے پولیس کے نظام کو ان پر مسلط کیا جائے جو اس علاقے میں بھی ناکام ہے جہاں اس وقت اسے قدرت حاصل ہے۔

ہمارا مقصد کمیٹی کی مکمل سوچ کا احاطہ اور اس کی تمام سفارشات کا بیان نہیں ہے۔ ہم سوچ کے اس رخ کو سامنے لانا چاہتے ہیں جو پارلیمنٹ کی اس کمیٹی نے پیش کیا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے بلوچستان ہی نہیں، تمام صوبوں اور ملک کے سب علاقوں اور متاثرہ افراد کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ یہ سب صرف اسی وقت ممکن ہے جب اصل فیصلے پارلیمنٹ میں ہوں، عوام کے مشورے سے ہوں۔ مکالمے کے ذریعے سیاسی معاملات کو طے کیا جائے۔ مخصوص مفادات اور فوجی اور سول مقتدرہ (military-civil establishment) کی گرفت کو ختم کیا جائے، اور عوام اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے جمہوری اداروں کے ذریعے اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں۔

صوبائی قیادت کی بھی بڑی ذمہ داری ہے۔ بلوچستان کی صوبائی قیادتیں بھی حالات کے بگاڑ کے سلسلے میں ایک حد تک ذمہ دار رہی ہیں لیکن زیادہ ذمہ داری مرکزی قیادت اور خصوصیت سے حکمران طبقے پر عائد ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید یہی وہ طبقہ ہے جو پارلیمانی کمیٹی کے کام کے آگے بڑھنے کی راہ میں حائل ہے۔ مسئلے کا حل پارلیمنٹ، سیاسی جماعتوں اور عوام کے اپنے کردار کو موثر بنانے میں ہے، بقول اقبال

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

(ترجمان القرآن۔ جولائی 2005ء)

❖■❖■❖

گوادر......اصل مسئلہ کیا ہے؟

گوادر ایک فراموش کردہ ساحل سمندر پر واقع شہر اچانک پاکستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے دلچسپی اور ترغیب کا باعث بنتا جا رہا ہے۔ پراپرٹی ڈیلروں نے اچانک ایک بے آب و گیاہ ریتلے میدان پر دھاوا بول دیا ہے اور جہاں کبھی کوئی کوڑیوں کے مول زمین خریدنے کو تیار نہیں تھا وہاں آج لاکھوں کروڑوں کے سودے ہو رہے ہیں یوں دکھائی دے رہا ہے جیسے لاہور اور کراچی کے لینڈ مافیا نے گوادر کو بلوچستان کا اقلیتی شہر بنا ڈالا ہو۔ اس صورت حال نے بلوچوں میں شدید ردعمل پیدا کیا اور بلوچستان کی موجودہ مخدوش صورتحال میں گوادر فیکٹر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہر بلوچ لیڈر اس حوالے سے اپنے تحفظات کا اظہار برملا کر رہا ہے۔

گوادر کی اہمیت اور اصل مسئلہ جاننے سے پہلے 11 جولائی 2005ء کا روزنامہ نوائے وقت کا ایک ادارتی نوٹ ملاحظہ فرمائیں جس سے صورتحال کو جاننا آسان ہو جائے گا۔ اخبار لکھتا ہے۔

''قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے بندرگاہیں و جہاز رانی نے گوادر میں سرکاری زمین کی الاٹمنٹ میں بے قاعدگیوں کا سخت نوٹس لیتے ہوئے چیف سیکرٹری بلوچستان کو ہدایت کی ہے کہ وہ گوادر کی بندرگاہ کے لیے مخصوص زمین کی الاٹمنٹ اور فروخت کا تمام ریکارڈ کمیٹی کو فراہم کریں۔

قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی نے چیف سیکرٹری بلوچستان سے دریافت کیا ہے کہ گوادر

بندرگاہ کے لیے 43 ہزار ایکڑ زمین مختص کی گئی تھی مگر اب ایک ایکڑ زمین بھی موجود نہیں۔
بلوچستان میں گوادر کی بندرگاہ اور اس سے متعلق تمام امور اور متصل شہر کی آبادکاری کسی ایک منظم ادارے کا کام ہے۔ یہ کسی ایک فرد، پراپرٹی ڈیلرز یا نیلام کرنے والوں کا کام نہیں یہ ٹاؤن پلاننگ کے تربیت یافتہ اور گوادر کی بندرگاہ کی پاکستان اور بلوچستان کے لیے خصوصی اہمیت اور اس کو تمام تر پہلوؤں سے سوچ سمجھ کر ترقی دینے کی منصوبہ بندی کرنے والے اداروں کا فریضہ ہے اور بندرگاہ کے قریب زمین جن لوگوں کو فروخت کی جائے یا کسی معاہدہ کے تحت انہیں یہاں کاروباری ادارے یا عمارتیں بنانے کی اجازت دی جائے، انہیں آگاہ کیا جائے کہ مقامی آبادی کی اہمیت بہر طور قائم رہنی ضروری ہے۔ گوادر سٹی کے آس پاس علاقوں کی آبادکاری کرتے ہوئے اشتہارات میں ایسے سلوگن دینے کی بھی ممانعت کی جائے جس سے بلوچستان کے رہنے والوں کو یہ احساس ہو کہ اس خطہ میں ہزاروں اور لاکھوں لوگ باہر سے آجائیں گے جس کی وجہ سے بلوچستان کی اصل آبادی کم تر ہو جائے گی کیونکہ یہ اکیسویں صدی ہے سیاسی شعور کا زمانہ ہے۔ مقامی سیاسی و معاشرتی شناخت کو کسی قیمت پر بھی مٹانا مدھم کرنا یا گم کرنا تاریخ کے ساتھ مذاق ہوگا۔ نئے شہر کا سب سے بڑا اور اہم مقصد بلوچستان کے خطے یہاں کے عوام کو ترقی اور نئی روشنی سے ہمکنار کرنا ہے۔ یہاں کے تہذیب و تمدن کو ترقی دینا اسے مزید روشن کرنا ہے۔ بلوچستان کے ہر گوشے کو بلوچستان ہی رہنا چاہیے۔ گوادر میں غلط الاٹ منٹوں کے حوالے سے قومی اسمبلی میں بھی بحث ہوئی اور وفاقی وزیر زبیدہ جلال نے وزیر اعظم کو خط بھی لکھا، اب قائمہ کمیٹی نے بھی توجہ دلائی ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ قائمہ کمیٹی کے سوالات کا جواب دے اور تمام ناجائز الاٹ منٹیں منسوخ کر کے عوام کو مطمئن کرے۔ قومی اسمبلی کی مجلس قائمہ کو نہ صرف اس سلسلہ میں رہنما کردار ادا کرنا چاہیے بلکہ قدم قدم پر تعمیر نو کی ذمہ داری نبھانے والوں کی کڑی نگرانی بھی کرنی چاہیے۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور)

قائمہ کمیٹی برائے بندرگاہ و جہاز رانی کو یہ نوٹس لینے کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب انہیں علم ہوا کہ حکومت کی 43 ہزار ایکڑ زمین میں سے اب ایک ایکڑ زمین بھی باقی

نہیں بچی جبکہ حکومت کو گوادر ماسٹر پلان پر عملدرآمد کے لیے 17595 ایکڑ زمین درکار ہے شاید سنگھار ہاؤسنگ سکیم کی الاٹمنٹ بھی اسی لیے منسوخ کی گئی کہ کسی طرح سرکاری اراضی حاصل کی جاسکے۔ جو لوگ آج پراپرٹی ڈیلروں کے بہکاوے میں آکر دھڑا دھڑ زمینیں خرید رہے ہیں وہ انتہائی خسارے کا سودا کر رہے ہیں۔ اس امر کی جانب پاکستان کی سپریم کورٹ بھی توجہ دلا چکی ہے کہ مستقبل میں کہیں کوئی اور کرائسس پراپرٹی کے حوالے سے نہ کھڑا ہو جائے کیونکہ حکومت کو بہر حال بندرگاہ کمرشل و صنعتی اداروں، سڑکوں، ایئر پورٹ اور ریلوے سٹیشن کے لیے زمین درکار ہوگی اور جب حکومت یہ زمین خریدے گی تو نجانے اس کا کیا ریٹ مقرر کرے گی جبکہ گوادر میں آج کل 40 تا 50 لاکھ روپے فی ایکڑ زمین فروخت ہو رہی ہے۔

گوادر جو آج سرمایہ کاروں کی جنت بنا ہوا ہے ماضی قریب میں مچھیروں کی ایک معمولی سی بستی اور چند ہزار نفوس پر مشتمل چھوٹا سا شہر تھا جہاں کسی کو پینے کا میٹھا پانی بھی میسر نہیں تھا۔

بحیرہ عرب کے چھ سو میل طویل ساحل سمندر کے کنارے خلیج فارس کے دھانے پر تین اطراف سے سمندر سے گھرے کوہ باطل اور کوہ مہدی کے دامن میں واقع ہتھوڑا نما وادی جسے سکندر اعظم نے (ICHTHYOPHAGOI) ''اچھا تا ئیو فاگوئی'' یعنی مچھیروں کی بستی کا نام دیا تھا بڑی تیزی سے پاکستان کی تیسری بڑی بندرگاہ اور اکیسویں صدی کے جدید شہر کا روپ دھار رہی ہے۔

گوادر کے متعلق یونانی تاریخ دان آسٹرین لکھتے ہیں کہ یہاں کے رہنے والوں کی زندگی کا انحصار صرف اور صرف مچھلی پر ہے چھوٹی اور نرم و نازک مچھلی کو تو وہ سمندر سے نکالتے ہی چبا جاتے ہیں جبکہ بڑی مچھلیوں کو یہ تیز دھوپ میں سکھاتے ہیں ان کی چوڑی ہڈیوں سے دروازے بناتے ہیں ان کے جانور بھی مچھلی ہی کھاتے ہیں۔ ساحل گوادر کے ماہ گیر ہزاروں سال بعد آج بھی ذرائع آمد و رفت نہ ہونے اور مارکیٹ سے سینکڑوں میل دور ہونے کے باعث مچھلیاں خشک کر کے ہی سری لنکا اور دوسرے ممالک کو برآمد کرتے ہیں۔
ویسے گوادر کے لفظی معنی ''ہواؤں کا دروازہ'' ہے اور یہ نام شاید اسے یہاں چلنے والی سمندری

ہوا کے جھونکوں کے باعث دیا گیا ہے۔ سکندر اعظم کے ہندوستان سے مقدونیا جاتے ہوئے گوادر کے اس ذکر کے بعد پھر طویل عرصہ تک خاموشی رہی اور اس کا ذکر 16 ویں صدی میں ملتا ہے جب پرتگیزی ایشیا کے بحری راستوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ساحل مکران بھی ان پرتگیزیوں کی زد میں آ گیا۔ انہوں نے یہاں ماہی گیروں کی کشتیوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ گوادر، پسنی اور جیونی کئی بار ان کا نشانہ بنے اور 1581ء میں پرتگیزیوں نے پسنی اور گوادر کی بندرگاہوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اس وقت گوادر کی بندرگاہ ہوت قبیلہ کے پاس تھی۔ ہوت قبیلہ کے نوجوان سردار میر حمل نے پرتگیزیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا شروع کیا اور میر حمل اور پرتگیزی حملہ آوروں کے مابین معاہدہ طے پایا جس میں انہوں نے ساحل مکران پر لوٹ مار نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اس معاہدہ کے بعد مکران کی ویران بندرگاہیں پھر آباد ہو گئیں مگر بعد میں پرتگیزیوں نے معاہدہ کو توڑتے ہوئے بے خبری میں ایک ایسی کشتی پر حملہ کر دیا جس میں میر حمل بھی سوار تھا سخت مقابلہ کے بعد میری حمل زخمی حالت میں گرفتار ہوا۔ پرتگیزی اسے کچھ عرصہ مسقط میں رکھ کر اپنی نو آبادی گوا لے گئے جہاں بعد میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ہوت قبیلہ کے بعد گوادر کی بندرگاہ بلندیوں، گچکیوں اور خان آف قلات کے قبضہ میں آ گئی۔ خان قلات میر نصیر خان اول کے دور میں 1783ء میں سلطان مسقط نے اپنے چھوٹے بھائی سلطان جو کھیو کو ملک بدر کر دیا جو میر نصیر خان کے پاس پہنچا جنہوں نے سلطان بوسعید کو اس شرط پر گوادر کی بندرگاہ دے دی کہ جب تک وہ یہاں ہے اس کی آمدنی سے استفادہ کرے چند سال بعد سلطان بوسعید نے اپنے بھائی کا تختہ الٹ دیا اور مسقط کا حکمران بن گیا مگر اس نے گوادر پر اپنا قبضہ برقرار رکھا اس کے بعد جب خان قلات میر نصیر خان نوری نے اپنی بیٹی کی شادی لسبیلہ کے حکمراں جام غلام شاہ سے کی تو اپنی بیٹی بی بی سلطان خاتون کو گوادر کی بندرگاہ جہیز میں دے دی اس طرح گوادر جام حکمرانوں کی ریاست کا حصہ بن گیا۔ 1794ء میں مسقط کے حکمراں نے دوبارہ گوادر پر قبضہ کر لیا لیکن ایک ہی سال بعد جام میر خان نے گوادر پر دوبارہ قبضہ کر کے سلطان مسقط کے افراد کو وہاں سے نکال دیا مگر خان خانیداد خان کے دور میں سلطان مسقط نے ایک کشتی میں چند عرب بھیج کر گوادر پر

دوبارہ قبضہ کر لیا بعد میں جب انگریزوں نے برصغیر پر قبضہ کیا تو انہوں نے گوادر کو مسقط ہی کے پاس رہنے دیا اور 39-1838ء میں پہلی افغان جنگ کے دوران برطانوی حکمرانوں نے گوادر پر توجہ دی۔ 1861ء میں میجر گولڈ اسمتھ نے یہاں کا دورہ کیا اور 1863ء میں گوادر میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کی تعیناتی عمل میں آئی۔ قیام پاکستان کے گیارہ سال بعد حکومت پاکستان نے گوادر اور اس کے مضافات کا تقریباً 80 کلومیٹر علاقہ حکومت عمان سے خرید لیا اور گوادر پاکستان میں شامل ہو گیا۔ آج بھی گوادر کے پچاس فیصد باشندوں کے پاس پاکستان اور عمان کی دوہری شہریت ہے اور ایک طویل عرصہ تک عمان کی فوج میں اکثریت مکران ہی کے باشندوں کی تھی۔

گوادر 1958ء میں پاکستان میں شامل تو ہو گیا مگر یہاں کے غریب ماہی گیروں کی قسمت تبدیل نہیں ہو سکی یہاں نہ بندرگاہ بنی نہ سڑکیں اور دوسری بنیادی سہولتیں دیکھنے میں آئیں۔ بیس پچیس سال قبل تو یہاں یہ حال تھا کہ یہاں پینے کا صاف شفاف پانی تک دستیاب نہیں تھا اور ہم نے خود لوگوں کو صاف شفاف پانی جسے وہ سونے سے زیادہ قیمتی سمجھتے تھے لوہے کے بکسوں میں تالے کی حفاظت میں رکھتے دیکھا ہے۔ بعد میں گوادر کے پاس اکڑہ کور ڈیم بنا تو لوگوں کو پینے کا صاف شفاف پانی میسر آیا بعد میں یہاں ایک منی پورٹ قائم کی گئی مگر اس کا مقامی ماہی گیروں کو اس لیے زیادہ فائدہ نہیں ہوا کہ گوادر سے کراچی تک مچھلی پہنچانے کے لئے سڑکیں تک نہیں تھیں۔ گوادر سے کراچی گاڑی 48 گھنٹوں میں پہنچتی تھی۔ گوادر کا تو یہ حال تھا کہ 2002ء تک یہ دنیا کا وہ واحد شہر تھا کہ جس کے آدھے حصے کو ایک دن اور آدھے حصے کو دوسرے دن بجلی فراہم کی جاتی تھی۔ ہر آنے والی حکومت نے گوادر اور مکران کے لوگوں کو اچھے دنوں کی نوید سنائی مگر یہ وعدے کبھی پورے نہیں ہوئے بلکہ اس دوران گوادر کے حوالے سے کئی اسکینڈل سننے میں آئے جن میں گوادر کی فروخت، اسے بین الاقوامی شہر بنانے اور یہاں امریکی اڈے قائم کرنے جیسے اسکینڈل شامل تھے۔

آج ملک کے کونے کونے سے "گوادر چلو" کی دلکش پیش کشیں کی جا رہی ہیں، جبکہ دوسری جانب ملک دشمن قوتیں ان کوششوں میں مصروف ہیں کہ گوادر پاکستان کی تیسری بندرگاہ اور دنیا کے ایک جدید شہر کے طور پر ابھر کر سامنے نہ آ سکے۔ کوئٹہ میں گوادر میں سرمایہ

کاری کے موضوع پر بین الاقوامی سرمایہ کاری کانفرنس ہوئی تو اس کانفرنس سے صرف پانچ روز قبل گوادر میں ریموٹ کنٹرول کار بم دھماکے کے ذریعے گوادر ڈیپ سی پورٹ پر کام کرنے والے چینی انجینئروں کو نشانہ بنایا گیا، اس حادثے میں تین چینی انجینئر جاں بحق ہوگئے اور حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ اس حملے کا اصل نشانہ چینی انجینئر نہیں، بلکہ گوادر تھا اور اس کا مقصد گوادر کو دبئی بننے سے روکنا تھا۔

گوادر کے پاکستان میں شامل ہونے کے بعد یہاں کی قسمت تو نہ بدل سکی، البتہ اسی دوران گوادر سپر طاقتوں خصوصاً سوویت یونین کی خصوصی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ سوویت یونین کو تو بحیرہ عرب کے گرم پانی کے سمندر تک رسائی کے لیے گوادر سے خصوصی دلچسپی تھی اور اس نے گرم پانی کے ساحل سمندر تک پہنچنے کے لئے کیا کیا سازشیں نہیں کی۔ کبھی آزاد بلوچستان اور کبھی آزاد پختونستان کی تحریکیں چلیں، مگر سوویت یونین کی گرم پانی کے سمندر تک پہنچنے کی خواہش پوری نہ ہو سکی، سوویت یونین خود ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، اسی دوران امریکہ بھی گوادر میں دلچسپی لینے لگا اور ایران، جس نے گوادر کے قریب چاہ بہار فری پورٹ قائم کر رکھی تھی، وہ گوادر کو اپنی اسی بندرگاہ کی نظر سے دیکھنے لگا۔ خلیجی ممالک بھی تیل کی گزر گاہ کے سمندری راستے پر ہونے والے جغرافیائی ودفاعی محل وقوع کے باعث اس میں دلچسپی لینے لگے اور سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد وجود میں آنے والی وسطی ایشیائی ممالک نے بھی گوادر کو اپنی تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا۔ اسی دوران گوادر پر قبضہ اور اس کے خلاف سازشوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا اور گوادر کو امریکہ کو فروخت کرنے، یہاں مکمل آزاد بین الاقوامی شہر بسانے اور گوادار میں سلطنت اومان کو اراضی دینے کے سکینڈل سامنے آئے۔ پاکستانی حکمرانوں نے بھی اس دوران گوادر کی دفاعی اور تجارتی اہمیت کا اندازہ لگالیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی محسوس کی جانے لگی کہ پاکستان کو ایک اور بندرگاہ کی اشد ضرورت ہے جو ہو تو تجارتی مقاصد کے لیے، مگر وہ اس کے دفاعی مقاصد کے لیے بھی کام آسکے۔

اس دوران گوادر میں ایک نئی بندرگاہ کی تعمیر کے منصوبے بنائے جانے لگے، 1967ء میں لیکو اینڈ لیفر نے پاکستان میں دوسری بندرگاہ کے قیام کے سلسلے میں

معاشی وانجینئرنگ فزیبلٹی رپورٹ تیار کی۔ اگلے سال 1968ء میں سر ولیم ہالکرو اور انکار پوریٹڈ کنسلٹنٹ انجینئرنگ نے ساحل مکران پر ماہی گیروں کے لیے بندرگاہ کی تعمیر کے لیے رپورٹ تیار کی۔ چھ سال بعد 1974ء میں مکران میں بندرگاہ کے قیام کے لیے ٹیپکو کنسلٹنٹ نے رپورٹ تیار کی اور 1979ء میں گوادر میں فش ہاربر کے قیام کے سلسلے میں پاکستان اور جاپان نے ایک پروٹوکول پر دستخط کیے، مگر 1983ء تک اس منصوبے پر کام شروع نہ ہوسکا، اس دوران بندرگاہ کو نئے سرے سے ڈیزائن کیا گیا۔ 1987ء میں گوادر فش ہاربر کا نیا ڈیزائن تیار ہوا۔ بندرگاہ کے لیے جگہ کا انتخاب کیا گیا اور 1988ء میں بلجیم کی ایک تعمیراتی کمپنی کو گوادر فش ہاربر کی ذمہ داریاں سونپی گئیں اور 1992ء میں 134 ایکڑ رقبہ اور 1700 میٹر طویل 600 میٹر چوڑی جیٹی تیار ہوگئی۔ گوادر ڈیپ سی پورٹ کے منصوبے کے بعد یہ فش ہاربر کوہ مہدی کے پاس منتقل کر دی جائے گی اور یہ فش ہاربر گوادر ڈیپ سی پورٹ کا حصہ بن جائے گی۔ اپنی جگہ یہ بات نہایت ہی قابل ذکر ہے کہ گوادر کا علاقہ ماہی گیری کے لیے عالمی شہرت رکھتا ہے اور دنیا بھر سے جدید ماہی گیری کے آلات سے لیس بڑے بڑے غیر ملکی جہاز یہاں ماہی گیری کے لیے آتے ہیں، جس سے اس بات کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ گوادر کے سمندروں سے مچھلیاں اور دوسری سمندری دولت ختم ہو جائے گی، اس لیے بلوچستان کے ساحل سمندر کی حدود بڑھا کر پچاس میل کر دی گئی، مگر اب حکومت سے باقاعدہ لائسنس کے ساتھ چند غیر ملکی بحری جہاز یہاں ماہی گیری کے لیے آتے ہیں۔ ساحل مکران پر سمندری دولت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں سالانہ 15 لاکھ میٹرک ٹن سے زیادہ مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں، جن میں سے صرف 8 فیصد مقامی استعمال میں آتی ہیں۔

گوادر فش ہاربر تو بن گئی۔ مقامی ماہی گیروں کو نام کی سہولتیں بھی میسر آگئیں۔ پاکستان میں کراچی اور پورٹ قاسم کے بعد تیسری بندرگاہ کے قیام کا مسئلہ برقرار رہا اور بالآخر پاکستانی حکمرانوں اور مسلح افواج نے یہ محسوس کر لیا کہ اب پاکستان کی معیشت اور دفاعی ضروریات کے پیش نظر گوادر ڈیپ سی پورٹ ناگزیر ہو چکی ہے، چنانچہ 1994ء میں ٹیلکو کنسلٹنٹ کو بلوچستان میں ڈیپ سی پورٹ کی فزیبلٹی رپورٹ تیار کرنے کی ذمہ داریاں

سونپی گئی۔ یہ رپورٹ ملنے کے بعد حکومت نے گوادر میں ڈیپ سی پورٹ تعمیر کرنے کا فیصلہ کرلیا اور نومبر 1995ء میں گوادر ڈیپ سی پورٹ کا پی سی ون تیار کیا گیا۔ کوئٹہ میں ہونے والی ایکو ممالک کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس نے گوادر ڈیپ سی پورٹ کو اپنی تجارتی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا، مگر نہ تو وزیراعظم نواز شریف اور نہ ہی وزیراعظم بے نظیر بھٹو گوادر ڈیپ سی پورٹ کی تعمیر کا کام شروع کرا سکے۔ 2001ء تک بھی گوادر ڈیپ سی پورٹ کی تعمیر کا کام شروع نہ ہوسکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عالمی قوتیں یہ نہیں چاہتی تھیں کہ گوادر ڈیپ سی پورٹ تعمیر ہو اور پاکستان معاشی طور پر مضبوط ہو، اگر کوئی ملک یہاں سرمایہ کاری کرنا بھی چاہتا تو اسے روک دیا جاتا، اس طرح 1993ء سے لے کر 2002ء تک نو سال کے دوران یہ بندرگاہ تعمیر نہ ہوسکی۔

ان حالات میں پاکستان کا ہر مشکل وقت میں اس کا ساتھ دینے والا دوست ملک عوامی جمہوریہ چین سامنے آیا۔ بیجنگ میں صدر جنرل پرویز مشرف اور چینی صدر نے ملاقات کے بعد گوادر ڈیپ سی پورٹ کی تعمیر کے معاہدے پر دستخط کئے اور مالی معاملات کی ذمہ داری بھی چینی حکومت نے قبول کی۔ اس طرح 22 مارچ 2002ء کو گوادر ڈیٹ سی پورٹ کی تعمیر کا کام شروع ہوا اور اس منصوبے کا فیز ون جو مکمل ہونے والا ہے، چار سو سے زیادہ چینی انجینئر اور کارکن طوفانی انداز میں کام کررہے ہیں۔ ان چینی انجینئروں نے سمندر سے سینکڑوں ایکڑ زمین چھینی ہے اور کل جہاں سمندر بہتا تھا، وہاں آج بندرگاہ کی برتھ تعمیر ہو رہی ہے۔ چینی اس طرح طوفانی انداز میں جنوں کی طرح کام کررہے ہیں کہ دس پندرہ دن بعد آدمی جب بندرگاہ کا رخ کرتا ہے تو اسے نقشہ ہی بدلا نظر آتا ہے۔ گوادر ڈیپ سی پورٹ کا پہلا مرحلہ اپریل 2006ء میں مکمل ہونا تھا، مگر چینی ماہرین کا کہنا ہے کہ ان کی یہ کوشش ہے کہ یہ منصوبہ چھ ماہ قبل ہی مکمل ہوجائے۔ گوادر ڈیپ سی پورٹ کی تعمیر کا کام جاری ہے اور پہلے مرحلے کی تکمیل کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہوگا، مگر عالمی قوتوں اور پاکستان دشمن عناصر کو یہ بندرگاہ اب بھی کھٹک رہی ہے۔

بلوچستان کے قوم پرست سیاستدانوں کی ساری سیاست اور ایشوز کا ہدف گوادر ڈیپ سی پورٹ ہے۔ قوم پرست سیاستدانوں کا یہ موقف ہے کہ اس بندرگاہ کی تعمیر سے

مقامی آبادی اقلیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اپوزیشن خصوصاً قوم پرستوں کی پوری کوشش ہے کہ گوادر ماسٹر پلان پر عمل نہ ہو اور نہ گوادر ڈیپ سی پورٹ تعمیر ہو۔ پونم کے کنوینر اور سابق وزیراعلیٰ بلوچستان سردار عطاء اللہ مینگل نے تو صاف الفاظ میں گوادر میں سرمایہ کاری کرنے والے سرمایہ کاروں کو دھمکی دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ گوادر میں سرمایہ کاری کرنے والوں کا سرمایہ تو کیا، وہ خود بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ ہمیں لاشوں کی ضرورت پڑی تو ان کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیں گے۔ سردار عطاء اللہ مینگل کا کہنا ہے کہ گوادر میں اگر ڈویلپمنٹ کرنی ہے تو ہماری شرائط پر، ہم سے رابطہ کیا جائے، ہم راستہ بتائیں گے۔ سردار عطاء اللہ مینگل کی اس دھمکی کے بعد پونم نے گوادر ڈیپ سی پورٹ کی تعمیر کی حمایت کے لیے تین شرائط پیش کی ہیں، جن میں قوموں کی برابری کی بنیاد پر دستور ساز اسمبلی کا انتخاب، محاصل کی تقسیم صوبوں کے حوالے کرنے، قانون سازی اور ایک صوبے کی بالادستی کے خاتمے کی شرائط شامل ہیں۔

یہ پہلا موقع ہے کہ پونم نے گوادر ڈیپ سی پورٹ کے بارے میں اپنی شرائط پیش کی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پونم نے گوادر ڈیپ سی پورٹ اور میگا پراجیکٹس کے خلاف بلوچستان بھر میں بڑے بڑے جلسوں کا سلسلہ شروع کیا ہے اور حکومت نے بھی ہر قیمت پر گوادر ڈیپ سی پورٹ کی تعمیر کا فیصلہ کیا ہے۔ وزیراعلیٰ بلوچستان میر جام محمد یوسف کا کہنا ہے کہ گوادر کی بندرگاہ ہر حال میں بنے گی۔ دھماکے کرنے والے صوبے کی ترقی نہیں چاہتے۔ کوئٹہ شہر کی گلیوں اور صوبے کے دوسرے علاقوں میں بم دھماکے کرنے والوں میں اگر جرات ہے تو وہ سامنے آکر مقابلہ کریں یا وزیراعلیٰ سیکرٹریٹ میں دھماکے کریں۔ جام یوسف کا کہنا ہے کہ ہم بلوچستان کے حقوق سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے۔ گوادر ڈیپ سی پورٹ کی تعمیر صوبے کے مفاد میں ہے اور یہ بندرگاہ بن کے رہے گی۔

گوادر ڈیپ سی پورٹ اور ماسٹر پلان کے خلاف سازشوں کے ان منصوبوں کے تحت گزشتہ دنوں گوادر میں ریموٹ کنٹرول کار بم دھماکے کے ذریعے ڈیپ سی پورٹ کے منصوبے پر کام کرنے والے چینی انجینئروں کو نشانہ بنایا گیا، جس میں 3 قیمتی جانیں ضائع بھی ہوئیں، مگر عوامی جمہوریہ چین کی قیادت نے اعلان کیا ہے کہ اس قسم کی کارروائیوں سے گوادر ڈیپ سی پورٹ کے منصوبے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور ہماری کوشش ہوگی کہ یہ

منصوبہ اپنی مقررہ مدت سے چھ ماہ قبل مکمل ہو جائے۔ بم دھماکے کے بعد گوادر ڈیپ سی پورٹ پر کام تیز رفتاری سے جاری ہے اور اس سلسلے میں سکیورٹی کے فول پروف انتظامات کیئے گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ گوادر میں چینی انجینئروں کی گاڑی پر حملے کا نشانہ دراصل چینی انجینئر نہیں، بلکہ گوادر تھا۔ ملک دشمن قوتیں یہ دیکھ کر کہ ان کی کوششوں کے باوجود گوادر ڈیپ سی پورٹ کی تعمیر کا کام نہیں رک سکا، اب ان کی یہ پلاننگ ہے کہ گوادر میں سرمایہ کاری نہ ہو، خصوصاً غیر ملکی سرمایہ کار اور بینکار گوادر نہ آئیں۔ چینی انجینئروں پر یہ حملہ ایک ایسے وقت میں کیا گیا، جب پانچ روز بعد کوئٹہ میں بلوچستان خصوصاً گوادر میں سرمایہ کاری کے حوالے سے پہلی بین الاقوامی کانفرنس ہونے والی تھی اور یہ بات درست ہے کہ ان حملوں کے بعد سرمایہ کار محتاط ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ روک لیے ہیں، مگر مستقبل گوادر کا ہے اور اس کے اس شاندار مستقبل کے باعث سرمایہ کار آج نہیں تو کل یہاں سرمایہ کاری ضرور کریں گے۔

دیکھنا یہ ہے کہ گوادر ماسٹر پلان، جو 8 مئی کو کوئٹہ میں ہونے والی بین الاقوامی سرمایہ کاری کانفرنس میں پہلی مرتبہ سرمایہ کاروں اور عوام کے سامنے آیا ہے، اس سے گوادر میں کیا تبدیلیاں آئیں گی اور یہ ننھا منا شہر، بلکہ مچھیروں کی بستی کیا واقعی کل کا دبئی ہوگا۔

گوادر ماسٹر پلان دراصل ایک چالیس سالہ منصوبہ ہے، جس کا مقصد گوادر ڈیپ سی پورٹ بننے کے بعد نہ صرف اس بڑے تجارتی شہر کی ضروریات پوری کرنا ہے، بلکہ گوادر کو ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت دنیا کا جدید ترین شہر بنانا ہے۔ ماسٹر پلان مختصر مدت، درمیانی مدت اور طویل مدت کے منصوبے پر مشتمل ہے اور یہ 2010ء سے 2050ء تک کی مدت پر مشتمل ہے۔ اس پلان پر عملدرآمد کے لیے 17595 ہیکٹر اراضی کی ضرورت ہوگی اور اس وقت صورتحال یہ ہے کہ حکومت بلوچستان کے پاس گوادر میں ایک ایکڑ سرکاری اراضی بھی نہیں ہے اور اپنی جگہ یہ ایک بہت بڑا معمہ ہے کہ حکومت گوادر ماسٹر پلان پر عملدرآمد کے لیے ایکسپورٹ پراسیسنگ زون، کمرشل ایریا، انڈسٹریل ایریا، گوادر ڈیپ سی پورٹ کے دوسرے اور تیسرے مراحل کی تعمیر، رہائشی سکیموں، سڑکوں کی تعمیر، ریلوے سٹیشن، بس ٹرمینل، جدید ہوائی اڈے، سیاحتی مراکز، ہوٹلوں اور پارکوں کے لیے اراضی کہاں سے حاصل کرے گی۔ یقیناً حکومت کو یہ اراضی حاصل کرنے کے لیے گوادر کی موجودہ آبادی کو

کہیں اور منتقل کرنا پڑے گا اور ماسٹر پلان کے تحت تو موجودہ گوادر فش ہاربر اور ماہی گیروں کو بھی موجودہ جگہ سے کوہ مہدی کے پاس یا کہیں اور منتقل کرنا پڑے گا۔ اس حقیقت کے باوجود گوادر میں وسیع پیمانے پر زمین کی خرید و فروخت کا کام جاری ہے اور گوادر میں نہ صرف یہ کہ ضرورت سے زیادہ اسٹیٹ ایجنسیاں قائم ہو گئی ہیں، بلکہ پاکستان کے مختلف شہروں اور بیرونی ممالک میں بھی گوادر میں زمین اور رہائشی سکیموں میں پلاٹ حاصل کرنے کے خواہش مندوں کے لیے دفاتر قائم کیئے گئے ہیں اور بلاشبہ اس وقت پاکستان میں گوادر کی اراضی سب سے مہنگے داموں میں فروخت ہو رہی ہے۔ ایک شخص نے دس لاکھ روپے میں خریدا پلاٹ ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے میں فروخت کیا۔ ہم نے خود گوادر میں صوبائی وزراء اور ممبران اسمبلی کو پلاٹوں کا یہ سودا کرتے دیکھا اور کوئی نہیں جانتا کہ ان پلاٹوں کے ذریعے کروڑوں روپے کمانے کی آرزو رکھنے والے سرمایہ کاروں کی رقم ڈوبتی ہے یا پھر راتوں رات وہ کروڑ پتی بنتے ہیں۔

گوادر میں اراضی کی قلت اور خرید و فروخت کی فضا میں حکومت بلوچستان نے سرکاری ہاؤسنگ سکیم "سنگھار ہاؤسنگ سکیم" کہ جس میں پاکستان کے تقریباً تمام حکمرانوں، جرنیلوں اور سیاستدانوں نے پلاٹ حاصل کیئے تھے، جن میں نواز شریف، بے نظیر بھٹو اور فاردق احمد لغاری بھی شامل ہیں۔ یہ ہاؤسنگ سکیم ختم کرنے کا اعلان کیا ہے اور حکومت کے اس فیصلے کے خلاف پلاٹوں کے مالک اعلیٰ عدالتوں میں چلے گئے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی حکومت نے گوادر میں چار رہائشی سکیموں کی منظوری بھی دی ہے، جبکہ مزید چار رہائشی سکیمیں ابھی زیر غور ہیں۔ ان رہائشی سکیموں میں بھی بڑی دلکش سہولتوں کی پبلسٹی کی جارہی ہے، مگر عملی طور پر ان رہائشی سکیموں کا اب تک کوئی وجود نظر نہیں آرہا، نہ ان رہائشی سکیموں کی پلاننگ ہوئی، نہ سڑکیں بنی ہیں، نہ آب نوشی اور سیوریج سسٹم ہے اور نہ پارک۔ صرف زمین کی نشاندہی کی جاتی ہے کہ یہ جگہ فلاں ہاؤسنگ سکیم کے لیے وقف ہے اور یہ اس کا نقشہ ہے، مگر لوگ ہیں کہ گوادر میں پلاٹ حاصل کرنے کے جنون میں مبتلا ہیں۔ ماسٹر پلان کے نقشے کے مطابق تو بعض ہاؤسنگ سکیموں کی جگہ کمرشل سینٹر، ایئر پورٹ، ریلوے یارڈ، آئل و گیس سٹوریج سینٹر قائم کیئے جائیں گے اور گوادر شہر کی موجودہ آبادی کو سر بندر کے قریب منتقل کیا جائے گا۔

گوادر ڈیپ سی پورٹ کا مستقبل یقیناً روشن ہے اور آج گوادر جیسا نظر آتا ہے 1960ء میں دبئی اس سے بھی کئی گناہ چھوٹا تھا، مگر گوادر کو اسکائی اسکریپز کا شہر بننے میں ابھی شائد چالیس پچاس سال لگیں، کیونکہ گوادر ڈیپ سی پورٹ کا پہلا مرحلہ تو مکمل ہونے والا ہے، مگر اس شہر میں ابھی تک بنیادی انفراسٹرکچر موجود نہیں ہے، نہ سڑکیں ہیں، نہ پانی اور نہ ہی بجلی۔ یہ سب کچھ گوادر میں آئے گا تو سرمایہ کار خود چل کر اور بغیر کسی دعوت کے گوادر آئیں گے، کیونکہ صنعتوں کے قیام کے لیے سڑکیں، بجلی، پانی اور کمیونی کیشن بنیادی ضرورتیں ہیں۔ بہر حال سیاستدان جتنی بھی مخالفت کریں، گوادر کے لوگ خوش ہیں کہ ان کا شہر دنیا کا جدید شہر بن رہا ہے، گوادر کو دبئی کی طرح دیکھنے میں ابھی بہت وقت لگے گا اور شائد موجودہ نسل میں سے بیشتر گوادر کی فلک بوس عمارتوں اور ماسٹر پلان کے تحت مرکزی ٹاور اور اس کے ریوالونگ ریسٹورنٹ کو نہ دیکھ سکیں، مگر مستقبل گوادر کا ہے اور گوادر اور بلوچستان ہی سے پاکستان کا روشن مستقبل وابستہ ہے۔ گوادر ماسٹر پلان پر عملدرآمد سے جہاں اگلے بیس پچیس سالوں میں یہ شہر بلند و بالا عمارتوں، پارکوں، ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں تبدیل ہو جائے گا، وہیں موجودہ گوادر شہر کے بازاروں اور محلوں کا نام ونشان مٹ جائے گا اور موجودہ گوادر بازار کی جگہ سے بندرگاہ کو ملک کے دوسرے علاقوں، وسطی ایشیائی ممالک، بھارت، ایران اور چین سے ملانے والی چھ اور آٹھ لائن سڑکیں گزریں گی۔ گوادر شہر کی موجودہ آبادی کو کہیں اور منتقل کیا جائے گا اور اس پر تقریباً 7.4 بلین روپے کے اخراجات آئیں گے۔ اس شدید مالی دباؤ اور گوادر ڈیپ سی پورٹ کے خلاف قوم پرست سیاستدانوں کی مہم کے پیش نظر موجودہ آبادی کو مرحلہ وار منتقل کیا جائے گا۔

گزشتہ صدی کے آغاز میں اسماعیلیوں کے روحانی پیشوا سر آغا خان نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ گوادر انہیں دے دیا جائے۔ 1905ء میں سر سلطان محمد شاہ آغا خان گوادر آئے اور انہوں نے یہاں ایک شاندار سکول بھی قائم کیا تھا جو آج بھی قائم ہے۔ ناگزیر وجوہات کی بنا پر تب انگریز وائسرائے نے سر سلطان محمد شاہ آغا خان کو گوادر الاٹ کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن گوادر سے آغا خان کی دلچسپی کبھی کم نہیں ہوئی اور آج بھی یہ سکول جدید وقدیم فن تعمیر کا خوبصورت منظر پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔

مقامی بلوچ آبادی گوادر میں تیزی سے ہونے والی سرمایہ کاری کے بعد اس خوف کا شکار ہے کہ آہستہ آہستہ یہاں غیر بلوچی آبادی بڑھتی چلی جائے گی اور بلوچ اپنے ہی شہر میں اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔ ماہرین نے مستقبل کے حوالے سے یہاں آبادی کا یہ تخمینہ پیش کیا ہے۔

سال	مقامی آبادی	مقامی اور بیرونی افراد کی کل آبادی
1998ء	45021	45021
2005ء	67695	101542
2010ء	90591	135887
2015ء	121231	218216
2020ء	162235	292023
2025ء	230133	414239
2030ء	307969	554344
2035ء	412132	741838
2040ء	551526	992747
2045ء	738068	1328522
2050ء	987698	1777856

گوادر بلاشبہ ملکی معیشت میں ایک اہم کردار کا حامل ہوگا لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت ایسے حالات پیدا نہ ہونے دے جن سے مقامی آبادی میں احساس کمتری پیدا ہو اور پاکستان دشمن قوتوں کو یہاں گھس بیٹھ کا موقعہ ملے۔

گوادر کی بندرگاہ میں امریکا کی دلچسپی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ سرد جنگ کے زمانے میں روسیوں کو گوادر سے دلچسپی تھی۔ اب چینی ماہرین اس بندرگاہ کی تعمیر وترقی کے لیے دن رات مصروف عمل ہیں۔ بھارت کو بھی اس سلسلے میں تشویش ہے۔ بلوچستان میں اس وقت جو بحران پیدا ہوا ہے وہ بظاہر بلوچستان کے سیاسی مطالبات سے متعلق ایک

پرائیویٹ ٹی وی چینل سے پیش کیے جانے والے ایک انٹر ۔ میں صدر جنرل پرویز مشرف کے ان ریمارکس کا ردعمل تھا جو انہوں نے بلوچستان کے مبینہ باغی عناصر کے ساتھ سختی سے نمٹنے کے متعلق دیئے تھے۔ صدر مملکت کے ان ریمارکس پر بلوچستان کے سیاسی قائدین نے سخت ردعمل ظاہر کیا تھا، بعد میں صدر مملکت کا مذکورہ انٹرویو لینے والے کالم نگار نے اپنے کالم میں سابق صدر غلام اسحاق خان کے دور میں نیویارک سے شائع ہونے والی کتاب The Twin Era of Pakistan کا ذکر کیا تھا۔ اس کتاب کو بلوچستان کی موجودہ علاقائی سیاست کے تناظر میں اہمیت دی جا رہی ہے۔ کتاب کے مصنف ابوالمعالی سید کا تعلق پاکستان سے ہے۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد امریکا کی لاس اینجلس یونیورسٹی سے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ان کے مقالے کا موضوع تیسری دنیا کے قرضوں کے بحرانوں کا ارتقا، عالمی مالیاتی اداروں کا کردار اور معاشی بحرانوں کے حل کی سفارشات سے متعلق تھا۔ وہ کینیڈا، برطانیہ اور امریکا کی کئی عالمی تنظیموں سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ کتاب میں انہوں نے جنرل ضیاء الحق کے دور کے سیاسی و آئینی بحران کو موضوع بحث بنایا ہے۔ کئی ابواب میں سیاسی حقائق بیان کیے گئے ہیں اور کئی ابواب میں تخیلاتی گفتگو کی ہے۔ مصنف کے انداز تحریر میں تلخی نمایاں ہے۔ فوج کی بالادستی، عسکری مطلق العنانیت، بھٹو کی پھانسی، پیپلز پارٹی کے خلاف جنرل ضیاء الحق کے اقدامات سمیت دیگر سیاسی امور پر مصنف کی گرفت مضبوط نظر آتی ہے۔ کتاب میں بلوچستان کو بھی سیاسی اہمیت کا حامل علاقہ قرار دیا ہے۔ مصنف نے ''ری پبلک آف بلوچستان'' کا نقشہ بھی کتاب میں شائع کیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں لکھا ہے کہ بلوچستان جو متحدہ پاکستان کا سب سے کم آبادی والا نہایت غریب صوبہ ہے، 2006ء میں آزاد مملکت کی حیثیت سے سعودی عرب اور کویت کے بعد تیل پیدا کرنے والا تیسرا امیر ترین ملک بن جائے گا، بلوچستان میں پسنی سے گوادر تک ہانگ کانگ کی طرح ایک ڈیوٹی فری بین الاقوامی بندرگاہ ہوگی، یہ مشرق وسطیٰ کے قریب دنیا کے لیے سب سے زیادہ مصروف ترین تجارتی اور کاروباری مرکز بن جائے گا۔

مصنف کی تخیلاتی پرواز کچھ یوں ہے کہ کوئٹہ یونیورسٹی مکمل طور پر امریکی معیار

کے مطابق ہوگئی ہے۔ اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر ایک امریکی نژاد بلوچ سکالر ہیں۔ بلوچ رہنماؤں نے جاپانی سرمایہ کاروں اور صنعت کاروں کو یہاں کارخانے قائم کرنے کے لیے ترغیبات دی ہیں۔ جاپانی یہاں اپنا مفاد دیکھتے ہیں کہ وہ یہاں سے مشرق وسطیٰ اور یورپی منڈیوں تک اثر و رسوخ حاصل کر سکتے ہیں۔ جاپانی یہاں تیل صاف کرنے کے کارخانے اور پیٹرو کیمیکل پلانٹس کے قیام کے لیے جرمنی سے مقابلہ کر رہے ہیں تاکہ اس خطے کی پیٹرولیم مصنوعات کو ''پروسیس'' کیا جا سکے۔ یہاں ہر شعبے میں بڑے پیمانے پر ترقیاتی سرگرمیاں جاری ہیں۔ شمالی مکران کے علاقے جہاں نہایت قیمتی معدنیات کے ذخائر ہیں، وہاں یورپی برادری کی مدد سے انہوں نے لوہے کے دو اور سٹیل کا ایک بہت بڑا پلانٹ قائم کر لیا ہے۔ کوریا، تائیوان، جاپان، بنگلہ دیش، مصر اور ترکی سے بھی تربیت یافتہ صنعتی ماہرین، مزدوروں اور کارکنوں کو بلایا جا رہا ہے۔

کتاب میں بلوچستان میں تیل اور گیس کے ذخائر کے تناظر میں مختلف منصوبوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ بلوچستان کی وسیع و عریض بنجر زمین قدرتی تیل اور گیس کے وسیع ذخائر سے مالا مال ہے۔ تیل اور گیس کے ذخائر سے آزاد مملکت بلوچستان کے رہنے والے بلوچ خوش ہیں۔ جب بلوچستان پاکستان کا حصہ تھا تو بلوچستان کے ساتھ ظالمانہ سلوک روا رکھا گیا تھا، اس ظالمانہ سلوک کی یاد اب بھی بلوچوں کے ذہن میں تازہ ہے۔

مصنف بلوچستان میں تیل کے ذخائر کے بارے میں لکھتا ہے کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ تیل صنعت کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور تقریباً تمام صنعتی ممالک تیل کے محتاج ہیں یا اس پر انحصار کرتے ہیں جو ان کے پاس نہیں ہے لیکن اس کے باوجود کسی نہ کسی طرح تیل کی قیمتوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ ذرا اس بات پر غور کریں کہ 1980ء میں مشرق وسطیٰ کے تیل کے ایک بیرل کی قیمت امریکی ساحل پر پہنچنے کے بعد تقریباً 27.73 ڈالر ہوگئی تھی جبکہ ٹیکساس میں پیدا ہونے والے تیل کی قیمت فی بیرل 7 ڈالر تھی۔ مصنف پھر تصوراتی انداز میں کراچی اور حیدرآباد پر مشتمل آزاد مملکت لیاقت آباد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بلوچستان میں روشنی بجھا دی گئی تو یہ صوبہ اس دلدل سے دوبارہ گزرنے کے لیے تیار نہیں

تھا۔ انہوں نے اپنی منزل اور اپنے مقصد کا خود تعین کیا اور آج وہ اپنے ملک کو ترقی اور خوشحالی کے دور میں لے جا رہے ہیں۔ آج اس ملک میں سڑکوں اور شاہراہوں کا جال کونے کونے تک بچھا دیا گیا ہے۔ ملک میں متعدد صنعتیں قائم ہیں۔ اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی نے ملک میں ترقی کی رفتار میں اضافہ کر دیا ہے۔ سب سے زیادہ معجزاتی پہلو یہ ہے کہ اس ملک کے دولت کے انبار دریافت کر لیے گئے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ خوش قسمت ہیں کہ انہیں ایک ایسی قیادت ملی، جس نے روز اول سے ملک کی ترقی و خوشحالی کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ بلوچستان کے لیاقت آباد یعنی سابق کراچی اور حیدر آباد پر مشتمل مملکت کے ساتھ بھی نہایت خوشگوار دوستانہ تعلقات ہیں، افغانستان اور ایران سے بھی اس کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ نئی نئی دولت اور اقتدار حاصل کرنے کی وجہ سے بلوچی قبائل کا احترام کیا جاتا ہے، لیکن اس کا پڑوسی پاکستان ابھی تک اس حقیقت کو ہضم نہیں کر پایا کہ بلوچستان اب اس ملک کا حصہ نہیں رہا ہے۔ مصنف کشمیر کو بھی ایک آزاد ریاست کے طور پر دیکھتا ہے اور لکھتا ہے کہ اور پھر کس نے یہ سوچا ہو گا کہ کشمیر جس کی لیے متحدہ پاکستان نے بھارت کے ساتھ دو مرتبہ جنگ کی، اپنے آپ کو تباہ کر لیا، ایک آزاد ریاست بن جائے گا اور کشمیر اقوام متحدہ کا ایک رکن ملک ہو گا۔ کشمیریوں کو یہ آزادی مذاکرات یا استصواب رائے سے نہیں ملی، بلکہ انہوں نے لڑ جھگڑ کر بھارت سے یہ آزادی حاصل کی ہے۔

مصنف پھر تخیلاتی طور پر باقیماندہ پاکستان کے بارے میں رائے دیتا ہے کہ پاکستان ہنوز شمالی سرحد پر پختون قبائل سے الجھا ہوا ہے، پاکستان بلوچستان اور سرائیکی علاقے گنوا چکا ہے۔ پاکستان اب اس پوزیشن میں نہیں رہا کہ وہ پختون علاقوں کو اپنے وفاق میں شامل رکھ سکے۔ بیشک پاکستان، مسلمانوں کے آزاد وطن کے طور پر حاصل کیا گیا تھا مگر یہ ملک جلد ہی یکے بعد دیگرے سازشوں اور مارشل لا حکومتوں کا شکار ہو گیا اور عوام کی وہ آرزوئیں دم توڑ گئیں جن کی تکمیل کے لیے انہوں نے آزادی حاصل کی تھی۔ مصنف پاکستان کی تباہی کا ذمہ دار پنجاب کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ پنجاب کا آزادی کے حصول میں کوئی خاص کردار نہیں رہا تھا۔ آزادی کی تحریک چلانے والی مسلم لیگ اس ملک کو متحد نہیں رکھ سکی۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ ابوالمعالی سید کی مذکورہ کتاب کو ملک اور بیرون ملک ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی حالانکہ کتاب میں بنیادی غلطیاں موجود ہیں۔ مصنف نے جذباتی انداز تحریر اختیار کیا ہے اور تحقیقی نوعیت کے امور سے جذباتی نتائج اخذ کیے ہیں۔ جب سوویت یونین دنیا کے نقشے پر موجود تھا، اس دور میں بھی اس نوع کی کتابیں آئے دن امریکا اور دوسرے مغربی ممالک سے شائع ہوتی تھیں۔ ابوالمعالی سید نے بھی اسی انداز کا طرز تحریر اختیار کیا ہے۔ تاہم پاکستان میں اس کتاب کو خصوصی اہمیت دی گئی اور کتاب کے مواد پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ مصنف نے پاکستان کو کئی حصوں پر تقسیم کر کے سیاسی نتائج کی بنیاد پر ابواب لکھے ہیں۔ اس کتاب کا سیاسی حلقوں میں بڑا چرچا ہے۔ بلوچستان کے تازہ سیاسی بحران کے بعد تو اس کتاب کے نکات کو کالم نگار بھی پیش کر رہے ہیں اور بعض تجزیہ نگار تو اس کتاب کی بنیاد پر پاکستان ٹوٹنے کی بھی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔

فرانس کے ایک مصنف نے بھی سابق سوویت یونین کی تحلیل کی پیشین گوئی اپنی کتاب میں کی تھی اور اب اسی مصنف نے خلیج کی جنگ کے پس منظر میں کتاب لکھی ہے جس میں انکشاف کیا گیا ہے کہ سابق سوویت یونین کی طرح امریکا بھی تحلیل ہو جائے گا۔ اس طرح امریکی اور دیگر مغربی تھنک ٹینکوں نے چین اور بھارت کے انہدام کی سینکڑوں مزید پیشین گوئیاں کی ہیں۔ سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ کی جغرافیائی تقسیم کے بارے میں سینکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر اس نوعیت کے مقالے شائع ہو رہے ہیں اور ان پر بحث بھی ہو رہی ہے۔ اس طرح کی سینکڑوں کتابیں بھارت کے غیر یقینی مستقبل کے بارے میں چھپ چکی ہیں۔

ابوالمعالی سید کی کتاب کی بنیاد پر پاکستان کی تباہی کا خواب دیکھنے والے حقیقت پسند نہیں ہیں۔ مصنف نے فوجی حکمرانی کے سیاسی نتائج کا سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں جائزہ لیا ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ ان عوامل کا سد باب کیا جائے جن عوامل کی بنیاد پر بنگلہ دیش وجود میں آیا تھا۔ عدلیہ کو آزاد کیا جائے، عدلیہ پر ہر قسم کا دباؤ ختم کیا جائے، انتظامیہ میں مداخلت ختم کی جائے، قانون کی بالادستی قائم کی جائے، آئین پر اس کی روح کے مطابق

عمل کیا ہے۔ سیاسی جماعتوں کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ سیاست دان بھی ذمے داری کا مظاہرہ کریں اور اقتدار میں آکر کرپشن کرنے کے اقدامات سے دور رہیں۔ وفاقی اور چاروں صوبائی حکومتوں کو عوام کے مفاد میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے۔ غربت کو ختم کیا جائے، غربت پورے معاشرے کو سرطان کی طرح چاٹ رہی ہے۔ اسی طرح مہنگائی، بے روزگاری اور قانون شکنی کو ختم کیا جائے۔ زرعی اصلاحات کی جائیں۔ دیہی علاقوں میں پختہ سڑکیں تعمیر کی جائیں۔ خارجہ پالیسی ملکی مفاد میں تشکیل دی جائے۔ پاکستان کے معاشی نظام میں عام آدمی کی بہبود کا خیال کیا جائے۔ بلوچستان کے تیل و گیس اور معدنیات کے ذخائر سے حاصل رقم بلوچستان کی بہبود پر خرچ کی جائے۔ ملٹری و سول بیوروکریسی کے اخراجات کم کیے جائیں۔ پاکستان میں حکومتی نظام میں لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانیوں کا قلع قمع کیا جائے۔ پاکستان کا تحفظ سیاسی سازشوں سے نہیں ہو سکتا۔ مذہبی جماعتوں اور ان کی ذیلی اداروں کی سرکاری سرپرستی بند کی جائے۔ مذکورہ تمام اقدامات کے ذریعے ہی لاکھوں لوگوں کی قربانیوں سے حاصل کیے گئے باقیماندہ پاکستان کو متحد اور مستحکم رکھا جا سکتا ہے۔ اگر آج بھی مرکزی حکومت نے صرف ایجنسیوں اور ٹاؤٹوں کی رپورٹس کو بنیاد بنا کر بلوچستان سے متعلقہ فیصلے کیے تو ہمیں یہ تلخ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بدقسمتی سے ہم چاروں طرف سے دشمنوں کے گھیرے میں ہیں اور کوئی بھی اس ''سنہری موقعہ'' کو ضائع نہیں جانے دے گا۔

بلوچ کون ہیں؟

بلوچستان کے مسئلے کو سمجھنے کے لئے بلوچوں کی تاریخ سمجھنا لازم ہے۔ کسی قوم کا مزاج، نفسیات اور روایات ہمیشہ اپنے ساتھ ماضی کی طویل داستان لیے ہوتے ہیں۔ جب تک ہم اُس قوم کے ماضی، رسوم، روایات وغیرہ کو نہیں جانیں گے اُس کو سمجھنا کارِ دارد ہوگا۔ انگریزوں نے برصغیر پر حکومت کرتے ہوئے برصغیر پاک و ہند میں بسنے والے کروڑوں عوام کے لئے ایک جیسے قوانین اور ضابطے نہیں بنائے تھے۔ ہر علاقے کی لوگوں کے مزاج اور نفسیات کے مطابق وہاں قوانین نافذ تھے۔ بلوچوں کے متعلق انگریزوں نے ایک کلیہ وضع کیا تھا جو ایک فقرے میں اس طرح ہے کہ ''بلوچ کو عزت دو''۔

انگریزوں نے بلوچستان میں صرف اسی کلیے کی بنیاد پر حکومت کی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا ہر طالبعلم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اس خطے خصوصاً پاکستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگ مختلف طریق زندگی، رسوم و رواج اور روایات کے حامل ہیں لیکن ایک بات جس پر سب متفق ہیں کہ بلوچوں کے نزدیک ''غیرت'' سب سے اہم مسئلہ رہا ہے۔ اگر آپ کسی بلوچ کو ''عزت'' دیں گے تو وہ آپ کے لئے جان دینے پر تیار ہو جائے گا لیکن جہاں آپ نے اُسے سختی سے کچھ منوانے کی کوشش کی وہ آپ کی صحیح بات کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا۔ انگریزوں نے حکومت کرنے کی جو حکمت عملی بلوچستان میں اپنائی تھی وہ سرحد، سندھ اور پنجاب میں نہیں اپنائی۔ یہاں انہوں نے حکومت کرنے کے کچھ اور کلیے بنائے تھے جن کا علم تاریخ کے ہر طالبعلم کو ہے۔ لیکن بلوچستان میں

انگریزوں نے سرداروں کو صرف ''عزت'' دی اور آسانی سے حکومت کرتے رہے۔

حیرت اور دُکھ کی بات ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ انہوں نے ملکی معاملات کو ہمیشہ ڈنڈے کے زور پر چلانے کی کوشش کی ہے۔ دھونس اور دھاندلی سے اپنا اُلو سیدھا کر کے اپنے اقتدار کو طوالت دیتے رہے اور نتیجہ ظاہر ہے۔ آج عملاً صورت حال یہ ہے کہ بلوچستان پر حکومت کا کنٹرول دم توڑ رہا ہے اور ہم ''سب اچھا'' کے نعرے لگا رہے ہیں۔

کیا 28 مئی 2005ء کو بلوچستان کے وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ پر ہونے والا حملہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہیں ہے؟

آخر گذشتہ تین چار ماہ سے کون سا ایسا ہفتہ گذرا ہے جب بلوچستان میں کوئی تخریبی کارروائی نہ ہوئی ہو؟

اس کے باوجود لاء اینڈ آرڈر کے ڈنکے بجا کر آخر ہم کسے بے وقوف بنا رہے ہیں اور کس کا مشن پورا کر رہے ہیں۔ آیئے بلوچوں کی تاریخ کو سمجھئے، اُن کی روایات کو جانئے اور اُن کے مزاج ونفسیات کا تجزیہ کیجئے تا کہ آپ کو علم ہو کہ یہ لوگ ٹکڑوں پر پلنے والے نہیں، عہدوں کے لالچ سے ٹلنے والے نہیں، بکنے اور جھکنے والے نہیں، البتہ انہیں عزت دے کر، ان کا مان بڑھا کر آپ انہیں اپنا بازوئے شمشیر زن بنا سکتے ہیں۔

تاریخ میں بلوچوں کا ذکر سب سے پہلے دسویں صدی عیسوی بمطابق چوتھی صدی ہجری کے عرب تذکرہ نگاروں نے کیا جبکہ ان سے قبل ایران کے مشہور شاعر فردوسی نے سلطان محمود غزنوی کے حکم پر لکھے جانے والے شاہنامہ میں بلوچوں کا ذکر کیا تھا، فردوسی نے شاہنامہ میں اس نظم کے اندر ساسانی بادشاہوں کا اور ان کے عہد پر فردوسی نے کیکاوس اور کیخسرو کی جنگوں کا ذکر کیا ہے اور ان میں بلوچوں کی بہادری کو بیان کیا۔ کیکاوس کے متعلق شاہنامہ میں فردوسی لکھتا ہے کہ اس کے پاس پارس، کوچ، بلوچ، گیلان اور دوسرے علاقوں کے لوگ فوجی ملازم تھے۔ اس میں وہ اشعار بھی صاف نظر آتے ہیں جن میں ان قوموں کا ذکر کیا گیا جس میں کیخسرو کو اپنی فوج جمع کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

تاریخی اعتبار سے نوشیرواں کا زمانہ 578ء تک شمار ہوتا ہے لیکن تاریخ میں خسرو

کا ذکر زیادہ واضح ملتا ہے جس نے جسٹینین جنگ کی تھی۔ فردوسی نے اس جنگ کا ذکر بھی تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور اس میں نوشیرواں کو اعلانیوں کے ساتھ جنگ میں مصروف دکھاتا ہے جو بحیرہ کیسپین کے قریب آباد تھے اور پھر اچانک وہ انہیں دریائے سندھ کے کنارے پر دکھاتا ہے اور نوشیرواں ان کو فتح کر کے ہی واپس آتا ہے یہاں پر اسے اطلاع دی جاتی ہے کہ بلوچوں اور گیلانیوں کے لشکر نے ملک کے کئی حصوں میں لوٹ مار مچا رکھی ہے چنانچہ وہ ان کو اپنا مطیع کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اس دوران اسے ایک کاہن کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل بابکان بادشاہ نے بھی ان وحشی بلوچوں کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا لیکن نوشیرواں نے ان کے پہاڑوں کا محاصرہ کر لیا اور اپنی فوج کو حکم دے دیا کہ بلوچ کو خواہ وہ بچہ ہو یا جوان قتل کر دیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی چنانچہ کوئی بلوچ زندہ نہ بچا اور ان کی شورش اور ترک تاز ختم ہو گئی۔ (یہ قدیم ترین نسخے کے مطابق ہے) لیکن موہل نے جس نسخے کا حوالہ دیا ہے اس میں ''ستم کردن ورنج'' کے بجائے ''ستم کردن کوچ'' ہے۔ بعد میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلوچوں کو صفحہ ہستی سے مٹایا نہیں گیا کیونکہ نوشیرواں کی فوج میں بدستور ان کی شمولیت کا پتہ چلتا ہے۔ خاقان چین کے سفر کے خیر مقدم کے موقع پر وہ گیل کے سپاہ کے ہمراہ سنہری ڈھالیں لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر یہ نظر آتا ہے کہ بادشاہ کے احباب اور فریقین (آزاد لوگ) آذر بادگان (آذر بائیجان) کی جانب ایک لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے جس میں گیلان ولمان بلوچوں کے پہاڑوں اور سروچ کے میدانوں کے دستے اور کوچ کے شمشیر زن شامل تھے پھر کچھ نسخوں میں نوشیرواں کے ہاتھوں بلوچوں کی شکست کے بعد لوگوں پر فوج کشی کی داستان بھی ملتی ہے یعنی بالفاظ دیگر گیلان اور آذر بائیجان پر بلوچوں کا بحیرہ کیسپین کی نسلوں سے یہ تعلق اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ ان کا مرز بوم کرمان آگے شمالی اطراف میں کیسپین بحر کے آس پاس ہونا چاہئے جہاں ان کا ذکر دوبارہ ملتا ہے۔ فردوسی نے یہ بیان یقیناً روایات سے ماخوذ کیا ہوگا، اگر اسے اپنے عہد کے بلوچوں کا ذکر مقصود ہوتا تو وہ یقیناً کرمان اور لوط کے علاقے کا ذکر کرتا کیونکہ اس زمانے میں انہی علاقوں میں بلوچ آبادیاں تھیں اور یہ ان گزر گاہوں کے قافلوں کو لوٹتے تھے جو سیستان اور خراسان کی جانب جایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے

کہ ان کا کوئی خاص تعلق گیلان سے نہیں ہو سکتا تھا۔

فردوسی نے الفاظ بلوچ اور کوچ اکثر اوقات ایک ساتھ استعمال کیے ہیں لیکن یہ محض اس عہد کا ایک عام انداز گفتگو تھا۔ شاہنامہ کے قدیم ترین مسودے میں کوچ کا لفظ بہت کم ہے اور ان اشعار میں تو آتا ہی نہیں جن میں نوشیرواں کے ہاتھوں بلوچوں کی شکست کا ذکر ہے کیونکہ بلوچ اور کوچ کی ترکیب اس دور میں عام طور مروج تھی اور اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ ان دونسلوں کے لوگ کرمان میں ایک دوسرے کے قرب میں آباد تھے اور ان کے مابین دوستانہ تعلقات قائم نہیں تھے۔

بلوچوں کی کرمان کو ہجرت کا سبب نوشیرواں کے ہاتھوں ان کی شکست تھی بلکہ زیادہ قرین قیاس یہ بات ہے کہ جیجوں کے باشندوں یا سفید ہنوں کی یورش نے جو اسی عہد کا ایک واقعہ ہے انہیں کرمان آنے پر مجبور کر دیا اس ہن قوم کو غلطی سے ہیتل (Hayital) کا نام دیا گیا ہے۔ عربوں نے کرمان 23ھ میں فتح کیا۔ نوشیرواں کی وفات کے 65 برس بعد یہ فوج کشی خلیفہ دوم کے حکم سے عبداللہ کی سپہ سالاری میں ہوئی تھی۔ عربوں کے حملوں کے وقت کرمان کے سلسلہ ہائے کوہ میں ایک ایسی نسل کے باشندے رہتے تھے جنہیں کوچ (عربی میں کوزج یا قوفش) کہا جاتا تھا اور کچھ تحریروں میں بلوش بھی درج ہے۔ ان میں سے کوئی بھی مصائب الدرائے اس عہد کا یا قریبی عہد سے تعلق رکھنے والا نہیں۔ اس موضوع پر سب سے پہلے بلاذری نے قلم اٹھایا ہے جس کی وفات 279ھ بمطابق 892ء میں ہوئی۔ اس کے بعد طبری نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب مصنفہ 320ھ بمطابق 932ء روشنی ڈالی پھر مسعودی نے اس کا ذکر کیا، ان کی تصنیف کے عہد کا تعین 332ھ بمطابق 943ء ہے اور مورخ اصطخری متوفی 340ھ بمطابق 951ء ہے۔ ان میں سے پہلے دو موروخوں نے اس فتح کا حال تحریر کرتے ہوئے محض کوچ یا بلوش کا ذکر کیا ہے مسعودی اور اصطخری جن کی تصانیف کا موضوع جغرافیہ ہے جو اپنے عہد سے متعلق لکھتے ہیں انہوں نے کوچ اور بلوچ دونوں کا ذکر کیا ہے ویل نے اپنی تصنیف (Geschicieder Chalifer) حصہ اول صفحہ نمبر 95 میں طبری کی مطابقت میں کوزج یا قوفش کا ذکر کیا ہے اور ڈوسن (آئی 417) میں لکھا ہے کہ عبداللہ نے دارالسلطنت کرمان فتح کیا تو کرمانیوں نے بلوچ اور کوچ سے کمک

حاصل کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ یہ بیان غالباً تاریخ گزیدی کے حوالے سے لیا گیا ہے۔ اس تاریخ کی سال تصنیف 730ھ بمطابق 1329ء سے قبل ہرگز نہیں ہے لہٰذا زیادہ قابل اعتبار نہیں جغرافیائی معلومات کی روشنی میں بہترین صائب الدرائے اصطخری اور مسعودی ہیں نیز اس ضمن میں ادریسی کی گراں قدر تصنیف (843ھ بمطابق 1151ء) اور یاقوت کا رونا مچہ مولفہ 615ھ بھی کارآمد ہے لیکن یاقوتی قدیم تصانیف پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔

بلوچ کرمان میں چوتھی صدی ہجری میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھے اور اس کا امکان تو ہے لیکن اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ تین سو سال پہلے جب عربوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا تھا تو یہ لوگ اس وقت بھی یہیں آباد تھے۔ بلوچ کوچوں کے علاقے کے قریب آباد تھے لیکن ان سے قطعی منفرد تھے مسعودی محض یہ لکھتا ہے کہ وہ قوفش یعنی بلوچ اور جٹ (زط) کے متعلق کوئی صراحت نہیں کر سکتا جو علاقہ ہائے کرمان میں آباد ہیں اصطخری پوری تفصیل دیتا ہے، وہ بیان کرتا ہے کوچ پہاڑوں میں رہتے ہیں اور بلوچ صحرا میں۔ یہ دونوں نسلیں اپنی مخصوص زبان بولتی ہیں جو فارسی سے مختلف ہے۔ اس زمانے میں کرمانیوں میں عام بول چال کی زبان فارسی نہیں تھی اوسلے (Osely) نے اس عبارت کا جو ترجمہ کیا ہے اس کے مطابق جس ریگان یا صحرا میں بلوچ آباد تھے وہ پہاڑ کے جنوب میں کرمان اور سمندر کی جانب واقع تھا اور عربی متن، ترجمہ یہ ہے

''کرمان کی شمالی سرحد مکران ہے اور مکران اور سمندر کے درمیان جو صحرا ہے وہ بلوشوں (بلوچوں) کی جانب جاتا ہے لیکن آگے چل کر لکھتا ہے کہ بلوش قوفش کے پہاڑوں کے مرتفع علاقے میں رہتے ہیں اور ان کے علاوہ کوئی ان پہاڑوں میں داخل نہیں ہو سکتا وہ بلاؤں کی طرح مویشی پالتے ہیں اور خیموں میں رہتے ہیں نیز ان کے علاقے سے گزرنے والے راستے محفوظ نہیں''۔ مزید لکھتا ہے ''بلوش کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ عربوں کے سلسلہ ہائے نسب سے ہیں اور اپنے سردار کے ماتحت رہتے ہیں ان کے جنوب میں ذرا آگے بڑھ کر ایک دوسری نسل کے لوگ رہتے ہیں جو کوچ اور بلوچ دونوں سے بدیہی طور پر مختلف ہیں۔ فارسی متن کے مطابق وہ ہرمز کے قریب پہاڑوں میں رہتے ہیں انہیں نسلاً عرب کہا جاتا ہے اور ان کا پیشہ راہزنی ہے''۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں قارن اور بارفین پہاڑوں کے باشندے زرتشتی مذہب کے پیرو تھے انہوں نے اطاعت قبول نہ کی اور وہ قوفش پہاڑوں کے باشندوں سے زیادہ چالاک تھے یہ لوگ عباسی خلفاء کے زمانے میں دائرہ اسلام میں لائے گئے۔

اصطخری نے بھی بجستان کا ذکر کرتے ہوئے اس ملک کے صوبوں کی فہرست پیش کی ہے جن میں سے دو (نمبر شمار 19 اور 22) کو بلوچ (بلوص) کا ملک کہا ہے جس صحرا میں بلوچوں کی آبادی کے متعلق کہا گیا ہے درحقیقت وہ کرمان کے سلسلہ ہائے کوہ کے جنوب میں واقع نہیں معلوم ہوتا بلکہ وہ عظیم صحرا ہے جسے اب دشت لوط کہا جاتا ہے اور جو کرمان کے شمال اور مشرق میں ہے اور کرمان اور خراسان کو سیستان سے علیحدہ کرتا ہے اور یسی جو ایک محتاط مورخ تھا، لکھتا ہے کہ

''سلسلہ ہائے کوہ کوچ میں وحشی نسل کے لوگ آباد ہیں ایک قسم کے کرد اور بلوچوں کی آبادیاں کچھ تو شمال کی جانب اور کچھ مغرب کی جانب ہیں''۔

اس نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ:

''وہ خوشحال ہیں، ان کے پاس مویشی وافر ہیں اور ان کے پڑوسی ان سے ہراساں رہتے ہیں وہ اس امر کی تصدیق بھی کرتا ہے کہ راہزنی نہیں کرتے۔ یاقوت مجموعی طور پر اوریسی کی تائید و تصدیق کرتا ہے، وہ بھی کوچ کا کردوں سے موازنہ کرتا ہے اور ایک عربی شعر پیش کرتا ہے۔ ''ہم کس بیابان میں پہنچ گئے، جس میں زط (جٹ) کرد اور وحشی قوفش لوگ آباد ہیں''۔

الدوامنی کے حوالے سے وہ قوفش کے متعلق یہ تفصیل لکھتا ہے:

''وہ قبل از اسلام کے یمنی عرب سلسلے سے ہیں اور ان کا کبھی کوئی مذہب نہیں رہا، خواہ مظاہر پرستی ہو یا اسلام''۔

وہ ان کو غیر مہذب اور وحشیوں کے نام سے یاد کرتا ہے اور اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان کو ہر حال میں ختم کر دینا چاہیے کیونکہ یہ اکثر لوٹ مار اور لڑائی میں مصروف رہتے ہیں اور اصطخری مزید لکھتا ہے کہ کوچ (قوفش) دراز قد گھنگھریلے بال اور چھریرے بدن کے ہوتے ہیں یہ خود کو عرب کہتے ہیں اور ہر قسم کے مظالم اور لڑائی کو جائز

سمجھتے ہیں ان سے پہلے بلوش لوٹ مار کرنے والے قبیلوں میں شمار ہوتے تھے اس لوٹ مار اور جنگ وجدل کی وجہ سے ان کی لڑائی اعدادالدولہ کے ساتھ ہوئی تھی جس سے ان کی بڑی تعداد قتل ہو گئی تھی۔ قوفش اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں لیکن وہ دین پر اپنی مرضی سے چلتے ہیں یاقوتی بلوچ (بلوص) کے متعلق ایک الگ نظریہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے جس کے اندر وہ بلوچوں کی تعریف کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ وہ کردوں سے مشابہہ تھے اور فارش اور کرمان کے درمیان رہتے ہیں۔ جنگجو قوفش ان سے خوفزدہ رہتے ہیں جو ان کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ بلوچ اپنے پڑوسیوں کی بہ نسبت زیادہ مہذب اور خوشحال ہیں، بکریوں کی کھالوں یا بالوں کے بنے ہوئے خیموں میں رہتے ہیں اور قوفشوں کی طرح لوٹ مار اور یورش نہیں کرتے۔

اعدادالدولہ دیلمی کے علاوہ اس کے چچا مفیر الدولہ کی وفات 356ھ بھی کرمان کے ان قبائل پر یلغار کی جنہیں کچھ لوگ کرد بتاتے ہیں اور کچھ کوچ بلوچ لکھتے ہیں ان سے رزم آرائی کے دوران میں ان کا بائیں ہاتھ اور دائیں ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں جس کے بعد سے وہ اقطع کہلانے لگا۔

بلوچ یقیناً گھوڑے رکھتے تھے اور دور دور کے علاقے میں لوٹ مار کیا کرتے تھے جیسے ان کی اولاد اب تک کرتی رہی ہے وہ خراسان اور سیستان کے صحراؤں کو عبور کرتے تھے اور سیستان کے دو صوبے اصطخری کے زمانے میں بلوچ علاقے کے نام سے معروف تھے اس بات کا ثبوت ہے کہ بلوچ ان علاقوں میں اقامت گزیں ہو چکے تھے۔ محمود غزنوی کے عہد میں اس بادشاہ کے سفیر کورومان جاتے ہوئے انہوں نے تبس اور خبیس کے مابین لوٹ لیا جس سے بادشاہ کا غصہ ان کے خلاف بھڑک اٹھا اور اس نے اپنے بیٹے مسعود کو ان کی سرکوبی کیلئے بھیجا جس نے بالآخر انہیں خبیس کے پاس شکست دی۔ یہ مقام سلسلہ ہائے کوہ کرمان کے دامن میں صحرا کے آخری سرے پر واقع ہے۔ ایک دوسرے موقع پر ان راہزنوں کو ہلاک کر دینے کی یہ ترکیب کی گئی کہ زہر بھرے سیبوں کے کچھ باران کے علاقوں سے گزارے گئے جنہیں انہوں نے لوٹ کر کھا لیا (اس طرح بہت سے مر گئے) تذکرہ میں اسے نامناسب اور غیر اخلاقی منصوبہ سے تعبیر کیا ہے۔

فردوسی ان لٹیروں کے نام سے واقف تھا کیونکہ وہ اس زمانے میں خراسان کے ایک شہر طوس میں رہتا تھا جو مشہد کے قریب ہے۔ شاہنامہ کے جو اشعار عبارت میں پیش کیے گئے ہیں اور جن میں بلوچوں کا ذکر موجود ہے ظاہر ہے فردوسی کی واقفیت پر مبنی ہونگے ممکن ہے کہ بلوچوں کی مستقل آبادی خراسان اور سیستان ہر دو جگہ ہو۔ فی زمانہ بھی، جیسا کہ لارڈ کرزن نے بتایا ہے کہ بلوچوں کی آبادی شمال میں تربت حیدری تک پھیلی ہوئی ہے۔

یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مذکورہ بالا بیان (شاہنامہ کا بیان) کی تصنیف کے تھوڑے ہی عرصہ بعد تمام بلوچ کرمان سے ہجرت کر گئے اور قرائن بتاتے ہیں کہ مکران اور سندھ کی سرحد پر مستقل آبادی پہلے ہی شروع ہو چکی تھی جیسا کہ اصطخری کی عبارت سے پتہ چلتا ہے، جس میں اس نے سیستان کے صوبوں کے نام گنائے ہیں بعد میں طبقات ناصری کے مصنف نے بھی تحریر کیا ہے کہ اس نے سیستان کے ایک مقام گنبد بلوچ میں قیام کیا تھا۔ یہ اشارہ سرسری سہی لیکن اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ سیستان میں بلوچ آبادی موجود تھی لیکن تاریخ کے ابواب اس بارے میں خاموش ہیں کہ سندھ میں نفوذ سے بیشتر کہاں کہاں رہے، سندھ میں ان کے داخلے کا ذکر تیرھویں صدی کے وسط میں ملتا ہے۔

یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں بلوچ نسل کے لوگوں نے دو مرتبہ نقل مکانی کی اور دونوں بار ہجرت کی وجہ ایشیا کے ایک بڑے علاقے میں نئے فاتحوں کی پیش قدمی تھی۔ پہلی ہجرت اس وقت ہوئی جب فارس کے سلجوقیوں کے ہاتھوں ویلمی اور غزنوی طاقت کا خاتمہ ہوا۔ اس موقع ان لوگوں کو کرمان چھوڑ کر مشرقی مکران اور سندھ کی جانب جانا پڑا۔ یہ ہجرت چنگیز خان کے اس علاقے میں حملوں اور جلال الدین منکبرنی کی ترک تازی کی وجہ سے ہوئی دوسری ہجرت کے نتیجہ میں انہوں نے پہلی بار وادی سندھ میں قدم رکھا جس سے ان کیلئے تیسری اور آخری ہجرت کا راستہ ہموار ہوا اور اس آخری ہجرت نے ان کے ایک بڑے حصے کو ہندوستان کے میدانی علاقے میں منتشر کر دیا۔ اس آخری ہجرت کا زمانہ ہندوستان پر تیمور لنگ کے حملے کا عہد اور پھر بابر اور بعد میں غزنوی بادشاہوں کے حملوں کا دور ہے۔ ہر چند تاریخی مواد کی کمی ہے لیکن اس کمی کو روایت سے ایک حد تک پورا کیا جاسکتا ہے۔ یہ روایات بلوچوں اور خاص کر کوہ سلیمان پر آباد قبائل سے ملتی

ہے وہ واقعاتی اعتبار سے مکمل ہیں۔ ان روایات کا دارومدار قدیم زمانے کی رزمیہ نظمیں ہیں۔ تاریخی قدر و قیمت کے لحاظ سے ان نظموں کا سلسلہ اس عہد سے شروع ہوتا ہے جبکہ بلوچ سیستان میں قیام پذیر تھے اس سے پہلے کے زمانے کے متعلق یہ روایت ہمیں صرف اتنا بتاتی ہے کہ بلوچ حضور اقدس ﷺ کے چچا امیر حمزہؓ کی اولاد ہیں اور کربلا کے میدان میں یزید سے جنگ کی تھی لیکن امیر حمزہؓ سے سلسلہ نسب ملانے کی یہ کوشش محض اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ مسلمان نسلوں میں شرفا کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنا شجرہ نسب کسی مشہور ہستی یا کسی ایسی شخصیت سے ملانا ضروری سمجھتے ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہو مثلاً سندھ کے کلہوڑہ خاندان اور بہاولپور کے داؤد پوترا اپنے تئیں حضرت عباسؓ کی اولاد بتاتے ہیں اور اسلام قبول کرنے کے بعد شیخ کہلاتے اور خود کو خالص قریشی النسل مشہور کرتے تھے۔

واقعہ کربلا اور سیستان میں بلوچوں کے قیام کے دوران کے بعد کا زمانہ ہے اور سیستان کے دوران قیام سے قصص کا آغاز ہوتا ہے۔ پرانی منظوم داستانوں میں بلوچوں کے متعلق مذکور ہے کہ وہ جب سیستان آئے تو وہاں کے بادشاہ شمس الدین نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی، کچھ عرصہ بعد ایک دوسرا بادشاہ بدرالدین برسراقتدار آیا جس نے ان پر مظالم کئے اور ان کو اپنے ملک سے نکال دیا گیا۔ فی الحقیقت سیستان میں شمس الدین نام کا بادشاہ ہوا ہے یہ بادشاہ سفاری خاندان کا ایک مطلق العنان حکمران تھا اور اس کی وفات 569ھ میں ہوئی۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ بڑا ظالم تھا اور اس کی رعایا اس سے بہت نفرت کرتی تھی۔ عین ممکن ہے کہ اس نے بلوچوں کی خدمات اپنی فوجی قوت کو بڑھانے کیلئے حاصل کر لی ہوں کیونکہ وہ اس زمانہ میں ایک حد تک سیستان میں آباد ہو چکے تھے لیکن بدرالدین بادشاہ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

ایک روایت میں یہ مذکور ہے کہ بدرالدین نے بلوچوں کے چوالیس (44) بولکوں سے مطالبہ کیا کہ ہر بولک ایک ایک لڑکی حرم شاہی میں داخل کرے، بولکوں نے بظاہر رضامندی کا اظہار کیا لیکن لڑکیاں بھیجنے کی بجائے انہوں نے چوالیس (44) لڑکوں کو زنانہ لباس پہنا کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا اور اس کے عتاب سے بچنے کیلئے اس کی اقلیم سے نکل بھاگے۔ بادشاہ نے ان لڑکوں کو تو واپس کر دیا لیکن خودان کے تعاقب میں کیچ مکران

کی طرف روانہ ہوا جہاں اسے بلوچوں کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی۔

قدیم روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بلوچ نسل بڑی بڑی شاخوں میں اسی زمانے میں تقسیم ہوئی کہ جب میر جلال خان ابن جنید بلوچوں کا حاکم تھا اس کے چار بیٹے ہوئے۔ رند، لاشار، ہوت اور کورائی۔ ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام جتو تھا اور جس کی شادی اس کے بھتیجے مراد سے ہوئی انہیں پانچوں میں سے بلوچ نسل کے پانچ بڑے سلسلہ ہائے نسب رند، لاشار، ہوت، کورائی اور جتوئی بنے لیکن کچھ قبائل ایسے بھی ہیں جنہیں ان سلسلہ ہائے نسب میں سے کسی میں شامل نہیں کیا جا سکتا چنانچہ ان لوگوں کے اجداد کے نام کچھ شجرہ ہائے نسب میں درج کر لیے گئے ہیں۔ دو اور لڑکوں عالی اور بلو کا بھی ذکر ملتا ہے بلو کی اولاد بلیدی ہیں اور عالی کے دو بیٹوں غزان اور عمر سے غزانی مریوں اور عمرانیوں (جو اب منتشر حالات میں متعدد قبائل میں ملتے ہیں) کا سلسلہ ملتا ہے۔ اس بات کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا کہ تحفۃ الکرام میں جو شجرے دیئے گئے ہیں وہ معتبر و مستند معلوم نہیں ہوتے، میر جلال خان کے ان چار بیٹوں میں سے آگے دو نے بہت زیادہ ترقی کی اور انہی کی نسل سے آنے والی نسل متعارف ہوئی۔ رند، لاشار کی اولاد سے ہی قبیلوں کی بنیاد پڑی اور یہ چاروں بھائی اس دن علیحدہ علیحدہ ہو گئے کہ جس دن میر جلال خان اس دنیا سے رخصت ہوا اور اس کی تدفین کے بعد چاروں بھائیوں نے اپنے والد کی یاد میں الگ الگ رسوم ادا کرنے کے بعد بڑے بیٹے رند خان کو باپ کا جانشین تسلیم کرنے کے بعد بلوچی روایات کے مطابق اس کی دستار بندی کی گئی اور چاروں بھائیوں رند خان، لاشار خان، ہوت خان اور کورائی خان نے اپنے باپ کی یادگار کے طور پر آسروخ گنبد تعمیر کرائے اس دوران ہوت خان اپنے دوسرے بھائیوں کے مدمقابل آ گیا۔ واضح رہے کہ ہوت خان جلال خان کی دوسری بیوی کے بطن سے تھا جو غیر بلوچ تھے۔ ہوت خان کی ہی اولاد سے مشہور لوک داستان سسی پنوں کا ہیرو پنو خان ہی وارث بنا تھا، سسی اور پنوں کی قبریں آج تک کیچ کے علاقہ میں موجود ہیں۔ اور ان علاقوں میں سسی اور پنوں کا واقعہ سینہ در سینہ بلوچوں اور دوسرے مقامی لوگوں میں چلا آ رہا ہے۔

ہوت خان کے الگ ہونے کی وجہ سے چاروں بھائی بھی الگ ہو گئے اور اسی دن سے بلوچ ان چار قبیلوں میں تقسیم ہو کر پھر اپنے اپنے آنے والے اجداد کے نام سے مشہور ہونا شروع

ہو گئے۔ لیکن ان چار مرکزی قبیلوں رند، لاشار، ہوت اور کورائی نے آج تک اپنے اجداد کے نام پر اپنی قوم کے نام کو اپنی اصلی شناخت بنا کر قائم رکھا ہوا ہے بلوچوں کے ان چار قبیلوں بلیدیوں نے جو بلیدہ کے رہائشی تھے کچھ عرصہ بعد ان قبیلوں کے ساتھ شمولیت کی جبکہ دوسرے دو اور قدیم بلوچ قبائل غزانیوں اور عمرانیوں کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے۔

اب یہاں پر ایک اور اہم ترین قبیلہ کا ذکر کروں کہ جس کی نسل نے دو سو سال تک ضلع ڈیرہ غازی خان کے علاقہ پر حکومت کی یہ اہم ترین قبیلہ تاریخ میں دودائی کے نام سے مشہور ہیں اور اس کیلئے ہمیں تاریخ ہی کے حوالے سے ثابت کرنا پڑے گا کہ یہ دودائی قبیلہ کس طرح سے بلوچوں میں شامل ہوا۔ اس قبیلہ کے متعلق انگریز مورخ ایم لونگ ڈیمز اپنی مشہور کتاب (The Ethnography and Historical Sketch of Baloch Race) میں رقمطراز ہے کہ دودائی ایک قدیم ہندوستانی نژاد قبیلہ ہے اور یہ بلوچ نسل میں اس وقت شامل ہوا جب بلوچ قبائل سندھ میں داخل ہو چکے تھے اس وقت سندھ پر راجپوت سومرہ خاندان کی حکومت جو عرب فاتحین کے بعد اس علاقے پر حکمران تھے۔ مختلف تاریخی تذکروں میں اس خاندان کے بادشاہوں کے ناموں کی ایک طویل فہرست موجود ہے جن میں پانچ حکمران دودا کے نام سے آتے ہیں مذکورہ بالا فہرست بڑی حد تک ناقابل اعتبار ہے۔

دودا چہارم کا زمانہ تیرہویں صدی عیسوی کا درمیانی حصہ 650ء ہے اس بادشاہ کے والد خفیف کے دور حکمرانی میں بلوچوں کی ایک جماعت سندھ کے علاقہ میں داخل ہوئی اور سندھ کے قبائل سوڑھا اور جھریجا (جاٹوں) سے اتحاد قائم کر لیا۔ خفیف کے بعد جب دودا چہارم بادشاہ بنا تو بلوچوں نے جھریجا قبیلے کے ہمراہ مل کر دودا چہارم کی حمایت کرنا شروع کر دی اور سوڑھا قبیلہ سے اتحاد ختم کر دیا۔ اس دودا سے اگلا بادشاہ عمر خان بنا اس طرح بلوچوں نے ایک بار پھر سمہ سوڑھا اور جٹ (جھریجا) قبیلوں سے اتحاد قائم کر لیا۔ ڈیمز مزید لکھتا ہے "بلوچوں کا یہ اتحاد زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ سمہ قبیلے نے بادشاہ سے چند شرائط پر صلح کر لی، جبکہ دوسرے اتحادوں کو اطاعت قبول کرنا پڑی کیونکہ اس اطاعت کا مطلب یہ تھا کہ بلوچ قبائل واپس اپنے پہاڑی علاقوں میں چلے جائیں لیکن اس

امر کی کوئی قابل قبول شہادت موجود نہیں کہ بلوچوں نے اس زمانے میں میدانوں میں مستقل سکونت اختیار کی ہو۔ دودا پنجم کے دور حکومت میں سومرہ خاندان کی بادشاہت کا خاتمہ ہوگیا اور اقتدار سمہ قبیلہ کے پاس آ گیا۔ سمہ قبیلے نے خاندان جام کی بنیاد ڈالی، یہ واقعہ غالباً تیرہویں صدی عیسوی کے اواخر کا ہے اس زمانے میں دہلی پر علاؤالدین خلجی کی حکمرانی تھی، تاریخ معصومی میں اس کا سن تالیف 1600ء ہے۔ یہاں ایک اور تاریخی واقعہ دودا خان کی غیر معمولی صلاحیت سے متعلق ہے اور یہ لوک کہانیوں ہی سے واقعہ ملتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے پانی پیتے ہوئے دو سانپ نگل لیے تھے، دودا نے جو کہ جسم کے اندر دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا یہ سانپ سلطان محمود غزنوی کے پیٹ سے باہر نکال لیے۔ سلطان محمود غزنوی یہ کرامت دیکھ کر دودا پر بڑا مہربان ہوگیا اور اس نے خوش ہو کر دودا کو اس کی چھینی ہوئی سلطنت واپس کر دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ دودا اول کے بارے میں تھا کیونکہ اس کا عہد وہی ہے جو غزنوی خاندان کی حکمرانی کا تھا''

اس کی وفات 485ھ میں بہ عہد مسعود سوئم ہوئی تھی۔ اس قصہ کے آغاز میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ دودا نے اپنے دشمنوں سے جان بچا کر اپنی گھوڑی دریائے سندھ میں ڈال دی اور اس کو پار کیا تھا۔

اس حکایت کی طرف رجوع کرتے ہیں جو دودائی قبیلے کے آغاز سے متعلق بلوچوں میں مشہور ہے۔ دودا سومرہ کو اس کی برادری والوں نے ٹھٹھہ سے نکال دیا۔ اس نے جان بچانے کی خاطر اپنی گھوڑی دریائے سندھ میں ڈال دی۔ صبح ہوئی تو وہ سردی سے اکڑا ہوا ایک رند کی جھونپڑی کے قریب پہنچا، رند کا نام صالح تھا صالح نے اسے گھوڑی سے نیچے اتارا اور اسے اپنے ہاں پناہ دی۔ منظوم داستان میں یہ اشعار موجود ہیں۔

''یہ شخص جو پہلے محض ایک جٹ تھا، ایک جکدال تھا جس کی پہلی کوئی حیثیت نہ تھی ایک عورت کے طفیل بلوچ بن گیا۔ وہ پہلے پہاڑیوں کے دامن میں ہڑند میں رہتا تھا لیکن قسمت نے اسے سب کا سردار بنا دیا''

اس کی اولاد آگے چل کر دودائی قبیلہ بن گئی اور جنوبی پنجاب کے علاقوں میں بلوچوں کے درمیان ایک مقتدر حیثیت کی مالک بنی۔ گورچانی یا گورشانی قبیلے کا نام اسی شخص

کے بیٹے گورش پر پڑا۔

قیاس یہ کہتا ہے کہ سومروں کے زوال کے وقت اس قبیلے کی ایک ٹکڑی نے اپنے سردار دودا کی سرکردگی میں بلوچوں کی حمایت اختیار کر لی۔ بلوچ اس زمانے میں مکران کے اور سندھ کے قریب پہاڑوں میں آباد تھے۔ رفتہ رفتہ دودائی قبیلہ کے یہ لوگ بلوچوں کے ساتھ غلط ملط ہو گئے اور بعد میں بلوچوں کا ایک قبیلہ کہلانے لگے۔ اگرچہ شکل وصورت کے لحاظ سے یہ لوگ بلوچ نظر آتے ہیں اور بلوچ زبان بولتے ہیں۔ لیکن عام طور پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ گورچانی (جو دودائی نسل کا سب سے بڑا قبیلہ ہے) اصلی بلوچ نہیں ہے۔ دودائی قبیلے کی ایک دوسری اہم شاخ جو ایک عرصہ تک مقتدر حیثیت کی مالک رہی ہے، میرانی ہیں۔ ان کے سرداروں نے دو سو سال تک ڈیرہ غازی خان میں نوابی کی ہے لیکن اب یہ قبیلہ بھی پارہ پارہ ہو کر زوال پذیر ہو چکا ہے لیکن اس وقت ان کی یادگار مقبرہ غازی خان میرانی اس وقت بلوچ تہذیب کا نشان بن کر باقی ہے لیکن افسوس کہ مقبرہ غازی خان اس وقت روز بروز کھنڈرات میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے جبکہ میرانی قبیلہ بھی ڈیرہ غازی خان کے نواحی علاقوں میں بڑی تعداد میں آباد ہو چکا ہے اور اپنی بلوچی انا کے سہارے اپنے آپ تک اپنی نوابی قائم کیے ہوئے ہے ان میں ایک شخص محترم سرور کربلائی معروف شاعر بھی خاندان کے فرد شمار ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا پانچ ممتاز قبائل ان قبیلوں کے علاوہ جن کا ذکر آ پہنچا ہے، کچھ کم حیثیت قبیلہ اور بھی ہیں جو چوالیس بلوچ بولکوں کے زیردست (Servile) چار بولکوں کی حیثیت رکھتے ہیں یہ گوپانگ دشتی، گادھی اور گھولو کے علاوہ چند اور بھی ہیں چنانچہ پندرہویں صدی میں ہندوستان پر حملے کے وقت بلوچ قوم مندرجہ ذیل عناصر پر مشتمل تھی (1) اصلی بلوچی نسل کے پانچ قبیلے یعنی رند، لاشاری، ہوت، کورائی (قرائی) اور جتوئی (2) وہ گروہ جو بعد میں مکران میں ترتیب پائے مثلاً بلیدی، غزانی اور عمرانی (3) دودائی (4) زیردست قبائل۔

اس دور کے بعد دو اور قبیلے بلوچوں کی برادری میں شامل ہوئے ایک تو مکران کے کچھی اور دوسرے سندھ کے جکرانی، ان کی شمولیت کا زمانہ کافی بعد کا ہے۔

سومروں کے زوال کے بعد قریباً ڈیڑھ سو سال تک، سندھ میں بلوچوں کے متعلق

کچھ اور سننے میں نہیں آیا، کبھی کبھار شورشیں ضرور ہوتی ہونگی لیکن تاریخ میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کے بعد دوسری بار ان کا ذکر جام تغلق (1432ء، 1450ء) کے زمانے میں ہوتا ہے جبکہ اس نے بھکر کے قریب کسی مقام پر لشکر کشی کی تھی۔ اس زمانے میں چاروں طرف ایک افراتفری کا عالم تھا جس کی وجہ تیمور کا ہندوستان پر حملہ تھا اسی قسم کی افراتفری کا عالم سلجوقیوں اور چنگیز خان کی فتوحات کے بعد پیدا ہو گیا۔ دہلی کی تغلق بادشاہت کا رہا سہا اقتدار ختم ہو چکا تھا اور چند کمزور بادشاہوں کے یکے بعد دیگرے تخت نشین ہونے کی وجہ سے زمام حکومت لودھی افغانوں کے ہاتھ آئی تھی۔ ان کے بعد طالع آزماؤں کیلئے یورش کے دروازے کھل گئے تھے ان حالات نے مختلف مقامات کے لوگوں کو ہندوستان پر فوج کشی کرنے کی ہمت دلائی۔ سب سے پہلے تو بابر اور اس کے ترک سرداروں کو جنہیں مغل کہا جاتا ہے اور جو مغل سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے، دوسرے شاہ بیگ کی قیادت میں ارغونوں کو جنہوں نے سندھ میں ایک عارضی حکومت قائم کر لی اور تیسرے بلوچوں کو، جو کسی حکمران خاندان کے قیام میں تو کامیاب نہ ہوئے لیکن شمالی ہندوستان کی آبادی پر ان لوگوں نے گہرے نقوش چھوڑے۔ وہ بقیۃ الذکر دونوں حملوں کے نتائج سے زیادہ اہم تھے۔

قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے میدانی علاقوں میں نفوذ سے پیشتر قلات کا پہاڑی علاقہ جہاں اب بروہیوں کا تسلط ہے بلوچوں کے قبضے میں تھا۔ یہ بات کم از کم قرین قیاس ضرور ہے کہ بروہیوں کے ساتھ ان کی جنگوں نے انہیں آگے کے علاقے پر جانے پر مجبور کر دیا ہو۔ لیکن خود ان کی تاریخی روایات میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ مصنفین اس ضمن میں عام طور پر یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ قلات پر ایک ہندو قبیلہ سیوا نامی قابض تھا اس قبیلے نے بلوچوں کے حملوں سے بچنے کی خاطر بروہیوں کی خدمات حاصل کیں۔ بعض دوسرے مصنفین کا خیال ہے کہ بروہی اس علاقے کے اصل باشندے ہیں اور یہ خیال اس حقیقت پر مبنی ہے کہ بروہی زبان میں دراوڑی عنصر کا کافی اثر ہے لیکن خود بروہیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ بلوچوں کی طرف حلب سے آئے ہیں۔ ایک قابل توجہ نظریہ یہ بھی ہے کہ یہ لوگ کرمان میں بلوچوں کے جو پڑوسی کوچ تھے وہی ہیں۔ کوچوں کو بار ہا کردوں کے مماثل اور بعض کرد ہی بتایا گیا ہے۔ بروہیوں میں آج کل بھی ایک مقتدر قبیلہ کرد کے نام

سے موجود ہے اور مزاری بلوچوں میں بھی ایک پاڑہ اسی نام کا پایا جاتا ہے۔ بلوچ بروہی زبان کو آج تک کرگالی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کرگالی کے معنی کردوں کی زبان ہے گو اصل کردی زبان سے اس کا کوئی علاقہ نہیں۔ کردی زبان ایران کے ایک علاقہ کی بولی ہے اور بلوچی سے کسی قدر مشابہت رکھتی ہے۔ موجودہ صورتحال میں یہ بات ایک امکانی نظریہ کی صورت میں پیش کی جا سکتی ہے کہ براہوئی مغرب کی جانب سے آئے ہیں اور قلات کے پہاڑی علاقے میں ان کی سکونت اور بلوچوں کی میدانی علاقوں کی طرف سے ان بلوچوں کا انقطاع جو مکران میں آباد ہیں اسی دور کا واقعہ ہے۔ ہجرت اختیار کرنے والے قبائل کا رخ کسی قدر شمال کی جانب تھا۔ کیونکہ ان کی منزل مقصود ملتان اور جنوبی پنجاب کا علاقہ تھا نہ کہ سندھ۔

راجپوت قبیلے لنگاہ نے اپنے سردار سہرا (847ھ بمطابق 1443ء) کی زیر قیادت ملتان میں ایک خودمختار حکومت قائم کر لی تھی۔ بادشاہ بننے کے بعد رائے سہرا نے قطب الدین کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ اس کے بعد 848ھ میں اس کا بیٹا شاہ حسین تخت نشین ہوا جس نے 908ھ بمطابق 1502ء تک حکومت کی۔ اسی دور حکومت میں بلوچ پہلی بار پنجاب میں آباد ہوئے جس کی صورت یہ ہوئی کہ ملک سہراب دودائی اپنے تین بیٹوں یعنی غازی خان، فتح خان اور اسماعیل خان اور کثیر التعداد بلوچوں کے ہمراہ ملتان آیا۔ شاہ حسین نے بڑی عزت افزائی کی اور انہیں ایک جاگیر کوٹ سے دھن کوٹ کے علاقے تک بخش دی۔ دوسرے بلوچوں کو جب اس جود وسخا کا علم ہوا تو وہ گروہ در گروہ پہنچنے لگے۔ رفتہ رفتہ سیت پور اور دین کوٹ کے تمام علاقوں میں بلوچ آباد ہو گئے۔ یعنی یہ کہنا چاہئے کہ دریائے سندھ اور چناب کے درمیان موجودہ ضلع مظفر گڑھ میں ان واقعات کی تصدیق ملتان کے بادشاہوں کے متعلق فرشتہ کی تاریخ اور طبقات ناصری سے بھی ہوتی ہے۔ فرشتہ نو آمدہ لوگوں کو دودائی اور بلوچ دونوں ناموں سے یاد کرتا ہے وہ لکھتا ہے ''بلوچ کیچ مکران سے آئے اور ان دو بھائیوں کے فوراً بعد، جو سمہ قبیلے سے تھے جام بایزید اور جام ابراہیم اور جنہوں نے جام نندہ نظام الدین سندھ کے سمہ حکمران سے جنگ کی تھی وہ مہاجر کی حیثیت میں شاہ حسین کے پاس پہنچے اور اس سے جاگیریں حاصل کیں موجودہ علاقے آج شریف، شورکوٹ اور

جنگ اس میں شامل تھے۔ جام بایزید نے نہایت اثر ورسوخ پیدا کرلیا اور شاہ حسن کی فوج کا تمن دار ہوگیا"۔ شاہ حسین کی وفات اور شاہ محمود کی جانشینی کے بعد وہ باغی ہوگیا، عارضی طور پر صلح ہوگئی مگر ملک سہراب دودائی اور جام بایزید کے درمیان اختلاف کی بہت بڑی خلیج حائل ہوچکی تھی یہ صورتحال بلوچوں کی دوسری آبادکاری سے پیوست ہے جو میر چاکر خان رند کی سرکردگی میں ہوئی۔

قبائلی قصص سے پتہ چلتا ہے کہ میر چاکر کے دو بیٹے شہداد اور شیہک تھے۔ شہداد کی پیدائش کے متعلق ایک کرامت مشہور ہے کہ اس کی ماں پر جنات کا سایہ ہوگیا تھا۔ بلوچی زبان میں ایک متصوفانہ نظم موجود ہے جسے شہداد کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ اس نظم میں ملتان شہر کے آباد ہونے کا ذکر ہے اسی طرح ایک دوسری نظم جس میں عمارت گری کا ذکر ہے، شہداد کے نام سے منسوب کی جاتی ہے۔

بلوچوں نے جب مکران کو چھوڑ کر سیوی (سبی) اور گنداواہ میں نو آبادیاں قائم کیں تو اس زمانے کی تہذیب کا پتہ ان کے اشعار سے مل سکتا ہے جو خالص عرب کی بدویانہ تہذیب تھی انہوں نے شہر بسائے اور قلعے تعمیر کیے، اس وقت ان کے پاس بہترین دولت مویشی ہی تھے۔ چنانچہ میر شیہک جب سیوی (سبی) پہنچا تو اس کے پاس نو ہزار گھوڑے تھے اور بھیڑ بکری اور دنبوں کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا ان کی مستورات قلعوں میں رہتی تھیں اور وہ خود تنبو میں رہتے تھے اور یہاں ان کی کچہریاں لگتی تھیں۔ ان کے فرش قالین سے مزین تھے ان کے ہاں بالشت اور بستروں کی چادروں کا رواج تھا یہ تمام سامان ایران سے منگواتے تھے ان کے برتن زیادہ پیتل اور جست کے ہوتے تھے کیونکہ ان دنوں میں مکران برتنوں کی صنعت کاری کی وجہ سے مشہور تھا۔ امیروں کے پاس سونے اور چاندی کے برتن بھی تھے مگر اس وقت تمام بلوچ قبائل رند اور لاشاری سرداری کے ماتحت تھے۔

وہ پاؤں میں چمڑے کے لمبے بوٹ، بدن پر زرہ ہیں اور سر پر فولادی نوک دار ٹوپیاں پہنتے تھے، ان کے فولادی ہتھیار چمکتے تھے، ان کے گھوڑوں کے زینوں پر پیتل کا عمدہ کام ہوتا تھا، ان کے کمربند اور چمڑے کا سامان خوشبودار چمڑے کا ہوتا تھا جس پر سبز مخمل پر زردوزی کا کام ہوتا تھا۔ ان کے پاس تیر کمان' نیزے اور دو دہائی تلواریں جنگ کے میدان

میں ہوا کرتی تھیں اور یہ تلواریں زیادہ تر ایران' دمشق اور یمن کی ہوا کرتی تھی اور اسلحہ کی تجارت زیادہ تر مسقط والوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ شہسواری میں وہ کمال' چست و چالاک تھے' وہ باری باری حملہ کرتے تھے جب کامیاب نہ ہوتے تو ایک دم حملہ کر کے دشمن کو تباہ کر دیتے تھے۔ جیسا کہ سرہند اور پانی پت کے میدانوں میں انہوں نے کر دکھایا۔

جنگ کے میدان میں ان کے ساتھ قرآن کے قاری ہوتے تھے جو قرآن کی آیتیں پڑھتے تھے۔ رند و لاشار کی جنگ میں پچاس قرآن کے حفاظ تھے جن کی لاشوں کو ڈولیوں میں اٹھا کر انہوں نے سپرد خاک کیا تھا۔ صلح کے وقت وہ چوغے' دستار اور کمر میں قیمتی شالیں لپیٹ کر محفل میں بیٹھتے تھے' ان کی کمر میں خنجر آویزاں رہتے تھے اور وہ زلفوں اور کپڑوں پر عطر ملتے تھے جو اکثر وہ قندھار سے منگواتے تھے۔ اس لئے جب کسی سردار کی محفل گرم ہوتی تھی تو چاروں طرف خوشبو پھل جاتی تھی۔

امیروں کی عورتیں کمخواب اور زربفت کا قیمتی لباس پہنا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر جب بیورغ نے قندھار کی شہزادی گران ناز کیلئے سیوی (سبی) کے شہر سے لباس خرید کیا تو اس کی قیمت سات سو تیموری درہم تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک ان کے ہاں تیموری سکہ رائج تھا۔ بلوچستان اکثر بیرونی حکومتوں کے ماتحت رہا۔ اس لئے مختلف مقامات پر وہاں بیرونی سلاطین کا سکہ رائج تھا مگر بعد میں براہوئی حکمرانوں نے اپنا سکہ جاری کیا۔

بلوچی سردار نہایت ہی مہمان نواز اور فیاض تھے۔ مثلاً میر چاکر رند نوبند شاری کی سخاوت کی داستانیں اب تک مشہور ہے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ کسی فقیر نے میر نوبندی لاشاری سے خیرات طلب کی۔ میر نے اپنا قیمتی لباس اور تمام گھر کا اسباب فقیر کے حوالے کر دیا۔ سخاوت کی مثال اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے۔

جنگ کے میدان میں میر چاکر لاشاریوں کے محاصرہ میں پھنس کر گرفتار ہونے کی نوبت کو پہنچتا ہے مگر عین موقع پر دلیر نوبندغ اس کو اپنے گھوڑے پر سوار کر کے جنگ کے خطرناک میدان سے باہر نکال کر لے جاتا ہے حالانکہ یہ نوبندغ لاشاری تھا' اس سے بڑھ کر رواداری کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بلوچی مہمان نوازی کیلئے ہمایوں کا واقعہ

کافی ہے۔ مرزا کامران بلوچی سرداروں کو لالچ دے کر اپنا طرف دار بناتا ہے مگر بلوچ مہمان کی حفاظت کرتے ہیں اور معزول شہنشاہ کو منزل مقصود پر پہنچا دیتے ہیں۔

ان کی محفلوں میں موسیقی اور سرود بھی تھا۔ دبنور' سرندا اور باب Rebeck ان کے موسیقی کے ساز تھے۔ ان کے ڈوموں کے اشعار زیادہ تر بہادری Herosim کے متعلق تھے۔ ان اشعار میں وہ اپنے بڑوں کے کارناموں کو دہراتے تھے۔ ان کے انصاف کا طریقہ آسان اور سادہ تھا۔ سردار علماء کے مشورہ سے فیصلہ کرتے تھے جو احادیث نبوی اور شرع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاسبان تھے۔ تعلیم کا کام ان کے سپرد تھا۔ اس لئے ہر خاص و عام کے دل میں ان کی عزت تھی۔ سلطان ابوسعیدی نے ان کی اس طرح مدح سرائی کی ہے۔

در چمن گفتہ بلبل وقمر ہے
مدح این گلبن ابو الامر ہے

یہ مدح سرائی اس لئے کی گئی تھی کہ سلطان نے 736ء میں وفات پائی۔ پورے ملک نے اس کے مرنے کا ماتم کیا تھا۔ اوحدی کرمانی اس زمانہ میں ہو گزرے ہیں جب تاتاری طوفان ختم ہو چکا تھا اور علم وادب کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر روشن ہونے لگیں' علم تصوف میں اوحدی کرمانی کا درجہ شیخ عطار' مولانا روم اور فخر الدین عراقی کے برابر ہے۔ بلوچ قوم میں بعض شعرا کبار اور محدثین اور حفاظ ہو گزرے' جن کا اعداد وشمار کرنے کیلئے علیحدہ دفتر کی ضرورت ہے۔ ان کا بیان نظرانداز کر کے بلوچ تاریخ کا معیار محض جنگوں کو ہی ٹھہرائیں گے تو ایک مورخ کیلئے یہ ازحد ناانصافی ہوگی کہ وہ ادبیات کے پہلو کو تاریکی میں رکھے۔

چونکہ بلوچستان کا سیاسی اور تہذیبی دامن ہمیشہ سے عرب وایران اور بعد میں سندھ' افغانستان اور ہندوستان سے وابستہ رہا اس لئے ان اقوام کی تاریخ کا بیشتر حصہ ان ممالک کی تاریخ اور ادبیات کے دفتروں میں پوشیدہ ہے۔ بلوچوں میں اس دور میں بڑے بڑے صوفیاء کرام اور اولیاء بھی ہو گزرے ہیں جو دراصل بلوچ ہی تھے مگر چونکہ اس وقت وہ ایران وعجم کی خاک میں پوشیدہ ہیں اس لئے ہر جگہ وہ عجمی شمار ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ کرمانیؒ جو حقائق معرفت اور مسائل تصوف کے عالم تھے۔ حضرت ابوحمزہ الخراسانیؒ جو

خراسان کے نہایت ہی جلیل القدر مشائخ میں سے تھے اکابران طریقت میں نہایت رفیع القدر تھے' بلوچ تھے۔

بلوچ اس علم دینی اور ادبیات میں زیادہ تر عراق کے علمی مراکز بصرہ' کوفہ اور بغداد سے وابستہ تھے اور ان کے علم وفضل پر عربیت غالب تھی' چنانچہ خراسانی' سیستانی اس قوم کا بادیہ نشین تھا مگر اس کے صنائع اور بدائع کلام عربی شاعری تھی۔

دور غزنوی تک جب فارسی نے نیا جنم لیا' تب سارے مشرق میں فارسی کا چرچا تھا میر شیہک اور میر چاکر خان رند کے زمانہ میں دفتری زبان فارسی رہی مگر شعر وسخن کی زبان بلوچی تھی۔ چنانچہ اس دور میں جتنے بھی بلوچی شعراء ہو گزرے ہیں ان کی زبان بلوچی نظر آتی ہے اور وہ شعر اور سخن میں یہی مادری زبان کام میں لاتے ہیں۔ بلوچی علماء کو اس دور میں ہم دہلی کے دربار میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز دیکھتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی اور فارسی زبان کے ماہر تھے کیونکہ یہی دو زبانیں مشرق میں ممتاز نظر آتی ہیں تاہم رند ولاشار کی جنگ اور اس سے پہلے بہت سے بلوچ بلوچستان سے ہجرت کر کے سندھ اور بلوچستان میں نو آبادیاں قائم کرتے ہیں۔ اس لئے یہ امر لازمی ہے بلوچی زبان مکران سے لے کر دوآبہ باری تک پھیل جاتی ہیں اور آج تک ڈیرہ جات یا سندھ میں جتنی بھی قومیں بلوچ ہیں ان کی زبان بلوچی ہے۔

اگر اس زمانہ کے بلوچ شعراء کا پتہ نکالیں گے تو یہی معلوم ہوگا کہ چاکر کا بیٹا شہداد خود بلوچی زبان کا شاعر تھا۔ اسی طرح بیورغ خود کمال کا شاعر تھا اور شعر وسخن اس کا مزاج تھا۔

ان کے علاوہ اس زمانہ میں رند ولاشاریوں کے جتنے بھی مدبر تھے مثلاً فیروز شاہ ریحان' جاڑو اور ریحار یہ سب بلوچی اشعار کے ماہر تھے۔

شیریں فرہاد اصل ایرانی زبان کا افسانہ ہے رندوں کے زمانہ میں بلوچوں نے اس کو بلوچیت کا جامہ پہنانا' دوستین شیرین جب ترکوں نے بلوچوں پر مظالم برپا کیئے تب میر چاکر رند ترکوں سے لڑا۔ دوستین رند تھا اور لعل خان کی لڑکی شیرین سے اس نے شادی کی۔ دونوں فارسی زبان کے ماہر تھے۔ دوستین کو ترک گرفتار کر کے ہرات کے قلعہ میں قید

کرتے ہیں۔شیرین فارسی میں ایک خط لکھ کر اس کو ایک فقیر کی معرفت روانہ کرتی ہے پھر
کسی ترکیب سے وہ بھاگ کر واپس خراسان آتا ہے اور شیرین اس کو شعر سناتی ہے جو اس
نے فارسی خط میں لکھا تھا اس قصہ میں منگچر' کونار وغیرہ مقامات کی گلریزی کا بیان درج ہے۔

اسی طرح مہران گاج کی وادی کو دودھ اور شہد کی دکھاتا ہے دوستین شیرین کے
اشعار 1881ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں شائع ہوئے اور 1885ء میں ڈیمز
صاحب نے ان کو بلوچی ٹیکسٹ بک میں شائع کرایا۔

بیورغ کا عشقیہ کلام قندھار کی شہزادی گران ناز کے متعلق ہے یہ ارغون شہزادی
امیر ذوالنون ارغون کی چھوٹی صاحبزادی تھی۔امیر ذوالنون کی دولڑکیاں تھیں' ایک سلطان
ابوالغازی حسین مرزا ہرات کے ساتھ بیاہی تھی۔یہ بیورغ رند تھا مگر جنگ رند و لاشار میں
اس نے لاشار کی طرفداری کی کیونکہ وہ میر چاکر کی اس حکمت عملی کے خلاف تھا کہ اس نے
ترکوں سے مدد طلب کی تھی۔

شاہ مرید اور ہانی بہترین افسانہ ہے ہانی مندو کی بیٹی تھی اور شاہ مرید کے باپ کا
نام شیئے مبارک تھا۔ایک روز شراب خوری اور نشہ کی حالت میں اس نے اپنی بیوی کو چاکر
کے کہنے پر طلاق دیتا ہے اور پھر اس کی تلاش میں شب بیداری اور اختر شماری کرتا ہے۔

مسٹر ڈوئی Mr. Douie نے اس بلوچی نامہ میں درج کیا یہ قصہ صاف دکھاتا
ہے کہ بلوچوں میں شراب نوشی کی عادت تھی اور ان کی شراب قندھار اور ہرات جیسی گلریز
زمین کی پیداوار تھی۔ان کے پیالہ و جام سونے اور چاندی کے تھے ہانی رند خاتون تھی جو اپنی
خوبصورتی کی وجہ سے پیکر جمال تھی اور مرید اس کی محبت میں مست اونٹ کی طرح تھا۔
میران جو میر چاکر کا چچازاد بھائی بڑے پایہ کا مصنف ہو گزرا' مسٹر میئر Mr. Mayer
نے اس کو اپنی کتاب میں یاد کیا ہے۔

اس کے بیش بہا اشعار عیسٰی اور باری کے متعلق ہیں۔لیچ Leech' میئر
Mayer اور برٹن Burton نے بھی مختصر طور پر اس کا ذکر کیا۔میر ریحان میر چاکر کا
چچازاد تھا۔سالو کی بیماری کا سن کر غمگین ہوتا ہے' سالو جو تصویر کھینچتا ہے اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ اس زمانے میں کانوں میں سچے موتی کے زیور اور ناک میں بھی عورتیں زیور پہنتی

تھیں۔ہاتھوں کی مندریوں گلے میں چاندی کے طوق بھی عورتیں پہنا کرتی تھی اور ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی بلوچوں میں بیمار ہوتا تھا تو وہ حلال جانوروں کی قربانیاں بھی
کرتے تھے۔یہ قصہ بھی مسٹر میئر نے درج کیا ہے۔ان سب میں بیورغ کے کلام شیرین
اور عشقیہ ہیں۔ان میں جابجا محبت کے رنگارنگی پھول نظر آتے ہیں۔بعد کے زمانہ میں بھی
یہ اشعار بلوچوں کو یاد تھے چنانچہ میر ارامن لاشاری اور ریحان رند کے گھوڑ دوڑ کے متعلق
جتنے بھی اشعار تھے وہ باغہ لاشاری کو زبانی یاد تھے جن کو جے ایل میئر صاحب پادری نے
انگریزی میں ترجمہ کیا۔میر ریحان رند کے اشعار جو گوہر جتنی کے متعلق ہیں ان کو ڈیمز نے
1893ء میں ترجمہ کیا۔چنانچہ ریحان کے اشعار دو عمرانی کھوسہ شاعروں میں ہیرو جان و علی
محمد خان کو یاد تھے۔سلطان شاہ حسین کا رندوں کی طرف داری کرنا اور میر چاکر کا ہندوستان
پر حملہ یہ تمام شاعر یورپین فاضلوں کو غلام محمد کی زبانی معلوم ہوئے اور ان اشعار سے
ٹیمپل Temple کو "افسانہائے پنجاب" Legends of Punjab تصنیف کرنے
کا موقع مل گیا۔حقیقت میں یہ سہرا غلام محمد مرزا کے سر ہے جس سے خود ایل ڈیمز کو "بلوچی
ٹیکسٹ بک" کتاب تصنیف کرنے کا موقع مل گیا۔رند و لاشار کی جنگ کی کیفیت جو اشعار
میں موجود ہے اس کا ترجمہ مسٹر ایل ڈیمز نے شاعر غلام بولک رند کی زبانی 1879ء میں
بمقام سیوی (سبی) ترجمہ کیا اس لئے یورپین محققین نے اس دور کو "افسانہ تاریخ بلوچ"
The Legendry History of the Baloches نام رکھا جو سراسر ناانصافی
ہے۔اس رند و لاشار کی جنگ میں ہیبت خان نے میر چاکر کی طرف داری کی تھی اور یہ بیرک
(بیورغ) کا لڑکا تھا۔اس حکایت کو ایل ڈیمز نے احمد خان لاہانی لُنڈ کی معرفت معلوم کیا۔
ان اشعار میں میر عالی بلیدیوں کے کارناموں کا بھی ذکر کیا۔غلام محمد بلیچانی کے اشعار میں
نوبندغ کی سخاوت اور فیاضی کا بھی ذکر ہے۔

ہمایوں نے جب دہلی پر حملہ کیا تھا تو رند و لاشار نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔
اس طرح غلام محمد بلیچانی کے اشعار میں رند اور دودائی قبائل کی جنگوں کا ذکر موجود ہے۔

دودائی قبیلہ کے سربراہ سہراب خان اور حاجی خان تھے۔یاد رہے کہ حاجی خان
نے بعد میں اپنے بیٹے کے نام پر 1476ء میں ڈیرہ غازی خان شہر کی بنیاد رکھی تھی۔یہ میرانی

بلوچ کے نام سے مشہور ہوئے تھے۔ اس خاندان نے ڈیرہ غازی خان پر دو سو سال تک حکمرانی کی ہے۔

بلوچوں کی ان تمام اشعار میں ان کی غیرت اور دلیری اور مہمان نوازی کے قصے درج ہیں۔ ایک اور مثال بلوچوں کی تہذیب اور غیرت کو ظاہر کرتی ہے کہ جب میر چاکر رند نے ارغون کے بادشاہ امیر ذوالنون سے لاشاریوں کو شکست دینے کے لئے فوجی امداد طلب کی تھی تو جب ارغون کے لشکر نے اچانک حملہ کر کے لاشاریوں کو تہہ تیغ کرنا شروع کر دیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران میر چاکر کو جب اس صورتحال کا پتہ چلا تو اس نے بلوچی روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے لاشاریوں کی خواتین اور بچوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

شہنشاہ ہمایوں نے جب 1540ء میں اپنے ہی جرنیل غلام فرید خان' شیر شاہ سوری سے ذلت آمیز شکست کھائی اور کئی سال تک شہنشاہ ایران کے پاس پناہ گزیں رہ کر اپنی فوجی طاقت بڑھاتا رہا اور بعد میں جب اس نے شیر شاہ سوری کی وفات کے بعد مغل سلطنت کے علم کو بلند کرنا چاہا اور دہلی پر حملہ کیا تو اس کے ساتھ چالیس ہزار کا لشکر بلوچوں پر مشتمل تھا اور جب ہمایوں دہلی پر حملہ آور ہوتا ہے تو بلوچوں کے جنگجو لشکر نے اس کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا اور یہاں پر ڈیمز کے الفاظ میں ''جب ہمایوں نے دہلی پر حملہ کیا تو بلوچوں نے ہراول دستہ میں شامل ہو کر افغانوں پر بڑھ چڑھ کر حملے شروع کر دیئے اور جب لشکر زیادہ غصے میں آتا تو اپنی بڑی بڑی داڑھیوں کو منہ میں لے کر انتہائی غصے کی حالت میں چباتے ہوئے آگے بڑھتے اور اس دوران وہ دشمن کو مکمل طور پر ختم کر کے ہی دم لیتے۔ اس کے علاوہ بلوچ تہذیب کے ان گنت واقعات تاریخ میں بھرے پڑے ہیں''۔

بلوچ شروع سے ہی باکردار اور غیور رہا ہے۔ خودداری اور عزت کی خاطر جان قربان کر دینا بلوچ کا شیوہ رہا ہے۔ ایک دوسری بات کہ بلوچ سردار بلوچ معاشرے کی نگرانی پاسبانی کے اعلیٰ رتبے کے مالک ہوتے ہیں اور اپنے اپنے قبیلوں کے فوجی' انتظامی اور عدالتی سربراہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلوچ نسل کے کردار میں آج تک بہت کم ہی تبدیلی نظر آئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچ نسل اور اس کے دور افتادہ خطوں پر وقت اور

زمانے کے اثرات نہایت سست رفتاری سے بڑھ رہے ہیں مگر بلوچ کے اندر جذبہ افتخار اور ان رسم ورواج میں زمانے کے نشیب وفراز سے کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

بلوچ اپنی سچی روایات کا آج تک پاسدار اور ان پر سختی سے عمل پیرا ہے۔ بلوچوں میں حجازی عربوں جیسی بہت سی عادتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر دونوں جنگجو اور جانباز ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بلوچوں نے اپنے خون کو آلودگی اور آمیزشوں سے پاک وصاف رکھا اور اپنے امتیاز کردار کو برقرار رکھا۔ شجرہ نسب کو از بر کرنا ہمیشہ سے ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور تا حال یہی صورت حال باقی ہے' وہ اپنے ننگ وناموس کی حفاظت کرنا اپنا فرض تصور کرتے ہیں۔ اپنے قریبی رشتہ داروں میں شادی بیاہ کے رواج پر مکمل طور پر اور انتہائی سختی کے ساتھ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی لڑکی کو اپنے خاندان سے باہر شادی کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ بلوچوں میں طلاق کا رواج بہت کم ہے' کیونکہ اپنے شوہر سے بے وفائی کی سزا موت ہے اور اس طرح دیگر وجوہات کی بناء پر بیوی کو چھوڑنا انتہائی معیوب تصور ہوتا ہے۔ بلوچوں کی شجاعت' فیاضی' مہمان نوازی' وفا شعاری' احساس افتخار اور جذبہ رشک ان کی بہترین خصوصیات رہی ہیں۔ بلوچوں میں افراتفری' ہنگامہ پروری اور اتحاد کا فقدان شروع سے رہا ہے۔ ان کی قبائلی دشمنیاں صدیوں تک جاری رہتی ہیں۔ آپس میں جنگ وجدل ان میں شروع سے رہا ہے جو ان کو زوال پر آمادہ کرنے کیلئے کافی ہیں۔ سماجی نقطہ نگاہ سے اجتماعی طور پر غیر اثر پذیری کا مادہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے لیکن سیاسی لحاظ سے بلوچ مسلمہ طور پر ایک ایسی غیر متحد قوم ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ انتقام جوئی پر ان کا کامل ایمان ہے اور وفا شعاری ان کے کردار کی بنیادی خصوصیات ہیں۔

بلوچی کردار ہمسایہ نسلوں سے بالکل مختلف اور ممتاز ہے۔ ایک بلوچ فتح وشادمانی کا عالم ہو یا شکست آرام کی گھڑی' ہر حال میں بہادری اور شجاعت' مستقل مزاجی' استقامت' متانت' وقار اور عزت اور بے خوفی' بے باکی کے دامن کو تھامے رکھتا ہے۔ تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہیں کہ بلوچوں نے کسی شکست اور مصائب وآلام کے کسی سانحے کے وقت ذلت اور بزدلی کے ساتھ سر تسلیم خم کیا ہو۔ پہلی جنگ عظیم میں جب اقوام عالم متحد ہو کر جرمن سے جنگ لڑ رہی تھی تو برطانوی حکومت نے مری قبیلے سے فوجی بھرتی کا مطالبہ کیا

لیکن بھرتی کیلئے تمام بلوچ قبائل نے قطعاً انکار کر کے انگریز سے جنگ چھیڑ دی۔ یہ جنگ کئی سال تک جاری رہی' اس ہولناک اور تباہ کن جنگ سے مری قبیلے کو شدید مسائل و تباہی و نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ سینکڑوں گاؤں بمباری اور آتش زنی سے خاکستر اور ویران ہو گئے۔ جنگ ختم ہونے پر اس قبیلے کے مرکزی مقام کاہان میں ایک دربار کا انعقاد کیا گیا۔ چیف کمشنر نے قبائلیوں سے خطاب کیا' دربار کے بعد گورنر جنرل نے مری قبیلے کے سردار نواب خیر بخش مری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا خوب آئندہ مری برطانوی حکومت کے خلاف کبھی ہتھیار اٹھانے کی جرات نہیں کرے گا تو نواب موصوف نے برجستہ ترکی بہ ترکی جواب' ہاں صاحب برطانوی بھی بھرتی کیلئے آئندہ کبھی بلوچوں سے مطالبہ کی جرات نہیں کرے گا''۔

انیسویں صدی کے وسط میں بلوچوں کے مرد مجاہد میر بجار خان ڈومکی نے برطانوی استعمار کی قوت و جبر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جبکہ دوسری طرف برطانوی ارباب اختیار میں انہیں نوابی کے علاوہ ایک بڑی جاگیر کا لالچ بھی دیا۔ لیکن اس مرد مجاہد نے تحریص و ترغیب کی ان پیشکشوں کو بڑی جرأت اور خودداری کے ساتھ ٹھکرا دیا کہ ''شیر جنگل میں بھوکا تو رہ سکتا ہے لیکن شکار اپنا ہی کھائے گا''۔ ایک لومڑی کی طرح کسی محل و ایوان میں محبوس ہونے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ انسان اپنے سچے قول کی خاطر اپنی جان تک کی بازی لگا دے۔ ایک معروف برطانوی مدبر نے بلوچوں اور پٹھانوں کے کردار کا نقشہ پیش کرتے ہوئے اپنے بے باک تجزیہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے'' دونوں قومیں جنگجو اور غارت گری میں یکتا ہیں۔ مگر ان کی لڑائی کے قواعد و ضوابط اور طریقہ ہائے کار قطعاً مختلف ہیں' خواہ وہ آپس میں باہمی قبائلی لڑائیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ پٹھان اپنے مقصد کے مطابق کوئی بھی چال چل سکتا ہے اور مخالف کو عقب سے نشانہ باندھ کر وار کرتا ہے لیکن بلوچ برسرِ عالم کھلم کھلا اور آمنے سامنے لڑتا ہے۔ بلوچ میں ایک مخصوص شجاعت کا رواج ہے جو ہر لحاظ سے ایشیا کے عرب فاتحوں کی بہادر اولاد کہلوانے کے مستحق ہیں۔ بلوچ بنی نوع انسان کی ایک خوبصورت اور محرک نسل ہیں جنگ کے دوران عورتوں اور بچوں کی کبھی بے حرمتی نہیں کرتے۔''

بلوچوں کے بارے میں ایک مصنف مزاج اہل قلم نے حقیقت کا اظہار اس صورت میں کیا کہ بلوچ صادق اور صاف گو ہوتے ہیں' جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں ایک سچے بلوچ کی زبان اور دل پر ایک بات ہوگی' امانت میں کبھی خیانت نہیں کریں گے اور اس کی حفاظت اور نگرانی کیلئے اپنی جان تک قربان کر دیں گے۔ وہ غیر مہذب ہیں مگر اس حالت میں بھی اطمینان اور افتخار سے سرشار رہتے ہیں وہ بہادری اور جنگ و جدل میں مشہور ہیں جیسا کہ فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں بلوچوں کو پہاڑی بکرے سے تشبیہ دی کیونکہ وہ سر سے پاؤں تک مسلح ہوتے ہیں اور میدان کارزار میں کبھی پیٹھ نہیں دکھاتے''۔

مشہور انگریز مورخ مسٹر ایم لونگ ڈیمز بیان کرتا ہے'' یہ مشاہدے میں آیا ہے کہ بلوچ قوم کی سب سے بڑی خوبی سخاوت مہمان نوازی ہے اور مذہب اسلام میں یہ دو بڑی خوبیاں اتم پائی جاتی ہیں بلوچ خود تو بھوکا رہ کر گزارہ کر لیتا ہے لیکن اپنے مہمان کی خاطر اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا ہے' سخاوت بلوچوں کا ورثہ رہی ہے بڑے نامور لوگ بلوچوں میں سخاوت کی وجہ سے مشہور ہوئے ہیں' بگٹی سخی سہری کو اپنا مرشد تصور کرتے ہیں' گشکوریوں میں سخی گہرام بہت فیاض شخصیت ہوئی ہیں' مزاری قبیلے میں سخی رندحان بہت بڑی سخاوت والی شخصیت تھے۔ اس طرح سخی صوبدار جیکب آباد کے بلیدیوں کی برگزیدہ ہستی ہے کوہ سلیمان میں سخی بوربخش' سخی سرور ہب' دارو پیر بہت بڑی شخصیات ہو گزرے ہیں' لاشاریوں میں نوبندغ لاشاری جو اپنی فیاضی اور سخاوت کی وجہ سے بے حد مشہور ہو گزرے ہیں' وہ سونا لٹانے والے کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے اس طرح وہ لاتعداد یتیموں اور محتاجوں کا وسیلہ بنا جو ہر وقت اس کے پیچھے لگے رہتے۔

اس وقت بھی بلوچوں میں فیاضی و مہمان نوازی کا دستور زمانہ اولیٰ کی طرح قائم ہے' ہندوستان میں پہلے زمانے میں بلوچوں کے پاس دولت و ثروت اور مال مویشی تھے۔ مویشیوں کے ریوڑ' اونٹوں کے گلے' نایاب گھوڑے' غلام اور تلواریں' انعام و اکرام دینا بلوچوں کا عام وطیرہ تھا۔ سخاوت' مہمان نوازی' بہادری' شہسواری اور وفاداری وہ بنیادی معیار تھے جن سے قبائل کی ایک دوسرے پر فضیلت اور فوقیت کو جانچا جاتا تھا مزاری قبیلے کی ایک مثال یہاں بیان کرتا چلوں' مزاریوں میں دو نام بڑے معتبر گزرے ہیں ایک سردار سر

امام بخش خان اور دوسرا نام سردار بہرام خان مزاری۔ ان دونوں سرداروں کے زمانے میں مزاریوں کی مہمان نوازی مشہور تھی۔ ہر دو سرداروں کے ہاں روجھان میں مہمانوں کے لئے دو سو بستر بیک وقت تیار ہوتے تھے لیکن پھر بھی بسا اوقات مہمان خانہ میں اس قدر ہجوم ہوتا کہ مہمانوں کیلئے اور خیمے نصب کرنے پڑتے' اسی طرح آس پاس کے دوسرے قبائل بھی مہمان نوازی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلوچ مزارعہ اپنی اراضی کی پیداوار کا ایک خاص حصہ مستقل طور پر اپنے سردار کو دیتا ہے تاکہ فیاضی' سخاوت کے میدان میں اپنے قبیلے کے وقار' شہرت کو قائم ودائم رکھا جاسکے۔

انگریز مورخ نیکوتا بیان کرتا ہے کہ "بلوچوں کیلئے مہمان نوازی ایک مقدس فریضہ ہے اور ان کے مذہب کا جزو بھی تصور کیا جاسکتا ہے' ایک قبائلی کے گھر کے دروازے ہر آنے والے کیلئے کھلے رہتے ہیں جبکہ ایک دشمن بھی اس کے گھر سے اس وقت تک باہر نہیں جاسکتا جب تک کہ اس کا میزبان اپنی گنجائش کے مطابق بہتر سے بہتر شے کے ساتھ اس کی خاطر تواضع نہ کرے"۔

بلوچ قبائل میں انتقام گیری کا جذبہ اتنا شدید اور تیز ہوتا ہے کہ کسی خاندان کے سب بالغ مرد افراد مارے جاتے تو مرنے والے خاندان کی خواتین اپنے بچوں کو بچپن ہی میں قاتلوں کے نام ازبر کراتی رہتی ہیں تاکہ جب وہ انتقام لینے کے قابل ہو جائیں تو پھر ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ قدیم بلوچی نظمیں اشعار اور گیت انتقام کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔ بجار خان میر چاکر کے زمانے میں پڑ رندوں کا سردار تھا' بلیدی قبیلہ کے ہاتھوں مارا گیا اس کے بدلے میں بجار خان کے عزیزوں نے بلیدیوں کے سردار ہیبت خان کو پکڑ کر ایک بلند چٹان سے سر کے بل نیچے پھینک دیا اور آتش انتقام کو مزید ٹھنڈا کرنے کیلئے اس کا سر تن سے جدا کر کے کاسہ کو تراش خراش کر پیالہ میں بدل دیا جو بجار خان کے خاندان میں پیالے کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ اس طرح کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ بیورغ کا والد شہ کٹی اور اس کے حواریوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا' شہ کٹی نے اپنی جان کی حفاظت کے لئے تمام تر اقدامات اختیار کئے مگر پھر بھی ایک روز بیورغ نے اس کو آڑے ہاتھوں لیا اور شہ کٹی پر ایسا جھپٹا کہ جیسے کوئی باز کبوتر پر جھپٹتا ہے اور ایسا زبردست وار کیا کہ شہ کٹی وہیں ڈھیر ہو گیا۔

دھوکہ بازی اور غداری بلوچوں میں سنگین ترین جرم تصور ہوتا ہے وہ قابل اعتماد اور اعتبار کے لائق فرد ہونا فخر محسوس کرتا ہے۔ جنگ کی حالت ہو یا امن کی دھوکہ بازی اور غداری کو وہ ناقابل معافی جرم تصور کرتے ہیں۔ ہر قبیلہ اپنے سردار کا وفادار اور فرمانبردار ہوتا ہے۔ سردار گوہرام خان لاشاری نے جب میر چاکر کے ساتھ جنگ شروع کی تھی تو سب سے پہلے چالیس ہزار جنگجو لاشاریوں سے مخاطب ہو کر انہیں دھوکہ بازی اور غداری سے باز رکھنے کی تلقین کی۔ سردار گوہرام خان لاشاری اپنے غیور جانبازوں سے یوں مخاطب ہوا "میرے غیرت مند اور بہادر لاشاریو' میں تمہاری عظمت اور بے باکی پر سلام کرتا ہوں' آج رندوں کے سردار میر چاکر نے لاشاریوں کو ختم کرنے کی قسم کھائی ہے لیکن چاکر نہیں جانتا کہ اس نے کس قبیلہ کو للکارا ہے' انشاء اللہ لاشار خان کا بچہ بچہ دس دس رندوں کو کافی ہوگا لیکن ہاں ایک بات یاد رہے کہ جنگ کے دوران ہم نے دشمن سے بھی دھوکہ بازی نہیں کرنی کیونکہ بری عادت ہماری عظیم روایات کے خلاف ہے"۔

ہر بلوچ بڑی سختی کے ساتھ اخلاق اور ننگ و ناموس کے کچھ مروجہ قواعد وضوابط پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ ان میں سے چند ایک روایتی آداب وضوابط اور اقدار حیات حسب ذیل ہیں۔

(1)...... خون کا بدلہ لینا تمام فرائض میں فوقیت رکھتا ہے۔ خطہ ارض کے مروجہ قانون کے مطابق خون کا بدلہ لینا شروع سے ہی چلا آ رہا ہے۔ عظیم مذہب اسلام نے بھی اسی بات کا درس دیا ہے کہ خون کا بدلہ خون۔ ہاں اگر مقتول کے ورثا "دیت" لے کر خدا واسطے معاف کر دیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

(2)...... امانت کے تحفظ کی خاطر جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔

(3)...... اس شخص کے تحفظ کی خاطر جان کی بازی لگانا بھی بلوچ اپنے لئے فرض سمجھتا ہے کہ جس شخص نے کسی بلوچ کے پاس پناہ لی ہو جسے بلوچی میں (باہوٹ) کہتے ہیں۔

(4)...... مہمان نواز ہونا اور مہمان کے جان و مال کی حفاظت کرنا۔

(5)...... کسی لڑائی کے دوران جہاں انسانی جانوں کا ضیاع ناگزیر ہوتا ہے۔ کسی عورت'

کسی نابالغ مرد کہ جس نے شلوار نہ پہنی ہو کسی ہندو اور کسی کمین فرد کے قتل سے اجتناب برتنا (ہندوؤں کو ہمسایہ یا باہوٹ) پناہ لینے والا تصور کیا جاتا ہے۔

(6)...... اگر کوئی سید یعنی حضور اقدس ﷺ کی اولاد متحارب طریقوں کے درمیان مداخلت کرے تو جنگ کو بند کرنا۔

(7)...... زانی کو موت کی سزا دینا۔

(8)...... جب کوئی شخص کسی کے بزرگوں کے مقبرے میں گھس جائے تو اس وقت تک اس پر ہاتھ نہ اٹھانا' جب تک کہ وہ اس احاطے میں موجود ہے۔

کسی بلوچ کیلئے عزت واحترام ہی اس کی زندگی ہے۔ اس سے عزت واحترام چھین لو تو گویا وہ زندگی سے محروم ہو گیا' وہ اپنی عزت' وقار کے تحفظ کے لیے اپنی ہر متاع بلا تامل قربان کر دے گا۔

(مظہر علی خان لاشاری۔سنڈے میگزین نوائے وقت مئی 2005ء)

بلوچوں کے اس تاریخی پس منظر کو جاننے کے بعد بھی اگر ہمارے ارباب اختیار انہیں اپنی مرضی اور منشا کے مطابق محض طاقت کے بل بوتے پر اپنے تابع رکھنا چاہیں تو اُن کی عقل پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔

❖■❖■❖

جغرافیہ اور انتظامی تقسیم

بلوچستان کو انتظامی لحاظ سے چھ ڈویژنوں (کوئٹہ، سبی، قلات، ژوب، نصیر آباد اور مکران) اور چھبیس ضلعوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے نام یہ ہیں: کوئٹہ، پشین، چاغی، ژوب، لورالائی، سبی، بارکھان، موسیٰ خیل، قلعہ سیف اللہ، قلعہ عبداللہ، زیارت، جعفر آباد، آواران، بولان، جھل مگسی، مستونگ، نصیر آباد، ڈیرہ بگٹی، کوہلو، خضدار، لسبیلہ، خاران، تربت، گوادر اور پنجگور۔ قیام پاکستان کے وقت یہ علاقہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ برٹش بلوچستان کہلاتا تھا اور دوسرا ریاستی بلوچستان۔ برطانوی بلوچستان کوئٹہ، پشین، لورالائی، ژوب، سبی اور چاغی کے اضلاع پر مشتمل تھا اور ریاستی بلوچستان قلات، خاران، مکران اور لسبیلہ کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ برٹش بلوچستان کا علاقہ براہ راست برطانوی حکومت کے زیر انتظام تھا اور ایجنٹ برائے گورنر جنرل (اے جی جی) اس علاقے کی نظم و نسق کا ذمے دار تھا۔ مؤرخین نے بلوچستان کی مختلف توضیحات پیش کی ہیں۔ لفظ ''بلوچستان'' نادر شاہ افشار کی وضع کردہ یا عطا کردہ اصطلاح ہے۔ قدیم دور میں اس کا یہ نام تھا نہ اس کی ترکیب موجود تھی۔ اس کے شمال مشرقی حصے پنجاب میں شامل تھے۔ شمال مغربی حصے صوبہ قندھار میں شامل تھے۔ جنوب مغربی حصہ (جسے اب مکران کہتے ہیں) جیدروشیہ یا گیدروشیہ کہلاتا تھا۔ یہ نام سب سے پہلے یونانی مؤرخین کے ہاں ملتا ہے۔ گویا جیدروشیہ موجودہ مکران ہے اور چونکہ یہ صحرائی اور بے آب وگیاہ علاقہ تھا اس لئے تواریخ قدیم میں اس کا زیادہ ذکر نہیں، گو اس میں کہیں کہیں نخلستان تھے بالخصوص کیچ مکران میں، اور ساحل کے ساتھ ساتھ ایک بری راستہ بھی گزرتا تھا جو سندھ اور مغرب ایشیا کو ملاتا تھا۔ اسی راستے

سے سکندر اعظم گزرا اور بعد میں عرب فاتحین بھی آئے۔اس وقت مکران دو حصوں میں منقسم ہے: پاکستانی مکران اور ایرانی مکران۔قریباً ساٹھ فیصد پاکستان میں ہے اور کوئی چالیس فیصد ایران میں ہے اسی لئے بعض اوقات اسے مکرانات کہتے ہیں۔لیکن قدیم دور میں مکران یا جیدروشیہ ایک ہی تھا۔وجہ تسمیہ غالباً یہ تھی کہ ایک قبیلہ جیدر یا گیدر نامی تھا جس کے نام پر اسے یہ نام دیا گیا۔اس کی واحد نشانی اب ایک مقام گدر کی صورت میں باقی ہے وہ قبیلہ بعد میں آنے والے قبائل میں جذب ہو گیا۔سیستان اس کے شمال میں تھا۔قدیم دور میں بھی اور اب بھی یہ دونوں مختلف جغرافیائی اور سیاسی خطے تھے۔سیستان ہمارے موجودہ اضلاع چاغی اور خاران کے شمال مغرب میں تھا اور ہے۔اور اسے یہ نام ساکا قبائل کی وجہ سے ملا۔ پہلے ساکستان اور پھر سیستان ہوا۔رقبے کے لحاظ سے بلوچستان پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔اس کا کل رقبہ ایک لاکھ چونتیس ہزار دو (1,34,002) مربع میل ہے جو سندھ، پنجاب، خیر پور اور بہاولپور کے مجموعی رقبے کے برابر ہے۔اس کی آبادی 1981ء کی مردم شماری کی رو سے 45 لاکھ ہے۔اس اعتبار سے یہ پاکستان کا سب سے چھوٹا صوبہ ہے۔کہیں کہیں تو ایک مربع میل میں ایک شخص آباد ہے۔

بلوچستان کے شمال میں افغانستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ، جنوب میں بحیرہ عرب، مشرق میں سندھ اور پنجاب اور مغرب میں ایران واقع ہے۔مغربی اور شمالی سرحدیں پانچ سو میل تک ایران اور 723 میل تک افغانستان سے ملتی ہیں۔اسی بنا پر اسے زبردست تاریخی اور فوجی اہمیت حاصل ہے۔ماضی میں دوسرے علاقوں سے تعلقات کے چار راستے تھے۔اہم ترین راستہ درہ بولان ہے جو کولپور سے رندلی تک پھیلا ہوا ہے۔اس کی لمبائی 54 میل ہے۔دوسرا درہ مولہ کا ہے جو دریائے مولہ کے دھانے سے انجیرا کے قریب شروع ہوتا ہے۔تیسرا لسبیلہ اور مکران کا بری راستہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔چوتھا بحری راستہ ہے۔بلوچستان جغرافیائی لحاظ سے تین حصوں، پہاڑی، میدانی اور صحرائی میں منقسم ہے۔مشرق سے مغرب اور جنوب مغرب کا تمام علاقہ وسیع و عریض سلسلہ ہائے کوہ سے پٹا پڑا ہے۔یہ علاقہ بلوچستان کے وسط میں واقع ہے جبکہ جنوب مشرقی علاقہ جو کچھ، سبی اور نصیر آباد پر مشتمل ہے ایک وسیع و عریض میدان ہے۔شمالی مغربی علاقہ جو نوشکی سے دریائے ہلمند، گرم سیل اور سیستان تک پھیلا ہوا ہے۔لق و دق ریگستان اور بے آب و گیاہ صحرا ہے۔

کوہ سلیمان دریائے گومل اور دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے اور بلوچستان کو پنجاب اور صوبہ سرحد سے جدا کرتا ہے۔یہ سلسلہ کوہ تقریباً اڑھائی سو میل لمبا ہے اور اس کی سب سے اونچی چوٹی تخت سلیمان کے نام سے مشہور ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے 11292 فٹ ہے۔

تخت سلیمان بلوچستان سے متصل صوبہ سرحد کے علاقے میں ہے۔وادی شال (کوئٹہ کا قدیم نام) اور مستونگ (مسر تنگ، تین راستے) کے درمیان واقع مشہور پہاڑ چلتن اسی سلسلہ کوہ کا ایک حصہ ہے جس کی بلندی 10480 فٹ ہے۔سلسلہ کوہ وسطی ہربوئی (اسے کوہ بروہی وسطی کا نام بھی دیا گیا ہے) سارا وان (مقامی زبان میں سارا ابتدا، انتہا اور فراز کو کہتے ہیں) کی جنوب مشرقی اور مشرقی سمت میں تقریباً شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے۔اس کی کل لمبائی 280 میل ہے۔بلوچستان کے مشہور درے بولان اور مولا اسی سلسلہ کوہ میں واقع ہے۔زرغون اس کی سب سے اونچی چوٹی ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے 11788 فٹ ہے۔اس کی ایک چوٹی زرگٹ ہے جو بڑی سرسبز ہے۔یہ وادی زیارت کے جنوب میں واقع ہے اس کی بلندی 11200 فٹ ہے۔اسی سلسلے میں قلات سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر مشرق کی طرف ہربوئی کا وہ صحت افزا مقام ہے جہاں ایک تفریحی قیام گاہ بھی تعمیر کی گئی ہے۔سلسلہ کوہ ہربوئی، بلوچستان کے دوسرے پہاڑوں کی طرح بنجر اور خشک نہیں بلکہ اس پہاڑ پر دیودار کوہی (جونیپر) کے گھنے جنگلات ملتے ہیں۔زیارت، نچارہ، پندران، نرمک، جوہان اور کشان وغیرہ کی دلکش اور شاداب وادیاں اسی کے دامن میں واقع ہیں۔ ان کے علاوہ درہ بولان اور درہ مولہ میں بیسیوں ایسے چھوٹے بڑے نخلستان ملتے ہیں جو صحت افزا اور دل پذیر ہیں۔توبہ کاکڑی کا سلسلہ کوہ، ژوب اور کوئٹہ پشین کے ضلعوں میں واقع ہے اور افغانستان اور بلوچستان کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے۔یہ پہاڑ تقریباً 300 میل لمبا ہے۔

خوجک کا مشہور درہ اسی پہاڑ میں ہے اور شیلا باغ کی مشہور و معروف 225 میل لمبی ریلوے سرنگ بھی اسی پہاڑ سے گزرتی ہے۔یہ برصغیر پاک و ہند کی سب سے بڑی سرنگ ہے اور دنیا کی بڑی بڑی سرنگوں میں شمار ہوتی ہے۔کوہ کیر تھر، جھالاوان کے علاقے کو سندھ سے جدا کرتا ہے۔کوہ پب، لسبیلہ اور جھالاوان میں شمالاً جنوباً 190 میل تک پھیلا

ہوا ہے۔ ان دونوں سلسلوں کی بلندی بعض مقامات پر 700 فٹ سے زائد ہے۔ کوہ سیاہاں، مکران اور خاران کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا ہے۔ اس کا طول 174 میل ہے۔ کوہ چاغی جو ضلع چاغی کے شمالی حصے میں شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے، 90 میل لمبا ہے اور معدنی ذخائر سے اٹا پڑا ہے۔ راس کوہ کا سلسلہ 140 میل، کوہ وسطی مکران 250 میل اور کوہ ساحلی مکران 280 میل کی لمبائی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آخرالذکر پہاڑ بحیرہ عرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔

بلوچستان کا ساحلی علاقہ 471 میل لمبا ہے۔ اس میں اورماڑہ، جیونی، سونمیانی، پسنی اور گوادر پانچ بندرگاہیں واقع ہیں۔ ان بندرگاہوں اور کراچی کے درمیان موٹر لانچوں کے ذریعے آمدورفت ہوتی ہے۔ گوادر، پسنی اور جیونی کی بندرگاہوں میں ماہی گیری کی صنعت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مچھلی کی برآمد سے زرمبادلہ کی اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے۔ بلوچستان میں کئی دریا ہیں لیکن یہ سارا سال رواں دواں نہیں رہتے۔ بارش کے دنوں میں رواں دواں ہوتے ہیں مگر باقی عرصہ عموماً خشک رہتے ہیں۔ دریائے ژوب، دریائے ناڑی، دریائے بولان، لوہڑہ پشین، دریائے مولہ، دریائے حب، دریائے ہنگول، دریائے پورالی، دریائے دشت اور دریائے رخشان یہاں کے مشہور دریا ہیں۔ بلوچستان میں آبپاشی کے ذرائع بارش کا کھدر جو، کاریزات، رہٹ، پانی نکالنے کی مشینیں، بیراج اور فیڈر، قدرتی چشمے ہیں۔ مقامی اصطلاح میں جن زمینوں کی آب پاشی کا انحصار بارش یا برف باری پر ہے، ان کو خشکابہ کہتے ہیں۔

جو زمینیں طغیانی کے پانی سے سیراب ہوتی ہیں ان کو سیلابہ کہا جاتا ہے۔ زرعی پیداوار میں گندم، جو، مکئی، جوار، تمباکو، دالیں اور مختلف سبزیاں شامل ہیں لیکن بلوچستان زیادہ تر اپنے عمدہ پھلوں کے لئے مشہور ہے۔ یہاں بہترین اقسام کا انگور، سیب، شفتالو، زردآلو، بادام، آلوچہ، شہتوت، خربوزہ اور تربوز پیدا ہوتا ہے اور پاکستان بھر کی منڈیوں میں پہنچتا ہے۔ سیب برآمد بھی کیا جاتا ہے۔ معدنی پیداوار میں کوئلہ، سوئی گیس، کروم، گندھک، سنگ مرمر، اسبسٹاس، تانبا، بیرائٹ، سرمہ اور سیسہ شامل ہیں۔

معدنیات کی تلاش اور چھان بین کے لئے کوئٹہ میں جیولاجیکل سروے آف پاکستان کی ایک برانچ قائم ہے جو جدید ترین سازوسامان اور لیبارٹری کے علاوہ معدنیات

کے ایک بہترین میوزیم سے آراستہ ہے۔ بلوچستان میں عمدہ نسل کے مویشی بالخصوص بھیڑیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مختلف نسلوں کے ملاپ سے زیادہ پیداوار دینے والی نسلیں تیار کی جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے آسٹریلیا سے بڑی تعداد میں بھیڑیں درآمد کی گئی ہیں۔ صوبے میں افزائش نسل کے تین سرکاری فارم، 54 ویٹرنری ہسپتال اور 664 ویٹرنری ڈسپنسریاں کام کر رہی ہیں۔ بلوچستان میں ریلوے لائن اس علاقے کو کراچی، لاہور، پشاور اور ایران سے ملاتی ہے۔ اس کا ایک سیکشن جھٹ پٹ سے چمن تک 250 میل لمبا، دوسرا کوئٹہ سے زاہدان تک 546 میل لمبا، تیسرا کھوسٹ سے بی تک 83 میل لمبا اور چوتھا بوستان سے فورٹ سنڈیمن تک 184 میل لمبا ہے۔ جیکب آباد سے ایک لائن اوستہ محمد اور دوسری کشمور تک جاتی ہے۔ سڑکوں میں کوئٹہ، بی، جھٹ پٹ (198 میل)، کوئٹہ چمن (77 میل)، کوئٹہ فورٹ سنڈیمن (206 میل)، کوئٹہ احمد وال نوک کنڈی میر جاوا (380 میل)، کوئٹہ قلات (90 میل)، کوئٹہ لورالائی ڈیرہ غازی خاں (177 میل) ہیں۔

آر سی ڈی روڈ کراچی سے لسبیلہ، ہزارہ، قلات، نوشکی اور دالبندین سے ہوتی ہوئی ایران چلی جاتی ہے۔ کراچی سے قلعہ فید تک اس کی لمبائی 840 میل ہے۔ یہ سب سڑکیں پختہ ہیں۔ کوئٹہ مکران روڈ کی سوراب پہنچ کر دو شاخیں بنتی ہیں۔ ایک شاخ سوراب سے براستہ گھدر پنجگور سے ہوتی ہوئی تربت اور پسنی کی بندرگاہ تک جاتی ہے۔ یہ سڑک کوئٹہ سے سوراب اور ہزار تک پختہ ہے۔ تربت جیونی روڈ 67 میل لمبی ہے۔ تربت مند روڈ ایرانی سرحد کو چھوتی ہے۔ نوشکی خاران روڈ 90 میل لمبی ہے جو خاران سے آگے نکل کر بسیمہ کے مقام پر کوئٹہ پنجگور روڈ سے مل جاتی ہے۔

بلوچستان کی بندرگاہوں اور کراچی کے مابین لانچوں اور بادبانی کشتیوں کے ذریعے آمدورفت ہوتی ہے۔ پی آئی اے کے طیارے روزانہ کراچی، کوئٹہ، لاہور اور اسلام آباد آتے جاتے ہیں۔ کراچی سے تربت، گوادر، پنجگور، پسنی، کوئٹہ وغیرہ کے لئے فوکر سروس موجود ہے۔ فورٹ سنڈیمن کو بھی کوئٹہ، اسلام آباد، پشاور سے ملا دیا گیا ہے۔ کوئٹہ کا ہوائی اڈہ بین الاقوامی بن چکا ہے۔ ہر موسم میں جہاز اترنے اور چڑھنے کے لئے جدید آلات نصب کیے گئے ہیں۔ ایک سرکاری اندازے کے مطابق بلوچستان میں درجہ اول دوئم کے چالیس ہسپتال (تعداد بستر 3343)، 605 ڈسپنسریاں، 459 دیہی مراکز صحت، 72

ذیلی دیہی مراکز، 17 ٹی بی کلینک، 81 زچہ بچہ کی بہبود کے مراکز دور دراز علاقوں میں بھی قائم کیے گئے ہیں۔ بلوچستان تعلیمی میدان میں ترقی کر رہا ہے۔ اس وقت اس صوبہ میں بھی طلبا وطالبات کے لئے 8011 پرائمری سکول، 623 مڈل سکول، 361 ہائی سکول، 123 انٹرمیڈیٹ کالج، 16 ڈگری کالج، ایک ایک میڈیکل اور انجینئرنگ، لاء کالج اور ایک یونیورسٹی موجود ہے۔ ایک کیڈٹ کالج اور بہت سے ایگرو ٹیکنیکل پولی ٹیکنیک اور کمرشل ادارے اور اساتذہ کی تربیت کے لئے ادارے بھی کام کر رہے ہیں۔

تاریخ بلوچستان از پروفیسر عزیز محمد بگٹی میں صفحہ نمبر 5 پر بلوچستان کے بارے میں لکھا ہے: بلوچ آبادی کے حوالے سے بلوچستان کی جغرافیائی حدود کا صحیح تعین تو مشکل ہے لیکن صوبہ بلوچستان کے ساتھ ملحق ایرانی بلوچستان، افغانی بلوچستان اور پاکستان کے صوبوں سندھ، پنجاب اور سرحد کی بلوچ اکثریتی آبادی کو پیش نظر رکھ کر بلوچ سرزمین کی حدود کا تعین مختلف مورخین نے کچھ اس طرح کیا ہے، لارڈ کرزن کے مطابق ''یہ علاقہ علمند اور بحیرہ عرب اور کرمان اور سندھ کے درمیان واقع ہے۔ افغانستان میں ہلمند کا ایک حصہ فراح، چکنسور اور گرم سیل کے علاوہ شورادک اور ہرات میں بادغین تک بلوچ علاقے ہیں۔''

انگریز مؤرخ ہیوز A.W. Hughes نے اپنی مشہور کتاب TheCountry of Balochistn میں بلوچستان کی حدود کا تذکرہ یوں کیا ہے: ''جدید اصطلاح کی رو سے اگر کہا جائے تو بلوچستان اس تمام خطے پر مشتمل ہے جس کے شمال اور شمال مشرق میں افغانستان کی عظیم شہنشاہیت واقع ہے۔ اس کی مشرقی سرحدات انگریزوں کے ماتحت صوبہ سندھ سے ملتی ہیں۔ اس کی مغربی حدیں سلطنت ایران سے اور بحیرہ عرب کی موجیں اس کے تقریباً چھ سو میل لمبے ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ پھر بھی یہ بلوچستان کی سرحدات کا ایک عام ساخاکہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس موضوع پر پوری وضاحت سے کام لیا جائے اور اس کی باریکیوں میں جایا جائے جیسا کہ بلوچستان کے طبعی اور سیاسی حالات کا تقاضا ہے۔'' اس کے بعد اس کے بعد ہیوز اس کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے: بلوچستان کا وہ حصہ جو مشرقی سمت میں پھیلا ہوا ہے اور جس میں جھالاوان اور لسبیلہ کے اضلاع آتے ہیں وہاں سے سرحد ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ راس موہاڑی جو 24-52 عرض بلد اور 41-66 طول بلد

پر واقع ہے۔ شمال کی طرف یہ حد کافی دور تک نمایاں ہے جسے پہلے حب ندی اور پھر کوہستان ہربوئی انگریزوں کے صوبے سندھ سے جدا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ شمالی عرض بلد کے متوازی چند میلوں کے فاصلے پر ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد سرحد ضلع گنداوہ کے جنوبی حصے کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف پھیل جاتی ہے اور سندھ کی سرحد سے ملحق ہو کر شمال مشرق کی طرف بیس میل کے فاصلے پر کسی بیراج کے مقام پر پنجاب کی سرحد سے بغلگیر ہوتی ہے اور اس سمت میں گنداری پہاڑ سے گزر کر بالآخر ہڑند کے نواح میں ایک مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں انگریزی، افغان اور بلوچ سرحدات ملتی ہیں۔ پھر یہ سرحد یہاں سے قریب قریب مغربی سمت کو 160 میل سے زیادہ فاصلے تک جاتی ہے حتیٰ کہ درۂ بولان کے قریب لالہ جی نامی سلسلہ کوہ کو چھو کر اچانک شمال مغربی سمت کو مڑ جاتی ہے اور بڑھتے بڑھتے قلات کے ضلع شال (کوئٹہ) میں کوہ تکتو کے شمال میں چند میل کے فاصلے پر دریائے لوڑہ (پشین) پہنچ جاتی ہے جو بلوچستان اور افغانستان کی تسلیم شدہ سرحد ہے۔ یہ مقام بلوچستان کی آخری شمالی حد ہے اس کے بعد سرحد جنوب مغرب کا رخ کر کے قلات کی ضلع شال (کوئٹہ) کے ساتھ ساتھ نوشکی اور خاران کے اضلاع تک چلی جاتی ہے جو بلوچستان کے جدید نقشے میں ضلع ساراوان کے حصے ہیں۔ یہ خاران کی انتہائی جنوبی حد میں واشی نامی سلسلہ کوہ سے مل جاتی ہے جسے مچھ یاماش بھی کہتے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطابق یہ حدود بم کے مشرق میں صحرائے کرمان اور کوہ لسلرو میں ایرانی سطح مرتفع کے جنوب مشرق سے لیکر سندھ اور پنجاب کی مغربی سرحد تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جناب محمد سردار خاں بلوچ اپنی کتاب ''تاریخ بلوچ اور بلوچستان'' میں پاکستان، ایران اور افغانستان میں بلوچ علاقوں کا کل رقبہ 340000 مربع میل بتاتے ہیں۔ اس علاقہ میں 960 میل کا ساحل بھی شامل ہے۔ جسٹس میر خدا بخش بجارانی اپنی کتاب ''بلوچستان تاریخ کے آئینے میں'' میں بلوچوں کی سرزمین کی حدود کا تعین یوں کرتے ہیں ''اگر ہم بحیرہ عرب میں بندر عباس سے شمال میں کرمان کی طرف ایک لائن کھینچیں اور شمال میں ایران کے علاقہ، نہہ کی طرف بڑھیں اور افغانی سیستان میں فراح کی طرف مشرق میں آئیں اور اس کے بعد مشرق میں گرشک تک بڑھیں اور وہاں سے پاکستان میں بلوچستان کی حد پر باراخان کے گاؤں تک آئیں اور اس کے بعد بلوچستان کے شمالی علاقہ

میں سے ہوتے ہوئے مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خاں کے ضلعوں تک بڑھیں اور پھر وہاں
سے جیکب آباد، لاڑکانہ کی جنوب مشرقی سرحد اور سکھر اور دادو اضلاع کے شمال تک آئیں
اس کے بعد مغرب کی طرف مڑیں اور بحیرہ عرب میں کراچی کے قریب بلوچستان کے ضلع
لسبیلہ کی سرحد تک پہنچ جائیں تو یہ مذکورہ بالا علاقہ کی حدود ہوں گی۔ یہ علاقہ تقریباً 250000
مربع میل وسیع ہے۔''

میر گل خاں نصیر اپنی کتاب ''بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں'' میں
اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ''بلوچستان کے نام سے اگر ہم سرزمین ایشیا کے اس خطے کو
مخصوص کریں جس میں بلوچ آباد ہیں تو اس کی حدود تقریباً مندرجہ ذیل ہوں گی۔ مشرق
میں پنجاب، ڈیرہ اسماعیل خاں اور ڈیرہ غازی خاں کے ساتھ ساتھ ملتان تک اور پھر
دریائے سندھ کے شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ کشمور اور جیکب آباد تک اور یہاں سے جنوب
مغرب کی طرف سیہون کو چھوتے ہوئے کراچی کی بندرگاہ تک مغرب میں روسی ایرانی سرحد
تک مرو اور اشک آباد کی جنوبی حدود سے مشہد اور مکران کو مغرب میں چھوڑ کر بندر عباس تک
شمال میں ڈیرہ غازی خاں کے شمالی کوہستان کے ساتھ ساتھ علاقہ بگٹی مری اور کھیتران کو
جنوب میں رکھ کر اسی سلسلہ کوہ کو حد فاصل قرار دے کر کوئٹہ کے شمالی پہاڑ تکتو سے گلستان کی
جنوبی پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے قندھار کے جنوبی ریگستان کے ساتھ ساتھ کوہ ملک سیاہ
اور پھر وہاں سے شمال مغرب کی طرف ہرات کو شمال مشرق میں چھوڑ کر روسی ایرانی سرحد تک
مرو اور اشک آباد کی جنوبی حدود تک جنوب میں کراچی کی بندرگاہ سے بندر عباس تک کا تمام
ساحلی علاقہ، بلوچستان کے کئی بلوچ علاقے افغانستان ایران سندھ اور پنجاب میں شامل
کیے گئے ہیں جبکہ 1879ء کے معاہدہ گنڈمک کے تحت امیر افغانستان سے حاصل کردہ
بعض پختون علاقے خان قلات سے اجارہ پر حاصل کردہ بلوچ علاقے کے ساتھ شامل کر
کے برٹش بلوچستان کے نام سے ایک الگ بلوچستان قائم کیا گیا جسے اپنا مستقر بنا کر انگریز
حکمرانوں نے بلوچستان پر اپنا تسلط قائم کرنے کی راہ ہموار کی۔

جنرل ایوب خاں نے اپنے دور حکومت میں لسبیلہ اور نصیر آباد کے علاقوں کو
بلوچستان سے کاٹ کر بالترتیب کراچی اور جیکب آباد میں شامل کر لیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ
بلوچستان کا ایک سرحدی علاقہ بشمول سرحدی حصہ بھی جاداشاہ ایران کے حوالے کر دیا جس

پر اس وقت کی قومی اسمبلی میں کافی بحث و مباحثہ بھی ہوا تھا۔ کوئی بھی جنرل اپنے ملک کے
لئے اپنا علاقہ فتح کرنے کے بعد ہی فیلڈ مارشل کے اعزاز کا مستحق بن سکتا ہے لیکن جنرل
ایوب خاں نے اپنے ملک کا ایک اہم علاقہ دوسروں کے حوالے کرنے کے بعد اپنے آپ کو
فیلڈ مارشل بنالیا۔ بہرحال ان تمام تبدیلیوں کے بعد بھی ملک کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔

محل وقوع رقبہ اور آبادی:

بلوچستان 24-54، 32-4 عرض بلد کے درمیان شمال کی طرف اور 60-56،
15-70 طول بلد کے درمیان مشرق کی طرف واقع ہے۔ مغرب میں اس کی 590 میل لمبی
سرحد ایران سے ملتی ہے جبکہ شمال میں افغانستان کے ساتھ اس کی 720 میل طویل سرحدیں
لگتی ہیں۔ اس کے مشرق میں سندا، پالاب، اور شمال مغربی سرحدی صوبے واقع ہیں جبکہ
جنوب میں بحیرہ عرب کے ساتھ اس کا 470 میل طویل ساحل ہے۔ اس جغرافیائی محل وقوع
کے باعث بلوچستان کو پاکستان کے اہم ترین علاقے کی حیثیت حاصل ہے۔ زمانہ قدیم
میں یہ کئی حملہ آور افواج کی گزرگاہ رہا ہے۔

''بلوچستان تاریخ کے آئینے میں'' از جسٹس خدا بخش میں مندرجہ ذیل بلوچ
قبائل تحریر کیے ہیں: بلوچ قبائل، باجوئی، بزنجو، بگٹی، بلیدی، میںگلوی، ڈومکی یا ڈوکی، ہارونی،
جمالی قیصرانی، کھیتران، کھوسہ، کرد بدود، لاشاری، لیغاری، لہری، مری، مزاری، مینگل، محمد
حسنی، محمد شاہی، رہسیانی، رند، شاہوانی، ٹمی لنڈ، زہری (موسیانی)، احمدانی، ڈریا، دشتی،
کشکوری، گوپانگ، گوچانی، گورگیشر، گرمانی، جمارھی، قندرانی، جنک زبزوئی، جتوئی،
جسوانی، کرامئی، کچانی، کسکائی، کلاچی، کلوئی، کوش یا کش، گمسی، مستوئی، میرالی، نوحمدی یا
نوحانی، پچسیانی، پندرانی، رئیس، منیارانی، سعید زدئی۔

مذہب:

بلوچوں میں اکثریت سنی مسلمانوں کی ہے۔ مکران میں پسنی کے علاقے میں کچھ
لوگ کرامتی اور ذکری بھی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ میر چاکر
کے لڑکے شہداد نے سولھویں صدی کے نصف اول میں ملتان میں شیعہ عقائد کی تبلیغ کی تھی۔

ہوسکتا ہے کہ یہ بات صحیح ہو۔ شاید اس نے اپنا عقیدہ تبدیل کرلیا ہو یا شاید اس زمانے میں بلوچوں کی اکثریت شیعہ ہو، بہر حال موجودہ زمانہ میں حالات بالکل مختلف ہیں۔

پیشے:

بلوچوں کا سب سے بڑا پیشہ مختلف قبیلوں اور گروہوں کا آپس میں لڑنا جھگڑنا تھا، بلکہ ابھی تک ہے۔ اگر اتفاقاً انہیں اس قسم کے لڑائی جھگڑوں کا موقع نہ ملے تو پھر وہ آپس ہی میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ بلوچوں کے تنزل کی ایک بڑی وجہ یہی دیہی لڑائی جھگڑے ہیں۔ وہ بہترین بلوچ جو گھوڑے کی سواری، بندوق کی نشانہ بازی اور شمشیر زنی میں یکتائے زمانہ ہوتے ہیں، آپس میں جھگڑوں کی وجہ سے ہر سال بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور قبیلہ کے کسی کام کے نہیں رہتے کہ کشت و خون اور جبر و تشدد کا یہ کھیل ایک مستقل خصوصیت بن کر رہ گیا ہے۔ یہ خاندانی جھگڑے اکثر اوقات تو پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ سال تک چلتے رہتے ہیں اور لوگ اِن میں اس قدر مشغول رہتے ہیں کہ انہیں ثقافتی اشغال اور معاشرتی کاروبار مثلاً کھیتی باڑی اور تعلیم و تدریس تک کے لئے وقت نہیں ملتا۔ بہر حال اب تمدنی حالات نسبتاً بہتر ہوتے جا رہے ہیں لیکن اس تبدیلی کی رفتار افسوسناک حد تک آہستہ ہے۔

خوراک:

بلوچی قبائل کا ہر فرد اپنے گلوں اور مویشیوں کے لئے نئی نئی چراگاہوں کی تلاش میں یا دشمن قبیلہ کے حملہ کے خیال سے عموماً سفر میں رہتا ہے اس لئے وہ اپنے ساتھ خوراک کا بہت سارا ذخیرہ اور کثیر تعداد میں برتن اپنے ساتھ اٹھائے نہیں پھرتا۔ ایک عام بلوچی خاندان خاوند، بیوی اگر بچے ہوں تو وہ اور گلہ چرانے کے لئے ایک لڑکے پر مشتمل ہوتا ہے۔ بھیڑیوں اور چوروں کو دور رکھنے کے لئے ان کے پاس عام طور پر ایک کتا بھی ہوتا ہے۔ ان کے پاس ہاتھ کی بنی ہوئی چادر اور ایک تیار خیمہ بھی ہوتا ہے جو یا تو بھیڑ کی اون اور لکڑی سے بنایا جاتا ہے اور گدان کہلاتا ہے یا کھجور کے پتوں سے یہ تیار کیا جاتا ہے۔ اسے کل یا کڑی کہتے ہیں۔ اس خیمہ کو بڑی آسانی سے لپیٹ کر گدھے یا گائے کی پیٹھ پر باندھا جاسکتا ہے۔ آٹا پینے کی پتھر کی چکی تقریباً دو ہفتے کا سامان خورد و نوش، کھانا پکانے اور استعمال

کے چند برتن، کچھ ایندھن اور پانی۔ یہ چیزیں ہر مقام پر ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔ خاندان کے لوگ عام طور پر اپنی بھیڑوں اور بکریوں سے حاصل کیا ہوا مکھن اور دودھ استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ سبزیوں کے زیادہ شوقین نہیں ہوتے اور پھر ان کا ماحول بھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ان کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ سجی یعنی بھنا ہوا گوشت ایک بلوچ کے واسطے بہترین غذا ہوتی ہے۔ یہ پہاڑی قبائل خاص طور پر مری اور بگٹی قبائل کی مرغوب ترین غذا ہے۔ موقعہ کے لحاظ سے ایک یا دو بھیڑ یا بکریاں لکڑی کی آگ پر دونوں طرف سے بھونی جاتی ہیں۔ گوشت کو لکڑیوں میں پرو کر ان لکڑیوں کو آگ کے بیچ میں زمین میں گاڑ دیا جاتا ہے۔ گوشت کو آہستہ آہستہ بھونا جاتا ہے۔ اسے ہوا اور دھوئیں سے بچانے کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ بھیڑ کے بھننے میں تقریباً چار پانچ گھنٹے لگ جاتے ہیں اور کئی من لکڑی خرچ ہوتی ہے جو دیں پہاڑوں پر مل جاتی ہے۔ سجی عام طور پر اہم مہمانوں کو پیش کی جاتی ہے اگر مہمان عوام سے ہو تو دس افراد کو ایک دنبہ سجی کے لئے دیا جاتا ہے۔ روٹی پکانے کے لئے عام طور پر گول سے پتھروں کو اس آگ میں رکھ دیا جاتا ہے جس پر سجی پکائی جاتی ہے۔ جب وہ پتھر سرخ ہو جاتے ہیں تو ان پر آٹے کی موٹی تہہ جما دی جاتی ہے اور آٹے کو آہستہ آہستہ پکنے دیا جاتا ہے۔ پکنے کے بعد اسے علیحدہ کرلیا جاتا ہے اور پتھروں کو پھینک دیا جاتا ہے۔ اس طرح روٹی تیار ہو جاتی ہے اور سجی کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے۔ اسے کاک کہا جاتا ہے۔

لباس:

ہر قبیلہ کا اپنا الگ الگ لباس ہوتا ہے۔ یہ اختلاف پگڑی کے باندھنے کے انداز میں بھی ہوتا ہے اور ان کے کپڑوں کی تراش خراش میں بھی۔ قبائلی باشندے تراش خراش کے اس اختلاف کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔ مثال کے طور پر مری قبیلہ میں بجارانی اپنی پگڑی اس طرح باندھتے ہیں کہ سامنے کی طرف لا جیسی شکل بن جاتی ہے اور اپنے لمبے بالوں کو بلوچی ٹوپی میں کر کے سر کے اوپر باندھ لیتے ہیں۔ گزینی گروہ کے لوگ اپنے بالوں کو لٹکتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں اور سر پر چاروں طرف پگڑی باندھ لیتے ہیں۔ ایک بلوچ فراک کی مانند ایک لمبا جامہ پہنتا ہے جو اس کی ایڑیوں تک آتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ڈھیلا ڈھالا پاجامہ جو شلوار کہلاتی ہے ایک لمبی چادر ایک سوتی پگڑی۔ اکثر گھر کے بنے

ہوئے جوتے جو پنجہ سے تنگ ہوتے ہیں یا چمڑے یا کھجور کے سینڈل جو سواس کہلاتے ہیں
استعمال کرتا ہے۔ مرد صرف سفید کپڑے پہنتا ہے اور کسی بھی رنگ کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے
لباس میں صرف اس کا چغہ (اوورکوٹ) ضرور رنگدار ہوتا ہے۔ پرانے زمانے میں امن
کے دور میں ایک کھاتے پیتے بلوچ کو بیس سے چالیس گز تک کپڑے کی شلوار پہنے، پندرہ
بیس گز کی سوتی ململ کی پگڑی باندھے ایک بہت بڑی چھ سات گز کی چادر ڈالے اور ایک
بہت بڑا کرتا پہنے دیکھنا ایک عام بات تھی۔ گو انہیں چلنے میں دشواری ہوتی ہوگی۔ درزیوں کی
غیر موجودگی میں گھر کی خواتین ہی یہ تمام کپڑے سیتی ہیں اور اس کا خیال رکھتی ہیں کہ رنگین
دھاگا استعمال نہ کیا جائے۔ لیکن اب گذشتہ بیس سال سے صرف سفید لباس پہننے کا رواج
کچھ کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ کپڑے کی قلت اور مہنگائی ہے اور پھر اس قدر زیادہ کپڑے
میں اپنے آپ کو ملبوس رکھنا بھی کچھ تکلیف دہ ہی بات ہے۔ علاوہ ازیں کھیتی باڑی کرنے
اور مستقل طور سے ایک مقام پر قیام کرنے کی وجہ سے بلوچوں کی موجودہ نسل کے لئے اپنے
بڑوں کی پیروی کرنا بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے۔

بلوچ خواتین:

ایک بلوچ خاتون اپنے سر کے اوپر سرخ یا سفید سوتی چادر اوڑھتی ہے اور ایک
قمیض جسے پشک کہتے ہیں اور جو شب خوابی کے لباس کی مانند ہوتی ہے اور جو ان کے ٹخنے
تک لمبی ہوتی ہے، پہنتی ہے۔ یہ قمیض سامنے سے اور آستینوں پر سے کڑھی ہوئی ہوتی ہے
جسے جیغ کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ سرخ سفید یا سیاہ پاجامہ اور شلوار استعمال کرتی ہے۔
اپنے اس روایتی لباس میں ایک بلوچ خاتون نہایت حسین اور دلآویز معلوم ہوتی ہے اور اس
پر ترکی عربی اور ایرانی اثرات واضح طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے کپڑوں پر کڑھائی کی
مقدار، سائز اور قیمت اس خاتون کے تمدنی رتبہ کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ کڑھائی جتنی زیادہ اور
جتنی قیمتی ہوتی ہے معاشرہ میں اس کا رتبہ اتنا ہی زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ دستور کے مطابق ایک
بیوہ عام طور پر رنگین یا زیادہ کڑھے ہوئے کپڑے نہیں پہنتی۔ وہ سفید کپڑے پہنتی ہے اور
بہت ہی معمولی طور پر کڑھے ہوئے، جس سے اس کا بیوہ ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر
اس کی دوبارہ شادی ہو جائے جس پر کوئی پابندی نہیں ہے تو پھر وہ دوبارہ رنگین کپڑے پہننا

شروع کر دیتی ہے۔ چاندی کی بھاری چوڑیاں، سونے کی ناک کی نتھ، کانوں کی سونے یا
چاندی کی چھ چھ بالیاں اگر دستیاب ہو تو سونے یا چاندی کا تکلیف دہ حد تک بھاری نیکلس
اس کے زیورات میں شامل ہیں۔ بلوچی کڑھائی کا رنگین کام فن کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔
اس کے مقابلے کا کام دنیا میں اور کہیں بھی نہیں ہوتا۔ اس کے ایک سو اٹھارہ مختلف ڈیزائن
ہوتے ہیں۔ مزید خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے اس کڑھائی میں شیشے بھی لگائے جاتے ہیں
لیکن ان کا انداز سندھی کڑھائی میں شیشے لگانے سے مختلف ہوتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد بلوچی
کڑھائی نہ صرف پاکستان بلکہ یورپ اور امریکہ میں بہت مقبول ہو گئی ہے۔ ہر سال کڑھی
ہوئی قمیض، بلوچی ٹوپیاں اور چپل بہت زیادہ تعداد میں برآمد کیے جاتے ہیں اور اس طرح
ان کے ذریعے نہ صرف کثیر زر مبادلہ حاصل کیا جاتا ہے بلکہ یہ پاکستان کی ثقافت کا اہم حصہ
بنتا جا رہا ہے۔

ہتھیار:

ایک جوان بلوچ کے لئے ایک تلوار، چاندی یا پیتل سے منڈھی ہوئی ایک
ڈھال، ایک دیسی بندوق اور اگر ممکن ہو تو ایک نیزہ رکھنا لازمی اور ضروری ہے۔ بہر حال
اب تلوار کی جگہ دیسی یا غیر ملکی رائفل نے لے لی ہے۔

سیاسی جدوجہد:

آزاد پاکستان کے قیام کے لئے بلوچستان کے عوام برطانوی حکومت اور ہندو
کانگریس کے خلاف مسلمانان ہند کی عام جدوجہد میں ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں
سے پیچھے نہیں رہے۔ حقیقتاً انہوں نے ایک الگ مسلم ملک کے حصول کی تحریک کو آگے
بڑھایا۔ تقسیم ہند سے پہلے کے بلوچستان کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی
ہے کہ بلوچ پاکستان کی تحریک میں برطانوی حکومت کے مدمقابل آنے اور اپنی جانیں
قربان کرنے میں کبھی بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ بلوچستان اسٹیٹس کے سربراہ کی حیثیت
سے خان قلات نے قائداعظم محمد علی جناح کی ان کے متعدد بار کوئٹہ تشریف لانے کے موقع
پر اخلاقی اور مادی امداد دی۔ قبائلی سربراہوں اور نمائندوں کا بھی اس تحریک میں کچھ کم حصہ

نہیں ہے۔ ایک شخص کو چھوڑ کر باقی تمام نے شاہی جرگہ کے ممبر کی حیثیت سے 1947ء میں پاکستان میں شامل ہونے کے حق میں ووٹ دیئے اس طرح بلوچستان کے باشندوں نے ہندوؤں کی سازشوں اور انگریزوں کی چالبازیوں کو خاک میں ملا دیا۔ ان خوبیوں کی بنا پر قائداعظم نے بلوچستان کے لوگوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ بلوچستان کے پاکستان کا حصہ بننے کی کہانی اگلے باب میں بیان کی گئی ہے۔

زبان:

فارسی اس خطے کی سرکاری زبان بھی رہی۔ سابقہ ریاست قلات میں 1930ء کے لگ بھگ تک دربار میں فارسی ہی کا راج تھا۔ یہاں اب تک مساجد میں ابتدائی تعلیم اسی زبان میں دی جاتی ہے۔ یہاں فارسی کے متعدد نامور شعراء گزرے ہیں۔ بعض براہوئی، بلوچ اور پٹھان شاعر فارسی کے جید عالم بھی تھے۔ ان میں قاضی نور محمد گنج آبوی (مصنف جنگ نامہ میر نصیر خاں نوری)، ناطق مکرانی (مرزا غالب کے ہمعصر)، پیر محمد کاکڑ، ملا محمد حسن براہوئی (بلوچستان میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر۔ فارسی میں قریباً بیس ہزار شعروں کا مالک، بلوچی اور براہوئی میں بھی شعر کہنے والا)، علامہ عبدالعلی، مولاداد، ملا فاضل، یوسف عزیز مگسی، مولانا محمد یعقوب، مرزا احمد علی، علیم اللہ علیم، زیب مگسی وغیرہ وغیرہ خاص طور پر شہرت کے مالک ہیں۔ براہوئی زبان میں عربی الفاظ کی کثرت بھی اس امر کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ عربی النسل مسلمان یہاں کی آبادی کا حصہ بن گئے جن کی تبلیغی کوششوں کے باعث مقامی لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ مکران اور قلات ڈویژنوں میں اکثر لوگ بلوچی اور براہوئی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ مغربی بلوچستان میں بلوچی اور پشتو بولنے والے کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔ جنوبی و مشرقی بلوچستان میں سندھی اور براہوئی دونوں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ شمالی و مشرقی بلوچستان میں سرائیکی، بلوچی اور پشتو تینوں بولی جاتی ہیں اور کوئٹہ جو بلوچستان کا مرکز ہے اس میں براہوئی، پنجابی بولنے والے افراد بھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں اور قریب قریب ہر فرد تین چار زبانیں بیک وقت نہایت آسانی و روانی سے بول سکتا ہے۔

(ڈاکٹر انعام الحق کوثر بحوالہ اردو ڈائجسٹ مئی 1998ء)

بلوچستان کے مشہور شہر

کوئٹہ بلوچستان کا دارالخلافہ ہے۔ کراچی سے 536 میل اور لاہور سے 727 میل کے فاصلہ پر ہے۔ پہاڑوں میں گھرا ہوا کوئٹہ کے پہاڑوں کی بلندی 5500 فٹ ہے۔ کسی زمانہ میں کوئٹہ کا نام رسول آباد تھا بعد میں شال کوٹ کے نام سے پکارا جانے لگا بعد میں کوئٹہ مشہور ہوا۔ پشتو میں کوئٹہ قلعہ کو کہتے ہیں۔ 1935ء کے زلزلہ میں بیس ہزار افراد جاں بحق ہوئے اور تمام عمارتیں ملبہ کا ڈھیر بن گئیں۔ زلزلہ میں جاں بحق ہونے والوں کی یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ آرمی کمانڈ اینڈ سٹاف کالج 1908ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس کالج سے تعلیم یافتہ بعض جرنیلوں نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں بہادری کے کارنامے سرانجام دیئے۔ حنا جھیل اڑک وادی بہترین تفریح گاہیں ہیں۔

ژوب ضلع کا صدر مقام ہے۔ انگریزوں کے دور میں فورٹ سنڈیمن کے نام سے مشہور تھا ژوب کوئٹہ سے 106 میل کے فاصلہ پر ہے۔ ژوب ملیشیا کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ قلعہ سیف اللہ صحت افزا مقام ہے جو سطح سمندر سے 5084 فٹ بلند ہے۔ سیف اللہ نے قلعہ تعمیر کر دیا تھا۔ لورالائی ضلعی صدر مقام ہے۔ قریبی ریلوے سٹیشن ہرنائی ہے جو 54 میل کے فاصلہ پر ہے۔ سطح سمندر سے 4699 فٹ بلند ہے یہاں سردیوں میں برف گرتی ہے۔ پشین کو ضلع کا درجہ حاصل ہے۔ کوئٹہ کے شمال کی جانب 30 میل کے فاصلے پر ہے۔ 1883ء میں پشین کی بنیاد رکھی گئی۔ چمن ضلع پشین کی تحصیل ہے۔

چمن کوئٹہ سے 88 میل کے فاصلہ پر ہے۔ سڑک اور ریل رابطہ کا کام دیتی ہے۔

خوجک درہ قریب ہے۔ گلستان، قلعہ عبداللہ، بوستان مشہور شہر ہیں۔ خوجک سرنگ جو اڑھائی میل لمبی ہے، 1891ء میں تعمیر ہوئی۔ برصغیر کی سب سے لمبی سرنگ ہے جو کوئٹہ چمن ریلوے لائن پر ہے۔ کوئٹہ سے 70 میل کے فاصلہ پر ہے۔ نوشکی چاغی ایٹمی دھاکہ کے بعد چاغی کے علاقہ کو خاصی شہرت ملی۔ کوئٹہ زاہدان ریلوے لائن پر چاغی کوئٹہ سے 98 میل کے فاصلہ پر ہے یہاں مشہور قلعہ بھی ہے۔ افغانستان میں شکست کھانے کے بعد امیر عبدالرحمٰن نے 1869ء میں اس قلعہ میں قیام کیا۔ خضدار، ڈویژنل ہیڈکوارٹر ہے۔ کبھی یہ قلات کا حصہ تھا۔ کوئٹہ سے جنوب مغرب 200 میل کے فاصلہ پر ہے۔

خضدار کراچی سے 210 میل شمال کی جانب ہے۔ آر سی ڈی روڈ خضدار کے قریب سے گزرتی ہے۔ قدیم قلعے بھی موجود ہیں۔ مکران ضلعی صدر مقام ہے۔ کھجوروں کے لئے مشہور ہیں۔ مکران قلات سے 443 میل کے فاصلہ پر ہے۔ سسی پنوں کے مشہور رومانی قصے کا ہیرو پنوں کا تعلق اسی علاقہ سے تھا۔ تربت میں ایک قلعہ پنوں کے قلعہ کے نام سے مشہور ہے۔ پسنی مچھلیوں کی مارکیٹ ہے۔ گوادر یہاں کی مشہور بندرگاہ ہے۔ تربت سے 160 میل کے فاصلہ پر ہے۔ گوادر کا کراچی سے فاصلہ 290 میل ہے۔ خاران ضلعی صدر مقام ہے جو کوئٹہ سے 200 میل کے فاصلہ پر ہے۔ لسبیلہ کراچی سے 116 میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں سکندر اعظم کی آمد پائی جاتی ہے۔ محمد بن قاسم کے مشہور جرنیل محمد بن ہارون کا مزار دیگر مسلمان اکابرین کے مزارات لسبیلہ میں موجود ہیں۔ بلوچستان کے پہلے چیف کمشنر بھی یہیں پر دفن ہیں جن کی یاد میں سفید سنگ مرمر کی یادگار اور باغ تعمیر کیا گیا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہاں شیریں فرہاد کے مزار ہیں۔ فرہاد نے شیریں کے پہاڑ کو کھودا تھا۔ اور یہ بات بھی مشہور ہے کہ جس بوڑھی عورت نے فرہاد کو غلط خبر دی کہ شیریں مرگئی ہے اس کی قبر بھی یہیں پر ہے۔

قلات بلوچستان کا اہم شہر ہے۔ کوئٹہ سے جنوب کی جانب 90 میل کے فاصلہ پر ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ریاست قلات کا الحاق پاکستان سے ہوا۔ 1935ء کے زلزلہ میں اسے بھی نقصان پہنچا۔ مستونگ مشہور شہر ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر کے دور کے پرانے قلعہ کے آثار موجود ہیں۔ احمد شاہ درانی اور قلات کی فوجوں کے درمیان معرکہ ہوا۔ یہاں شاہ

شجاع نے بھی قیام کیا۔ سبی ڈویژنل ہیڈکوارٹر اور ریلوے جنکشن ہے۔ جیکب آباد سے سبی کا فاصلہ 90 میل کے قریب ہے۔ جدید شہر کی بنیاد 1880ء میں رکھی گئی۔ سبی کا میلہ مویشیاں بہت مشہور ہے۔ ہرنائی مشہور شہر ہے ہندو راجہ ہرنام داس کے نام سے مشہور ہوا۔ ایک اور بات مشہور ہے کہ ہرنائی قبیلہ کے نام سے شہر منسوب ہے۔ بلوچستان کے دوسرے مشہور شہر زیارت، کچھی مچھ کہولو، مری ڈیرہ بگٹی، سوئی قدرتی گیس کی وجہ سے مشہور ہوا۔ سوئی کشمور سے 37 میل کے فاصلہ پر ہے۔ نصیر آباد استاد محمد جھٹ پٹ ہے۔ پنجگور بلوچستان کا اہم ضلع ہے۔

چاغی:

پاکستان کے سیاسی اور جغرافیائی نقشہ میں ضلع چاغی ہمیشہ سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ پاکستان کا واحد ضلع ہے جس کی سرحدیں دو ملکوں ایران اور افغانستان سے ملتی ہیں۔ یہ ضلع جو 19516 مربع میل رقبہ پر مشتمل ہے ایک 350 میل طویل پٹی کی صورت میں ہے جبکہ مختلف مقامات پر اس کی چوڑائی بیس سے 45 میل تک ہے۔ یوں اپنی وسعت کے باعث چاغی پاکستان کے کل رقبے کے سولھویں حصے پر مشتمل ہے۔ صحرائی علاقہ ہونے اور پانی کی کمیابی کے باعث اس کی آبادی بہت کم ہے اور فی مربع میل علاقہ میں اوسطاً تین افراد آباد ہیں۔ ضلع چاغی معدنیات کی دولت سے مالا مال ہے۔ یہاں ملنے والا سنگ مرمر اپنے اعلیٰ معیار کے باعث دنیا بھر میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ سنگ مرمر کی مصنوعات نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ علاقے میں سونے چاندی اور تانبے کے ذخائر بھی ہیں۔ سینڈک کا منصوبہ ان ہی قیمتی معدنیات برآمد کرنے کے لئے شروع کیا گیا جو بدعنوانی اور فنڈز کی کمی کے باعث بیچ میں اٹکا ہوا ہے۔ سرمہ، گندھک اور لوہے کے ذخائر بھی بڑے پیمانے پر موجود ہیں۔

ضلع چاغی صدیوں سے ایران اور افغانستان کو ہندوستان سے ملانے کا ذریعہ ہے۔ آر سی ڈی شاہراہ ان گزرگاہوں کی جدید صورت ہے جو پاکستان کو ایران اور آگے یورپ تک ملاتی ہے۔ یہاں ہمیشہ سے ایرانیوں اور افغانوں کے سیاسی، انتظامی اور ثقافتی

اثرات رہے۔تحریک پاکستان کے دوران بھی یہاں کی ممتاز اور باشعور شخصیات نے نہایت اہم کردار ادا کیا باوجودیکہ اس وقت تعلیم عام نہیں تھی لیکن لوگوں تک تحریک پاکستان کے مقاصد پہنچانے اور انہیں سمجھانے کا کام نہایت خوش اسلوبی سے کیا۔تحریک پاکستان میں پسماندہ ضلع چاغی کی دو شخصیات میر قادر بخش زہری مرحوم اور میر نبی بخش زہری سرفہرست ہیں۔میر نبی بخش زہری قیام پاکستان سے قبل آل انڈیا مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری تھے۔اس کے علاوہ تو تیزئی قبیلے کے سربراہ ملک محمد نور تو تیزئی ان کے کزن ملک رحیم تو تیزئی، سابق چیئرمین یونین کونسل دالبندین، سابق وفاقی وزیر میر ابراہیم بلوچ، سردار نصرت اللہ سنجرانی (مرحوم) اور سید عبدالحلیم شاہ تحریک پاکستان میں پیش پیش تھے۔

زیارت اور چمن:

کوئٹہ سے زیارت کا فاصلہ 35 کلومیٹر ہے۔گاڑیاں تقریباً تین گھنٹے میں کوئٹہ سے زیارت پہنچتی ہیں۔زیارت سطح سمندر سے 8200 فٹ بلند ہے۔زیارت کی آبادی تقریباً 65-60 ہزار نفوس پر مشتمل ہے گو کہ یہ صوبہ بلوچستان کا حصہ ہے مگر یہاں بلوچی ایک بھی نظر نہیں آتا بلکہ کاکڑ قبیلہ کی پٹھان قوم کے لوگ آباد ہیں۔پنجاب کے کچھ لوگوں نے بھی یہاں دکانیں بنائی ہوئی ہیں۔زیارت کا موسم سردیوں میں سخت سرد اور گرمیوں میں خوشگوار رہتا ہے۔یہاں کثیر تعداد میں ہوٹلز اور گیسٹ ہاؤسز تعمیر ہو چکے ہیں جس سے رہائش میں کافی سہولتیں میسر آ گئی ہیں۔یہاں پشتو اور اردو زبانیں بولی جاتی ہیں۔اتنی پرامن اور پرسکون جگہ ہے کہ خواتین عزت و احترام سے رات کے وقت بھی سڑکوں پر چہل قدمی کرتی نظر آتی ہیں۔مشہور مقام کی بڑی آبشار، مزار پیر بابا، ہوٹل ہل ویو، قائداعظم ریذیڈنسی، مزار خرواری بابا، پراسپیکٹ پوائنٹ، لوگوں کی کثیر تعداد حضرت خرواری باباؒ کے مزار پر حاضری اور زیارت کے لئے آتی ہے۔اسی وجہ سے وادی زیارت کا نام زیارت رکھا گیا۔حضرت خرواری بابا کی زندگی رب کائنات کے عبادت، ریاضت، مشقت اور مجاہدے سے بھرپور ہے۔آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ رات کے وقت آپ کے دادا جان نے آپ سے پانی مانگا۔جب آپ پانی لے کر آئے تو دادا جان عبادت میں مصروف تھے اس لئے آپ

ساری رات پانی لئے کھڑے رہے۔سخت سردی کی وجہ سے آپ کے ہاتھوں کی چمڑی اتر گئی اس لئے آپ کے دادا جان نے آپ کو خردار یعنی گنج کا خطاب عطا فرمایا اور آپ خرواری بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔

پراسپیکٹ پوائنٹ زیارت سے تقریباً 20 کلومیٹر کے فاصلے پر خرواری بابا کے مزار سے قبل سطح سمندر سے تقریباً 8900 فٹ بلند مقام ہے۔یہاں سے سرسبز شاداب کھیتوں اور لہلہاتے باغات پر مشتمل وادی کا دلکش منظر پیش کرتا ہے۔نیچے خرواری بابا کا مزار بھی بڑا خوبصورت منظر پیش کرتا ہے جبکہ نوگزا بابا کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ جب اس بزرگ کامل کا وصال ہوا تو آپ کے جنازہ میں ایک سودخور شخص بھی شامل تھا اور جب بھی حضرت بابا جی کے جسد خاکی کو لحد میں اتارنے لگتے تو قبر تنگ پڑ جاتی۔اس طرح جب تک وہ سودخور شخص موجود رہا قبر تنگ پڑتی رہی یہاں تک کہ نوگز قبر کھودنا پڑی اسی وجہ سے آپ نوگزا بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔

''سنڈے من تنگی'' زیارت سے تقریباً 6 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔بلند و بالا دو سنگلاخ چٹیل پہاڑوں کے درمیاں تنگ راستے سے اندر چلتے جائیں تو تھوڑا آگے جا کر سنگلاخ چٹیل پہاڑ سے چشمہ پھوٹ رہا ہے۔

کوئٹہ سے چمن کے لئے بسیں، ویگنیں بھی چلتی ہیں اور ٹرین سروس بھی روزانہ چلتی ہے۔تقریباً تین گھنٹے کے سفر کے بعد کھوجک پاس عبور کر کے افغانستان کے بارڈر پر واقع چمن آتا ہے۔ہمارے ہاں چمن کے انگور بہت مشہور ہیں مگر حقیقت میں چمن شہر میں درخت نام کی کوئی چیز کم ہی نظر آتی ہے۔یہ انگور دراصل افغانستان سے آتے ہیں اور چونکہ براستہ چمن آتے ہیں اس لئے چمن کے انگور مشہور ہو گئے۔یہاں دنیا بھر کے دیگر سامان کاسمیٹکس، الیکٹرانکس کی بہت بڑی مارکیٹ موجود ہے۔

تربت:

مکران ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر تربت (طربت) میں ایرانی سرحد کے ساتھ ایک سو کلومیٹر اندر کیچ کا علاقہ ہے جو تربت کا ضلعی ہیڈ کوارٹر ہے۔تربت کا قدیم نام گنج آباد تھا جو

تربت کی زراعت اور خوشحالی کی بنا پر رکھا گیا تھا۔ یہاں عرب اور افغان مختلف ادوار میں حکمران رہے ہیں۔ جب عرب یہاں آئے تو انہوں نے ان کا نام طربت رکھ دیا اس کا مطلب بھی زرخیز اور خوشحال تھا۔ انیسویں صدی میں انگریزوں نے جب اسے (Turbat) لکھا تو بعد ازاں (T) کی مناسبت سے اردو ترجمہ تربت ہو گیا۔ حالانکہ اصل نام طربت ہے اور یہ بات کہ وہاں کسی بزرگ کی قبر (تربت) ہے جس کی وجہ سے یہ نام ہے، بالکل غلط ہے۔ چودھویں صدی میں یہاں ملک شیر باز خاں کی حکومت تھی جس نے شاہ ایران کی تابعداری منظور نہ کی۔ شاہ نے اپنی فوج اس علاقے میں بھیجی جس نے علاقہ کو نہ صرف فتح کیا بلکہ تباہ و برباد کر دیا۔ اس وقت ایرانی فوج فخریہ انداز میں کہتی تھی یہاں کچھ نہیں رہا۔ اس یچ کا بگڑا کام کیچ ہو گیا۔ اس علاقے کی مشہور قوم ہوت گزری ہے۔ علاقہ کیچ اور ہوت کا تاریخی حوالہ لوک کہانی سسی پنوں میں ملتا ہے۔ پنوں کا تعلق ہوت قوم (قبیلے) سے تھا یہ قوم کرمان (ایران) سے موجودہ مکران میں آئے انہوں نے کیچ کے علاقے پر قبضہ کیا۔

کیچ میں اب ایک تاریخی عمارت کے آثار ملتے ہیں جسے شہزادہ پنوں کا قلعہ کہا جاتا ہے جسے میری قلعہ بھی کہتے ہیں۔ دریا کیچی کور (کور بلوچی میں چھوٹے دریا کو کہتے ہیں) کے کنارے واقع اس عظیم الشان قلعہ کی کھنڈرات باقی ہیں مگر اس کی بلندی پر کھڑے ہو کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنا وسیع و عریض اور شان و شوکت والا قلعہ تھا جسے پتھروں اور مٹی سے بنایا گیا۔ گذشتہ سال اطالوی ماہرین آثار قدیمہ نے یہاں آکر قلعہ کی تحقیق کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سات ہزار سال پرانا ہے۔ سسی پنوں کا قصہ نہ صرف بلوچستان بلکہ سندھ اور پنجاب میں بھی بے حد مقبول ہے جسے تینوں زبانوں میں لکھا گیا اور اس پر شاعری کی گئی۔

بلوچ لوک کہانی میں روایت ہے کہ سندھ کے علاقے سیہون میں ایک ہندو راجہ سندھ کے کنارے رہتا تھا۔ اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ اس نے ہندو پنڈت جوتشی سے بیٹی کی زندگی کا حال دریافت کیا، ستاروں کا حساب لگا کر اس نے بتایا کہ جب یہ جوان ہو گی تو بہت عاشق مزاج ہو گی اور کسی شہزادہ سے شادی کرے گی۔ راجہ شاستر اور جوتش پر یقین

رکھتا تھا ایسے میں لڑکی کو گھر میں رکھنا اپنی ہتک تصور کیا اور اسے مارنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ اس نے لکڑی کے صندوق میں جواہرات و نقدی کے ساتھ بیٹی کو ڈال کر دریا میں بہا دیا جسے بھنبھور شہر میں دریا کے کنارے ایک دھوبی نے پکڑ لیا جو وہاں کپڑے دھو رہا تھا۔ لڑکی کو اپنی بیوی کے سپرد کیا اور کہا کہ سسی کی اپنی لڑکی کی طرح پرورش کریں گے۔ جواہرات اور نقدی سے دھوبی کے حالات بھی بہتر ہو گئے۔ لڑکی چونکہ راجہ کی اولاد تھی اس لئے جوان ہوتے ہی اس کے حسن اور خوبصورتی کے چرچے ہر طرف ہونے لگے۔ کئی خوشحال گھرانوں سے رشتے آئے مگر اس نے انکار کیا۔

سسی کو اپنے خوابوں کے شہزادہ کی تلاش تھی۔ ادھر کیچ کے علاقہ کے سردار عالی ہوت بلوچ کے گھر میں پنوں پیدا ہوا جو خود بڑا حسین تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کیچ کے گرد و نواح میں کوئی عورت میرے لائق نہیں ہے۔ وہ تجارت کی غرض سے مختلف علاقوں کا سفر کرتا تھا۔ اسی دوران بھنبھور میں ایک باغ میں آرام کرتے ہوئے اسے ایک لڑکی ملی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پسند کر لیا۔ پنوں نے سسی کے باپ سے رشتہ مانگا جس نے اسے منظور کر لیا۔ شادی کے بعد پنوں سسی کے گھر رہنے لگا۔ اس کے ساتھیوں نے واپس کیچ جا کر عالی ہوت کو بتایا کہ اس کے بیٹے نے وہاں شادی کر لی ہے۔ پنوں کے بھائیوں کو باپ نے بھیجا جو بھنبھور آئے اور پنوں کو واپس چلنے پر اصرار کیا۔ اس کے بار بار انکار پر بھائیوں نے بہانے سے نشہ آور چیز کھلا کر اسے بے ہوش کر دیا اور صبح ہونے سے قبل اپنے ساتھ لے گئے۔ سسی اٹھی تو اس کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ اور سہیلیوں کے منع کرنے کے باوجود پنوں کی تلاش میں کیچ کی جانب روانہ ہو گئی۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ راستے میں بڑی مشکلات ہیں اور باقاعدہ کوئی راستہ نہیں۔ ریگستان اور پہاڑ ہیں جہاں لوگ بہت کم آباد رہتے ہیں۔

سسی سندھ کے علاوہ شاہ بلاول اور اوتھل کے ریگستانی میدانوں میں لسبیلہ تک پہنچی جہاں ایک اونٹ والے نے اسے تنہا دیکھ کر اپنی بدنیتی دکھانی چاہی تو روایات کے مطابق سسی نے خدا سے دعا مانگی کہ میں بے یار و مددگار ہوں اور یہ میری عصمت پر حملہ کرنا چاہتا ہے، تو نے اپنے بندوں کی مشکل میں ہمیشہ مدد کی ہے۔ اس کی دعا قبول ہوئی اور زمین

میں شگاف ہو گیا۔ سسی اس میں زندہ دفن ہو گئی اور اس کی عزت بچ گئی۔ اُدھر پنوں کو اونٹ پر ہوش آئی تو وہ بھائیوں کی منت سماجت کر کے واپس سسی کی طرف روانہ ہوا جہاں سسی زمین میں دھنس گئی تھی وہاں اس کا ڈوپٹہ پڑا تھا۔ معلوم کرنے پر اسے اصل حال سے آگاہی ہوئی تو وہ بھی وہاں بیٹھ گیا اور پروردگار سے دعا مانگی کہ مجھے بھی سسی کے ساتھ جگہ دے۔ دونوں کی آپس میں سچی محبت کا ثبوت ہے کہ اس کی دعا بھی قبول ہوئی اور وہ زمین میں زندہ داخل ہو گیا۔ دونوں کی قبریں لسبیلہ میں بنی ہوئی ہیں اور لوگ آج بھی اپنی مرادوں کے لئے وہاں جاتے ہیں۔

بلوچستان کے اولیائے کرام

برصغیر پاک و ہند کے دوسرے حصوں کی طرح اسلام کی زیادہ تر اشاعت ان صوفیائے کرام اور اولیاء عظام کے ہاتھوں ہوئی۔

حضرت اخوند پیرؒ: آپ کا مقبرہ بارکھان ضلع لورالائی میں تحصیل کے صدر مقام کے قریب ہے۔ **پیر ابراہیم یک پاسیؒ:** یہ مستونگ کے چشتی سیدوں کے مورث اعلیٰ ہیں ان کا مزار مستونگ کے علاقے میں واقع ہے۔ **حضرت خواجہ ابراہیم دو پاسیؒ:** دو پاسی خاندان کا اصل وطن چشت ہے مگر اس خاندان کے مورث اعلیٰ خواجہ ابراہیم دو پاسی کی اولاد کا مولد ڈھاڈر ضلع کچھی ہے۔ اس خانوادے کو سارے علاقے کی آبادی کا پیر خانہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ کی خانقاہ ڈھاڈر سے کوئی دو کوس کے فاصلے پر درۂ بولان کے عین دروازے پر واقع ہے۔ **حضرت شیخ اَلوؒ:** شیخ عطااللہ المعروف شیخ حضرت مودود چشتی براتی کے خلیفہ تھے اور اپنے پیر کی وفات کے بعد بھی آپ پانچ سات لک برات رہے۔ شیخ کبار نے 550ھ/1155ء میں وفات پائی۔ **حضرت اچک نیکہؒ:** آپ پٹھانوں کے معروف قبیلہ اچکزئی کے جدامجد ہیں۔ آپ بڑے عالم فاضل، زاہد، عابد اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ آپ کا نام اچک تھا آپ کا مزار دوبندی سے 24 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ **حضرت احمد جوانمردؒ:** روایت ہے کہ سید احمد جوانمرد اپنے والد محترم سید موسیٰ کے ایام زندگی اور لڑکپن میں علاقہ شیرانی میں مویشی چرایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ کے پاس چالیس بھیڑیں تھیں۔ اتفاق سے چالی بزرگ آئے اور کہا ہم آپ کے مہمان ہیں۔ آپ نے چالیس بھیڑیں ذبح کر کے کباب بنا دیں۔ مہمان بزرگوں

نے احمد جوانمرد کے خطاب سے نوازا۔ **حضرت شیخ اسمٰعیل سڑبنیؒ:** آپ کا مزار کوہ سلیمان میں خواجہ خضر کے مقام اور داذی خواہ نامی جگہ پر ہے وہیں آپ کے مرید شیخ احمد ابن موسیٰ کا مزار ہے جو ایک بہت بڑے بزرگ تھے۔ آپ کا زمانہ 500ھ بمطابق 1106ء بتایا جاتا ہے۔

حضرت اسمٰعیل نیکہؒ: آپ کی جائے پیدائش کھوسٹ ضلع سبی میں ہوئی ان دنوں کھوسٹ میں پانی کی بے حد قلت تھی۔ مریدوں نے آپ سے دعا کے لئے درخواست کی، آپ کی دعا سے وہاں پانی کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ آپ کا مزار کھوسٹ میں ہے۔ **قاضی اسمٰعیلؒ:** آپ کا مزار گاجان میں ہے۔ **حضرت میاں الٰہی بخشؒ:** آپ کا اسم گرامی میاں الٰہی بخش تھا۔ آپ عبادت گزار اور متقی تھے۔ آپ کا آبائی وطن لالہ پنڈی ضلع گجرات (پنجاب کا ایک قصبہ) تھا۔ آپ 1890ء میں بلوچستان چلے آئے۔ 1928ء میں آپ نے وفات پائی اور کاسی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ کی بہت زیادہ کرامات ہیں۔ **حضرت اختر نیکہؒ:** آپ کا مزار ہندو باغ میں ضلع ژوب کے تھانہ تنگی کے پاس ہے۔ **حضرت بابا خرواریؒ:** صاحب کشف و کرامات تھے۔ آپ کا مزار زیارت سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔

حضرت بابک صاحبؒ: آپ کا مزار عنایت اللہ کاریز (گلستان) سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر جنوب کی جانب خوژک نامی پہاڑ کے دامن میں ہے۔ **حضرت باقر نیکہؒ:** ضلع ژوب کی تحصیل قلعہ سیف اللہ میں سب سے زیادہ مشہور مزار آپ ہی کا ہے جو قلعہ سیف اللہ سے شمال کی جانب تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر سپین تنگی میں واقع ہے۔ **سید برات باباؒ:** آپ کا مزار قلعہ عبداللہ کے قریب پہاڑی پر واقع ہے۔ آپ صاحب کشف و کرامت تھے۔

حضرت سید بلانوشؒ: آپ پیران پیر سید محی الدین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد سے ہی نام شیخ بلیدر ہے لیکن بلانوش کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کا مزار نوشکی میں ہے۔ **حضرت سید بچن شاہؒ:** آپ ضلع سبی کے مشہور صوفی ہو گزرے ہیں آپ کا مزار بھی وہیں ہے۔ **حضرت پیر بوھرؒ:** آپ کا مزار ویل پٹ ضلع لسبیلہ کے مقام باغ کلاں میں واقع ہے۔ سالانہ میلہ ماہ جون کے پہلے پیر دوشنبہ کو منعقد ہوتا ہے۔ **حضرت پیر بو بکؒ:** آپ کا مزار رضائی کالاگ (خاندان) میں ہے۔ روایت ہے کہ جب منگولوں نے ان کا تعاقب کیا تو انہوں نے اپنے پیروکاروں کو چٹانوں میں تبدیل کر دیا اور خود غائب ہو گئے۔ آپ کا مزار پستے کے ایک

درخت کے نیچے ہے۔

حضرت بیٹ نیکہؒ: بیٹ نیکہ غوری بادشاہوں کے ہمعصر تھے۔ ان کا زمانہ حیات 300ھ-400ھ کے دوران ہے۔ فورٹ سنڈیمن کے قریب دفن ہیں۔ **حضرت بی بی نانیؒ:** آپ کا مزار بولان (قلات ڈویژن) میں ہے۔ بی بی نانی پل کے جنوبی سرے پر پانی کے کنارے واقع ہے۔ آپ اپنے زمانے کی صالحہ اور عابدہ خاتون تھیں۔ **حضرت بی بی ہاروانہؒ:** آپ نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ ہر وقت ذکر الٰہی میں مگن رہتیں۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کو چوتیر (ضلع لورالائی) سے چار میل دور وانی کے مغربی کنارے پر سپرد خاک کیا گیا۔ **حضرت بی بی نیک رنؒ:** آپ کا مزار قلات میں ہے۔ آپ اپنی صدی کی معروف عاجدہ خاتون تھیں۔

حضرت بابک صاحبؒ: بابک صاحب نامی ایک بزرگ کا ذکر پہلے آ چکا ہے اسی نام کے ایک اور زالا دعلاقہ تھا۔ چٹیالید کے ضلع لورالائی میں دفن ہیں۔ **حضرت بابک نیکہؒ:** علاقہ ہری پال (عارف آل) فورٹ سنڈیمن کے ایک پہاڑ کے دامن میں ان کا مزار ہے۔

حضرت باشہید نیکہؒ: سنزرخیل کاکڑ کی ملازئی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ برنائی ضلع سبی میں چولائی قبرستان میں ان کا مزار ہے۔ **حضرت پیر پنجہؒ:** کوئٹہ سے سبی جاتے ہوئے تینتیسویں میل پر ایک چٹان واقع ہے جو جنجک (شینے) کے درخت سے متصل ہے۔ اس چٹان کے ایک پتھر میں سوراخ ہے جو نیزے کا بتاتے ہیں۔ ساتھ ہی گھوڑے کے سموں کے نشان بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پاؤں کے نشان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہیں۔ نیزہ اور گھوڑا بھی ان سے متعلق تھا۔ **حضرت پہلوان باباؒ:** پہلوان بابا شریعت کے پابند اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ ریس کورس (ہندہ) کوئٹہ کے قریب ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ یہیں ان کی وفات پر ان کا مزار بنایا گیا۔ **حضرت پیر بخاریؒ:** آپ سند جادی سے 15 میل کے فاصلے پر پوئی کے مقام پر دفن ہیں۔ پوئی ندی کے پانی کو آپ نے دودھ میں تبدیل کر دیا تھا۔ **حضرت پھل چونوؒ:** آپ حضرت شیخ حسینؒ کے جلیل القدر صاحب کشف و کرامات فرزند عالی مرتبت تھے۔ آپ کا مزار لوری بھٹ میں ہے۔ آپ کے مزار کے پاس ایک پہاڑ کے غار میں سے پانی ٹپک ٹپک کر جمع ہوتا ہے۔ جمع ہونے والی جگہ میں یہ پانی سرخی مائل ہے مگر برتن یا ہتھیلی میں لیں تو بالکل صاف شفاف دکھائی دیتا ہے۔

حضرت پادن پارن نیکہؒ: ژوب کے علاقے مرغیل کے ایک مقام حسن خیل شیرانی کی ایک بڑی ندی کے درمیان آپ کا مزار ہے۔ **حضرت میاں تاج محمدؒ**: آپ حضرت میاں محمد حسن کے چھوٹے بیٹے تھے۔ 1831ء میں پیدا ہوئے، 1892ء کو وفات پائی۔ **حضرت تنز حیدر پیرؒ**: آپ کا مزار کلی شیریں تحصیل سنجاوی ضلع لورالائی میں ہے۔ **حضرت ناصرؒ**: آپ کا مزار تحصیل کے شیخ مانده میں ہے۔ **حضرت تور نیکہؒ**: آپ ہندو باغ کے اطراف و اکناف میں کہیں دفن ہیں۔ اسی نام کا ایک مزار گلی درگئی تحصیل بوری ضلع لورالائی میں بھی ہے۔ محمد اسماعیل سائل روایت کرتے ہیں کہ ان کا تعلق گالزئی کدے زئی سنزرخیل کا کڑ سے ہے۔ درگئی کے قریب پہاڑی کے دامن میں موجود تور مسجد الٰہی کے نام سے مشہور ہے۔ **حضرت تیار غازیؒ**: آپ کا اصل نام اسرائیل الدین تھا۔ 200 سال پہلے آپ اوچ شریف سے بھاگ کر نیامت تشریف لائے تھے۔ لفظ تیار ہر وقت آپ کی زبان پر رہتا تھا اس لئے تیار غازی کہلائے۔ **حضرت شیخ تقیؒ**: آپ شیخ ذہوار کے گھرانے سے ہیں اور علی زئی درانی ہیں۔ مقامی لوگ آپ شیخ تغنے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پندی شیخاں مستونگ میں آپ کا مزار ہے۔ آپ کی شخصیت جلالی تھی۔

حضرت خواجہ محمد عمر جان چشمویؒ: آپ کی ولادت صفر 1288ھ/ 1871ء میں ہوئی اور وصال یکم ذی الحجہ 1360ھ/ 1941ء کو ہوا۔ آپ کا مزار کوئٹہ کے قریب چشمہ شریف میں ہے۔ **حضرت ملا محمد عظیم صاحب زادہؒ**: آپ کا مزار شہر چمن سے مغرب کی جانب 9 میل کے فاصلے پر سادات سے ایک گاؤں سلیمان زئی کے مشرق کی طرف واقع ہے۔ **حضرت مست توکلیؒ**: مست توکلی 1244ھ/ 1828ء کی موسم بہار کی ایک شام کو مری شیرانی درگانی قوم میں پیدا ہوئے۔ 1313ھ/ 1895ء میں حضرت مست توکلی کا وصال ہوا۔ انہیں میدان گری میں دفن کر دیا گیا۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کا مزار نکیل پہاڑ کی چوٹی پر بنایا گیا ہے۔ **حضرت میاں محمد پناہؒ**: آپ 1293ھ/ 1867ء میں پیدا ہوئے اور 20 شوال 1348ھ/ 1929ء کو صبح کے وقت اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ **حضرت امین شاہؒ**: مہڑی نیابت میں دفن ہیں۔ **حضرت اللہ یار شاہؒ**: آپ کا مقبرہ بولان بند میں ہے۔ **حضرت اسحاق جوگیزئیؒ**: آپ کا مزار راڈ ضلع ژوب میں ہے۔ **حضرت اووہ مند دزیانؒ**: یہ سات افراد بیدار قوم سے ہیں ایک ہی جگہ لورالائی سے تقریباً 6 میل کے فاصلے پر مشرق کی جانب پینگہ گاؤں میں دفن ہیں۔

حضرت اکک صاحبؒ: زالار علاقہ تھل چوٹیالی تحصیل دلی ضلع لورالائی میں دفن ہیں۔ **حضرت پیندسری شاہؒ**: آپ کا مزار ضلع سبی کے تحصیل شاہرگ میں میاں کچھ کے مقام پر واقع ہے۔ **حضرت بالخواری نیکہؒ**: سنجاوی سے 15 میل کے فاصلے پر پوئی نامی گاؤں میں ان کا مقبرہ ہے۔ حضرت بڑمکو، موسیٰ جانؒ، برنائی ضلع سبی کے چوکئی نامی گاؤں میں ایک دوسرے کے پاس پاس ان کی قبریں ہیں۔ **حضرت بم نیکہؒ**: سرانان تحصیل پشین کے نچلے تالاب کے پاس بڑی ڈھیری کے اوپر دفن ہیں۔ **حضرت بولی بلندؒ**: کچلاغ کے ایک قریبی کی اونچی چوٹی پر ان کا مزار ہے۔ **حضرت بہاولانؒ**: علاقہ مری بمقام کاہان میں انکا مقبرہ ہے۔ یہیں بہاولانزئی قبر بھی ہے۔

حضرت بہلول نیکہؒ: قلعہ سیف اللہ ضل ژوب کے دشت مرغہ میں ان کا مزار ہے۔ **حضرت بی بی ستیؒ**: کوئٹہ شہر کے کاسی قبرستان میں ان کا مقبرہ ہے۔ **حضرت بی بی نازوؒ**: ان کا مزار چوہان میں ہے۔ **حضرت بیدار نیکہؒ**: تحصیل بوری ضلع لورالائی کے علاقہ لوڑالائی کے گاؤں پینگ میں دفن ہیں۔ **حضرت پیراک پیرؒ**: بی تحصیل میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت پیر حسنؒ**: حب ندی نیا بتے لسوبیلہ میں آپ کا مزار ہے۔ ماہ اکتوبر میں میلہ لگتا ہے۔ **حضرت پیر گدرؒ**: مزار گدر لسبیلہ میں ہے۔ ہر سال جمادی الثانی کے مہینے میں عرس ہوتا ہے۔

حضرت پیر میرانؒ: آپ ویندر لسبیلہ میں دفن ہیں۔ **حضرت پایو نیکہؒ**: آپ کا مزار مرغہ فقیر زئی ضلع ژوب کے قریب گاؤں سرہ غوڑگہ میں ہے۔ **حضرت بلوانیکہؒ**: آپ ضلع ژوب کے علاقہ شیرانی کے گاؤں مغل کوٹ میں دفن ہیں۔ **حضرت پیر پلی والاؒ**: علی جان سالارانی تحصیل بارکھان میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت پیر نوھنؒ**: مزار منگور میں ہے۔ ذوالحج میں مزار پر میلہ لگتا ہے۔

حضرت پیر منکلو والاؒ: آپ کا مزار اچھری تحصیل بارکھان ضلع لورالائی میں ہے۔ **حضرت تورتارہ ڈانؒ**: یہ چھ بھائی ہیں۔ ان کے مزارات کلی نو حصار کی ایک مسجد میں ہیں۔ **حضرت تور لال خانؒ**: آپ کا مزار تحصیل پشین کے حرم زئی گاؤں میں ہے۔ **حضرت تنز حیدر پیرؒ**: آپ کا مزار کلی شیریں تحصیل سنجاوی ضلع لورالائی میں ہے۔ **حضرت ثارو شیخ**

ؒ: آپ کا مزار مرغزان وادی تحصیل مسلم باغ ضلع ژوب میں ہے۔ **حضرت تنزین نیکہ ملاؒ:** آپ کدے زئی سنزرخیل کاکڑ ہیں۔ مزار لورالائی سے آٹھ میل کے فاصلے پر مشرق کی جانب ورگئی گاؤں میں ہے۔ **حضرت نماز نیکہؒ:** برڈ گاؤں تحصیل بوری ضلع لورالائی میں دفن ہیں۔ **حضرت جان محمد ملاؒ:** شرن حمزروزئی میں لورالائی سے 17 میل کے فاصلے پر دفن ہیں۔ **حضرت جلال خاکؒ:** آپ کا مقبرہ لاجور گلستان میں ہے۔ **حضرت جلال نیکہؒ:** مسلم باغ تحصیل ضلع ژوب کے کجیر گاؤں کے قریب آپ دفن ہیں۔ **حضرت جلیل نیکہؒ:** تحصیل پشین کی کلی حیدرزئی کے قریب مشرق کی جانب سڑک کے کنارے آپ کا مزار ہے۔ **حضرت جنگل پیرؒ:** نرم میں پندگل کے قریب جنوب میں آپ کا مزار ہے۔

حضرت جواند پیرؒ: مہرمان ستمان تحصیل مارکھان ضلع لورالائی میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت جہاندا جوگیزئیؒ:** آپ کا مقبرہ راڈ ضلع ژوب میں ہے۔ **حضرت جنگی نیکہؒ:** کلی اوریاگی تحصیل بوری ضلع لورالائی میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت جمعہ ناناؒ:** لورالائی فورٹ سنڈیمن روڈ پر تقریباً 35 میل کے مقام پر برڈ کنرم گاؤں میں دفن ہیں۔ **حضرت پچجن نیکہؒ:** لورالائی سے پسیرہ راغہ روڈ پر 45 میل کے مقام پر پچجن نامی گاؤں میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت خوڑوین نیکہؒ:** لورالائی شہر سے 11 میل مشرق کی جانب ڈلی گاؤں کے قریب شبوزئی میں مدفون ہیں۔ **حضرت چاندرام پیرؒ:** آپ کا مزار جھالاوان میں چھائی کے قریب چھاپار کے مقام پر ہے۔ **حضرت چارگل نیکہؒ:** اوریاگی کلی تحصیل بور ضلع لورالائی میں آپ کا مقبرہ ہے۔ **حضرت چپین نیکہؒ:** چپین نیکہ تحصیل بوری ضلع لورالائی کے خنکی نامی گاؤں میں دفن ہیں۔

حضرت سرپریکڑے نیکہؒ: آپ کا مزار لوڑئی علاقہ شبوزئی تحصیل بوری میں ہے۔ **حضرت سکیسر نیکہؒ:** آپ کا مقبرہ ہندوباغ کے قریب بابوچینہ نامی گاؤں کے قریب ہے۔ **حضرت سادہ گلؒ:** آپ کی تدفین تنگ حیدرزئی کے قریب ہوئی ہے۔ **حضرت سخی نیکہؒ:** مسلم باغ سے جنوب کی طرف 20 میل پر یعقوب ماندہ کے کنارے آپ کا مزار ہے۔ **حضرت سعد اللہ فقیرؒ:** درگئی گاؤں تحصیل بوری ضلع لورالائی میں مدفون ہیں۔ **حضرت سعد اللہ ناناؒ:** لورالائی فورڈ سنڈیمن روڈ پر 35 میل کے فاصلے پر برڈ گاؤں میں دفن ہوئے۔

حضرت سلد نیکہؒ: آپ پشین میں مزری علاقہ کے آخری حصے میں ٹانگی نامی گاؤں میں دفن ہیں۔ **حضرت سلطانؒ:** ساراوان میں زہرآئے مقام پر دفن ہیں۔ **حضرت سلطان سمرقند بخاریؒ:** آپ کا مزار کنداوہ میں تیری کے قریب واقع ہے۔ **حضرت سلطان عارضیؒ:** آپ کا مقبرہ سراوان کیں نورگا زاہری کے مقام پر ہے۔

حضرت سلیمان آخوندؒ: زالار علاقہ تھل چٹیالی تحصیل زکی ضلع لورالائی میں دفن ہیں۔ **حضرت سمائیل نیکہؒ:** ضلع ژوب کی تحصیل قلع سیف اللہ کے بکوئی گاؤں میں مدفون ہیں۔ **حضرت سودل نیکہؒ:** آپ کا مزار سرکی کاریز کے قریب ضلع ژوب میں ہے۔ **حضرت سولوکئی ناناؒ:** مجتر میں دفن ہیں۔ **حضرت سید محمدؒ:** توئی اور ضلع ژوب میں دفن ہیں۔ **حضرت سید نورروزؒ:** آپ کا مزار جھالاوان مین منگاچر کے مقام پر ہے۔ **حضرت شاہ داھوؒ:** آپ کا مزار جوہان میں ہے۔

حضرت شاہ کمال پیرؒ: آپ زیدی میں دفن ہیں۔ **حضرت شپتر گوتے نیکہؒ:** آپ ضلع لورالائی کی تحصیل بوری میں شاہ کاریز اور پونگر کے درمیان دفن ہیں۔ **حضرت شعبان پیرؒ:** آپ کا مقبرہ جھالاوان میں چلماٹی کے قریب چھاپار کے مقام پر ہے۔ **حضرت شکرہ ور نیکہؒ:** آپ کا مقبرہ ژوب کے علاقہ شیرانی کے ایک مقام ترھیل کپیپ میں ہے۔ **حضرت شملی نیکہؒ:** مزار تغرتو مزغی، تحصیل ہندوباغ میں ہے۔

حضرت شین حاجیؒ: آپ کا مزار جھالاوان میں منگوچر کے مقام پر ہے۔ **حضرت شیخ جدکیؒ:** بندات حسین زئی تحصیل قلعہ سیف اللہ کے قریب دفن ہیں۔ **حضرت شیخ دارون نیکہؒ:** ہندوباغ کے جنوبی سمت میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت شیران نیکہؒ:** مزار مسلم باغ میں ہے۔ **حضرت حسن نیکہؒ:** دہانہ سر روڈ پر علاقہ شیرانی میں لواڑہ سڑک کے قریب آپ کا مقبرہ ہے۔ **حضرت حسین باریؒ:** ساراوان میں چاکو کے قریب واردما میں دفن ہیں۔ **حضرت حئی نیکہؒ:** آپ زخپیل ہیں۔ مزار درازن تحصیل بوری لورالائی ضلع میں ہے۔ **حضرت حاجی صاحبؒ:** زالار علاقہ تھل چٹیالی تحصیل دکی ضلع لورالائی میں آپ کا مقبرہ ہے۔ **حضرت خان نیکہؒ:** آپ ہندوباغ کے قریب بڑے قبرستان میں دفن ہیں۔ **حضرت خوبدا نیکہؒ:** آپ کا مزار پل یارو سے جنوب مشرق کی طرف پانچ فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ **حضرت داروز نیکہؒ:** آپ کا

مزار تحصیل ہندو باغ کے گاؤں بی لہو میں ہے۔ **حضرت دلیل مغرتؒ**: آپ کا مقبرہ گرگوجی تحصیل موسیٰ خیل ضلع لورالائی میں ہے۔

حضرت ڈنگر نیکہؒ: ضلع سبی کی تحصیل ہرنائی کی تنگی تورخان میں آپ کا مقبرہ ہے۔

حضرت ڈونگڑا نیکہؒ: لورالائی فورٹ سنڈیمن روڈ پر 40 میل کے فاصلے پر زڑا گاؤں میں مدفون ہیں۔ **حضرت رحیم داد و کریم دادؒ**: کوئٹہ چھاؤنی میں قلعے کے قریب دفن ہیں۔ **حضرت رسول ملا گڑ ندئیؒ**: آپ کا مزار دہار تحصیل بوری ضلع لورالائی میں ہے۔ **حضرت رمدان سخی پیرؒ**: آپ کا مقبرہ ساراوان میں دودبخو کے مقام پر ہے۔ **حضرت رسول شیخ**: مزار میختر تحصیل بوری میں ہے۔ **حضرت روزے گڑندئی ملاؒ**: آپ کا مدفن شرن تحصیل بوری ضلع لورالائی میں ہے۔ **حضرت دوزک ملاؒ**: مزار شبوزئی گاؤں میں لورالائی سے مشرق کی سمت 14 میل کے فاصلے پر ہے۔ **حضرت زید نیکہؒ**: آپ پشین میں مزریوں کے درمیان دفن ہیں۔ **حضرت زیارت ملا نیکہؒ**: یہ مزار ضلع ژوب کی تحصیل قلعہ سیف اللہ کے گاؤں ہندی میں ہے۔ **حضرت زید اللہ داد زئیؒ**: آپ کا مزار تیلرائے ژوب میں واقع ہے۔ **حضرت ژڑ پیرؒ**: آپ کا مزار ضلع سبی میں کچھ کے مقام سے آٹھ میل کے فاصلے پر ندگار نامی گاؤں میں ہے۔

حضرت سات براھم خیلؒ: یہ سب ایک ہی جگہ دفن ہیں۔

حضرت سام خیل جہارتنؒ: ہندو باغ ضلع ژوب کے اطراف میں یہ چاروں بھائی ایک جگہ دفن ہیں۔ **حضرت شیخ معروف نیکہؒ**: گلستان میں داویان کے قریب ندی لوڑہ کے کنارے دفن ہیں۔ **حضرت شیخ موسیٰ نیکہؒ**: آپ کا مزار ہرنائی میں سولانٹر کے قبرستان میں ہے۔ **حضرت شیخ واصلؒ**: جھالاوان میں شیخ واصل ہی کے مقام پر دفن ہیں۔ **حضرت شاہ جمالؒ**: ان کا مزار میانی لسبیلہ میں ہے۔ **حضرت شاہ حسین نیکہؒ**: مزار ارگسہ تحصیل مسلم باغ میں ہے۔ **حضرت صاحب اگاؒ**: آپ کانسگلزئی گاؤں تحصیل پشین میں دفن ہیں۔ **حضرت صوفی نیکہؒ**: آپ کا مزار ہندو باغ میں پڑے بند کے قریب ہے۔ **حضرت فیض محمد اخوندزادہؒ**: مزار میختر تحصیل بور ضلع لورالائی میں ہے۔

حضرت فدا حسینؒ: اوتھل شہر لسبیلہ میں آپ کا مزار ہے۔ جمادی الثانی میں میلہ لگتا ہے۔ **حضرت فتح ملاؒ**: آپ کا مزار دہار تحصیل بوری ضلع لورالائی میں ہے۔ **حضرت قاضی نیکہؒ**: آپ کا مزار پشین میں مسترزئی قبرستان میں ہے۔ **حضرت معصوم نیکہؒ**: آپ کا مزار پشین شہر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ انہیں غائب بابا، شاورخ بابا بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت کانو نیکہؒ: آپ کا مزار اندروبی تحصیل سنجاوی ضلع لورالائی میں واقع ہے۔ **حضرت کٹا پیرؒ**: آپ ماما سمند خان کلی تحصیل بارکھان میں مدفون ہیں۔ **حضرت کلا نیکہؒ**: تحصیل پشین کے علاقہ مترکی میں ژڑ نامی گاؤں میں دفن ہیں۔ **حضرت کا کا نیکہؒ**: آپ کا مدفن زالار علاقہ تھل چٹیالی تحصیل دکی ضلع لورالائی میں ہے۔ **حضرت کوکل نیکہؒ**: علاقہ ہرنائی میں تنگی کے درمیان دفن ہیں۔ **حضرت کاٹے ولیؒ**: وٹاکری تحصیل بارکھان ضلع لورالائی میں قبرستان کانیا والا میں دفن ہیں۔ **حضرت کودے نیکہؒ**: ان کا مقبرہ ژڑغوڑے تورخیزی تحصیل بوری ضلع لورالائی میں ہے۔

حضرت کجور نیکہؒ: آپ کا مزار درگئ تحصیل بوری میں ہے۔ **حضرت پیر سید گلاب شاہ مشہدی نقشبندی القادریؒ**: آپ 1366ھ/1908ء میں موضع فقیر محمد سیداں (صوبہ سرحد) میں پیدا ہوئے اور 17 اکتوبر 1962ء/ 1382ھ کو اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ **حضرت کلئی نیکہؒ**: آپ کا مقبرہ سنجاوی میں پہائی گاؤں میں ہے۔ **حضرت کنران محمد پیرؒ**: آپ سنگوچر (جھالاوان) میں دفن ہیں۔ **حضرت یاسین نیکہؒ**: آپ کا مزار میختر میں لورالائی سے 50 میل کے فاصلے پر ہے۔ **حضرت خواجہ یحییٰ کبیر غرغشتیؒ**: آپ کوہ سلیمان کے مضافات میں شہر علی کے مقام پر 707ھ/ 1307ء کے اوائل میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایک سوستائیس سال کی عمر میں 20 نومبر 1430ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔

حضرت سید یوسف شاہ غازیؒ: آپ 27 رمضان المبارک کو بلہ شریف (صوبہ سرحد) میں پیدا ہوئے۔ 27 اپریل 1952ء میں وفات پائی۔ ہدے ہی میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت ملک یار غرشینؒ**: ایک قیاس کے مطابق آپ فورٹ سنڈیمن سے مغربی قطب کی جانب 8000 فٹ اونچے پہاڑ غرشین میں رہتے تھے۔ **حضرت ہفت ولیؒ**: قلات ڈویژن میں شوران سے شمال کی جانب قریباً آٹھ میل دور بھٹاری کے مقام پر سات بزرگوں (شاہ عمر، ولی نعمت اللہ شاہ، محمود شاہ، شاہ یوسف، شاہ امین الدین، شاہ وانڑ اور شاہ یوسف) کے مزار ہیں جنھیں عرف عام میں دربار ہفت ولیؒ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ **حضرت وچ یکہ گانؒ**: لورالائی

سے ایک میل پر واقع گاؤں رودلین کے ملا خدر قبرستان میں آپ دفن ہیں۔ جس کی ہڈیاں اور ایک آدھ عضو کی خشک جلد دکھائی دیتی ہے۔ **حضرت خواجہ ولی بابا**ؒ: آپ کی ولادت چشت (افغانستان) میں ہوئی تحصیل علم کے بعد ہندوستان اور پھر وہاں سے کوئٹہ، کوہ خواجہ عمران کے دامن میں کلی کران میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کا عرف کلی کران میں ہر سال عقیدت واحترام سے منایا جاتا ہے۔ **حضرت نور محمد سید**ؒ: آپ کا مزار سنگان تحصیل بی میں ہے۔

حضرت نہال مہا کاویؒ: آپ کا مقبرہ علاقہ مری، کاہان سے چھ میل کے فاصلے پر ککی کے مقام پر ہے۔ **حضرت نوگزین بابا**ؒ: آپ کا مزار کوئٹہ چھاؤنی میں ہے۔ **حضرت سید نو احمد شاہ بخاری**ؒ: آپ کا مزار لورالائی چھاؤنی میں ہے۔ **نانی کا مقبرہ**ؒ: ہنگلاج جو دریائے ہنگول کے کناریوں پر واقع ہے میں ایک زیارت ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ وہ پاربتی یا کالی دیوی یا ماتا دیوی کا مزار ہے جب کہ مسلمان اسے نانی کا مقبرہ کہتے ہیں۔ **حضرت محمد شریف خلیفہ**ؒ: آپ پشاور سے یہاں آئے اور لورالائی سے دو میل شمال کی جانب کلی اوریا گی میں آپ کا مزار ہے۔

حضرت ملغوزار نیکہؒ: دونوں درگئیوں کے درمیان آپ تحصیل بوری میں دفن ہیں۔ **حضرت ملا عمر نیکہ**ؒ: آپ کا مزار کلی عبدالرحمٰن ضلع ژوب میں ہے۔ **حضرت مالے اخوند صاحب**ؒ: آپ کا مزار ضلع سبی کے سنی کے قریب ہے۔ **حضرت موسیٰ شیخ**ؒ: شاہرگ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر آپ کا مزار ہے۔ **حضرت میاں شادی نیکہ**ؒ: آپ کو اس تحصیل ہرنائی کے رہنے والے تھے۔ روایت ہے کہ کو اس کی پرانی بستی کو آپ نے تباہ کیا تھا جس کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ **حضرت مانو نیکہ**ؒ: آپ کا مزار شاہرگ تحصیل ہرنائی ضلع سبی میں ہے۔

حضرت میر نیکہؒ: فورٹ سنڈیمن کے شیرانی قوم کے علاقہ مانی خواہ میں کڑم کے مقام پر آپ کا مزار ہے۔ **حضرت میر حسن گڑندی**ؒ: گلستان میں لولک کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر آپ کا مزار ہے۔ **حضرت موری نیکہ**ؒ: مسلم باغ کے اطراف واکناف میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت ملا مردان نیکہ**ؒ: درگئی گاؤں تحصیل بوری ضلع لورالائی میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت ملنگ صاحب**ؒ: بوستان میں کلی مغوٹیان میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت منڈہ انا**ؒ:

آپ مغلیہ دور حکومت میں زندہ تھیں۔ آپ کا مزار سرانان پشین کے قریب نئی کلی میں ہے۔ **حضرت موج دین پیر**ؒ: آپ کا مزار بھاگ میں ہے۔ **حضرت ملا ستار اخوندزادہ**ؒ: کلی چینہ علاقہ لوڑہ لئی تحصیل بوری ضلع لورالائی میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت ملا مبین**ؒ: مشرن علی زئی گاؤں میں آپ دفن ہیں جو لورالائی ڈیرہ غازی خان سے 19 میل کے فاصلے پر ہے۔ **حضرت ملا صدیق اخوند**ؒ: تحصیل ہرنائی میں گوڈی غوڑ کلی کے قریب دفن ہیں۔ **حضرت ملا قدوس آغا**ؒ: سرکالڑ تحصیل ہرنائی میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت رسول اخوند**ؒ: مقبرہ زنگیوال گاؤں کے قریب دفن ہیں۔ **حضرت ملا رسول نیکہ**ؒ: ان کا مزار گلستان میں نمزہ ہندو تھانہ کے قریب پہاڑ کے دامن میں ہے۔ **حضرت ملا جوگی نیکہ**ؒ: یغور کلی تحصیل بوری ضلع لورالائی میں دفن ہیں۔ **حضرت ملا یاران اخوند**ؒ: کچلاغ کوئٹہ سے 15 میل کے فاصلے پر شمال کی جانب آپ کا مزار ہے۔

حضرت ملا اولیاءؒ: ان کا مقبرہ ہرنائی میں کونوی گاؤں میں ہے۔ **حضرت مست گیلان**ؒ: کوئٹہ میں تکتو کے پہاڑ کے دامن میں سمل گاؤں میں دفن ہیں۔ **حضرت مرجان نیکہ**ؒ: مسلم باغ میں خسارہ گاؤں میں آپ کا مزار ہے۔ **حضرت مائی نترو**ؒ: غزالی خاندان سے ان کا تعلق ہے۔ **حضرت محبوب غازی**ؒ: کوئٹہ ناچاری میں تازی کاریز کے کنارے دفن ہیں۔ **حضرت محمد دین آغا**ؒ: آپ کا مزار قبرستان سمالزئی گلستان میں ہے۔ آپ عنایت اللہ کاریز میں رہتے تھے۔ **حضرت محمد اللہ پیر**ؒ: آپ کا مقبرہ باغ سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ **حضرت مائی سدو**ؒ: نیسان میں آپ کا مزار ہے۔ محمدانی، لوبارانی، شب برات پر نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ **حضرت مائی خیرو**ؒ: یہ بہاولانزئی قبیلے سے ہے۔ **حضرت مانڑگئی نیکہ**ؒ: سرکی گاؤں تحصیل ہندو باغ میں مانڑگئی نیکہ کا مزار ہے۔ **حضرت مانا نیکہ**ؒ: آپ کا مزار سنجاوی ضلع لورالائی میں ہے۔ **حضرت مندو نیکہ**ؒ: آپ کا مزار فورٹ سنڈیمن ضلع ژوب سے 35 میل کے فاصلے پر گاڑ داؤ کے مقام پر ہے جسے وزیر باغ بھی کہتے ہیں۔ **حضرت گڑندی نیکہ**ؒ: شبوزئی گاؤں میں لورالائی سے 14 میل کے فاصلے پر مغرب کی جانب دفن ہیں۔

حضرت پیر لاکھاؒ: آپ کا مزار بلوچستان کے درہ مولا میں جھل مگسی سے بیس میل دور جنوب مغرب کی جانب ہے۔ **حضرت پیر لعل شاہ**ؒ: کٹبار شریف سے مغرب کی جانب سوا

کوس کے فاصلے پر دفن ہیں۔ **حضرت لالہ سیدؒ**: آپ کا مقبرہ مزہ تنگی تحصیل بوری ضلع لورالائی میں ہے۔ **حضرت لالہ سلیمانؒ**: سوراب ساراوان میں مزار ہے۔ **حضرت لونیؒ صاحب زادہؒ**: علاقہ مسلم باغ میں بڑے بند کے قریب دفن ہیں۔ **حضرت لاج میر حاجیؒ**: آپ کا مزار موضع برڈ تحصیل بوری ضلع لورالائی میں ہے۔ **حضرت جان محمد کاکڑؒ**: آپ ژوب شاہ شجاع کے زمانے میں تحصیل علم کے لئے پشاور صوبہ سرحد گئے۔ حضرت محمد عمر چمکنی کی مریدی اختیار کی۔ تحصیل علم کے بعد اپنے مرشد کے نظریات اور تعلیمات کی تبلیغ کے لئے واپس ژوب آ گئے۔ **حضرت چتر پیرؒ**: بگٹی قبیلے کے اس محترم پیر کا مزار دریائے چتر کے شمال میں اس مقام پر واقع ہے۔

حضرت چیریک پیرؒ: ملک قمبر یا چیریک پیر کا مزار اریری کلاگ (خاران) میں واقع ہے۔ **چلتن باباؒ**: چلتن بابا خانقاہ چلتن پہاڑ میں اور مزار کوئٹہ چھاؤنی میں ہے۔ **حضرت چوخوڑ دین نیکہؒ**: لورالائی شہر سے 11 میل مشرق کی جانب ڈلی گاؤں کے قریب شبوزئی میں مدفون ہیں۔ **حاجی صاحب گٹ والےؒ**: آپ کی وفات 1967ء میں ہوئی اور شنہ خوڑہ میں آپ کو دفن کیا گیا۔ **حضرت حریفؒ**: آپ بخارا سے آ کر یہاں اقامت پذیر ہوئے ہیں۔ **حضرت شیخ حسن المعروف شیخ کٹہ متی زئی خلیل انصاریؒ**: شیخ کٹہ ابن شیخ یوسف 1386ء کی عظیم شخصیت تھے۔ آپ اپنے وقت کے روحانی و باطنی پیشوا اور غوث تھے۔ **حضرت پیر حیدر شاہؒ**: آپ کا مزار عین کاہان کے باہر ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے مرقد کی خاک ہیضے کے لئے اکسیر ہے۔ **حضرت پیر حیدر نیکہؒ**: تحصیل پشین ضلع کوئٹہ میں بند خوشدل خان سے تقریباً دو میل دور آپ کا مزار ہے۔ **حضرت حسین نیکہؒ**: آپ کا مزار ژوب میں دریائے قندھار کے کنارے واقع ہے جس کے اوپر تقریباً بیس گز لمبا، بارہ گز چوڑا اور تین گز اونچا جھونپڑا ہے۔ **حضرت شیخ حسینؒ**: پنجاب کے باشندے تھے۔ آپ کی تدفین نوشکی میں ہوئی۔

حضرت محمد عبداللہ المعروف حکیمؒ: آپ کا نام محمد عبداللہ اور تخلص حکیم تھا۔ آپ عشق و عرفان میں ڈوبے رہتے۔ عرب، حبش، سوڈان، یمن اور ہندوستان کی سیاحت کے بعد بلوچستان آ کر مستونگ میں مقیم ہوئے۔ **حضرت شیخ حمرؒ**: جام میر خان اول کے عہد میں سندھ سے شیخوں کا ایک قبیلہ 1164ھ/1750ء میں لسبیلہ میں سکونت پذیر ہوا۔ اس شیخ خاندان میں شیخ

حمر ایک عابد اور زاہد شیخ تھے۔ **حضرت حاجی حملؒ**: آپ کا مزار سبی میں قلعہ کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ بہت بڑے ولی اللہ ہیں۔ **حضرت ملا خدرؒ**: آپ کا مزار لورالائی شہر سے ایک میل مغرب کی جانب رودلین گاؤں کے اربوسین قبرستان میں ہے۔ **حضرت خلیزی نیکہؒ**: روایت ہے کہ وفات سے قبل آپ نے وصیت فرمائی کہ میری میت اونٹ پر رکھ دینا جہاں اونٹ رُکے وہیں مجھے دفن کر دینا۔ اونٹ لورالائی شہر سے تین میل کے فاصلہ پر مغرب کی سمت سپلی گاؤں کے قریب بیٹھ گیا۔ وہاں پانی کا نام ونشان نہ تھا۔ قبر کی کھدائی کے دوران اچانک وہاں سے چشمہ پھوٹ پڑا۔ مرگی، دق اور فالج کے مریضوں کو شفا ملتی ہے۔ **حضرت خنائی باباؒ**: آپ کی خانقاہ خنائی میں واقع ہے۔ خناق کوئٹہ سے لورالائی فورٹ سنڈیمن کے راستے میں تیس میل کے فاصلے پر ہے۔

حضرت ملا خوشحال اخوندؒ: آپ کا مزار غیشر سے دو میل جنوب کی جانب ایک پہاڑی کے اوپر ایک بڑے اور پرانے قبرستان میں واقع ہے۔ **حضرت پیر دربار شاہؒ**: آپ کا مزار زن کے سلسلوں میں سطح مرتفع زنجک کی چوٹی پر واقع ہے۔ وہاں ایک جیسی چھ قبریں ڈھیر کی صورت میں ہیں۔ **حضرت سید راجن شاہ جیلانیؒ**: لاڑکانہ کے علاقے میں نارہ کے کنارے سکونت پذیر تھے۔ کچھی (بلوچستان) کے علاقے میں بھی ان کے بہت سے مرید اور خادم تھے۔ **حضرت سید رحمت اللہ شاہؒ**: آپ قندھار کے رہنے والے تھے۔ چوٹیالی میں آپ کی خانقاہ ہے۔ **حضرت ملا رحیم دادؒ**: آپ کا تعلق سنزرخیل قبیلہ سے تھا اور ژوب آپ کا مسکن تھا۔ حضرت شاہ فقر اللہ علوی سے فیض یاب ہوئے۔

حضرت پیر رضائی بکیانیؒ: آپ کا مزار زن کے سلسلوں میں ہے۔ یہ سوئی گیس کمپنی کے کھودے ہوئے پہلے کنوؤں کے قریب ہے۔ **حضرت میاں رکھئیل شاہؒ**: میاں رکھئیل شاہ فتح پور (گنداوا، بلوچستان) میں مقیم رہے۔ آپ مخدوم خواجہ عبدالستار صوفی القادری کے مرید اور خلیفہ تھے۔ **حضرت خواجہ روح اللہ صاحب اخوندزادہ کا لگ زئیؒ**: آپ تحصیل پشین سے آٹھ میل کے فاصلہ پر خداداوزئی گاؤں میں 1813ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ملا محمد عیسیٰ" کچی اخوند کے ہاتھ بیعت کی۔ **حضرت سخی تنگوؒ**: سخی تنگو کا مقبرہ تحصیل ڈھاڈر علاقہ خان پور نفر میں موضع کوٹ مینگل نوشہرہ شاہوانی اور مہر گڑھ ریئسانی براہوی کے قریب ہے۔

حضرت سخی فتح خانؒ: آپ کا مزار قلات ڈویژن میں جوہان کے نزدیک قیصر میں ہے۔

حضرت ملا سرور اخوند زادہؒ: کاکڑ قبیلے کے مذہبی اور روحانی پیشوا ہونے کے ساتھ پشتو زبان کے اچھے شاعر بھی تھے۔ **حضرت سلطان حمیدالدین حاکم قریشی ھنکاریؒ:** کی ولادت 1174ء میں کیچ مکران میں ہوئی۔ آپ نے حضرت شیخ رکن الدینؒ کے ہاتھ پر سلسلہ سہروردیہ میں بیعت کی۔ 1336ء کو رحلت فرمائی۔ سلسلہ سہروردیہ میں آپ نے سب سے لمبی عمر پائی۔ آپ کی وفات ملتان میں ہوئی لیکن رحیم یار خان کے ریلوے سٹیشن ترنڈہ سے جانب شمال چار میل کے فاصلہ پر بمقام مئو دفن کیے گئے۔ **حضرت پیر سلطان قیصرؒ:** آپ کا مزار ضلع چاغی میں ہے۔ ایک پہاڑ کوہ سلطان آپ کے نام سے منسوب ہے۔ **حضرت سنزر نیکہؒ:** آپ فورٹ سنڈیمن سے 37 میل کے فاصلہ پر علاقہ کبزئی میں کوٹ قبول زئی کے مقام پر گوسہ میں دفن ہیں۔ **حضرت پیر سہریؒ:** آپ کا مزار ڈیرہ بگٹی کے قریب پہاڑ کی عین چوٹی کے اوپر واقع ہے۔ ہر سال بگٹی قوم کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں وہاں دنبے ذبح کرنے جاتے ہیں۔

حضرت سید احمد شاہؒ: آپ کا تعلق حضرت سید در جمال بخاری کی اولاد سے ہے جو پشین میں سکونت پذیر رہے۔ **حضرت پیر سید بلوؒ:** سرباب روڈ کوئٹہ میں آپ کی خانقاہ پر آج بھی لوگ بڑی تعداد میں حاضری دیتے ہیں۔

حضرت سید ذر بلیلؒ: کلی پوئی کے جس مقام پر آپ کا مزار ہے وہ سیر کی کہلاتا ہے۔ مزار بہت خوبصورت ہے اور مرجع خلائق ہے۔ **حضرت سید محمودؒ:** آپ کا مزار نوشکی سے چالیس میل دور زارو میں ہے۔ آپ ایک جلالی طبیعت کے بزرگ تھے۔ **حضرت الحاج سید محمد یعقوبؒ:** نزکی تحصیل پشین میں آپ 1952ء کو فوت ہوئے اور حضرت مودود چشتی کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ **حضرت سپر کئی پیرؒ:** آپ کا مزار مختر تحصیل بوری ضلع لورالائی میں ہے۔ **حضرت شے رجبؒ:** آپ صاحب حال بزرگ تھے۔ وفات کے بعد نیمرغ میں ہی دفن ہوئے۔ **حضرت شہ کھٹےؒ (شیخ کھٹے):** آپ امیر چاکر سردار اعظم زہد بلوچ 1555ء کے مرشد تھے۔ آپ سبی کے شمال مغرب کی جانب ناڑی ندی کے کنارے مدفون ہیں۔ **حضرت شیر جان آغا قلندر گلنگوریؒ:** آپ کا مقبرہ نوشکی روڈ کے قریب گلنگور میں واقع ہے۔ آپ خرکاری کرتے تھے۔

حضرت شاموہیکہؒ: ضلع ژوب علاقہ کاکڑ کلی بابڑ کے قریب کوچے زئی کے مقام پر آپ دفن ہیں۔ **حضرت شیخ تیمنؒ:** آپ ولی اللہ ہونے کے ساتھ پشتو زبان کے اچھے شاعر بھی تھے۔ **حضرت شیخ فرید نیکہؒ:** آپ کا مزار پشین میں کلی پیران میں ہے۔ آپ سید ہیں۔ مقبرہ پر گنبد بھی ہے۔ **حضرت شیخ ماندہ باباؒ:** پشین روڈ پر کوئٹہ کے قریب آپ کا مزار ہے۔ قریبی ریلوے سٹیشن اسی نام سے منسوب ہے۔ **حضرت طاہر آب شناسؒ:** آپ بلوچستان کے مشہور سید قبیلہ 'تارن' کے جد امجد تھے۔ آپ کا نام نامی سید طاہر تھا اور زمین میں موجود پانی کی نشاندہی فرماتے تھے۔

بزرگان شاہ پور: چھتر کے علاقہ میں شاہ پور کا قصبہ صوفی سادات کرام کا مسکن ہے۔ کئی ولی پیدا ہوئے۔ ان میں سید حسن شاہؒ بڑے نامور بزرگ گزرے ہیں۔ وحشی قبائل آپ کی ایک نظر سے مطیع و فرمانبردار ہو جاتے تھے۔ **حضرت شاہ بلاولؒ:** آپ کا مزار شاہ بلاول گاؤں کے پاس ورہب ندی ضلع لسبیلہ کے مغرب کی جانب ہے۔ **حضرت شاہ عبداللہؒ:** آپ شاہ جعفرؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کا وصال قلات ڈویژن میں درنگ کے مقام پر ہوا جو زنک میں واقع ہے۔ **حضرت پیر شاہ محمودؒ:** آپ اوچ شریف کے شیخ تھے۔ آپ کے مزارات مغدران پہاڑیوں میں چوتی اور بارکھان میں دھتی کے مقام پر واقع ہیں۔

حضرت شاہ مردانؒ: آپ کا مزار کشن اور جوہان کے وسط میں قلات بولان روڈ پر واقع ہے۔ **حضرت شے حسنؒ:** بعض روایات کے مطابق آپ کا نام ابوالفتح صفی الدین محمد ہے۔ آپ کا مزار علاقہ عبداللہ زئی ضلع ژوب میں ہے۔ **حضرت شاموہیکہؒ:** آپ شامزئی، کبیرزئی، سنزرخیل کاکڑ کے جد اعلیٰ ہیں۔ اپنے دور کے بزرگ تھے۔ آپ کا مزار لواڑگی علاقہ عبداللہ زئی تحصیل فورٹ سنڈیمن ضلع ژوب میں ہے۔

حضرت میاں عبدالحکیم نانا صاحبؒ: میاں عبدالحکیم نانا صاحب 1679ء میں خانوزئی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ 1740ء میں وفات پا گئے۔ مزار چوٹیالی تھل میں ہے۔

حضرت خواجہ عبدالحئی جان چشمویؒ: آپ حضرت خواجہ محمد عمر جان چشموی کے بڑے صاحبزادے، سجادہ نشین اور خلیفہ اعظم تھے۔ اسرار ربانی سے واقف، صاحب کرامات تھے۔ آپ کا وصال 13 نومبر 1388ھ/1968ء کو ہوا۔ ان کے علاوہ بلوچستان میں جو اولیاء کرام ہیں

ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت خواجہ عبدالعزیزؒ: حضرت خواجہ حافظ عبدالمجیدؒ، حضرت غرغشت نیکہؒ، حضرت ملاعثمان اخوندؒ، آپ کا مزار سرانان سے ایک میل پشین کی جانب ہے۔ حضرت پیر عمرؒ، آپ کا مزار دریائے ہمن کے کناروں پر خضدار اور واہر کے مابین ہے۔ **حضرت عبدالوہاب اخوندزادہؒ:** ضلع ژوب کی تحصیل قلعہ سیف اللہ کے مانجرہ گاؤں کے قریب دفن ہیں۔ **حضرت عبدالمجید صاحبؒ:** آپ کا مزار زالار علاقہ تھل چٹیالی تحصیل دکی ضلع لورالائی میں ہے۔ حضرت عبائب نیکہؒ، آپ تحصیل پشین کی کلی شین غریو کے قریب ایک پہاڑ پر دفن ہیں۔ **حضرت علی گرنڈیؒ:** آپ ہرنائی میں توکے گاؤں کے قریب تنگی میں دفن ہیں۔ **حضرت علی نیکہؒ:** آپ کا مزار ژوب میں ہے۔ **حضرت عمر شاہ آغاؒ:** آپ عبداللہ خاں کے قریبی بڑے قبرستان میں مدفون ہیں۔ **حضرت عبدالرحمٰن نیکہؒ:** آپ کا مزار برڈ گاؤں تحصیل بوری ضلع لورالائی میں ہے۔ **حضرت عمر خان ملاؒ:** آپ کا مزار مستنگ میں ہے۔ **حضرت عظیم نیکہ سیدؒ:** آپ کا مزار مڑہ تنگی فورٹ سنڈیمن روڈ پر واقع ہے۔ **حضرت عمران باباؒ:** آپ کا مزار گلستان سے مشرق کی جانب ہے۔ **حضرت پیر عزت شاہؒ:** آپ کا مزار مٹھڑی سٹیشن کے قریب درختوں کے جھنڈ میں واقع ہے۔ **حضرت واجہ غریب شاہؒ:** آپ کا مزار گوادر سے پندرہ میل دور نگور کے مقام پر ہے۔ **حضرت میاں غلام حیدرؒ:** آپ 19 ذیقعد 1236ھ/ 1820ء کو پیدا ہوئے۔ حضرت میاں غلام حیدر شاہ حنفیؒ: آپ 1950ء میں بیمار ہوئے اور سبی میں جمعہ کے دن 13 رجب 1371ھ مطابق 20 اپریل 1951ء کو وفات پائی۔

(صوفیائے بلوچستان۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر)

❖■❖■❖

بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت

نسیم حجازی مرحوم، حاجی محمد جہانگیر جوگیزئی مرحوم اور ایم مسعود کھدر پوش مرحوم ان افراد میں سے ہیں جنہوں نے بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ اردو ڈائجسٹ کے مدیر جناب الطاف حسن قریشی نے یہ داستان ان اصحاب کی معلومات کی روشنی میں مرتب کی جسے بعدازاں ''بلوچ پنجاب برادرہوڈ'' نامی تنظیم نے بھی پمفلٹ کی صورت میں شائع کی۔

بلوچستان کی جغرافیائی، دفاعی اور سیاسی اہمیت پاکستان بننے سے پہلے بھی بہت زیادہ تھی اور پاکستان بننے کے بعد تو اس میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہماری بیشتر حکومتوں نے اس علاقے کی افادیت کبھی شدت سے محسوس نہیں کی۔ اس خطے پر تشکیل پاکستان کا کس قدر دارومدار تھا اور ہندو اور انگریز یہاں کیا عزائم رکھتے تھے، اس کا صحیح اندازہ وہاں کے تاریخی اور سیاسی حالات کا جائزہ لیے بغیر ناممکن ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے بلوچستان دو بڑے حصوں میں منقسم تھا۔ ریاستیں اور برٹش بلوچستان۔ ریاستوں میں قلات، خاران، لسبیلہ اور مکران کے علاقے شامل تھے۔ سب سے وسیع علاقہ ریاست قلات کے پاس تھا۔ یہ ریاست رقبے، اثرونفوذ اور اہمیت کے اعتبار سے ہندوستان کی دوسری بڑی ریاست تھی یعنی حیدرآباد دکن کے بعد اس کا نمبر آتا تھا۔ خان آف قلات، احمد یار خاں مدبرانہ شخصیت کے مالک تھے۔ مطالعے کا بے پناہ شوق تھا۔ ذہن، خیالات اور افکار سلجھے ہوئے تھے۔ اپنی صاف ستھری زندگی کے حوالے سے کوئی

والی ء ریاست ان سے بہتر تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ پہلے والی ء ریاست تھے جنہوں نے 1939ء اور 1940ء کے لگ بھگ قائداعظم کو ریاست میں آنے کی دعوت دی اور انہیں سرکاری مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا تھا۔ نواب قلات کے بارے میں عام تاثر یہ پایا جاتا تھا کہ وہ مشیر رکھتے ہیں۔ چاروں ریاستوں میں بلوچیوں کی کثرت تھی۔ ریاست مکران کے ساتھ ساتھ چھ سومیل کا ساحل دور تک چلا گیا تھا۔ برٹش بلوچستان بھی دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ کوئٹہ جسے انگریزوں نے 1884ء میں خان قلات سے لیا تھا بڑی حد تک بین الاقوامی شہر بن گیا تھا۔ یہاں یو پی، بہار اور دوسرے ملکوں کے باشندے کاروباری اور دوسری سرگرمیوں کی وجہ سے آباد تھے۔ اس رنگارنگی کی وجہ سے کوئٹہ سیاسی خدوخال میں باقی تمام برٹش بلوچستان سے جدا نظر آتا تھا۔ کوئٹہ کے علاوہ بھی کئی علاقے انگریزوں نے خان قلات سے مستعار لے رکھے تھے۔ ان میں بولان، نصیر آباد، ضلع چاغی خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ ان علاقوں میں زیادہ تر بلوچ بستے تھے۔ یہ سب کے سب خان قلات کے پوری طرح وفادار تھے۔ ان علاقوں کے سوا باقی برٹش بلوچستان میں پٹھانوں کی کثرت تھی۔ اس اعتبار سے تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ بلوچ اور اسی قدر پٹھان بلوچستان (ریاستوں کے ساتھ) آباد تھے۔ برٹش بلوچستان کا انتظامی اور سیاسی سربراہ اے جی جی کہلاتا تھا اور ہر ضلع میں پولیٹیکل ایجنٹ نظم ونسق کا ذمہ دار تھا۔ ریاستوں اور برٹش بلوچستان کے اہم معاملات میں شاہی جرگہ فیصلے کرتا تھا۔ اس جغرافیائی پس منظر کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور سیاسی اثرات بھی ملحوظ رکھنے ضروری ہیں۔

بلوچ قبائل

بلوچوں میں سب سے زیادہ گہرے اثرات خان قلات کے تھے۔ کوئی بلوچ قبائل ان کی منشا کے خلاف جانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ بڑے بڑے بلوچ قبائل یہ ہیں:

مری قبیلہ:

پاکستان بننے سے پہلے اس کے سردار اعلیٰ دوداخاں مری تھا۔ اس قبیلے کا جدامجد دوداخاں قبیلے کا مثالی کردار بن گیا تھا۔ قبیلے میں مشہور تھا کہ ایک بار انگریزوں کا دربار لگا۔ اس میں وائسرائے آیا ہوا تھا۔ قبیلوں کے سرداروں کو انگریزوں کی طرف سے حکم ملا کہ وہ بگھی میں جت جائیں اور اسے کھینچیں۔ دوداخاں نے بگھی کھینچنے سے انکار کر دیا اور انگریزوں کے خلاف بغاوت کردی۔ مری قبیلہ اس روایت پر فخر کرتا ہے۔

بگٹی:

یہ قبیلہ بھی بڑا اہم ہے۔ اس وقت اس کا سردار جمال خاں بگٹی تھا۔ اسے 1850ء کے لگ بھگ قتل کردیا گیا۔ اب اکبر خاں بگٹی اس قبیلے کا سردار ہے۔

جمالی:

یہ قبیلہ سندھ اور بلوچستان کی سرحد پر آباد ہے اس کے سب سے مؤثر فرد میر جعفر خاں جمالی تھے جنہوں نے بلوچستان اور سندھ کی سیاست میں عظیم الشان کردار ادا کیا۔ رند، نجرانی، مگسی، گولا کھوسا خاصے اہم قبیلے ہیں۔ اس وقت سب سے بے اثر قبیلہ مینگل تھا۔ عطاء اللہ مینگل اسی قبیلے سے ہیں۔

پٹھانوں کے قبائل

بلوچوں کی طرح بلوچستان میں پٹھانوں کے بھی متعدد قبائل ہیں مگران میں سب سے مضبوط قبیلہ کاکڑ ہے۔اس قبیلے کے کئی سردار تھے۔ان سرداروں میں نواب یار محمد خاں جوگیزئی کا نام تاریخ میں دمکتا رہے گا۔اس قبیلے کے تین لاکھ افراد پاکستان میں اور پانچ لاکھ افغانستان میں آباد ہیں۔پٹھانوں میں نواب جوگیزئی کے علاوہ اس وقت سردار عثمان، سردار غلام محمد خاں ترین، ارباب عمر خاں کانسی اور سردار میر اعظم خاں کانسی با اثر شخصیتیں تھیں اور ان کے گرد بلوچستان کی سیاست گھومتی تھی۔

اس سیاسی اور تاریخی ماحول میں بلوچستان کا اہم ترین ڈرامہ ابھرتا ہے۔اس ڈرامے سے پہلے عجیب وغریب واقعات پیش آئے۔جن دنوں قائداعظم کے روابط نواب قلات سے قائم ہوئے تقریباً اسی زمانے میں میر جعفر خاں جمالی نے قائداعظم سے رابطہ قائم کیا۔انگریزوں نے جمالی قبیلے کی اڑھائی لاکھ ایکڑ زمین پر قبضہ کرلیا۔جعفر خاں جمالی اس وقت لڑکپن کی حدود میں تھے،تاہم وہ انگریزوں کے خلاف مقدمہ لڑتے رہے۔ہائی کورٹ میں جمالی جیت گئے۔حکومت ہند پریوی کونسل میں چلی گئی۔اس مرحلے پر جمالی صاحب قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مقدمے کی پیروی کے لئے درخوست کی۔ قائداعظم نے فرمایا میں لندن جا رہا ہوں اور کوئی فیس لیے بغیر پریوی کونسل میں تمہارا مقدمہ لڑوں گا۔قائداعظم کے پیش ہونے سے پہلے ہی پریوی کونسل نے مقدمے کا فیصلہ حکومت ہند کے حق میں کر دیا۔جعفر خاں جمالی پر قائداعظم کے حسن اخلاق کا بہت اثر ہوا اور اس وجہ سے قائداعظم، جمالی قبیلے کے دلوں پر حکومت کرنے لگے۔انہی تعلقات کی بنا پر قائداعظم فرمایا کرتے تھے ”بلوچستان میرا اپنا صوبہ ہے۔“

ایک طرف میر جعفر خاں جمالی، قائداعظم پر جان چھڑکتے تھے اور دوسری طرف کوئٹہ میں مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی جس کی صدارت قاضی عیسیٰ کے حصے میں آئی۔یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ کوئٹہ پورے برٹش بلوچستان سے الگ تھلگ شہر تھا۔اس اعتبار سے کوئٹہ کی

مسلم لیگ، بلوچوں اور پٹھان سرداروں پر کوئی اثر نہ رکھتی تھی۔بلوچستان کی ساری سیاست سرداروں کے ہاتھ میں تھی اور یہ عجیب بات تھی کہ سردار 80 فیصد اپنے قبائل کے صحیح نمائندے تھے اور بیشتر سیاسی اعتبار سے بڑے باشعور تھے۔برٹش بلوچستان میں کانگریس کے اثرات بھی موجود تھے اور عبدالصمد خاں اچکزئی (ایک پٹھان سردار) کانگریس کے صدر تھے۔کانگریس کے علاوہ تنظیم وطن اور لوکل ایسوسی ایشن اور قلات نیشنل پارٹی تین خاص اہم تنظیمیں تھیں۔ان تنظیموں میں کانگریسی رجحانات بڑے قوی تھے۔

سازشوں کا آغاز

انگریز بلوچستان کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے اور ان کے عزائم اس خطے میں حد درجہ خطرناک تھے۔ڈی وائی فل کوئٹہ کے پولیٹیکل ایجنٹ تھے اور ان کے تحت حاجی جہانگیر جو نواب جوگیزئی کے صاحبزادے ہیں اور بعد ازاں بہاولپور میں بنیادی جمہوریت کے ڈائریکٹر بنے، اس وقت اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔یہ 1946ء کا بالکل آغاز تھا۔ایک دن مسٹر فل نے جہانگیر خان صاحب سے کہا ”ہم برما اور لنکا کی طرح بلوچستان کو ایک علیحدہ حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ہم ہندوستان سے اپنی فوجیں ہٹا کر بلوچستان میں لے آئیں گے۔یہ علاقہ روس کے خلاف ہمارا ایک مضبوط اڈہ (Base) ہوگا۔“

مئی 1946ء میں کیبنٹ مشن کا اعلان ہوا۔اس میں دستور ساز اسمبلی قائم کرنے کا جو منصوبہ پیش ہوا اس میں بلوچستان کو نمائندگی نہیں دی گئی تھی۔بعد میں کانگریس اور مسلم لیگ کے شدید اصرار پر ایک رکنی نمائندگی کا اعلان ہوا۔انگریزوں کی طرف سے پس وپیش واضح مقاصد رکھتی تھی۔بلوچستان کے ریاستی اور برطانوی علاقوں میں سرداروں کی حیثیت سیاسی جماعتوں سے زیادہ طاقتور تھی۔ان سرداروں کی بڑی اکثریت مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں گہری دلچسپی لیتی تھی لیکن چونکہ مسلم لیگ کی قیادت قاضی عیسیٰ کے ہاتھ میں تھی اور قاضی

عیسیٰ کسی قبیلے کے سردار نہ تھے، اس لئے یہ سردار مسلم لیگ میں شامل ہونے کو تیار نہ ہوئے۔
میر جعفر خاں جمالی خاموشی سے مسلسل بلوچ سرداروں میں پاکستان کے لئے کام کر رہے تھے۔ چنانچہ 1945ء میں سبی دربار کے موقع پر سرداروں کی طرف سے قائداعظم کی خدمت میں تار بھیجا گیا جس میں اپنی حمایت کا پورا پورا یقین دلایا گیا تھا۔ اسی طرح ایک اور موقع پر ان سرداروں کی طرف سے ایک وفد قائداعظم سے ملنے کے لئے دہلی گیا اور انہیں بلوچستان آنے کی دعوت دی۔ اب بلوچستان میں سیاسی صورتحال یہ تھی:

1. قاضی عیسیٰ مسلم لیگ کے صدر تھے اور وہ میر جعفر خاں جمالی کو اپنا حریف سمجھتے تھے۔
2. عبدالصمد خاں اچکزئی کانگریس کے صدر تھے اور ان کا تعلق پٹھان قبیلے سے تھا، اس لئے وہ بھی میر جعفر خاں جمالی کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔
3. خان آف قلات بلوچ قبائل میں سب سے مؤثر قوت تھے۔ میر جعفر خاں جمالی سے ان کے تعلقات بہت گہرے اور مستحکم تھے اور یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ خان آف قلات بھی سیاسی عزائم رکھتے ہیں۔

اس پیچیدہ صورتحال نے بلوچستان کے مسائل کو بہت نازک اور سنگین بنا دیا تھا۔ قاضی عیسیٰ چونکہ کسی قبیلے کے سردار نہ تھے، اس لئے انہوں نے سرداروں کے خلاف مہم شروع کر دی۔ وہ یہ محسوس نہ کر سکے کہ سرداروں کی بڑی تعداد مسلم لیگ کے لئے ہمدردی کے جذبات رکھتی ہے۔ ادھر یہ فیصلہ ہوا کہ دستور ساز اسمبلی کے لئے ممبر کا انتخاب شاہی جرگہ کرے گا۔ اس اعلان نے ایک اور خوفناک سازش کو جنم دیا۔

شاہی جرگے میں ریاستوں کے سردار بھی شامل تھے، اس میں بلوچوں کی اکثریت تھی۔ عبدالصمد خاں اچکزئی یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بلوچی غلبے کی موجودگی میں کانگریس کے لئے کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ سنا ہے انہوں نے قاضی عیسیٰ کو اپنے ساتھ ملایا اور ان سے کہا کہ اگر ہم شاہی جرگے سے بلوچی اکثریت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو دستور ساز اسمبلی کے انتخاب میں آپ سے تعاون کروں گا۔ بلوچی اثرات ختم کرنے کا دوسرا فائدہ انہیں یہ نظر آیا کہ اس طرح میر جعفر خاں جمالی بلوچستان کی سیاست سے بے دخل کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ قاضی عیسیٰ خان

قلات سے ملے اور انہیں یہ نکتہ سمجھایا کہ ان کے سرداروں کو برٹش بلوچستان کے معاملے میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کا مسئلہ برٹش بلوچستان کا مسئلہ ہے۔ اس طرح جب ریاستوں کا مسئلہ آئے گا تو برٹش بلوچستان کے سردار ریاستوں کے معاملات میں دخل نہیں دیں گے۔ چنانچہ خان قلات نے اے جی جی کو ایک درخواست دی جس میں کہا گیا تھا کہ شاہی جرگے میں سے قلات کے سرداروں کو نکال دیا جائے گا۔ انگریز تو یہ چاہتے ہی تھے چنانچہ شاہی جرگے میں سے ریاستی سرداروں کو خارج کر دیا گیا۔ اب شاہی جرگے کی تعداد 53 رہ گئی۔ اس میں 12 میونسپل کمیٹی کے غیر سرکاری اراکین بھی شامل کر لیے گئے۔ اس طرح کل تعداد 65 ہو گئی۔

اس فیصلے کا ان لوگوں پر بہت برا اثر ہوا جو پاکستان کے لئے کام کر رہے تھے۔ میر جعفر خاں جمالی نے بلوچ سرداروں میں پاکستان کے لئے راہ ہموار کر رکھی تھی، مگر اب یہ ساری محنت رائیگاں ہوتی نظر آتی تھی۔ پٹھان قبائل میں ابھی تک کچھ زیادہ کام نہ ہو سکا تھا۔ آخری وقت پر عبدالصمد خاں نے قاضی عیسیٰ کو دغا دیتے ہوئے خود انتخاب لڑنے کا اعلان کر دیا۔ یہ وقت پاکستان کے لئے جدوجہد کرنے والوں پر بڑا سخت گزرا۔ میر جعفر خان جمالی بہت پریشان تھے۔ انہیں کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسے موقع پر پاکستان دوست قوتوں کی نظر نواب جوگیزئی کی طرف اٹھی۔ وہ کاکڑ قبیلے کے بااثر سردار تھے، لیکن ان کے تعلقات سبھی لوگوں کے ساتھ تھے۔ عبدالصمد خاں اچکزئی کا بھی ان پر اچھا خاصا اثر تھا۔ میر جعفر جمالی نہایت نازک صورتحال کے پیش نظر خود نواب جوگیزئی کے پاس پہنچے۔ بلوچ اور پٹھان ہونے کی وجہ سے ان میں فاصلے موجود تھے مگر تصور پاکستان نے انہیں ایک ہی منزل کا راہی بنا دیا تھا۔ یہ دونوں قائدین بڑی دیر تک محو گفتگو رہے۔ گفتگو کے دوران میں طرح طرح کے خطرناک موڑ آئے۔ عبدالصمد خاں کی حکمت عملی یہ تھی کہ ایک سے زیادہ سردار کھڑے ہوں تاکہ شاہی جرگے کے ووٹ بٹ جائیں اور ان کی کامیابی کا راستہ نکل آئے۔ نواب جوگیزئی کے اقرار اور انکار پر بلوچستان کی سیاسی قسمت کا صحیح یا غلط فیصلہ ہونا تھا۔ اس موقع پر حاجی جہانگیر خاں نے اپنے والد پر بہت دباؤ ڈالا اور آخر کاری میر جمالی، جہانگیر خاں اور نسیم حجازی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ نواب جوگیزئی نے انتخابات

میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔

قاضی عیسیٰ کی شکست یقینی تھی چنانچہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ مسلم لیگ کسی ایسے انتخاب میں حصہ نہیں لے گی جس میں ووٹ ڈالنے والے رجعت پسند سردار ہوں گے۔ وہ یہ اعلان کر کے دہلی چلے گئے۔ شاہی جرگہ کئی ٹولیوں میں بٹا ہوا تھا۔ پاکستان کے سپاہی محاذ پر نکل کھڑے ہوئے اور ایک ایک سردار کو کانگریس کے خطرناک عزائم سے آگاہ کیا۔ انگریزوں کی ریشہ دوانیاں بھی کام کر رہی تھیں۔ جوں جوں انتخاب کے دن قریب آتے گئے کانگریس نے سیم وزر لٹانا شروع کر دیا۔ یہ بہت ہی خوفناک حربہ تھا۔ اس حربہ کو غیر مؤثر بنانے کے لئے پاکستان دوست طاقتوں نے تدبیریں شروع کیں۔ نسیم حجازی نے تجویز پیش کی کہ انتخابات کی تاریخ سے چند روز پیشتر سرداروں کے وفد کو اے جی جی سے ملنا چاہئے۔ وفد اے جی جی کی موجودگی میں نواب جوگیزئی کے حق میں اپنی حمایت کا اعلان کرے۔ یہ تجویز کارگر ثابت ہوئی۔ بے پناہ کوششوں سے چالیس سرداروں نے نواب جوگیزئی کی حمایت کے اعلان پر دستخط کر دیئے اور پھر یہ سردار اے جی جی سے ملنے گئے۔ اس حمایت کی خبر ''تنظیم'' میں چھپ گئی اور اس کا یہ اثر ہوا کہ کانگریس کو اپنے عزائم پورا کرنے کا موقع نہ ملا۔ انتخابات سے کئی روز پہلے نامزدگی کا فیصلہ ہوا۔ 65 اراکین میں سے 40 اراکین واضح اکثریت تھے۔ عبدالصمد خاں کو جو کانگریس کی طرف سے امیدوار تھے، کو 10 سے زیادہ ووٹ نہ ملے۔

''تنظیم'' ہفت روزہ تھا۔ اس کے تمام مصارف میر جعفر خاں جمالی برداشت کرتے تھے۔ اس کے ایڈیٹر نسیم حجازی تھے۔ تنظیم نے بلوچستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ بظاہر یہ ہفت روزہ تھا، لیکن اس کے ضمیمے بعض اوقات دن میں کئی بار نکلتے تھے۔ عبدالصمد خاں کی ترجمانی ہفت روزہ ''استقلال'' کرتا تھا۔ نواب جوگیزئی کی فتح پاکستان دوست قوتوں کی عظیم الشان کامیابی تھی۔

اپریل 1947ء میں پریشان کن واقعات کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا۔ قاضی عیسیٰ صرف سال میں ایک بار مسلم لیگ کا جلسہ دھوم دھام سے بلاتے تھے۔ وہ چونکہ کوئٹہ کی ایک اہم انجمن، انجمن اسلامیہ کے جنرل سیکرٹری بھی تھے اس لئے وہ سال کے سال مسلم لیگ

کے صدر منتخب کر لیے جاتے۔ قاضی صاحب نے مسلم لیگ کے ایسے ایسے عہدیدار اپنے ارد گرد اکٹھے کیے جن کو بلوچستان میں احترام کی نظر سے نہ دیکھا جاتا تھا۔ اپریل 1947ء میں بھی انہوں نے مسلم لیگ کا جلسہ منعقد کیا۔ اس بار خلیق الزمان صاحب کو کوئٹہ آنے کی دعوت دی گئی۔ میکمون پارک میں جلسہ ہوا۔ قاضی عیسیٰ نے بڑے پرجوش لہجے میں کہا: ''انگریز یہاں سے رخصت ہونے والے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تمام سردار جو دراصل انگریزوں کے بچے ہیں، وہ بھی یہاں سے رخصت ہو جائیں۔''

اس شعلہ بار تقریر کے بعد قاضی صاحب نے انگریزوں سے اقتدار وصول کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی بنا دی۔ اس کمیٹی کے افراد کچھ نہ پوچھئے، کیا تھے۔ انہوں نے پہلے ہی اجلاس میں اپنے تمام اختیارات قاضی عیسیٰ کو سونپ دیئے۔ اس طرح قاضی صاحب اپنے آپ کو بلوچستان کا وزیر اعظم تصور کرنے لگے۔ قاضی عیسیٰ کی تقریر نفرت کا دھماکہ ثابت ہوئی۔ شاہی جرگہ بپھر گیا۔ اس نفسیاتی فضا میں عبدالصمد خان کو کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے اس روز بڑے بڑے سرداروں سے ملاقاتیں کیں اور ان کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ ہم جناح کے پاس بھی جائیں گے اور نہرو کے پاس بھی۔ جو بھی ہماری شرائط مان لے گا، ہم سب اسی کا ساتھ دیں گے۔

قاضی عیسیٰ کی تقریر پر بلوچستان میں شدید ردعمل ہوا۔ ایک طرح کی آگ سی لگ گئی۔ اس صورتحال سے پاکستان کے شیدائی سخت پریشان ہوئے۔ چنانچہ نسیم حجازی اور جہانگیر خان نے خلیق الزماں سے ملاقات کا وقت لے لیا۔ ملاقات کا وقت چار بجے شام مقرر ہوا۔ یہ دونوں خلیق الزماں صاحب سے ملنے کے لئے قاضی عیسیٰ کی اقامت پر گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ قاضی عیسیٰ اور خلیق الزمان، اے جی جی سے ملنے چلے گئے ہیں۔ قاضی عیسیٰ کی تقریر سے ریاست قلات میں ایک نئی ذہنی رو چل نکلی۔ موقع پرست عناصر نے بلوچ سرداروں میں یہ فتنہ اٹھایا کہ اگر ریاست قلات نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تو ان کی زندگی قاضی عیسیٰ سے وابستہ ہو جائے گی اور قاضی عیسیٰ سرداری نظام کو تہس نہس کر دیں گے، اس لئے آزاد بلوچ ریاست کا قیام ضروری ہے۔ خلیق الزماں صاحب کو اس نازک صورتحال سے باخبر رکھنے کے لئے ایک تفصیلی خط لکھا گیا جسے خان عبدالخالق خاں نے

ہوائی اڈے پر خود خلیق الزماں صاحب کو دیا مگر چودھری صاحب پوری طرح قاضی عیسیٰ کے قبضے میں تھے۔ عبدالخالق خاں بڑے کام کے آدمی تھے وہ بلوچوں اور پٹھانوں کے درمیان رابطے کی حیثیت رکھتے تھے۔

قاضی عیسیٰ نے بگڑتی ہوئی صورتحال کا ذرا احساس نہ کیا بلکہ ایسے اقدامات شروع کردیئے جن سے آگ اور بھڑک اٹھی۔ انہوں نے سرداروں کے خلاف مہم اور تیز کردی اور ایک شخص گل محمد خاں کی قیادت میں ایک ٹولی کو بلوچ سرداروں کے خلاف تقریریں کرنے کے لئے بلوچی علاقوں میں بھیج دیا۔ گل محمد خاں پٹھان تھے۔ ان کے آنے کی خبر سنی تو بلوچ قبائل غیظ وغضب سے پاگل ہو گئے۔ دراصل قاضی صاحب، گل محمد خاں کے ذریعے میر جعفر خاں جمالی پر کاری ضرب لگانا چاہتے تھے۔ جمالی صاحب اس روز کوئٹہ میں تھے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ گل محمد خاں ہمارے علاقے میں جا رہا ہے تو وہ اپنے علاقے نصیرآباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ گل محمد خاں اور اس کے ساتھی بلوچی علاقوں سے گزر رہے تھے کہ کسی بلوچ نے گل محمد خاں کو گولی ماردی۔ یہ خبر بجلی کی طرح سارے بلوچستان میں پھیل گئی۔ کوئٹہ میں کہرام مچ گیا۔ قاضی عیسیٰ نے اس موقع پر ایک جلسہ عام کیا اور اس میں دھمکی دی کہ ہم بلوچوں سے انتقام لے کے رہیں گے۔ یہ بڑا پرآشوب وقت تھا۔ جذبات اُبھرے ہوئے تھے۔ تقریروں نے سارے ماحول کو سوگوار اور دلخراش بنا دیا تھا۔ مقررین نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ میر جعفر خاں جمالی کو فوراً گرفتار کر کے پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔ گل محمد خاں شہید کے نعرے لگتے رہے۔ شہر میں مکمل ہڑتال رہی۔ اس قدر ہجوم پہلے کسی جلسے میں نہ دیکھا گیا تھا۔

بلوچستان میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ اس موقع پر نسیم حجازی اور خان عبدالخالق خاں، خان قلات سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے۔ ان کی رائے میں خان قلات ہی اس صورتحال پر قابو پا سکتا تھا۔ اگر اس موقع پر وہ خاموش رہتا تو پٹھانوں اور بلوچوں میں جنگ چھڑ جانا بالکل یقینی تھا۔ دوسری طرف اگر حکومت میر جعفر خاں جمالی کو گرفتار کر لیتی تو بلوچ قبائل بھڑک اٹھتے اور ساتھ ہی ساتھ پاکستان کا راستہ بند ہو جاتا۔ خان قلات بلوچوں کو قابو میں رکھ سکتا تھا اور انگریز حکام سے بھی اس کے روابط بہت گہرے

تھے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات خان قلات کو تازہ ترین صورتحال سے باخبر رکھنے کے لئے گئے۔ قلات وہاں سے 90 میل کی مسافت پر تھا۔ گرمی سے برا حال ہو رہا تھا۔ وہ ابھی قلات سے پندرہ میل کے فاصلے پر تھے کہ کار سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ قاضی عیسیٰ کی کار تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ قاضی عیسیٰ تقریر ختم کرتے ہی قلات کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ ان کا قلات آنا کئی نئے فتنے جگا سکتا تھا۔ خان عبدالخالق اور نسیم حجازی، خان قلات سے ملے۔ خان نے وعدہ کیا وہ اے جی جی سے ابھی ملتے ہیں اور میر جعفر خاں جمالی گرفتار نہیں کیے جائیں گے۔

ایک اور سازش

یہ مئی 1947ء کے آخری دن تھے۔ حکومت نے جمالی کو گرفتار نہیں کیا تاہم قاضی عیسیٰ کے خلاف سرداروں میں شدید نفرت پیدا ہو گئی اور پاکستان کے لئے کام کرنا بہت دشوار ہو گیا۔ پاکستان کے لئے سردھڑ کی بازی لگانے والے صورتحال کو خوشگوار بنانے کی کوششوں میں مصروف تھے کہ ان پر ایک اور بجلی گری۔ 3 جون کو ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان اور پاکستان کو آزادی دینے کا اصول تسلیم کر لیا تھا۔ اس اعلان میں یہ شق بھی موجود تھی کہ بلوچستان کا فیصلہ شاہی جرگے کے ارکان کریں گے۔ یہ انگریزوں کی دوسری بڑی سازش تھی۔ سرحد اور سلہٹ میں ریفرنڈم ہونا قرار پایا تھا، مگر بلوچستان کو ایسے عالم میں شاہی جرگے کے سپرد کر دیا گیا۔ جب وہ مسلم لیگ سے سخت بدظن تھا یعنی 65 مشتعل ارکان کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ان کا نمائندہ بھارت کی دستور ساز اسمبلی میں بیٹھے یا پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں۔ کیسے نازک موقع پر کس قدر بھیانک چیلنج۔ شاہی جرگے کے بگڑے ہوئے ارکان کو بڑی آسانی سے فریب دیا جا سکتا تھا۔ انگریزوں کے لئے بھی راستہ کھلا تھا اور کانگریس کے لئے بھی۔ نئے حالات سے گھبرا کر قاضی عیسیٰ دہلی چلے گئے۔

3 جون کے اعلان سے عبدالصمد خاں اچکزئی کا چہرہ فرط مسرت سے دمک اٹھا۔

شاہی جرگے کی اس وقت ذہنی کیفیت یہ تھی:

1. بڑی اکثریت قاضی عیسیٰ کی تقریر سے برہم تھی۔
2. شاہی جرگے میں ابھی تک ایسے سردار موجود تھے جو یہ سمجھتے تھے انگریزوں کا رخصت ہونا ایک افسانہ ہے، انہیں کون نکال سکتا ہے۔
3. ایک طبقہ واضح طور پر پاکستان کے حق میں تھا۔
4. چند سردار، خان قلات کے اس حد تک وفادار تھے کہ وہ صرف قلات کے بارے میں سوچ سکتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم ان کے ذہن میں سماتی ہی نہ تھی۔
5. ایک اقلیت ان سرداروں کی بھی تھی جو کانگریس کے پراپیگنڈے سے خاصے متاثر تھے۔
6. کوئٹہ میں میونسپل کمیٹی کے 12 ارکان میں سے 3 ہندو تھے۔

ان حالات میں کام کرنا بڑا دشوار تھا۔ 29 جون کو شاہی جرگے کے ارکان فیصلہ کرنے والے تھے۔ صرف 26 دن کی مہلت تھی اور واقعات دریائے سندھ کے پرشور طوفان کی طرح تند و تیز تھے۔ ایک ایک لمحہ اہم بھی تھا اور بوجھل بھی۔ تاہم باہمت لوگوں نے آخری معرکے میں سردھڑ کی بازی لگانے کا عزم کر لیا۔

مسعود کا ورود:

قاضی عیسیٰ سیاسی چاند ماری سے حالات کو جس طرح زخمی کر گئے تھے، ان کا مداوا کچھ سہل نہ تھا۔ ماحول مخالف اور امیدیں ڈگمگا رہی تھیں۔ اس عالم میں قدرت نے زبردست مدد کی۔ مسٹر مسعود جو کبھی محکمہ اوقاف کے سربراہ بنے اور ان کے افکار و تصورات کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آتی ہیں، ان دنوں نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہ اتفاق سے کوئٹہ چلے آئے۔ ان کا آنا ایک عظیم الشان واقعہ ثابت ہوا۔ اس زمانے میں وہ اپنی دینی حمیت اور درویش صفت مزاج کی وجہ سے مسلمانوں میں بے حد مقبول تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود بلوچستان کی سیاست کے محور بن گئے۔ عوام میں یہ بات خود بخود پھیلتی گئی کہ مسعود صاحب، قائداعظم کے خصوصی نمائندے کی حیثیت سے آئے ہیں اور آئندہ بلوچستان کے اے جی جی مقرر ہوں گے۔ ان پھیلی ہوئی باتوں نے آگے چل کر

خاموش مگر فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

مسعود صاحب سے حاجی جہانگیر خاں، نسیم حجازی، میر جمالی اور نواب جوگیزئی کے روابط بہت جلد قائم ہو گئے۔ انہیں تشویشناک صورتحال سے آگاہ کیا گیا۔ قاضی عیسیٰ کی غیر محتاط اور غیر سیاسی تقریر کا فوری توڑ بہت ضروری تھا۔ طے پایا مسعود صاحب اس سلسلے میں غلام علی تالپور کو فون کریں گے کہ قائداعظم کو صحیح صورتحال سے مطلع کر دیا جائے۔ غلام علی تالپور صاحب سے رابطہ قائم ہوا۔ کہنے لگے میں قائداعظم سے بات کر کے رات کے نو بجے فون کروں گا۔ مسعود صاحب نے بلوچستان کے احباب سے کہا وہ رات کے نو بجے چند اہم سرداروں کو جمع کر لیں تاکہ ان کی موجودگی میں قائداعظم کا پیغام سنا جائے۔ ٹھیک نو بجے ٹیلی فون آیا اور دوسری طرف سے جناب تالپور بول رہے تھے۔ ''میں نے قائداعظم کو صورتحال سے باخبر کر دیا ہے۔ آپ ان سے براہ راست بات کر لیجئے۔''

اسی وقت قائداعظم کے نام پر کال بک کرائی گئی۔ تمام احباب پوسٹ آفس سپرنٹنڈنٹ ابراہیم علی خاں کے گھر پر جمع تھے۔ ابراہیم صاحب نے تشکیل پاکستان میں بڑا اہم مگر نہایت خاموش رول ادا کیا۔ رات کے ساڑھے دس بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ حاضرین سانس روکے بیٹھے رہے۔ عجیب شوق اور عجب اضطراب کا عالم تھا۔ قائداعظم کی آواز جونہی ابھرتی ٹیلی فون کٹ جاتا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک یہی ہوتا رہا۔ کبھی مسعود پوری قوت سے ہیلو کہتے اور کبھی جہانگیر خاں صاحب بلند آواز سے بولتے۔ وہ تھک جاتے تو نسیم حجازی صاحب ریسیور سنبھال لیتے۔ ایک نزع کا عالم طاری تھا۔ خبر نہیں قائداعظم کیا کہہ دیں۔ دو چار الفاظ سے زیادہ کچھ بھی نہ سنا جا سکا۔ اس رات قائداعظم سے بات نہ ہو سکی تاہم یہ فائدہ ہوا کہ مختلف سرداروں سے مسعود صاحب کے روابط قائم ہو گئے۔ ان سرداروں میں جمال خاں بگٹی، سردار عثمان، سردار امین اور دودا خاں مری بہت اہم تھے۔ ان روابط سے ژوب، سبی، لورالائی اور پشین کے قبائل پر نہایت اچھا اثر پڑا۔

دوسری طرف کانگریسی دام ہمرنگ زمین بچھانے میں مصروف تھی۔ ہندو مقاصد کے لئے کام کرنے والے کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ اگر کسی بلوچ سردار سے بات کرنا ہوتی تو ایک گروہ قلات نیشنل پارٹی کا لبادہ اوڑھ لیتا اور بلوچ سردار کی عصبیت جگانے

کی کوشش کرتا۔ اگر معاملہ پٹھان سردار کا ہوتا تو انجمن وطن کی طرف سے وفد جاتا اور اس کی عصبیت کو اپیل کرتا۔ کوئٹہ کے لوگوں سے بات کرنے کے لئے لوکل ایسوسی ایشن موجود تھی۔ کانگریس کا طریق کار ملاحظہ فرمایئے سب سے پہلے سرداروں کو ہندوستان میں شامل ہونے کی ترغیب دی جاتی، دلائل یہ ہوتے۔

☆ صرف ہندوستان، بلوچستان کے اخراجات برداشت کرسکتا ہے۔

☆ اگر بلوچستان نے ہندوستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تو آزاد بلوچستان قائم کردیا جائے گا۔

☆ بنیا لوگ پٹھانوں پر حکومت نہیں کر سکتے۔ لامحالہ پٹھان آزاد ہوں گے اور آزاد ہندوستان آزاد پٹھانستان کے قیام میں پوری مدد کرے گا۔

☆ اگر بلوچستان نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تو بلوچوں اور پٹھانوں کے حقوق پامال ہو جائیں گے۔

☆ خان قلات کے قائداعظم سے گہرے مراسم ہیں۔ اس اعتبار سے بلوچستان کے تمام اختیارات خان قلات کے ہاتھ میں ہوں گے اور خان قلات پٹھانوں کو کچل دے گا۔

☆ یہ بھی ہوسکتا ہے بلوچستان کے تمام اختیارات کسی پنجابی کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں وہ بلوچ اور پٹھان دونوں کو اپنا غلام بنا لے گا۔

ادھر کانگریس بلوچستان کو سر کرنے کی مہم میں مصروف تھی اور ادھر انگریز مسلمانوں کی جمعیت کو پارہ پارہ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ جہانگیر خاں صاحب نے اپنا ایک ایسا واقعہ سنایا جس سے انگریزوں کے عزائم بالکل بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"10 جون میری ملاقات چیف میڈیکل آفیسر مسٹر لے جارڈ سے ہوئی۔ ان دنوں مسٹر فل نوشکی میں پولیٹیکل ایجنٹ تھے۔ مسٹر لے جارڈ نے کہا، ہم قلات کو ایک علیحدہ مملکت دیکھنا چاہتے ہیں، تم اپنے قبائل کے ساتھ قلات چلے جاؤ وہاں تمہاری پوزیشن بہت مستحکم ہوگی۔ ریفرنڈم کے بعد مسٹر فل قلات ریاست کے وزیر خارجہ ہوں گے اگر تم قلات نہ جانا چاہو تو اپنے پٹھان قبائل پر مشتمل پٹھانستان قائم کرلو۔ ژوب، لورالائی، کوئٹہ، پشین، نوشکی اور سبی ضلع میں تمہارے قبائل موجود ہیں۔"

یہ تھیں بلوچستان میں انگریزوں کی بھیانک سازشیں۔ یہ سازشیں آگے چل کر اور زیادہ خطرناک صورت اختیار کرگئیں۔ عبدالصمد خاں صاحب ایک وفد لے کر نواب جوگیزئی کے پاس آئے۔ عبدالصمد خان اچکزئی اور نواب جوگیزئی چونکہ ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، اسی لئے نواب صاحب کو عبدالصمد خاں کی بات سننی ہی پڑی۔ عبدالصمد خاں اچکزئی نے کہا کہ نہرو صاحب اٹھارہ کروڑ روپے دینے کو تیار ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں نہرو صاحب کے ہاتھ کی تحریر لا دوں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کانگریس بلوچستان کی ترقی پر کروڑوں روپیہ خرچ کرنے کا وعدہ کرتی ہے۔ مکران ساحل پر ایک وسیع بندرگاہ تعمیر کرنے کا منصوبہ تیار کیا جا چکا ہے۔ یہ سبز باغ دکھانے کے بعد عبدالصمد خاں نے آخری وار کیا: "ہم جانتے ہیں پٹھان قبائل کی قسمت آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ قبائل کے مفادات سے غداری نہیں کریں گے۔"

اس گفتگو کے وقت نواب جوگیزئی کے صاحبزادے جہانگیر خاں بھی وہیں موجود تھے۔ انہوں نے عبدالصمد خاں اچکزئی کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا اور کہا "اگر ہمیں ورغلانے کے لئے دوبارہ آئے تو نتائج کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔" اس واضح رویے کی وجہ سے عبدالصمد خاں نے اس موضوع پر پھر کبھی براہ راست بات نہیں کی البتہ مختلف طریقوں سے وہ نواب صاحب کو صراط مستقیم سے ہٹانے کی کوشش کرتا رہا۔

ریفرنڈم کی تاریخ 29 جون قریب آتی جارہی تھی۔ پاکستان دوست قوتوں نے وہی تکنیک استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو تکنیک دستور ساز اسمبلی کے انتخابات میں استعمال کی جا چکی تھی یعنی آخری تاریخ سے پہلے ہی سرداروں کو اعلان کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک منصوبے کے تحت 20 جون کو ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں سرداروں کی بھاری جمعیت موجود تھی۔ اس جلسے کی کانگریس کو ایک دن پہلے اطلاع ہوگئی تھی اور اس نے جلسے کو سبوتاژ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پاکستان دوست احباب کو علم نہ ہو سکا۔ وقت معین پر ٹاؤن ہال میں بے پناہ ہجوم تھا۔ تماشائی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ سٹیج پر بھی وہ لوگ قابض ہو گئے جن کا تعلق "انجمن وطن" سے تھا۔ نواب جوگیزئی نے اس جلسے کی صدارت کی۔ مرزا فیض الرحمٰن جو پاکستان کے بارے میں شدید تذبذب کا شکار تھے، سٹیج

سے اعلان کرتے رہے کہ چونکہ مسئلہ بہت نازک ہے اس لئے اطمینان سے ہر بات سننی چاہئے۔

میر جعفر خاں جمالی نے پاکستان کی حمایت میں پر جوش تقریر کی۔ انہوں نے کہا ''ہم ایک آزاد مملکت کی بنیاد ڈالنے والے ہیں، ہم کسی قیمت پر بھی ہندوؤں کی غلامی اختیار نہیں کریں گے۔ ہم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ہتھیلی پر سر رکھ کر نکلیں گے۔''

قلات نیشنل پارٹی کے ایک رکن نے پاکستان کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا ''پاکستان کے مالی وسائل ہمارا بوجھ برداشت نہ کر سکیں گے۔ ہم فاقے مرنا نہیں چاہتے۔ پاکستان تو فاقستان ہوگا۔''

مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری عبدالغفور درانی نے وضاحت کے ساتھ پاکستان کا جیتا جاگتا نقشہ پیش کیا۔ ان کا موضوع پاکستان کی اقتصادیات تھا۔ نیشنل پارٹی کے ایک اور رکن پاکستان کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہے۔ سرحد کے مشہور وکیل ضیاء الدین بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے تقریر کرنا چاہی مگر ایک طبقہ چلا اٹھا ''آپ غیر ملکی ہیں، ہم آپ کی بات سننا نہیں چاہتے۔''

ہال میں ہر لحظہ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس شور و غوغا میں میر جعفر خاں جمالی نے اعلان کیا کہ اب صاحب صدر، سرداروں کا مشترکہ اعلان پڑھ کر سنائیں گے۔ نواب صاحب اٹھے، انہیں اس سے پہلے کبھی اس انداز کا جلسہ دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا، وہ گھبرا گئے۔ دوسری طرف پاکستان دشمن عناصر نے چلانا شروع کر دیا۔ نواب صاحب مشترکہ بیان نہ پڑھ سکے اور جلسہ افراتفری میں برخاست کر دیا گیا۔ ٹاؤن ہال کے واقعہ نے پاکستان دوست قوتوں کی کمر ہمت توڑ دی۔ وہ یہ گمان بھی نہ کر سکتے تھے کہ کانگریس کے حواری کوئٹہ میں اس قدر منظم ہو سکتے ہیں۔ اس ناخوشگوار واقعہ کا ایک فائدہ بھی ہوا۔ وقت سے پہلے معلوم ہو گیا کہ کانگریس کے اثرات کہاں کہاں کام کر رہے ہیں۔

ٹاؤن ہال میں کامیابی کے بعد کانگریس نے نواب جوگیزئی کے خلاف خفیہ اور اعلانیہ تحریک شروع کر دی۔ ایک گروہ جس کا اصل میں تعلق کانگریس سے تھا، مگر وہ اپنے آپ کو مسلم لیگ کے ساتھ ظاہر کر رہا تھا، نواب صاحب پر تنقید کرنے لگا۔ وہ اس بات پر بڑا

برہم تھا کہ نواب صاحب نے مشترکہ بیان کیوں نہ پڑھا۔ اس گروہ کا مقصد بالکل واضح تھا۔ وہ مسلم لیگ اور پاکستان دوست قوتوں میں نواب صاحب کے خلاف شکوک و شبہات پھیلانا چاہتا تھا اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا شاہی جرگہ کئی حصوں میں منقسم ہو گیا ہے اور اگر جلد کوئی تدارک نہ کیا گیا تو انتشار خطرناک صورت اختیار کرلے گا۔ دوسری طرف پاکستان دوست مجاہد سر جوڑ کر بیٹھے۔ نئی صورتحال نے ان کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ یہ طے پایا کہ کل لوکل ایسوسی ایشن کا اجلاس ہو رہا ہے (نواب جوگیزئی اس ایسوسی ایشن کے صدر تھے، غلبہ زیادہ تر کانگریس کا تھا) نواب صاحب اجلاس میں پاکستان کی قرارداد پیش کریں۔ اگر اس قرارداد کی مخالفت ہو تو وہ واک آؤٹ کر جائیں۔ اس طرح وہ افراد آنکھوں میں آ جائیں گے جو پاکستان کے مخالف ہیں۔

23 جون کے اجلاس میں نواب صاحب نے پاکستان کی حمایت میں قرارداد پیش کی۔ کانگریس اور نیشنل پارٹی نے قرارداد کی سخت مخالفت کی۔ غوث بخش بزنجو نیشنل پارٹی کے کرتا دھرتا تھے۔ ان کا شمار خان قلات کے مشیروں میں تھا اور یہ ان مشیروں میں سے تھے جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ خان قلات غلط قسم کے مشیر رکھتے ہیں۔ قرارداد کی مخالفت کے ساتھ ساتھ کانگریس نے نواب صاحب پر ایک اور وار کیا۔ لوکل ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا اور اس میں نواب صاحب (صدر) کے خلاف قرارداد عدم اعتماد منظور ہو گئی۔ حالات روز بروز تشویشناک ہوتے جا رہے تھے۔ یہی مناسب سمجھا گیا قائداعظم کی طرف سے ایک بیان حاصل کیا جائے جس میں قاضی عیسیٰ کی تقریر کے برعکس سرداروں کو پاکستان کی طرف سے پوری تائید و حمایت کا یقین دلایا جائے۔ نواب صاحب کی طرف سے مسعود صاحب نے قائداعظم کو تار دیا، تار میں یہ بھی لکھا تھا کہ وہ فون نمبر 672 پر رابطہ کریں۔ یہ جمالی صاحب کا فون نمبر تھا۔ ابراہیم علی خاں صاحب نے (سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس) ذمہ لیا کہ یہ تار من وعن جلد سے جلد دہلی پہنچا دیا جائے گا۔

پتے ہوا دینے لگے

دو محاذوں پر مسلسل شکست کے زخم ابھی تازہ تھے کہ اپنوں کی طرف سے ایک اور کاری وار ہوا۔ نسیم حجازی 24 جون کی صبح میر جمالی کے ہاں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک میلہ لگا ہے۔ پچاس ساٹھ کے قریب کاریں کھڑی ہیں اور چند کاریں روانہ ہو چکی ہیں۔ معلوم ہوا خان قلات نے دعوت دی ہے۔ قلات ریاست کے وزیراعظم منیرالدین اور پرنس عبدالکریم جس نے آگے چل کر بغاوت کی، وہاں موجود تھے۔ نصیر آباد اور نوشکی کے بلوچ سردار جا چکے تھے۔ میر جمالی بھی یہ کہہ کر روانہ ہو گئے کہ میں رات تک واپس آ جاؤں گا اور گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ سارے واقعات اس تیزی سے رونما ہوئے کہ جناب نسیم حجازی صاحب کچھ اندازہ ہی نہ کر سکے کہ کیا ہونے والا ہے۔ بلوچستان کی سیاسی زندگی کے نازک دورا ہے پر خان قلات کا یوں اچانک نمودار ہونا ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ اہل دل پر وہ دن پہاڑ سا گزرا۔ سازشوں کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے اور کچھ معلوم نہ تھا کونسی طاقت کیا گل کھلا دے۔

دوپہر کے وقت ایک بلوچ سردار ہانپتا کانپتا نواب جوگیزئی کے ہاں پہنچا۔ اس نے کہا میں اپنے طور پر ابھی ابھی قلات سے آیا ہوں وہاں سرداروں کا بہت بڑا اجتماع ہے۔ خان قلات پر تکلف دعوت کا اہتمام کر چکے ہیں، میں نے وہاں جس قسم کی باتیں سنیں ان سے پریشان ہو کر آپ کے پاس چلا آیا۔ خان قلات آزاد بلوچستان قائم کرنا چاہتے ہیں۔ تمام بلوچ سرداروں نے حلف اٹھایا ہے کہ قلات میں آزاد مملکت قائم کریں گے۔ میں نے ضروری سمجھا آپ کو اس سے آگاہ کروں۔ میرا خیال ہے جب بلوچ سردار ایک آزاد مملکت قائم کرنے کی تدبیریں کر رہے ہیں تو آپ آزاد پٹھانستان کے لئے کیوں کام نہیں کرتے۔ بلوچ سردار کبھی پاکستان کا ساتھ نہ دیں گے۔

نواب صاحب پر اس ملاقات کا برا اثر پڑا۔ وہ واقعی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ میر جعفر خاں جمالی بھی اس سازش میں شریک ہیں۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے اس کا

تذکرہ بھی کیا۔ ذہنی بنیادیں ہلتی جا رہی تھیں۔ جہانگیر خاں بھی حد درجہ مضطرب تھے۔ چند احباب نے اس نئی صورتحال پر سوچ بچار کرنا شروع کیا اور جلد ہی یہ نکتہ سمجھ گئے کہ سردار ایک سازش کے تحت آیا ہے۔ یہ سازش کانگریس نے کی ہے۔ وہ جعفر خاں جمالی اور نواب جوگیزئی کے تعلقات ہر قیمت پر خراب کر دینا چاہتی ہے۔ نواب صاحب کے سامنے جب پورے واقعہ کا تجزیہ آیا تو ان کی بے چینی میں قدرے کمی ہوئی۔ اس کے باوجود ان کے سینے میں دل بری طرح دھڑکتا رہا۔ جہانگیر خاں بات سمجھ گئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ میں ہر وقت والد صاحب کے ساتھ رہوں گا تاکہ غلط لوگ انہیں پریشانیوں میں مبتلا نہ کر سکیں۔

رات کے 11 بجے میر جمالی واپس آئے، ان کی غیر موجودگی میں نواب جوگیزئی اور دوسرے احباب کے ذہنوں میں ہزاروں سوال اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ چند شکستہ دل یہ یقین کر بیٹھے تھے کہ جعفر خاں جمالی نے ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ شام کے وقت نسیم حجازی، نواب جوگیزئی سے ملنے گئے وہ سخت پریشان تھے۔ انہوں نے جذبات آمیز لہجے میں کہا: ”یہ کیا مصیبت ہے، کل تک پاکستان بن رہا تھا اور آج کوئی بلوچ سلطنت بنا رہا ہے اور کوئی آزاد پٹھانستان کا فتنہ اٹھا رہا ہے۔ خدا کے لئے میر جعفر جمالی کو بلا کر لاؤ ورنہ کل تک کانگریس ہر سردار کے سر پر تاج رکھ دے گی۔“

میر جعفر جمالی رات کے 11 بجے قلات سے واپس آئے۔ سخت تھکے ہوئے اور چہرے پر تفکرات کی گرد۔ نسیم حجازی جو اُن کے اتالیق بھی تھے، انہیں نواب صاحب کے پاس اسی وقت لے گئے اور خود لپک کر مسعود صاحب کو بلانے چلے گئے۔ رات کے ایک بجے تک گلے شکوے ہوتے رہے۔ آخر طے پایا کہ دونوں قائدین پاکستان کی حمایت میں مشترکہ بیان جاری کریں گے۔ اس عرصے میں نصیر آباد اور نوشکی کے چند سردار بھی آ گئے تھے۔ وہ بیان کے بارے میں میر جمالی صاحب سے رات کے تین بجے تک بحث کرتے رہے۔ اس وقت تک نسیم حجازی صاحب مشترکہ بیان تیار کر چکے تھے۔ مسعود صاحب نے بیان پڑھا اور نواب صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ نواب جوگیزئی اور میر جعفر خاں جمالی نے دستخط ثبت کر دیئے۔ دوسرے روز میر جمالی کو کراچی جانا تھا وہاں سندھ اسمبلی کے اجلاس میں ان کی شرکت بہت ضروری تھی۔ پاکستان کے بارے میں سندھ اسمبلی کو فیصلہ صادر کرنا تھا۔

اس نازک موڑ پر جمالی صاحب کا سندھ اسمبلی سے غیر حاضر رہنا سخت تباہ کن ثابت ہوسکتا تھا چنانچہ وہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ مشترکہ بیان جلد سے جلد شائع ہو جانا چاہئے۔

خوفناک سازش

بیان کے شائع ہونے میں قدرے تاخیر ہوگئی اور اسی روز ایک اور سازش کا بم پھٹا۔ بلوچستان محکمہ اطلاعات کا ایک ہفت روزہ ''اخبار بلوچستان'' شائع ہوتا تھا۔ ریفرنڈم سے چار پانچ روز پہلے ''اخبار بلوچستان'' نے بلوچستان کی آمدنی اور اخراجات کے اعدادوشمار شائع کیے۔ ان اعدادوشمار سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ بلوچستان مالی اعتبار سے خسارے کا سودا ہے اور مرکزی حکومت کو ہر سال اس علاقے پر کروڑوں روپے خرچ کرنے ہوں گے اور یہ خسارہ بڑی مملکت ہی برداشت کرسکتی ہے۔ سرداروں میں یہ اعدادوشمار بڑے اہتمام سے پھیلائے گئے۔ انگریز حکام کی دلچسپیاں واضح طور پر سامنے آرہی تھیں۔ ایک انگریز حاکم نے نجی محفل میں کہا: ''ہم نے ساحل مکران سے لے کر فورٹ سنڈیمن کے پہاڑ اور نوشکی سے لے کر نصیر آباد تک ہندو سلطنت کے لئے راستہ ہموار کردیا ہے۔''

سازش کی کڑیاں ایک ایک کرکے ظاہر ہو رہی تھیں۔ بلوچستان کا ریفرنڈم پہلے تھا اور صوبہ سرحد کا بعد میں۔ انگریزوں کی سکیم یہ تھی کہ پہلے بلوچستان میں کام کیا جائے اور 65 ممبروں کو قابو میں کرنا کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ بلوچستان اگر بھارت میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیتا ہے تو اس کا اثر صوبہ سرحد پر بہت گہرا پڑے گا۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کی وزارت تھی اور بلوچستان کے فیصلے کے بعد اس کا فیصلہ بھی یقیناً بھارت کے حق میں ہوتا۔ ان فیصلوں سے ریاستوں کا متاثر ہونا بھی یقینی تھا۔ برٹش بلوچستان اور چار بلوچ ریاستوں کا رقبہ کل مغربی پاکستان کے رقبے سے تقریباً آدھا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ علاقہ پاکستان کے بجائے بھارت میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیتا تو پاکستان وجود میں نہ آتا۔ ہندو اور انگریز بلوچستان کی اس حیثیت سے پوری طرح باخبر تھے اور وہ سب سے پہلے اسی علاقے میں شبخون مارنے کی پوری تیاریاں کررہے تھے۔

پہلا معجزہ

ہندو اور انگریز خفیہ سازشوں کے علاوہ اعدادوشمار کا حربہ بڑی قوت سے استعمال کررہے تھے۔ عین اس نازک موقع پر قدرت نے ایک بار پھر مدد کی۔ مالیات کے زبردست ماہر زاہد حسین صاحب اسی روز کوئٹہ تشریف لائے۔ مسعود صاحب نے نواب جوگیزئی سے کہا کہ وہ زاہد حسین صاحب سے رابطہ قائم کرکے انہیں پاکستان کی معیشت پر گفتگو کرنے کے لئے آمادہ کریں۔ زاہد حسین صاحب فوراً آمادہ ہوگئے۔ اہم سردار بلائے گئے اور ان کے سامنے پہلے مسعود صاحب نے تقریر کی: ''ہندوستان کو اس بات کی فکر ہے کہ اگر زرخیز ترین علاقہ پاکستان میں چلا گیا تو وہ فاقوں مرجائے گا۔ مسلمانوں نے غربت یا مفلسی سے تنگ آکر کبھی غلط راستہ اختیار نہیں کیا۔ عرب صحرا تھا، کیا مسلمانوں نے فاقہ کشی کے خوف سے ایران اور روم کی غلامی قبول کرلی تھی؟''

اس کے بعد زاہد حسین صاحب نے پاکستان کی مالیات پر بڑی مدلل تقریر کی۔ سرداروں کے لئے ان کی باتیں سمجھنا خاصا مشکل تھا۔ تاہم خاموشی سے سنتے رہے۔ مسعود صاحب نے مقرر کو ٹوکتے ہوئے پوچھا: ''زاہد صاحب آپ یہ بتائیے کہ پاکستان کا اپنا سکہ ہوگا؟''

''ہاں ہاں، پاکستان کا اپنا سکہ ہوگا۔'' زاہد صاحب نے زور دیتے ہوئے کہا۔ اس پر ایک پٹھان سردار اٹھا اور پوری قوت سے چلایا: ''بھائیو! پاکستان کیسے غریب ملک ہوسکتا ہے۔ حکومت کو جس قدر پیسوں کی ضرورت ہوگی، اسی قدر نوٹ چھاپ لے گی۔''

اس مجمع میں ایسے لوگ بھی تھے جو ہندوستان کے لئے کام کررہے تھے۔ انہوں نے سرداروں کو اس بات میں الجھانا چاہا کہ نوٹ چھاپنے کے لئے سونے اور چاندی کے ذخائر ہونے چاہئیں اور پاکستان کے پاس ذخائر موجود نہیں اس پر ایک سردار گرم ہوگئے۔ ''آپ جب انگریزوں کا چھاپا ہوا نوٹ لیتے ہیں تو سونے چاندی کے بارے میں کبھی نہیں پوچھتے۔ آخر پاکستان کے بارے میں آپ لوگوں کو اس قدر تردد کیوں ہے؟''

اس نوک جھونک سے کانگریسی عنصر شکست کھا گیا اور انگریزوں کی سازش بڑی حد تک ناکام ہوگئی۔ ابھی یہ فتنہ پوری طرح دبنے نہ پایا تھا کہ سازشیوں نے ایک اور محاذ کھول دیا۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ نواب جوگیزئی اور میر جعفر خاں جمالی کا مشترکہ بیان شائع ہونے والا ہے۔ یہ خبر ان کے لئے وحشت اثر ثابت ہوئی۔ انہوں نے فوری طور پر ایک وفد نواب جوگیزئی کی طرف بھیجا، وفد کے اراکین نے نواب صاحب سے کہا کئی سردار پاکستان کی حمایت میں بیان دینا چاہتے ہیں ہم ان سے دستخط حاصل کر رہے ہیں، آپ ابھی بیان جاری نہ کیجئے۔ سرداروں کے دستخط بھی ہوں گے تو اس بیان کا اثر بڑھ جائے گا۔ نواب صاحب نے بڑی سادگی سے وعدہ کر لیا اور نسیم حجازی صاحب کو پیغام بھجوا دیا کہ ابھی بیان شائع نہ کیا جائے۔

شرمناک حرکت

اس پراسرار ماحول میں حالات ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے۔ شام کے وقت نواب صاحب، مسعود صاحب کے ہاں آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک تار تھا، کہنے لگے ابھی ابھی دہلی سے آیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں: ''میں آپ کا شکر گزار ہوں، آپ کے لئے دعا کرتا ہوں، بلوچستان کے بارے میں بیان دے چکا ہوں۔'' اس تار پر بھیجنے والے کا نام غائب تھا۔ یہ شرارت یقیناً کسی ہندو نے کی تھی اور اس کا مقصد شکوک وشبہات پیدا کرنا تھا۔ چند اصحاب اسی وقت ڈاکخانے گئے اور تار دہرانے کی درخواست کی مگر دہلی سے کوئی جواب نہ آیا۔ سرداروں کو یہ تار دکھایا گیا، مگر کانگریسی حضرات نے یہ کہہ کر اثر زائل کرنا چاہا کہ یہ تار قائداعظم کا نہیں، نہرو کا ہے۔

رات تک یہ افواہ سارے شہر میں پھیل چکی تھی کہ نواب جوگیزئی نے کانگریس کی حمایت کا فیصلہ کر لیا ہے اور آج ان کے نام نہرو کا تار آیا ہے۔ اس افواہ نے سخت افراتفری پیدا کی۔ شاہی جرگے میں زبردست انتشار پھیل گیا۔ نسیم حجازی اور مسعود صاحب نے

حالات کو تیزی سے بگڑتے دیکھا تو نواب جوگیزئی کے ہاں پہنچے۔ یہ رات کے 12 بجے کا وقت تھا۔ نواب صاحب سو چکے تھے تاہم جہانگیر خاں صاحب آواز سنتے ہی باہر آ گئے۔ انہیں بگڑتے ہوئے حالات سے آگاہ کیں۔ جہانگیر خاں بولے آپ بیان آج رات ہی شائع کر دیں۔ میں جانتا ہوں آج جو وفد آیا تھا وہ کانگریس نے بھیجا تھا۔ کانگریس نواب صاحب پر سخت دباؤ ڈال رہی ہے۔ آپ میری ذمہ داری پر بیان شائع کر دیجئے۔ میر جعفر خاں جمالی کراچی گئے ہوئے تھے اور حالات کے چیلنج میں شدت آتی جا رہی تھی۔ بیان شائع ہوگیا۔ اس پر نواب صاحب خاصے جز بز ہوئے۔ ان کا کہنا تھا سرداروں کے نام نہیں آئے اور وہ سخت برہم ہیں۔ میرے لئے انہیں سمجھانا مشکل ہو گیا ہے۔ طویل گفتگو کے بعد نواب صاحب قائل تو ہو گئے مگر شرح صدر حاصل نہ ہوا۔

چوٹ پر چوٹ

26 جون کو اطلاع ملی کہ چند اہم بلوچ سردار اکبر خاں بگٹی کے مکان پر جمع ہوئے ہیں اور وہ آزاد بلوچستان کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بگٹی قبیلے کا سردار جمال خاں بگٹی تھا اس کی تمام ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں اور وہی یہ خبر لے کر آیا تھا۔ اکبر خاں بگٹی کے تعلقات جمال خاں بگٹی سے سخت کشیدہ تھے اور اکبر خاں بگٹی پاکستان کے خلاف ذہن رکھتے تھے۔ یہ خبر بلاشبہ روح فرسا تھی۔ میر جعفر خاں جمالی کراچی جاتے وقت دودا خاں مری کو اپنا نائب مقرر کر گئے تھے۔ اکبر خاں بگٹی انہیں بھی بہلا پھسلا کر لے گئے اس طرح اس نئی سازش کو ناکام بنانے والا کوئی آدمی موجود نہ تھا۔ جمال خاں بگٹی کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ چند مضبوط سرداروں کے ساتھ اس میٹنگ میں جائیں اور وہاں پاکستان کی حمایت میں باتیں کریں۔ اس طرح تمام سرداروں کو ورغلانا آسان نہ رہے گا۔ ہر طرف سے دل ہلا دینے والی خبریں آ رہی تھیں۔ اس عالم مایوسی میں ایک اور دھماکہ ہوا۔ قاضی عیسیٰ دہلی سے تشریف لا رہے تھے۔ اس وقت ان کی آمد بلوچستان کے لئے ایٹم بم سے کم نہ تھی۔

سردار بھڑک اٹھیں گے اور پاکستان کے لئے امید کی جو ننھی منی کرن نظر آتی ہے وہ بھی اندھیاروں میں گم ہو جائے گی۔ قاضی عیسیٰ کے استقبال کی تیاریاں بڑے پیمانے پر ہوئیں۔ کاروں کا قافلہ، ہاروں کی بہتات، انسانوں کا اژدہام یہ سب کچھ تھا۔ موقع پرست عناصر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ انگریزوں کے رخصت ہوتے ہی بلوچستان کا اقتدار قاضی عیسیٰ کے ہاتھ میں آ جائے گا۔ ڈر یہ تھا کہیں وہ آتے ہی سرداروں کے خلاف اعلان جہاد نہ کر دیں۔ ہوائی جہاز کی آمد کا وقت جوں جوں قریب ہوتا گیا، اہل دل کی نبضیں ڈوبتی چلی گئیں۔

قدرت کا ہاتھ

ریفرنڈم میں صرف تین دن باقی تھے اور میر جمالی کراچی سے واپس نہ آئے تھے۔ ابھی تک ایک بھی ایسا واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا تھا جس سے دل کو ڈھارس بندھتی۔ کانگریس نے اپنے خزانے کا منہ کھول دیا تھا۔ ایک ایک سردار سے رابطہ قائم کیا جا رہا تھا۔ کچھ پتہ نہ تھا حالات کیا رخ اختیار کر جائیں۔ نسیم حجازی چند دوستوں کے ہمراہ شہر کا ایک چکر لگانے کے لئے بازار میں آئے۔ جونہی مسلم لیگ کے دفتر کے آگے سے گزرے، عبدالغفور درانی صاحب نے انہیں روک لیا اور قریب آ کر چپکے سے کان میں کہا ''قاضی عیسیٰ نہیں آئے۔'' نسیم حجازی صاحب کا چہرہ دمک اٹھا۔ ناگاہ ان کی نظر سامنے ایک دکان پر جا پڑی وہاں نواب جوگیزئی کی کار کھڑی تھی اور نواب صاحب دکان میں تھے۔ نسیم حجازی نے درانی صاحب سے کہا ''کیا یہ ممکن نہیں کہ نواب صاحب کو جلوس کی صورت میں سارے شہر میں پھرایا جائے۔''

''ہاں ہاں یہ اچھا خیال ہے، تم انہیں لے آؤ۔'' درانی صاحب نے نیشنل گارڈ کے سربراہ کو بلایا اور ضروری ہدایات دیں۔ چند لمحے بعد فخر بلوچستان نواب جوگیزئی زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے اور دوسری طرف نواب صاحب کو اس کار میں بٹھا دیا گیا جو قاضی عیسیٰ کے لئے تیار کی گئی تھی۔ یہ جلوس اس مکان کے سامنے سے بھی گزرا جہاں اکبر خاں بگٹی بلوچ

سرداروں کے ساتھ منصوبے بنا رہے تھے۔ نواب جوگیزئی کے حق میں فلک شگاف نعروں نے ایک ایسی نفسیاتی کیفیت پیدا کر دی جس میں کانگریس اور اس کے ہمنواؤں کا ٹھہرنا بہت مشکل تھا۔ شاہی جرگے کے زیادہ تر سرداران دنوں کوئٹہ میں مقیم تھے ان کی آنکھوں نے عوام کے بے پناہ ہجوم اور ان کے فلک شگاف نعروں کے مناظر بہت قریب سے دیکھے۔ ان کے ذہن متاثر ہوئے اور ان کے دل پاکستان کے لئے دھڑکنے لگے۔ اس عظیم الشان جلوس نے نواب صاحب کی ذہنی کیفیت یکسر بدل ڈالی۔ ابھی تک وہ پاکستان کی حمایت میں دیوانہ وار آگے نہیں آئے تھے۔ حالات نے انہیں تشکیل پاکستان کی راہ پر لا کھڑا کیا تھا، مگر ابھی اس دل میں عشق و جنون داخل نہ ہوا تھا۔ اس جلوس کے بعد نواب صاحب نے فرمایا:

''ہم دیکھیں گے ہمارے راستے میں اب کون حائل ہوتا ہے۔ بلوچستان پاکستان اور صرف پاکستان کا حصہ بنے گا۔''

یہ الفاظ مشترکہ بیان میں موجود تھے مگر اب یہ فقط الفاظ نہ تھے، جذبات کے سرچشمے اور عزم کے طوفان بن گئے تھے۔ اس روز عبدالصمد اچکزئی کے اخبار ''استقلال'' نے یہ خبر شائع کی کہ ''تنظیم'' میں نواب جوگیزئی کا بیان ان کی مرضی کے خلاف چھپا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر نواب صاحب آگ بگولا ہو گئے اور اسی وقت ایک بیان جاری کیا جس میں کانگریس اور اس کے ہمنواؤں کو بالکل بے نقاب کر دیا۔ اس بیان میں نواب صاحب نے عبدالصمد خاں اچکزئی کے بارے میں کہا کہ وہ نہرو کی طرف سے میرے لئے پیشکش لے کر آئے تھے۔

سہ پہر کے قریب نسیم حجازی صاحب، میر جمالی کے گھر آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ جمالی صاحب ابھی تک نہیں آئے تھے۔ کوئی چار بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی یہ قائداعظم کا فون تھا نواب صاحب کے نام۔ نواب جوگیزئی کی کوٹھی وہاں سے سو گز کے فاصلے پر تھی۔ نسیم حجازی ننگے پاؤں بھاگے اور نواب صاحب کو اپنے ساتھ لے آئے مگر اس وقت تک ٹیلی فون کا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ شام کے آٹھ بجے تک قائداعظم کی آواز ابھرتی اور ڈوبتی رہی۔ اس عرصے میں شاہی جرگے کے سردار بھی جمع ہو گئے۔ اچانک ٹیلی فون میں کسی صاحب کی صاف اور شستہ آواز آئی وہ کہہ رہے تھے: ''آپ اپنا پیغام مجھے لکھوا دیجئے

میں دس پندرہ منٹ میں آپ کو قائداعظم کا جواب لے دوں گا۔"

یہ صاحب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے فرشتے ثابت ہوئے انہیں پیغام لکھوا دیا گیا کہ فلاں فلاں سردار یہاں بیٹھے ہیں، وہ آپ کو سلام کہتے ہیں۔ پاکستان کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دی ہے آپ کی رہنمائی درکار ہے۔ قاضی عیسیٰ صاحب کی تقریر سے سرداروں میں بے چینی پائی جاتی ہے، امید ہے آپ وضاحت فرمائیں گے۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد قائداعظم کا پیغام آ گیا۔ لکھا تھا: "میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، اخبارات میں بلوچستان کے متعلق ایک بیان پہلے دے چکا ہوں آج ریڈیو سے دوسرا پیغام نشر ہو جائے گا۔"

اور اسی رات ریڈیو سے پیغام نشر ہو گیا۔ سردار بڑے مطمئن نظر آتے تھے۔ 27 جون کو میر جعفر خاں جمالی بھی آ گئے۔ پاکستان کے لئے پوری قوت سے کام کیا گیا۔ راتوں کی نیند اور دن کا آرام پاکستان پر قربان کیا جا رہا تھا۔ سردار کانگریس کی عظیم پیشکشوں کو ٹھکرا رہے تھے۔ 28 جون کی رات کے 10 بجے تک پانچ سرداروں کے سوا باقی تمام سردار پاکستان کے حق میں ووٹ دینے کا وعدہ کر چکے تھے۔

آخری سازش

28 جون کی رات کو مسعود صاحب بنگلے پر دیر سے پہنچے۔ وہ اے۔جی۔جی سے مل کر آئے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک اور سازش تیار ہوئی ہے۔ 29 جون کو ریفرنڈم نہیں ہوگا صرف لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا 3 جون والا اعلان پڑھ کر سنایا جائے گا۔ 24 گھنٹے بعد 30 جون کو سرداروں کی رائے لی جائے گی۔ یہ واقعی بہت بڑی سازش تھی۔ 24 گھنٹوں کے اندر کچھ سے کچھ ہو سکتا تھا۔ کانگریس اور انگریز حکام کے لئے روپے پیسے اور طاقت کے ذریعے ووٹ حاصل کرنا بڑا آسان تھا۔ اس سازش کے خلاف پاکستان کے دیوانے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے نواب صاحب کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جونہی اے۔جی۔جی،

مسٹر جیفرے اپنا بیان ختم کرنے والے ہوں، یہ کھڑے ہو جائیں اور کہیں کہ ہم سب سردار فیصلہ کر چکے ہیں ہم پاکستان کے حق میں ہیں اور جو صاحب ہمارے مخالف ہیں وہ علیحدہ ہو جائیں۔ اس جارحانہ رویئے سے سازش ختم ہو جائے گی۔

تمام رات انہی تیاریوں میں گزری۔ دوسرے سرداروں کو بھی ذہنی طور پر تیار کر لیا گیا۔ دودا خاں مری سے کہا کہ پاکستان کے لئے بلوچوں اور پٹھانوں میں مسابقت ہوگی، دیکھیں کون بازی لے جاتا ہے۔ 29 جون کو ٹاؤن ہال میں 10 بجے تمام سردار جمع ہوئے۔ پریس کو بھی اندر جانے کی اجازت تھی۔ کانگریس اس اجلاس کے بارے میں کچھ زیادہ پریشان نہ تھی۔ اس کی نظر 30 جون پر تھی اور وہ اسی حساب سے منصوبے بنا رہی تھی۔ ٹاؤن ہال کے چاروں طرف بے پناہ ہجوم تھا۔ ٹھیک 10 بجے مسٹر جیفرے ہال میں داخل ہوئے۔ انہوں نے پروگرام کے مطابق لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا اعلان پڑھنا شروع کیا۔ وہ ابھی ختم نہ کر پائے تھے کہ نواب جوگیزئی بڑے اعتماد سے اٹھے اور مسٹر جیفرے سے مخاطب ہوئے:

"ہم یہ بیان پہلے پڑھ چکے ہیں، ہمیں فیصلہ کرنے کے لئے مزید وقت نہیں چاہئے کیونکہ شاہی جرگے کے سردار پاکستان کی حمایت میں فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا نمائندہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں بیٹھے گا۔ وہ حضرات جو اس فیصلے کے خلاف ہیں، ایک طرف ہو جائیں۔ سردار دودا خاں مری نے بھی پاکستان کے حق میں تقریر کی اور اس طرح چند منٹ میں تائید کا غلغلہ بلند ہوا۔ صرف چار سردار بیچ میں کھڑے رہے۔ انہوں نے پوچھا کیا یہ بلوچستان یا قلات کا مسئلہ ہے؟ مسٹر جیفرے اردو میں بولے "یہ صرف ہندوستان پاکستان کا مسئلہ ہے، قلات کا اس میں کوئی دخل نہیں۔"

چاروں سرداروں نے بیک زبان کہا: "ہم خان قلات سے عہد کر چکے ہیں کہ ان کا ساتھ دیں گے مگر یہ تو پاکستان اور ہندوستان کا مسئلہ ہے، ہم اپنا ووٹ پاکستان کو دیتے ہیں۔" مسٹر جیفرے کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیلی اور اس نے اردو زبان میں کہا "اچھا ہم وائسرائے کو تار بھیج دیں گے کہ شاہی جرگے کا فیصلہ پاکستان کے حق میں ہے۔" پورا ہال تالیوں کی گونج سے لرز اٹھا۔ پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گرجدار گونج پیدا ہوئی۔ نسیم حجازی پاگلوں کی طرح باہر آئے اور پوری قوت سے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا۔

تماشائیوں کی ایک بڑی تعداد پوچھ رہی تھی آج فیصلہ کیونکر ہوا۔ فیصلہ تو 30 جون کو ہوگا۔ انہیں کیا خبر قدرت پاکستان کے حق میں فیصلہ دے چکی تھی۔ آج اہل دل کی بر آئی تھی۔ شام کو میک مون پارک میں جلسہ عام ہوا جناب قاضی عیسیٰ تقریر کر رہے تھے:

''میں نے دہلی ہی میں کہہ دیا تھا کہ میرا صوبہ پاکستان کے خلاف نہیں جا سکتا، ہم نے جنگ جیتی ہے، ہم نے قربانیاں دی ہیں۔'' اس بیان حقیقت پر ٹاؤن ہال کے در و دیوار جھوم اٹھے۔

انگریز پاکستان کے خلاف مسلسل سازشوں میں مصروف رہے۔ بلوچستان میں ناکامی کے بعد انہوں نے اپنا رخ کابل کی طرف کر دیا۔ تخلیق پاکستان پر کابل میں تین چار روز تک خوشیاں منائی گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا افغانستان ایک اچھے مسلمان ہمسائے کی طرح اپنے فرائض ادا کرے گا۔ وہاں کے عوام پاکستان کے لئے قربانیاں دینے کو تیار تھے۔ چوتھے روز برطانوی سفیر نے افغانستان کے وزیراعظم سے ملاقات کی اور دوسرے ہی روز پختونستان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پختونستان کے اصل خالق انگریز ہیں۔

❖■❖■❖

جانے کس جرم کی پائی ہے سزا؟

قلات بلوچستان کی سب سے بڑی ریاست تھی اور اس اعتبار سے اس کے والی میر احمد یار خاں آف قلات کو ''بیگلو بیگی'' یعنی سب سے بڑا سردار کہا جاتا تھا۔ خان قلات کے قلم سے ''قوم بلوچ اور خوانین بلوچ'' نامی کتاب کی تلخیص حاضر ہے جو بلوچستان کے سیاسی حالات کو ظاہر کرتی ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ اصحاب کو خان آف قلات کے بعض خیالات اور تجزیوں سے اتفاق نہ ہو، اس کے باوجود ان کی سوچ سے آگاہی، جو بڑی حد تک ''بلوچ سوچ'' کا مظہر رہی، پاکستان کے موجودہ سیاسی معاملات کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ خان آف قلات کا معاملہ اللہ کی عدالت میں جا چکا ہے لیکن اُن کا نقطہ نظر سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

یہ کتابچہ مرتب کرنے کا خیال مجھے اس لئے آیا کہ بلوچ قوم نے مجھے اپنا خان مانا اور یہ عزت بخشی، بدلے میں اپنی استطاعت کے مطابق میں نے ہر دور میں ان کے لئے بے غرضی سے کام کیا اور اپنے آباؤ اجداد کی طرح جہاں کہیں قربانی دینے کا وقت آیا تو میں نے اس سے دریغ نہیں کیا اور ظلم و ستم اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مجھ پر بلوچ قوم کی طرف سے یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں پاکستانی عوام اور خود بلوچوں کی نئی نسلوں کو ان تمام حالات سے آگاہ کروں کہ وہ کیا مصائب تھے جو ہم نے، ہمارے بزرگوں نے اسلام اور پاکستانی عوام کی خاطر برداشت کیے۔ ہوسکتا ہے ان میں سے بعض باتیں تلخ ہوں لیکن ہم بلوچ صدیوں سے ایک روایت رکھتے ہیں کہ حقائق کو جوں کا توں بیان کر دیا
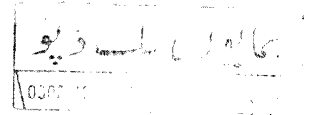
جائے۔اس کو ہم ''بلوچی احوال'' کہتے ہیں۔سو یہ کتاب بھی ''بلوچی احوال'' پر مبنی ہے یعنی سو فیصد سچ، خواہ کسی کو اچھا لگے یا برا۔

بلوچ قوم مشرقِ وسطیٰ کی رہنے والی ہے اور ان کا اولین وطن حلب تھا۔ یہ لوگ بادیہ نشیں تھے اور اکثر آپس میں جنگ و جدل کرتے۔ ظہورِ اسلام سے قبل حلب میں دو معروف سردار تھے جن میں سے ایک کا نام کرد تھا، دوسرے کا نام بلوچ۔ یہ دونوں رشتے میں بھائی تھے۔ خانہ جنگی ہوئی تو دونوں وہاں سے خاندان سمیت نکل کھڑے ہوئے۔ کرد نے عراق کا رخ کیا، بلوچ ایران پہنچا اور یہاں کوہ البرز میں رہائش اختیار کی۔ کچھ عرصہ بعد ان کا ایک سردار جس کا نام قمبر خان تھا، اپنے اہل خانہ اور لشکر سمیت قلات آیا اور یہاں آ کر آباد ہو گیا۔ چونکہ وہ خود کو اپنے جد میر ابراہیم کی مناسبت سے براہیمی کہلاتا تھا، جو بگڑتے بگڑتے براہیی، پھر براہوی اور آخر میں بروہی بن گیا، اس لئے تمام بروہی بنیادی طور پر بلوچ ہیں اور یہ خطہ قوم کی وجہ سے بلوچستان کہلایا۔ یہ سارے واقعات ظہورِ اسلام سے پہلے رونما ہوئے۔

بلوچ عربوں کی طرح عمدہ خصائل کے لوگ تھے۔ ان کی شجاعت بے مثل تھی، جنگ میں کام آنا بہادری اور بستر پر مرنا بزدلی سمجھا جاتا۔ وعدے کے پابند تھے۔ سخاوت اور مہمان نوازی ان کے شعار تھے۔ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن تھے۔ پیار سے آپ انہیں زہر بھی کھلا دیں تو وہ کھا لیں گے لیکن زبردستی کسی کی بات ماننے کی بجائے گردن کٹوانے کو ترجیح دیں گے۔ کم و بیش یہی خصائل آج کے سچے بلوچ میں پائے جاتے ہیں۔

بلوچوں کی انہی عادات کے پیش نظر کم و بیش ہر دور میں کسی نہ کسی حکمران سے جنگ آزما رہنا پڑا۔ شہنشاہ ایران، شاہ افغانستان، مغل فرمانرواؤں، انگریزوں اور پاکستان بننے کے بعد بدقسمتی سے اور بعض غلط فہمیوں سے بلوچ مختلف حکومتوں سے نبرد آزما رہے۔ تاہم میں یہ کہوں گا کہ انہوں نے کبھی کسی حکومت پر روپے کے لالچ یا زمین کی خاطر حملہ نہیں کیا، بلکہ عزت و آبرو کو بچانے اور عظیم بلوچی روایات کے تحفظ کی خاطر ہتھیار اٹھائے اور اکثر ادوار میں ان کی جنگیں مدافعانہ تھیں۔ اپنے علاقے سے باہر نکل کر یا کسی علاقے پر قبضہ کرنے کی خاطر بلوچوں نے کبھی جنگ نہیں کی۔

اور ہم نے بیان کیا ہے کہ بلوچستان کے علاقے میں بلوچ قوم ظہورِ اسلام سے قبل آئی، لیکن بلوچوں کی آمد سے پہلے بھی اس علاقے میں انسانی آبادیاں تھیں، چنانچہ ابتدائی سراغ کے مطابق چار ہزار قبل مسیح سے یہاں انسان آباد ہے۔ یہ علاقہ چونکہ وادیٔ سندھ اور ہندوستان کے تمام علاقوں کو ایران سے ملانے والی واحد خشکی کی گزرگاہ تھا، لہٰذا اسے جغرافیائی طور پر بہت اہمیت حاصل رہی۔ پرانی آبادیوں میں اب تک سنگہ گیس ڈور، شاہی ٹمپ ناچ اور شمالی بلوچستان میں پیر مانو غنڈی، مغل غنڈی، سور جنگل کے آثار موجود ہیں اور بعض جگہوں پر تو ماہرینِ آثار قدیمہ نے پرانی تہذیبوں کو کھود کر بھی نکالا ہے۔ ساراوان میں اسپلنجی اور مرد کے ٹیلے، سبی میں پیرک کا ٹیلہ، خاران کے مقبرے اور گور بند اب سربستہ راز نہیں۔ یہ بستیاں ظاہر کرتی ہیں کہ اس دور میں بلوچستان آج کی طرح خشک اور بنجر نہ تھا بلکہ یہاں سرسبز و شاداب علاقے تھے یہی وجہ ہے کہ آج یہاں فی مربع میل دو تین آدمی بستے ہیں، لیکن پرانے زمانے کی بستیوں کے آثار یہ بتلاتے ہیں کہ جا بجا انسانی آبادیاں تھیں اور وہ بھی اتنی گنجان کہ انسان ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔

1600 قبل مسیح میں آریہ لوگ بلوچستان میں آئے۔ ان لوگوں کی قوم کا نام ماکا تھا لہٰذا انہوں نے بلوچستان میں آ کر ''ماکاران'' آباد کیا جو بعد ازاں مکران بن گیا۔ سکندر اعظم ہندوستان سے واپسی پر مکران اور بیلہ ہی کے راستے واپس گیا تھا اور یہاں اس کی فوج کا ایک حصہ آب و ہوا کی شدت اور خوراک کی کمی کے باعث تباہ بھی ہو گیا تھا۔ سکندر اعظم کا ایک جرنیل سیلوکس، اس کی روانگی کے بعد ہندوستان کے بعض علاقوں اور بلوچستان پر قابض رہا، مگر بالآخر موریہ خاندان کے چندر گپت نے اسے شکست دی اور بلوچستان پر بھی گپت خاندان کی حکومت رہی۔ اس دور کی گپھائیں، جو بدھ مت کی نشانی ہیں، مینگول، زہری اور کچھی کے علاقے میں ملتی ہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ نے ایک جماعت مکران (بلوچستان) کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجی تھی۔ اس جماعت نے واپس جا کر جو رپورٹ دی، اس کے الفاظ یہ تھے: ''اس علاقے کا خیر، اس کے شر سے کم ہے، کیونکہ پہاڑ تو ایک طرف رہے، اس کے میدان بھی عام پہاڑوں سے زیادہ دشوار گزار ہیں۔ تھوڑی فوج

یہاں غلبہ حاصل نہیں کر سکتی اور زیادہ فوج کے لئے پانی اور خوراک نہ مل سکے گی۔'' یہ رپورٹ سن کر حضرت عمرؓ نے اس علاقے پر فوج کشی کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

عربوں نے کچھ عرصہ بعد بلوچستان کے ساحلی علاقے پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کیا ضرور لیکن وہی ہوا جس کی رپورٹ پہلے دی جا چکی تھی یعنی مکران اور جھالاواں میں عرب حاکم خوراک اور پانی کی کمی کے سبب زیادہ فوج نہ رکھ سکے اور کم فوج رکھنے کے نتیجے میں نظم و ضبط پر قابو نہ پایا جا سکا۔ یہاں تک کہ عرب گورنر کو خود جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ تال کے قریب عربوں کی بستی البیضہ کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ قصدار (خضدار)، قندابیل (قندھارا)، مستنج (مستونگ) کی بستیاں اس دور کے معروف تجارتی مرکز تھے جن کا ذکر عربوں نے اپنی تواریخ میں کیا ہے۔

707ء میں عرب فاتح محمد بن قاسم نے مکران پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ اس نے سندھ کی فتح کے بعد ہی مکران کو مسلمانوں کا ایک مرکز بنایا۔ اس کی فوج میں شیراز سے آنے والے بعض بلوچ قبائل بھی تھے۔ محمد بن قاسم نے ان بلوچ قبائل کو جاگیریں عطا کیں اور دسویں صدی عیسوی تک بلوچستان اسی عرب فاتح کے جانشینوں کے ماتحت رہا۔ اس دور میں بلوچوں کی تہذیب و تمدن پر جو بنیادی طور پر عرب ہی تھی، نئے عرب قبائل کے میل جول کی وجہ سے بہت گہرا اثر پڑا۔ البتہ جب خلافت کمزور ہوئی اور ایران نے آزادی حاصل کر لی تو اس نے بلوچستان پر حملہ کر کے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بلوچستان کا علاقہ ان کے لئے بھی اس قدر دشوار گزار اور صبر آزما تھا کہ انہوں نے مقامی سرداروں ہی کو حاکم بنانے میں مصلحت جانی۔ قلات پر البتہ سیوائی ہندوؤں کا تسلط رہا۔

تیرھویں صدی عیسوی میں وسطی ایشیا کے منگول قیامت بن کر ایشیا اور یورپ پر ٹوٹے اور انہوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بلوچوں نے کھل کر مغلوں کا ساتھ دیا اور قلات کی سیوائی حکومت کا بستر لپیٹ دیا۔ قلات ان دنوں براعظم ایشیا کی بڑی منڈیوں میں سے ایک تھی اور اسے مرکزیت حاصل تھی۔ خاصا عرصہ بلوچ مغلوں کی طرف سے اس علاقے پر حکومت کرتے رہے اور بعد ازاں اپنی آزاد اور خود مختار ریاست قائم کر لی۔ سردار میرو خان میروانی پہلے حکمران ہیں جنہوں نے قلات میں بلوچی

ریاست کی بنیاد رکھی اور انہیں خانہ بدوشی کی زندگی سے نکال کر مستقل رہائش کا اسلوب سکھایا۔ وقت گزرتا رہا اور بالآخر میر نصیر خان بلوچ اس علاقے میں حکمران ہوئے۔ یاد رہے کہ یہ احمد شاہ ابدالی کا دور تھا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی میں میر نصیر خان بلوچ نے احمد شاہ ابدالی کی مدد کی تھی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے حکم پر انہوں نے پنجاب کو سکھوں سے چھڑانے کے لئے دو جنگوں میں حصہ بھی لیا۔ میر نصیر خان بلوچ نے مختلف قبائل سے مقررہ تعداد میں سپاہیوں کی فراہمی کا نظام قائم کیا چنانچہ پہلی بار بلوچوں کی باقاعدہ فوج سامنے آئی۔ میر نصیر خان بلوچ 1810ء میں انتقال کر گئے۔

انگریز پہلی بار 1839ء میں بلوچستان میں جنگ آزما ہوئے۔ اس وقت میر محراب خان بلوچ کے پاس چند سو سپاہی تھے اور انگریزوں کے پاس سات ہزار، میر محراب خان بلوچ نے شہادت کو ترجیح دی۔ وہ ننگی تلوار لے کر نکلے اور اس حالت میں شہید ہوئے کہ جسم پر گولیوں کے تیرہ نشان تھے۔ جنگ کے بعد غیور بلوچوں نے اپنے ہاتھوں سے پچیس نوجوان خواتین کو ان کی مرضی کے مطابق شہید کر دیا کیونکہ مشہور تھا کہ انگریز عورتوں کی بے حرمتی کرتے ہیں۔

1875ء میں انگریزوں کو بلوچستان کے لئے ایک لارنس آف عریبیہ مل گیا۔ اس شخص کا نام سر رابرٹ سنڈیمن تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کے نام پر فورٹ سنڈیمن کا شہر آج بھی موجود ہے۔ 1876ء تک سنڈیمن نے میر خداداد کے سوا تمام سرداران بلوچ کو انعام، لالچ اور سازشوں کے ذریعے اپنے ساتھ ملایا۔ 1893ء میں میر خداداد خان کو دھوکے سے دعوت کے بہانے کوئٹہ بلایا اور قید کر دیا۔ بلوچستان میں ریذیڈنٹ مقرر کر لیا گیا اور اس کے ماتحت پولیٹیکل ایجنٹ بنائے گئے۔ میر خداداد خان نے 17 برس انگریز کی قید میں گزارے اور 21 مئی 1909ء کو قید کی حالت ہی میں فوت ہو گئے۔

انگریزوں نے میر خداداد کے نوعمر بیٹے میر محمود خان کی رسمی طور پر تاجپوشی کرائی تاہم جب وہ بڑا ہوا تو اس نے پہلے انگریز کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش کی اور کامیاب نہ ہوا تو احتجاجاً حکومت چھوڑ دی۔ آخری عمر میں اس کی بینائی بھی جاتی رہی اور وہ 3 نومبر 1929ء کو قلات میں فوت ہو گیا۔ میر محمود خان بلوچ کی وفات کے بعد میر خداداد کے تیسرے

صاحبزادے محمد اعظم جان کو خان بلوچ منتخب کرلیا گیا۔ وہ پختہ عقیدے کے باعمل مسلمان تھے اور روشن خیال اتنے کہ ان کا کہنا تھا کہ کمیونسٹ تحریک اسلام کے اقتصادی نظام سے لی گئی ہے۔ آخری دور میں انگریزوں نے انہیں بھی قید کرلیا۔

میں لورالائی کے ایک قید خانے میں پیدا ہوا جہاں انگریزوں نے میرے ضعیف العمر دادا میر خداداد خان اور میرے والد اعظم جان کو قید کر رکھا تھا۔ دادا بزرگوار کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہمیں نظر بند رکھا گیا۔ 1920ء میں مجھے ''ایڈجوٹنٹ'' بلوچستان کا پرسنل اسسٹنٹ بنا دیا گیا۔ ڈیڑھ سال بعد فوج میں 27 پنجاب رجمنٹ میں ایک سال تک فوجی تربیت دی گئی۔ 1937ء میں مجھے چاغی میں ایڈجوٹنٹ مقرر کیا گیا۔ کوئٹہ سے زاہدان تک پانچ سو میل لمبے علاقے کا میں انچارج تھا۔ انگریز روس کی فارورڈ پالیسی سے خوف زدہ تھے لہٰذا میرے ذمہ سب سے اہم کام یہ تھا کہ افغانستان اور ایران کی سرحدوں پر روسی کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکوں۔ ہمارے اکثر بلوچ روس کی فارورڈ پالیسی کی حق میں تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی سامراج سے انتقام لینے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

میری زندگی کے ابتدائی 25 برس پٹھان علاقوں اور قبائل میں گزرے۔ 75 پونڈ وزنی سامان لے کر میں کئی برس تک پہاڑوں میں پیدل سفر کرتا رہا اور مجھے پٹھانوں سے ہمیشہ محبت رہی۔ پٹھان بہادر اور جفاکش لوگ ہیں۔ وہ فطرتاً بہترین دوست ہوتے ہیں یا بدترین دشمن۔ احمد شاہ ابدالی اور میر نصیر خان بلوچ کے زمانے سے بلوچوں کے افغانستان سے مراسم رہے ہیں۔ خود میری بیگم والد کی طرف سے سید جمال الدین افغانی'' کی نواسی تھیں اور والد کی طرف سے ان کا تعلق محمد زئی شاہی خاندان سے تھا۔ پٹھان بلوچ اتحاد کی ابتدا میر نصیر خان بلوچ اور احمد شاہ ابدالی کی اس قسم سے شروع ہوئی جو دونوں سربراہوں نے خرقہ شریف اور قرآن حکیم کو سامنے رکھ کر پٹھان، بلوچ اتحاد کے لئے قسم اٹھائی تھی۔ اس دور سے اب تک ہم اس قسم کا احترام کرتے ہیں اور اگرچہ احمد شاہ ابدالی کے پوتے شجاع الملک نے یہ قسم توڑی اور بلوچ بھائیوں کو انگریز کی گولیوں کا نشانہ بنایا، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ بلوچ اور پٹھان اپنی اخوت اور بھائی چارے کو قائم رکھیں تو دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور عالم اسلام کا نقشہ بدلنے پر دین اسلام کی سرفرازی کے لئے بھی اپنی کوششوں کے

باعث آخرت میں بھی سرخرو ہوں گے۔

30 دسمبر 1933ء کو میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا کہ مجھے اپنے شفیق ترین مہربان باپ کے سائے سے محروم ہونا پڑا۔ میرے والد سچے مسلمان تھے۔ انہوں نے ہم سب کو پانچوں وقت کا نمازی بنایا۔ اتفاق سے امام صاحب موجود نہ ہوتے تو میرے والد بزرگوار ہی امامت فرماتے۔ رات کو کھانے کے بعد میں ان کے پاؤں دابتا تھا اور وہ خوش ہو کر ہمیشہ مجھے دعائیں دیتے۔ تاہم انسان فانی ہے وہ مالکِ حقیقی سے جا ملے اور میں بلوچوں کے مسائل میں گھرا ہوا ان کا سربراہ بنا دیا گیا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، مجھے بلوچوں سے عشق رہا۔ میرے پیش نظر حسب ذیل بڑے بڑے مسائل تھے:-

1. حکومت برطانیہ سے ایسے معاہدے کرنا کہ ہمیں جینے کا حق مل سکے۔
2. مختلف بلوچ قبائل کے سرداروں کو انگریز کے تسلط سے نکال کے بلوچی قلات سے وابستہ کرنا۔
3. علماء دین کو ازہر اور دیوبند کی جدید سوچ سے فیضیاب کروانا تاکہ وہ حجرے کی تنگ و تاریک فضا سے باہر آ سکیں۔
4. بلوچ پارلیمنٹ کا قیام تاکہ عوام کے مسائل اور سوچ براہ راست سامنے آ سکیں۔

1935ء میں جو عظیم زلزلہ آیا، اس میں ہمارے ہزاروں بلوچ بھائی شہید ہو گئے۔ قلات کا تاریخی قلعہ جس میں ایک ہزار کمرے تھے، زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اپنے مقاصد کے لئے کام شروع کیا۔ انگریز جرگہ کے نام پر خود حکومت کر رہے تھے اور سرداروں کو آپس میں لڑاتے تھے۔ جیل خانے بے گناہ قیدیوں سے بھرے پڑے تھے۔ جو بیگار سے انکار کرتا، پولیٹیکل ایجنٹ اسے گرفتار کر لیتے۔ صنعتیں ختم اور تجارت ٹھپ ہو گئی تھی۔ اجناسوں کا داخلہ بند تھا۔ 1890ء میں دارالحکومت قلات کی آبادی نوے ہزار تھی جو 1933ء میں تین ہزار رہ گئی۔ تشدد اور ظلم و ستم کے باعث بے شمار بلوچ خاندان ہجرت کر کے سندھ، پنجاب، ایران حتیٰ کہ روس تک چلے گئے۔ خود ہماری حکومت کا یہ عالم تھا کہ بلوچ خان کو قلات سے مستونگ جانا پڑتا تو انگریز کی اجازت کے بغیر وہ سفر نہ کر سکتا تھا۔

1936ء میں، میں نے بڑی محنت سے بلوچ ریاست کا آئین مرتب کیا اور

برطانوی پارلیمان کی طرز پر دارالعوام اور دارالامراء بنائے۔ دارالعوام میں 52 ارکان تھے جن میں 47 منتخب تھے اور 5 نامزد۔ دارالامراء میں بلوچستان کے مختلف علاقوں سے 38 سردار لیے گئے تھے جن میں رئیسانی، شاہوانی، رستم زئی، رند، گرد، لہڑی، لانگو، سانک زئی، اورک زئی، مینگل، مگسی، موسیانی، بزنجو، خدرانی، باجوئی، نیچاری، قمبرانی، بروہی، کچکی خاندان کے سربراہ شامل تھے۔ دونوں ایوانوں کے کل ارکان 87 تھے۔

میں نے بڑی محبت سے پارلیمنٹ کے ارکان اور دونوں ایوانوں کو اس امر پر رضامند کیا کہ وہ انگریز کے پیچھے خطابات کے لئے نہ بھاگیں اور وزیر اعظم قلات کو انگریز کے بجائے ان کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ میں نے جا بجا مدارس بنوائے، تبلیغی نظام رائج کیا، وزراء کی کونسل منتخب کی، ہر وزیر کو جدا محکمے سونپے، اسلامی شریعت کا نظام نافذ کیا، ہر تحصیل میں قاضی مقرر کیے اور مجلس شوریٰ بنائی، جبری بیگار منسوخ کی، ہر قبیلے کے سربراہ کی طرف سے مزارعین سے وصول کیا جانے والا ٹیکس ''زرشاہ'' منسوخ کیا۔ اس طرح مزدور سے اس کی آمدنی کا ٹیکس بھی ختم کیا گیا، جسے دروگر یا لائی گر کا نام دیا جاتا تھا۔ تعلیم کی مد پر بجٹ کو 13 ہزار سے بڑھا کر 4 لاکھ روپے سالانہ کیا گیا۔ بلوچی چھاپہ خانہ قائم ہوا اور لائبریریاں بنائیں۔ قلات میں چھوٹی سی اسلحہ ساز فیکٹری قائم کی اور دستکاری مثلاً کپڑا بننے، چمڑا رنگنے، لکڑی کی صنعت اور قالین بافی کو فروغ دیا گیا۔ بلوچ طلباء کو زرعی تعلیم کے لئے وظائف دیئے۔ بلوچستان میں تیل موجود ہے۔ ایک آئل کمپنی تیل کے تمام علاقوں پر قبضہ جما کر ریاست کو صرف دو ہزار روپے سالانہ دیتی تھی۔ میں نے 1945ء میں یہ ٹھیکہ بی اوسی کو دیا جس کو تیل نکالنے کا کام شروع کرنا تھا، لیکن 1947ء میں حکومت پاکستان کے حکم پر یہ ٹھیکہ منسوخ کر دیا گیا۔ آج تک بلوچستان سے تیل نکالنے کے ضمن میں کوئی خاص کام سامنے نہیں آیا۔

1946ء کا ذکر ہے کہ ریاست قلات اور برطانوی ہند کی حکومت کے مابین بعض معاہدات کے سلسلے میں کسی قانون دان کی ضرورت پڑی تو میں نے محمد علی جناح سے رابطہ قائم کیا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت مسلم لیگ کے سربراہ تھے، بلکہ ایک ماہر قانون اور آئینی گتھیاں سلجھانے والے دانشور بھی تھے۔ قائداعظم نے مجھے

یقین دلایا کہ جس کیس کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ آئینی نہیں بلکہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ میں آپ کی بلا معاوضہ قانونی امداد کروں گا، لیکن درحقیقت ہم سب کو سیاسی جنگ لڑنا ہوگی۔ ہمارے درمیان یہ مذاکرات چلتے رہے۔ حتیٰ کہ دسمبر 1945ء میں قائداعظم نے مجھے دہلی بلایا اور اس برطانوی وفد سے ملاقات کروائی جو ہندوستان کے ہندو مسلم لیڈروں اور والیان ریاست سے مذاکرات کر رہا تھا۔ میرا مقدمہ مسٹر آئی آئی چندریگر اور سر سلطان احمد اور مسٹر والٹن مانگٹن نے تیار کیا۔ قائداعظم نے ہماری طرف سے یہ کاغذات مناسب تبدیلی کے بعد کیبنٹ مشن اور وائسرائے ہند کے سامنے رکھ دیئے۔ ہمارا مؤقف یہ تھا کہ ریاست قلات آزاد اور خودمختار علاقہ ہے جس کے تعلقات 1876ء کے معاہدے کے مطابق برطانوی ہند سے قائم ہوئے تھے، چنانچہ برطانوی حکومت کے جانے کے بعد قلات ازخود آزاد ہو جائے گا اور اپنی صوابدید کے مطابق مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرے گا۔ یہی نہیں بلکہ 28 نومبر 1946ء کو مری بگٹی کے قبائلی علاقے کے دوسرداروں، سردار دودا خان مری، اور سردار اکبر خان بگٹی نے ایک درخواست کے ذریعے انگریزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان کے قبائلی علاقے بھی قلات کی فیڈریشن میں شامل ہونے چاہئیں۔ برٹش بلوچستان جس میں کوئٹہ وغیرہ شامل تھے اور دوسرا قلات اور دیگر ریاستیں۔

3 جون 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام کا اعلان کیا اور 17 جون کو قائداعظم نے ریاستوں کے بارے میں حسب ذیل بیان جاری کیا: ''آئینی اور قانونی طور پر ہندوستان کی ریاستیں برطانوی اقتدار اعلیٰ کے ختم ہوتے ہی آزاد اور خودمختار ہوں گی اور انہیں کھلی اجازت ہوگی کہ وہ ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی میں شامل ہوں یا پاکستان کی۔''

4 اگست 1947ء کو ایک گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن، لارڈ از لے، قائداعظم، مسٹر لیاقت علی خان، سر سلطان احمد مشیر قانونی ریاست قلات اور میں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کے فیصلے حسب ذیل تھے:-

1. 15 اگست 1947ء کو ریاست قلات کی نوخودمختار حیثیت بحال ہو جائے گی۔
2. قلات اور پاکستان کے آئندہ حکومت میں کسی سبب سے تعلقات استوار نہ ہو سکیں

اور ریاست قلات چاہے تو افغانستان میں شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔

3. خان آف قلات نے قیام پاکستان کے لئے اپنی اور دیگر بلوچوں کی خدمات گنوائیں اور قائداعظم اور ان کی سربراہی میں قائم ہونے والی نئی مملکت پاکستان پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔

اس گول میز کانفرنس کے نتیجے میں 11 اگست 1947ء کو ایک اعلامیہ جاری کیا گیا جس کے نکات حسب ذیل تھے:-

1. حکومت پاکستان قلات کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست کی حیثیت سے ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے مختلف تسلیم کرتی ہے۔
2. اس امر کے لئے قانونی رائے حاصل کی جائے گی کہ جو معاہدے برطانوی حکومت اور قلات کے درمیان ہوئے، پاکستان کو بھی مل سکتے ہیں یا نہیں۔
3. پاکستان کے نمائندوں اور خان آف قلات کے درمیان مزید گفت وشنید ہوگی۔
4. پاکستان اور قلات کے درمیان دریں اثناء ایک ساکن معاہدہ رہے گا جس کی رو سے حکومت پاکستان ان تمام ذمہ داریوں کو قبول کرے گی جو برطانوی ہند کے پاس تھیں۔

اس طرح پاکستان کے وجود میں آنے سے دس روز پہلے ہی ریاست قلات پاکستان کا حصہ بن گئی، حالانکہ ہندوستان کی ساڑھے سات سو ریاستیں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچی تھیں۔ اس معاہدے کے تحت چند ہفتے بعد گورنر جنرل اور وائسرائے ہند کے ایجنٹ مقیم بلوچستان نے لسبیلہ اور خاران کی ریاستوں کو خصوصی مراسلے لکھے جن کے مطابق ہر دو علاقوں کا کنٹرول ریاست قلات کو واپس کر دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ اب وہ قلات کے دائرہ اثر میں ہیں۔

15 اگست 1947ء کو یعنی قیام پاکستان کے دوسرے روز ریاست قلات نے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور 11 اگست 1947ء کے معاہدے کے مطابق میں نے اپنے وزیراعظم اور وزیر خارجہ کو حکومت پاکستان کے نمائندوں سے گفت وشنید کے لئے کراچی بھیجا تاکہ وہ قلات اور پاکستان کے درمیان کوئی باعزت اور شایان شان سمجھوتہ کر سکیں۔

اکتوبر 1947ء میں قائداعظم سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیں۔ میرا جواب یہ تھا کہ ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں لیکن میں نے ذاتی حیثیت میں کسی فیصلے پر دستخط کر بھی دیئے تو قبائلی اس پر کاربند نہیں رہیں گے، لہٰذا ان سے مشورہ ضروری ہے۔ اس سلسلے میں قائداعظم خود سبی تشریف لائے تو میں نے دوبارہ تجویز پیش کی کہ مختلف سرداروں سے جو گفتگو ہوئی اس کی روشنی میں سردارانِ قبائل الحاق کی طرف ملتفت ہوئے ہیں لیکن وہ حسب ذیل تحفظات چاہتے ہیں۔

الف: بلوچستان کے تاریخی اور قدیم رسم ورواج میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

ب: الحاق سے متعلق معاہدے پر خان آف قلات اور قائداعظم دونوں دستخط کریں گے۔

ج: حکومت پاکستان تحریک آزادی میں بلوچوں کے کردار کا اعتراف کرے گی اور قائداعظم سرداران قبائل کو ان کے روایتی اجتماع میں خود خراج تحسین پیش کریں گے۔

میری رائے میں دس برس تک قائداعظم سے براہ راست تعلقات رہے تھے لیکن اس مرحلے میں ان کے بعض افسر روڑے اٹکانے لگے۔ دوسری طرف اے جی جی بلوچستان سر امبروز اور میرا اپنا وزیراعظم پاکستان سے الحاق کے مخالف ہو گئے۔ ستم در ستم یہ کہ سیکرٹری امور خارجہ مسٹر اکرام اللہ کی جگہ کرنل ایس بی شاہ مقرر ہو گئے جنھوں نے ہمارے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ اُدھر قائداعظم نے کراچی پہنچتے ہی الحاق کا مسئلہ اور ہماری شرائط اپنی کابینہ کے سامنے پیش کر دیں جسے بلوچستان کی قوانین کے بارے میں کچھ معلومات نہ تھیں، چنانچہ قائداعظم جو بلوچوں کے قریبی دوست رہے تھے، ان کے نام پر بیوروکریسی اور سیاستدانوں کے ایک گروہ نے غلط فہمیاں پیدا کرنا شروع کیں۔ اس صورت میں میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ فوری طور پر سردارانِ قبائل سے ملاقات کروں اور جلد از جلد الحاق کا فیصلہ کرواؤں۔

پاکستان کی کابینہ کے ارکان نے اس دوران میں میرے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے خاران، مکران اور لسبیلہ کو الگ ریاستوں کا درجہ دلوایا اور ان کا پاکستان سے الحاق کروا دیا، حالانکہ خود انگریزوں کے آخری معاہدے کے مطابق انہیں خان آف قلات کے

ماتحت کر دیا گیا تھا۔ بلوچوں کی مرکزیت کو پاش پاش کرنے اور خان آف قلات کو نظر انداز کرنے کا شدید ردِعمل ہوا۔ میری ناچیز رائے کے مطابق اس کے تین نتائج سامنے آئے:۔

1. افغانستان، پاکستان سے بددل ہو گیا اور اس نے معاندانہ رویہ اختیار کیا۔
2. نظام دکن نے بلوچوں کے ساتھ بدسلوکی اور ذلت آمیز سلوک دیکھ کر ہندوستان سے الحاق کر لیا۔
3. مہاراجہ کشمیر نے پاکستان سے الحاق کا فیصلہ بدل کر ہندوستان سے الحاق کر لیا۔
4. خلیج کے بعض شیوخ کی ہمدردیاں جو شروع میں پاکستان کے ساتھ تھیں، بلوچوں سے ناروا سلوک کے سبب ختم ہو گئیں۔

27 مارچ 1948ء کو آل انڈیا ریڈیو نے اچانک شر انگیز خبر نشر کی جس کے الفاظ یہ تھے: ''دو ماہ پیشتر قلات نے حکومت ہند سے الحاق کی درخواست کی تھی لیکن قلات ثقافتی اور جغرافیائی طور پر ہندوستان کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں رکھتا، لہٰذا حکومتِ ہند نے انکار کر دیا۔'' یہ ایک شرارت تھی جس کا مقصد پاکستان اور قلات کے باہمی تعلقات کو خراب کرنا تھا۔ میں نے اس نشریئے کے خلاف ہندوستانی حکومت سے احتجاج کیا جس پر پنڈت نہرو نے بھارتی پارلیمنٹ میں اس خبر کی تردید کی اور ذاتی طور پر مجھے معذرت کا خط لکھا۔ ان حالات میں ایک طرف بلوچ قبائل تذبذب کا شکار تھے تو دوسری طرف پاکستانی بیوروکریسی کسی باعزت سمجھوتے پر آمادہ نہ تھی، تیسری طرف پاکستان جسے بنانے میں میں نے اپنا خون پسینہ صرف کیا تھا، قلات سے دور اور تصادم کے راستے پر جا رہا تھا۔ انہی حالات میں یہ بات میرے علم میں آئی کہ حکومت پاکستان نے کوئٹہ کے بریگیڈ کو حکم دیا ہے کہ وہ قلات کے خلاف فوجی کارروائی کے لئے تیار رہے۔

ان واقعات کے پیشِ نظر میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں بلوچ قبائل کی منظوری کے بغیر اور بلوچ پارلیمنٹ کے ارکان کی تائید کا انتظام کیے بغیر پاکستان سے الحاق کی تجویز پر دستخط کر دوں تا کہ بلوچ مسلمانوں کو پاکستانی بیوروکریسی کی یلغار سے بچایا جا سکے۔ چنانچہ 30 مارچ 1948ء کو خود میں نے کراچی جا کر الحاق نامے پر دستخط کر دیئے اور 15 اپریل 1948ء کو قلات سے قانونی طور پر میرا تعلق ختم کر دیا گیا۔ مجھ سے کہا

گیا کہ قلات کے معاملات کے لئے ایک پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کر دیا گیا ہے جو اے جی جی بلوچستان کے تحت کام کرے گا اور قلات کی انتظامیہ تمام ہدایات پولیٹیکل ایجنٹ سے حاصل کرے گی، چنانچہ اس معاہدے کے تحت میری حیثیت 1932ء کے اختیار کے مطابق ہو گئی۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ میں نے انہی پابندیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے قائداعظم کو ریاست قلات کا آئینی مشیر مقرر کیا تھا۔ بہرحال اس اطلاع کے ملنے کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر اندر قلات کے کئی وزیروں کو شہر بدر کر دیا گیا اور کچھ کو نظر بند کر دیا گیا۔ طرزِ عمل شرمناک تھا اور بلوچوں کی عزت کے منافی۔ تاہم میں نے احکامات کی تعمیل کی تا کہ پاکستان کمزور نہ پڑے۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے میری تمام تر اصلاحات کا بیڑہ غرق کر دیا۔ اسلامی نظام شریعت ختم کر دیا گیا۔ فلاحی قوانین معطل کر دیئے گئے اور جبری گوشہ نشینی سے تنگ آ کر میں نے اسلامی ممالک کی سیاحت شروع کر دی۔ کئی برس تک میں پاکستان سے باہر آتا اور جاتا رہا اس دوران میں نے چار حج کیے اور نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کی زیارتیں بھی۔ 1949ء میں لندن سے ایران کا ویزا حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ایرانی سفیر نے جواب دیا کہ آپ صرف تہران تک جا سکتے ہیں جہاں آپ شہنشاہ کے مہمان ہوں گے، لیکن مشہد سے زاہدان تک آپ کو سفر کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ بلوچوں کا علاقہ ہے۔ اس پر میں نے ایران جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ایران کے موجودہ شہنشاہ ایشیا کی اہم ترین شخصیت ہیں اور ہم بلوچ ان کے مشکور ہیں کہ گزشتہ چند برسوں سے ایران میں موجود بلوچ بھائیوں کی پسماندگی اور غربت دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بلوچوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے جو حکومت بھی کوشش کرے گی ہم بحیثیت قوم اس کے ممنون ہوں گے۔ (شہنشاہ ایران کی زندگی میں یہ کتابچہ شائع ہوا تھا)

بلوچوں کے افغانستان سے تعلقات صدیوں پرانے ہیں۔ مجھے جدید افغانستان کو دیکھنے کی ہمیشہ خواہش رہی۔ ایک زمانے میں وزیراعظم افغانستان شاہ محمود خان مرحوم نے جو میرے گہرے دوست تھے، افغانستان کا دورہ کرنے کی دعوت بھی دی مگر پاکستانی حکومت نے میرا افغانستان میں جانا پسند نہیں کیا بلکہ لیاقت علی مرحوم نے تو اپنے دور میں مجھے صوبہ سرحد پشاور تک جانے کی بھی اجازت نہ دی۔

ان تمام ناخوشگوار واقعات کے باوجود، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا، بلوچوں نے ہمیشہ تحریک آزادی اور قیامِ پاکستان کے لئے کوشش کی۔ اس وقت جب ہندوستانی ریاستیں، مسلم لیگ کے سربراہ حضرت قائداعظم سے تعلق پیدا کرتے ہوئے ڈرتی تھیں، میں نے انہیں ریاست قلات کا آئینی مشیر مقرر کیا۔ قائداعظم نے اس دور میں مجھے جو خطوط لکھے، وہ ان کی محبت اور مسلم لیگ اور تحریک آزادی کے لئے میری ناچیز خدمات کا اعتراف ہیں۔ انہوں نے مجھے واضح طور پر یہ کہا کہ آپ کی ریاست انگریزوں کے ساتھ سیاسی اور فوجی معاہدوں کے ساتھ شریک ہے، لہٰذا آپ علی الاعلان مسلم لیگ میں شمولیت نہ کریں لیکن اس جماعت کو بلوچستان میں مقبول بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔ چنانچہ بلوچ راہنماؤں نواب اسداللہ خاں رئیسانی، میر جعفر خان جمالی، زہری برادران، سیٹھ محمد اعظم خان، پٹھان بھائیوں میں سے قاضی محمد عیسیٰ، نواب محمد خان جوگزئی، خان غلام محمد خان ترین، مسٹر یحییٰ بختیار اور آبادکار بھائیوں میں سے سیٹھ فدا علی اور حاجی رسول خان وغیرہ نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خود میں نے طویل عرصہ تک قائداعظم کی کوئٹہ اور قلات میں میزبانی کی۔ قائداعظم اور مس فاطمہ جناح کو شاہانہ انداز سے بلایا اور رخصت کیا۔ دونوں بہن بھائیوں کو پہلے چاندی میں اور پھر سونے میں تولا۔ ستمبر 1945ء میں دونوں بمبئی سے بلوچستان گئے تو قائداعظم کا وزن 124 پونڈ اور مس جناح کا وزن 104 پونڈ تھا۔ اس وزن کے مطابق چاندی اور سونا ان کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد ایک لاکھ روپے مالیت کا ہار مس جناح کو پیش کیا اس پر دونوں حیران ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ ہم بلوچوں کا یہ دستور ہے اور آپ کو اپنی ذات کے لئے نہ سہی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس کی ضرورت ہوگی۔

قائداعظم پر جب کسی مغالطے میں یا دانستہ (اصل حالات خدا ہی بہتر جانتا ہے) خاکساروں نے قاتلانہ حملہ کیا تو میں نے ان کی حفاظت کے لئے اپنا ذاتی باڈی گارڈ بھیجا جو کافی عرصہ دہلی، کلکتہ اور کراچی میں 7 اگست 1947ء تک ان کی حفاظت کرتا رہا۔ قائداعظم واحد سیاسی رہنما تھے جنہیں قلات میں مکمل فوجی گارڈ آف آنر پیش کیا جاتا یعنی 21 توپوں کی سلامی دی جاتی۔ یاد رہے کہ یہ استقبالیہ صرف وائسرائے ہند کے لئے مخصوص تھا۔ یہی

نہیں، بلکہ مسلم لیگ کے جلسے جلوسوں کے لئے ذاتی موٹریں اور ٹرک اور قیام وطعام کے تمام اخراجات کا اہتمام اس خاکسار نے کیا۔ یہ سارے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ انگریز کے دور میں کس کس خطرے کو دعوت دے کر میں نے پاکستان کے بانی کا ساتھ دیا ہوگا۔ لیکن بلوچ صرف حکومت پاکستان سے باعزت معاہدہ چاہتے تھے جس کے برعکس قلات پر فوج کشی کی دھمکی دی گئی اور چند افسروں نے بانیٔ پاکستان اور میرے مابین غلط فہمیاں پیدا کر کے بلوچستان میں ایک ناخوشگوار صورت حال کو جنم دیا۔

میں یہ باتیں زبانی یادداشت کی بنا پر نہیں کہتا۔ اپریل 1947ء میں آزاد اور خودمختار ریاست قلات کی آئندہ پالیسی کی وضاحت ایک پمفلٹ میں کی گئی، جسے میں نے تحریر کیا۔ اس کے بنیادی نکات حسب ذیل تھے:-

1. حکومت قلات اندرونی اور بیرونی معاملات میں آزاد اور خودمختار حکومت ہوگی اور جناب قائداعظم کی پالیسیوں سے مکمل اتفاق کرے گی اور مسلم لیگ کی تحریک کے لئے ہر ممکن قربانی دے گی۔
2. حکومت قلات کا آئندہ دستور اسلامی قوانین کی بنیاد پر ہوگا اور اس کے حکمران کی حیثیت شرع محمدی کے مطابق محض آئینی ہوگی۔
3. حکومت برطانیہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ اگر اس نے آزادیٔ ہند کے سلسلے میں مسلمانان ہند کے جذبات کا خیال رکھے بغیر کوئی فیصلہ دیا تو نہ صرف اس کے نتائج ان کے لئے اچھے نہ ہوں گے بلکہ بلوچ سردار بھی اُسے ناپسند کریں گے۔

میں نے پاکستان کے لئے برطانوی حکومت کو دھمکیاں ہی نہیں دی تھیں، بلکہ قائداعظم کے مشورے سے قریباً پچاس ہزار بلوچ مجاہدین کے اسلحے، راشن اور وردی کا بندوبست کیا تھا۔ عین اس مرحلے پر مجھے قائداعظم کا پیغام ملا کہ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ ریاست قلات کے علاوہ بلوچستان کے دیگر علاقے جو برٹش بلوچستان کہلاتے ہیں، وہاں پاکستان کے حق یا مخالفت میں استصواب ہوگا۔ آپ اس کے لئے تیاری کریں۔ اس خط کی نقل باقاعدہ میرے پاس موجود ہے۔

یہ مرحلہ میرے نزدیک بہت اہم تھا۔ بلوچستان میں کانگرس نے ایڑی چوٹی کا

زور لگایا۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا، اس کے باوجود رائے شماری میں کانگرس کو شکست ہوئی اور بلوچ سرداروں نے مل کر اپنے عوام کو لے کر پاکستان کے حق میں رائے دی اور اس طرح بلوچستان پاکستان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ خدانخواستہ بلوچستان کے عوام پاکستان کے حق میں رائے نہ دیتے تو نہ کوئٹہ پاکستان میں شامل ہوتا اور نہ بعدازاں دیگر ریاستیں۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ 15 اپریل 1948ء کے بعد قلات کی انتظامیہ سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا تھا اور پولیٹیکل ایجنٹ یہاں من مانی کر رہے تھے۔ کم وبیش دس برس بعد یعنی 17 دسمبر 1957ء کو بلوچ سرداروں کی اکثریت نے مجھ سے ملاقات کی اور مجھے ایک عرضداشت پیش کی۔ اس عرضداشت کے مطابق حکومت پاکستان کو مکمل وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ون یونٹ کے قیام سے صدیوں پرانی روایات اور بلوچی دستور متاثر ہو رہے ہیں اور عوام میں مسائل اور بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔ جواب میں سرداران قبائل سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ مجھے موقع دیں کہ میں صدر پاکستان میجر جنرل سکندر مرزا سے ان مطالبات پر بات کر سکوں چنانچہ میں نے اس ملاقات کے لئے وقت لے کر دیا۔ 18 اکتوبر 1957ء کو کراچی میں مری، بگتی سرداروں سمیت 45 سرداروں نے میرے ہمراہ سکندر مرزا سے بات چیت کی اور مطالبہ کیا کہ ہمارے رسوم و رواج کو نہ چھیڑا جائے، بلوچ علاقوں کی ترقی کے لئے فنڈز ہماری عرضی کے مطابق خرچ کیے جائیں اور معاہدوں کا احترام کیا جائے جو قائداعظم اور خان آف قلات کے درمیان تحریری طور پر معرض وجود میں آئے تھے۔

صدر پاکستان سکندر مرزا نے بظاہر ہمیں تسلی دی اور مجھ سے کہا کہ قلات کی سابقہ پوزیشن کی بحالی کے لئے آپ کسی بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر قانون کی رائے حاصل کریں۔ انہوں نے کہا کہ لندن کے لارڈ میکنائر اس سلسلے میں بہترین رہیں گے۔ اسی مرحلے پر سکندر مرزا نے مجھ سے پاکستانی سیاست پر گفتگو کی جو مس جناح، خان قیوم اور سہروردی سے شدید خائف تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ مجھے پچاس لاکھ روپے دیں میں ریاست قلات کی بحالی کے لئے آپ کی مدد کروں گا۔ سکندر مرزا نے میرے علاوہ بہاولپور اور خیرپور کے والیان سے بھی علی الحساب چالیس لاکھ اور دس لاکھ روپے مانگے اور

کہا کہ اگر یہ رقم انہیں فراہم کر دی جائے تو وہ ان ریاستوں کی بحالی کے لئے فضا ہموار کریں گے۔ میں نے یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آپ خان قیوم، سہروردی اور مس جناح سے خود گفتگو کریں اور کاروبار حکومت وزیراعظم پر چھوڑ دیں۔ میں نے یہ بھی پیشکش کی کہ میں آپ کی صلح ان تینوں سے کروا دیتا ہوں۔

انہی دنوں سکندر مرزا نے مجھ سے ایک تجویز پر مشورہ طلب کیا۔ انہوں نے کہا کہ میرا ارادہ مارشل لا نافذ کرنے کا ہے۔ میں آپ کو نائب صدر اور نواب بھوپال کو وزیراعظم بنا دوں گا۔ آپ بلوچستان کی طرف سے مجھے حمایت کا یقین دلائیں۔ میں کانپ اٹھا اور کچھ سوچ کر یہ پوچھا کہ آپ نے ایوب خان سے یہ بات کی ہے؟ سکندر مرزا بولے کہ اگر وہ میری بات نہیں مانے گا تو میں اسے کان سے پکڑ کر نکال دوں گا۔ میں نے کہا یہ ممکن نہیں۔ ایوب خان فوج میں مقبول ہے اور وہ کبھی ایسے اقدام میں آپ کی مدد نہیں کرے گا۔ اس پر سکندر مرزا نے مجھ سے کہا کہ آپ ایوب خان کو ٹٹولیے۔ اتفاق سے اسی شام ایک تقریب میں ایوب خان سے میری سیڑھیوں پر ملاقات ہوئی۔

میں نے ایوب خان سے پشتو میں پوچھا کہ اس کا مارشل لا کے بارے میں کیا خیال ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایوب خان نے مجھ سے کہا کہ وہ ایسے غیر قانونی اقدام پر کبھی تیار نہیں ہو گا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس وقت تک دل سے یہی سمجھتے تھے، البتہ پونے دو سال بعد ایوب خان نے سکندر مرزا کی بات ضرور مانی لیکن فوراً ہی خود سکندر مرزا کو اقتدار سے الگ کر دیا۔ میری رائے میں لیاقت علی پاکستان کے آخری سیاسی حکمران تھے۔ اس کے بعد عملاً ملک فوجی اور سول افسروں کے قبضے میں چلا گیا جو لندن اور واشنگٹن کے اشاروں پر چلتے تھے۔ غیر ملکی سامراجی آلہ کاروں کی حکومت نے 1952ء سے 1971ء تک اپنا سکہ چلایا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا کہ سکندر مرزا سے تبادلۂ خیال کے بعد مارچ 1957ء کو لندن روانہ ہوا۔ امریکہ بھی گیا اور وہاں علاج کے بعد اگست 1958ء میں لندن رکا اور لارڈ میکنائر سے بات کی جن کی رائے یہ تھی کہ ون یونٹ میں قلات کا انضمام قانونی نہیں، کیونکہ اگر صوبہ سرحد میں ون یونٹ کے باوجود ریاستیں بحال ہیں تو قلات بھی بحال ہو سکتی ہے۔ اگست 1958ء میں بلوچستان واپسی ہوئی۔ امن وامان کی صورت حال نازک

ہو چکی تھی اور قبائلی سرداروں نے مقامی انتظامیہ کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ کمشنر قلات نے مجھ سے درخواست کی کہ خضدار میں منعقد ہونے والے جرگے میں بلوچ سرداروں کو آنے پر آمادہ کروں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ حکومت پاکستان سے کسی قسم کی آویزش ہو، لہٰذا میں نے بمشکل قبائلی سرداروں کو منایا۔ 14 اکتوبر 1958ء کو سکندر مرزا کو تار ملا کہ کراچی پہنچ کر میں اُن سے ملوں۔ میں سکندر مرزا سے بدظن تھا چونکہ میں نے اسے روپیہ دینے سے انکار کیا تھا، لہٰذا مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے دوبارہ استعمال کرنے کی کوشش کرے گا یا گرفتار کر لے گا، تاہم میں نے انہیں مطلع کیا کہ میں جلد ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ چنانچہ قبائلی سرداروں سے مشورہ کیا کہ لارڈ میکنائر کی قانونی رائے کے مطابق ان سے کیا بات کرنا ہو گی۔ میری رائے میں سکندر مرزا بیرونی طاقتوں کے زیر اثر تھا، اس کی بیوی ناہید ایک پراسرار ایرانی عورت تھی جو چار برس تک ایک ایرانی افسر کی بیوی رہی۔ مجھے وہ ہمیشہ ماتا ہری کی طرح خطرناک جاسوسہ نظر آئی۔ سکندر مرزا پاکستان میں سیاہ و سفید کا مالک تھا تو ناہید اس پر پوری طرح حاوی تھی۔ بہرحال یہ عورت جو کسی خاص مشن پر مامور تھی، پاکستان کی کشتی میں شگاف ڈال کر چلتی بنی۔

6 اکتوبر 1958ء کی ایک خون آشام صبح اذان کی آواز کے ساتھ ہی پاکستانی فوج کے ٹینک، بکتر بند گاڑیاں اور ٹرک قلات کے چاروں طرف پہنچ گئے۔ قلات سے کوئٹہ تک 96 میل کا فاصلہ ہے، یہ سڑک پاکستان کی فوج سے بھری ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے توپ کے گولے برسنے لگے اور بلوچی مسلمان حیران رہ گئے کہ ان کا قصور کیا ہے۔ گولیوں کی بارش میں قلات کے چھ معصوم شہری شہید ہو گئے۔ پورا شہر، مضافات میں جھلاواں کی وادیاں خوف و دہشت کی لپیٹ میں تھیں۔ میں نے اپنے مکان سے باہر متعین فوجی افسر سے اچانک حملے کی وجہ دریافت کرائی تو پتہ چلا کہ میں نے قلعہ میں 80 ہزار بلوچوں کا لشکر اور ہتھیار جمع کر رکھے ہیں اور میں پاکستان کے خلاف بغاوت کا اعلان کر چکا ہوں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ الزام اس شخص پر تھا جس سے قائداعظمؒ نے بھری محفلوں میں یہ کہا کہ خان اگر آپ میری مدد نہ کرتے تو پاکستان قائم نہ ہوتا۔ میں نے فوجی افسروں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر بے چارے مجبور تھے۔ میرے گھر سے اور قلعہ سے انہیں اسی ہزار

مسلح تو کیا ملتے تاہم چند محافظ اور ملازم پکڑ لیے گئے اور مجھے گرفتاری کا حکم سنا دیا گیا۔

میں نے قرآن شریف بغل میں دبایا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں دانستہ گھمایا گیا۔ میں نے معصوم بچوں کو تڑپتے اور جوانوں کو گولیوں سے چھلنی ہوتے دیکھا۔ اگر کوئی الوداع کہنے میری طرف آیا تو اسے بھون دیا گیا۔ میرے گھر میں پندرہ ہزار فوجیوں نے اپنا کیمپ لگایا، میری بیگم اور بچوں کو ایک کمرے میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہ کرنسی چھاپنے کی مشین اور پاکستان کے خلاف لٹریچر تلاش کرنے کے لئے سامان کی اکھاڑ پچھاڑ کرنے لگے۔ اسلحہ خانے میں ہتھیاروں پر دو دو انچ مٹی کی تہہ جمی تھی۔ میرے گھر کا سامان اس بے رحمی سے لوٹا گیا جیسے لٹنے والا مسلمان خلیفہ ہو اور لوٹنے والے تاتاری۔ قلات سے لاہور کے قید خانے تک میں نے ایک عجیب جذبے کے تحت سفر کیا۔ بار بار میرے جی میں آتا کہ ہم بلوچوں کا کیا قصور ہے۔ کیا پاکستان، اور بانیٔ پاکستان سے محبت کی یہی سزا ہے جو ہمیں مل رہی تھی۔

16 اکتوبر 1958ء کی دوپہر، ریڈیو پاکستان نے جب میری گرفتاری کی خبر نشر کی تو کوئٹہ، سبی، مستونگ، نوشکی، مچھ، بولان، ڈھاڈر اور تمام کوہستانی بلوچستان میں صف ماتم بچھ گئی۔ کوئٹہ کے عوام نے جلوس نکالا تو شہر میں فوج کا پہرہ لگا دیا گیا۔ نواب خیر بخش مری تین روز تک میری طرف سے ایوانِ قلات کے لان میں استفسار کے لئے آنے والوں کو تسلی دیتے رہے۔

8 اکتوبر 1958ء سے اچانک تمام پاکستان میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اس کے باوجود اسی روز بلوچستانی اخباروں نے میری گرفتاری پر اداریے شائع کیے۔ 18 اکتوبر ہی کو کوئٹہ سے پختون رہنما عبدالصمد اچکزئی، ملک عبدالعلی خان، بلوچ رہنما میر عبدالعزیز خاں کرد، میر عبدالرحمٰن کرد، مستونگ سے آغا عبدالکریم خان، نوابزادہ عبدالقادر شاہوانی اور بہت سے دیگر افراد قید کیے گئے۔ اسی طرح قلات سے میرے لڑکے محی الدین کے علاوہ لال بخش مینگل اور دیگر پچاس رہنماؤں کو زیر حراست رکھا گیا۔

اس ناگہانی یلغار میں جس بلوچ کے ہاتھ میں جو کچھ آیا، اس نے اپنے تحفظ کی خاطر اسے لے کر پہاڑوں کا رخ کیا اور بہ امر مجبوری مورچہ بند ہو گیا۔ حکومت نے اس پر یہ

سمجھتے ہوئے کہ کہیں عام بغاوت نہ ہو جائے، ہوائی جہازوں کے ذریعے اشتہار پھینکے کہ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس آ جائیں اور 28 اکتوبر کو مستونگ میں جرگہ منعقد ہوگا جس میں خان آف قلات بھی شریک ہوں گے۔

میری گرفتاری کے بعد فوج نے باقاعدہ جھالاواں پر چڑھائی کر دی۔ وہاں پناہ لینے والے بلوچ اپنے ہتھیار کیسے حکومت کے حوالے کر سکتے تھے، لہٰذا جھڑپوں کا آغاز ہوا۔ پہلی جھڑپ ڈانسر کے مقام پر ہوئی جہاں تین بلوچوں نے چار روز تک فوج کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا حتیٰ کہ ان کی گولیاں ختم ہو گئیں۔ حاجی نیک محمد مینگل کی سرکردگی میں بلوچوں نے پاکستانی افسروں کے ناجائز احکامات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے پاکستانی اعلیٰ حکام نے مینگلوں سے ملنے کی سرتوڑ کوشش شروع کر دی۔

انہی دنوں نواب نوروز خان نے اپنے جنگجو قبائل کے ساتھ سپاہیانہ شان و شوکت دکھاتے ہوئے میر گھاٹ کو اپنا اڈہ بنایا اور فوجی حکام سے اپیل کی کہ خان آف قلات کو باعزت طور پر رہا کر دیں، میں اور میرے قبائل ہتھیار ڈال دیں گے۔ لیکن حکام نے قرآن حکیم کا واسطہ دے کر نواب صاحب سے درخواست کی کہ وہ ان کے پاس بحیثیت مہمان آئیں اور صلح کی بات کریں۔ قرآن کا یہ شیدائی نوے سالہ نواب نوروز خاں اپنے ساتھیوں کو لے کر چند افسروں سے ملنے آیا لیکن افسروں نے دھوکے سے راتوں رات اسے گرفتار کر کے کوئٹہ میں بدنامِ زمانہ قلی کیمپ میں نظر بند کر دیا۔ اس پر بلوچ قبائل میں سخت ردعمل ہوا اور اس پر میر مستی خاں اور میر بہادر خاں نے چند امریکیوں کو جو وہاں سروے کرنے آئے تھے، پہلے گرفتار کیا پھر اس شرط پر رہا کیا کہ وہ باہر جا کر ساری دنیا کو یہ پیغام دیں گے کہ بلوچ آمریت کے خلاف نبرد آزما ہیں اور خان آف قلات کی رہائی چاہتے ہیں۔ بیس ہزار سپاہی، ہزاروں توپوں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے بلوچوں پر گولہ باری اور گولیاں برساتے رہے، سرسبز اور شاداب وادیاں ویران ہو گئیں۔ کھیت اور باغات جلا دیئے گئے۔ دکانیں لوٹ لی گئیں اور غریب عوام کی بھیڑ بکریاں کوئٹہ اور سبی کے بازاروں میں نیلام ہوئیں۔

غازی کیمپ کی طرز پر کوئٹہ میں قلی کیمپ قائم کیا گیا جہاں بلوچوں کو رات دن بیدار

رکھا جاتا۔ ان کے بال اکھاڑے جاتے، انہیں برف پر لٹایا جاتا، انہیں بجلی کے شاٹ دیئے جاتے، ڈاڑھی نوچنے، آنکھوں میں مرچیں چھڑکنے، پانی کے نلکے منہ میں ٹھونس کر پانی تیز چھوڑنے، غلاظت منہ میں ڈالنے تک کی سزائیں دی گئیں۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ تسلیم کریں کہ خان آف قلات پاکستان کے خلاف بغاوت کی تیاری کر رہا تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ اس کیمپ میں اذیتوں کی تاب نہ لا کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اکثر معذور و مجبور ہو گئے۔ بعض اندھے بہرے اور گونگے ہو گئے۔ کئی اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہو گئے حالانکہ یہ سب لوگ بے گناہ تھے اور انہیں مجبوراً اس جنگ میں دھکیلا گیا تھا۔ قلی کیمپ میں اذیت پانے والے معززین میں سے آغا عبدالکریم خان، میر محمد حسین عنقا، آغا محمد نصیر خاں، میر غوث بخش بزنجو، میر گل خاں نصیر، میر عبدالعزیز کرد، سردار دودا خاں زرکزئی، میر گوہر خاں زرکرزئی، ملا سعداللہ خاں، ملک اللہ بخش خاں، نواب محمد علی خاں تمگسی، میر سیف اللہ خاں تمگسی، سردار محمد زماں محمد شہی، قادر بخش زہری، میر بدل خاں زہری، میر محمد حیات، جمعدار جمال خاں، حاجی محمد وفا، ملاں جمعہ خاں موسیان، میر نیک محمد مینگل، میر نواب خان زہری، میر فیروز خاں لہڑی، ملاں محمد فضل مینگل، میر محمد امیر شہی، عالیجاہ غوث بخش، میر عبدالعزیز قلندرانی، میر سادل خاں اور ان کے سینکڑوں رفقا تھے۔

سردار دینار خاں کرد کے شکاری محمد عمر کو قلی کیمپ میں اس قدر روح فرسا سزائیں دی گئیں کہ ایک سال بعد اسے رہا کیا گیا تو وہ بیوی کے سامنے شرمندگی کی تاب نہ لا کر اپنی ہی بندوق سے خودکشی کر گیا۔ ڈھاڈر سے کول پور تک تمام پہاڑوں، دروں، سرنگوں اور اہم مقامات پر ایوبی آمریت کے خلاف نعرے لکھنے اور پمفلٹ شائع کرنے کے الزام میں 22 افراد گرفتار کر لیے گئے۔ ان میں میر عبدالرحمان کرد، میر عبدالعزیز کرد، میر احمد یار کرد اور میر محمد یوسف کو تفتیش کے لئے شاہی قلعہ لاہور میں لے جایا گیا۔

ریل فائرنگ کیس میں نور محمد خاں بنگلوئی، سردار بنگلوئی، میر محمد زماں بنگلوئی، میر نور محمد بنگلزئی، ملاں عبدالعزیز قلندرانی شامل تھے۔ ان مظالم کے خلاف احتجاجی جلسے کرنے کے سلسلے میں محمد اعظم شاہوانی، میر محمد حسن نظامی وغیرہ گرفتار ہوئے۔ علاوہ ازیں آغا سلطان ابراہیم خاں کو افغانستان پہنچانے کے الزام میں ہمارے پشتون بھائیوں ارباب

شاہنواز خاں، ملک عبدالعلی خاں، محمد یوسف غلوئی، میر عبدالرحمٰن شاہوانی اور میر نادر قمبرانی قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیے گئے۔ نادر خاں قمبرانی کو دس سال تک جلاوطن رہنا پڑا۔

جھلاواں کے قبائلی سرداروں نے میری گرفتاری اور مظالم پر مکمل بغاوت کا اعلان کیا۔ ادھر میری بیگم اور بچوں کو بلوچستان سے ضلع جہلم کے چوا سیدن شاہ کے قید خانے میں پہنچا دیا گیا۔ بیگم صاحبہ کا اردلی میر بہاول خاں موسیانی، چھپتا چھپاتا جھلاواں پہنچا اور زہری قبیلے کو اس صورت حال کا احساس دلایا، آخر بلوچوں کی رگِ حمیت پھڑکی اور انتظامیہ کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ حکام نے ایک بار پھر دھوکا کیا اور میرے کوہستانی شیروں کو قرآن مجید کا واسطہ دے کر پہاڑوں سے اتار لیا۔

اگست 1962ء میں ایوب خاں ملک امیر محمد خاں کے ساتھ کوئٹہ آئے اور مسلح افواج کی حفاظت میں نہایت اشتعال انگیز تقریر کی۔ اگلے ہی روز بلوچوں نے جوابی جلسہ کیا جس میں سندھ کے سیاسی راہنما میر رسول بخش تالپور بھی شامل تھے اور ایوبی آمریت کو للکارا۔ ایوب نے مشتعل ہو کر ایک بار پھر سختی کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ بلوچوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔ بلوچستان کے کونے کونے سے گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اکبر خاں بگٹی، عطاء اللہ مینگل، میر عبدالعزیز کرد، میر عبدالقادر شاہوانی، میر گل خاں نصیر، میر عبدالرحمان کرد، میر محبوب عزیز کرد، میر لعل بخش مینگل اور دوسو دیگر بلوچ رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا۔ ان پر بغاوت کے الزامات میں طویل مقدمات چلائے گئے اور کوئٹہ، مچھ، بولان، سندھ اور بلوچستان کی مختلف جیلوں میں قید رکھا گیا۔ میں کئی برس سے قید تھا، لیکن بالآخر حکومت پاکستان اس نتیجے پر پہنچی کہ میری گرفتاری بلوچستان میں حالات کو مزید خراب کر رہی ہے۔ بستی میں شہیدوں کی لاشیں پہنچیں، نوکر شاہی نے بعض سرداروں کو معزول کر کے اپنے ہم خیال سرداروں کو آگے لانا چاہا تو مری اور بگٹی قبائل بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور 1967ء تک ظالموں کو دندان شکن جواب دیتے رہے۔

1961ء میں پاکستان میں بالغ رائے دہی کی بنا پر انتخابات ہوئے اور بلوچ عوام نے جن افراد کو منتخب کیا انہوں نے مجھے مبارکباد کے تار ارسال کیے۔ نواب خیر بخش مری، عطاء اللہ مینگل، سردار دودا خاں زرکزئی اور نواب زادہ یوسف علی مگسی ان ساتھیوں میں

سے تھے جو منتخب ہوئے۔ نواب خیر بخش مری اور عطاء اللہ مینگل نے پاکستان اسمبلی میں بلوچستان پر ظلم و تشدد کی داستانیں بیان کیں اور اس طرح دنیا تک قلی کیمپ کی کارروائیاں اور جبر و تشدد کی داستانیں پہنچیں۔

لہٰذا 6 نومبر 1962ء کو مجھے رہا کر دیا گیا اور قلات کی سربراہی اور سابقہ اعزازات واپس کر دیئے گئے۔ مجھ سے خواہش کی گئی کہ میں بلوچ عوام سے انتظامیہ کی صلح کرواؤں۔ میں کوئٹہ پہنچا تو لاکھوں بلوچوں نے مسرت و شادمانی کا اظہار کیا۔ اس تمام عرصے میں میر جعفر خاں جمالی مرحوم نے انتہائی محبت اور خلوص کا ثبوت دیا۔ مجھے فخر ہے کہ میرے بلوچ بھائیوں نے بہادری سے نوکر شاہی کے ظلم و ستم کا مقابلہ کیا اور سچائی کے لئے ڈٹ گئے۔ میری قید کے دوران میں قلات میں میرے قائم کردہ سکول کے نام بدل ڈالے گئے۔ قلات کا شہری علاقہ جو میری ذاتی جائیداد شمار ہوتا تھا، وہاں مقیم عملے کو سرکاری ملازم بنا لیا گیا اور میری جائیداد کو کسی قسم کا معاوضہ دیئے بغیر قبضے میں لے لیا گیا۔ مستونگ میں میرے شاہی باغ پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ اکیس توپوں کی سلامی جو ایک آزاد ریاست کے حکمران کے طور پر میرا حق تھی وہ بھی لے لی گئی اور دوسرے ریاستی حکمران کی طرح وظائف کی رقوم میں اضافے کی بجائے مجھ سے تمام مراعات چھین لی گئیں۔ یہ صلہ تھا میری وفاداری کا اور حضرت قائداعظمؒ سے عقیدت و محبت کا اور مسلم لیگ کے لئے فنڈز مہیا کرنے کا۔ نیز یہ حشر تھا اس معاہدے کا جس پر خود حضرت قائداعظمؒ کے دستخط موجود ہیں اور جس کے مطابق ریاست قلات کو اپنی آزادی کے ساتھ پاکستان سے باہمی سمجھوتہ کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

13 جنوری 1970ء کو ون یونٹ کی تنسیخ کا اعلان ہوا اور میں نے یحییٰ خاں کی خدمت میں بلوچ ریاستوں کی طرف سے ایک مراسلہ بھیجا۔ ہم نے درخواست کی کہ بلوچستان کی ریاستوں کی الگ یونین بنا دی جائے کیونکہ ون یونٹ کی تنسیخ کے بعد ان کا کوئٹہ سے الحاق درست نہیں اور وہ کوئٹہ کی انتظامیہ کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے، لیکن اس پر بھی کوئی توجہ نہ دی گئی۔

خدا تعالیٰ شاہد ہے کہ ہم بلوچوں نے پاکستان کے قیام کی خاطر ہر ممکن کوشش کی

تھی، متحد اور خوش حال پاکستان ہی ہماری آخری منزل ہے، لیکن ہم پر بغاوت اور سرکشی کے جھوٹے الزام لگا کر عاقبت نا اندیش پاکستانی حکمرانوں نے بلوچستان میں بلاوجہ علیحدگی پسندی کے جراثیم پھیلائے۔ بلوچ قوم کی پوزیشن یہ ہے کہ بلوچستان کے علاوہ یہ ایران، افغانستان اور سرحد میں بھی آباد ہیں اور ان کی تعداد 1973ء تک تین کروڑ کے لگ بھگ ہو گی۔ میری قوم کے افراد نے کبھی حکومت کے خلاف بغاوت نہیں کی۔ کبھی پاکستان سے الگ ہونا نہیں چاہا، کبھی آزاد بلوچستان جیسے مہمل اصطلاحوں پر کام نہیں کیا۔ ہم نے محض یہ چاہا کہ پاکستانی حکمران ہمارے جائز حقوق اور ہمارے ساتھ کیے گئے معاہدوں کے مطابق انصاف اور رواداری سے کام لیں، ہماری عزتِ نفس کا احترام کریں اور ہم سے محبت و یگانگت کا برتاؤ رکھیں۔ برس ہا برس سے ہم پر ظلم توڑے گئے، ہمارے لوگوں پر تشدد کیا گیا، انہیں اپنی عزت، جان، مال اور آبروہی کی خاطر ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا گیا۔

یہ ظلم کی دستان کب ختم ہوگی، بلوچ عوام کو کب حقیقی انصاف اور عزتِ نفس واپس ملے گی۔ مجھے یقین ہے وہ دن ضرور آئے گا۔ ہم نے بلاشبہ مظالم برداشت کیے ہیں، لیکن ہم دل والے لوگ ہیں اس لئے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے کیونکہ لہریں چٹانوں سے ٹکراتی ضرور ہیں لیکن سرپٹخ کر واپس آجاتی ہیں اور چٹانیں اپنی جگہ قائم رہتی ہیں۔

قائداعظمؒ اور بلوچستان

قائداعظم محمد علی جناح پہلی دفعہ 1943ء میں بلوچستان تشریف لائے، لیکن اس صوبے سے ان کے تعلق خاطر کی تاریخ 1929ء سے شروع ہوتی ہے جب انہوں نے بلوچستان کی صوبائی خودمختاری کو اپنے مشہور بلکہ تاریخی چودہ نکات میں شامل کیا۔ اس سال آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس میں بھی ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ اس کے بعد بھی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے یہ مطالبہ وقتاً فوقتاً دہرایا گیا۔ یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس زمانے میں بلوچستان میں مسلم لیگ کی کوئی شاخ بھی قائم نہیں ہوئی تھی، جس کے ذریعے اہلِ بلوچستان اپنے حقوق کے سلسلے میں آواز بلند کرتے۔ اس کے باوجود قائداعظم نے اپنے طور پر اور سب سے پہلے بلوچستان کی ترجمانی کرتے ہوئے اسے صوبائی خودمختاری دینے کا مطالبہ کیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے مفاد کو عزیز رکھتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ سیاسی لحاظ سے یہ صوبہ بھی ملک کے دوسرے صوبوں کی سطح پر آجائے۔ یہیں سے کانگرس اور دوسری سیاسی جماعتوں کا طرز عمل بھی بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے جنہوں نے بلوچستان کے حقوق و مفادات سے بے نیازی اختیار کر رکھی تھی۔

بلوچستان سے قائداعظم کا رابطہ دو اہم شخصیتوں کے توسط سے ہوا، میری مراد نواب یوسف علی عزیز مگسی اور قاضی عیسیٰ سے ہے۔ عزیز مگسی مرحوم کو خدا تعالیٰ نے ایک حساس اور دردمند دل دیا تھا۔ وہ بلوچستان کی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی پسماندگی کو ملک

کے دوسرے علاقوں کے حوالے سے محسوس کرتے تھے۔ اپنے اس مشن کے سلسلے میں انہوں نے کئی بار قائداعظم سے بھی ملاقات کی۔ ان ملاقاتوں میں لازمی طور پر بلوچستان کے حالات بھی زیر بحث آئے ہوں گے۔ کچھ عجب نہیں کہ قائداعظم نے 1936ء میں جب مسٹر غلام بھیک نیرنگ کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں بلوچستان کی صوبائی خودمختاری کی قرارداد پیش کریں، تو اس پس منظر میں وہ ملاقاتیں بھی ہوں جو یوسف علی عزیز مگسی نے 1934ء اور 1935ء میں آپ سے کی تھیں۔

1938ء میں قاضی محمد عیسیٰ، انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وطن واپس آئے تو چند ہی مہینے بعد انہوں نے بمبئی پہنچ کر قائداعظم سے ملاقات کی۔ قائداعظم میں دوسری خوبیوں کے علاوہ ایک بڑا وصف یہ بھی تھا کہ وہ مردم شناس تھے، چنانچہ اس ملاقات میں انہوں نے قاضی محمد عیسیٰ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ بلوچستان میں مسلم لیگ کے قیام کے لئے کوشش کریں۔ قاضی صاحب نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور 1939ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صوبائی شاخ قائم کر دی جس میں صوبے کے بعض ممتاز رہنماؤں مثلاً میر جعفر خان جمالی، علامہ عبدالعلی، سردار صورت خان ترین اور کئی دیگر سرکردہ اشخاص نے شمولیت اختیار کی۔ صوبے میں مسلم لیگ کے قیام سے قائداعظم کا یہاں کے عوام سے باقاعدہ رابطہ قائم ہو گیا۔

بلوچستان مسلم لیگ کی پہلی کانفرنس دس گیارہ جون 1939ء کو کوئٹہ میں منعقد ہوئی اور اس کانفرنس میں قاضی محمد عیسیٰ کو صوبائی لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس موقع پر قائداعظم محمد علی جناح نے بھی مبارکباد کا ایک تار بھیجا جس میں انہوں نے بلوچستان مسلم لیگ کے قیام پر مسرت کا اظہار کیا تھا۔

مارچ 1940ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ تاریخی سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ اور آزاد و خودمختار وطن کے قیام کی قرارداد منظور کی گئی اور جو بعد میں قراردادِ پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس اجلاس میں نہ صرف بلوچستان مسلم لیگ کے نمائندے شریک ہوئے بلکہ اجلاس میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے بلوچستان مسلم نیشنل گارڈز کا ایک چاق و چوبند دستہ بھی وہاں گیا اور جب قائداعظم لاہور پہنچے تو ان کے

استقبال کے موقع پر جن رضا کار تنظیموں نے ان کو سلامی پیش کی، ان میں یہ دستہ خاص طور پر نمایاں تھا۔ قرارداد کی تائید میں جن مقررین نے اظہار خیال کیا ان میں قاضی محمد عیسیٰ بھی شامل تھے، لیکن تائید صرف اجلاس تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پورے بلوچستان میں اس قرارداد کا خیر مقدم کیا گیا۔ صوبے میں متعدد مقامات پر بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں عوام کو قرارداد کے پس منظر اور دو قومی نظریے کے معنی و مفہوم سے روشناس کرایا گیا۔ اس طرح صوبے کے دور افتادہ اور پسماندہ علاقوں میں تحریکِ پاکستان کا پیغام پہنچ گیا۔ یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اگرچہ کانگرس اور بعض دوسری جماعتیں یہاں پہلے سے قائم چلی آ رہی تھیں، لیکن ان کا حلقۂ اثر محدود تھا۔ اس کے برعکس مسلم لیگ یہاں دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہو گئی۔ اس صوبے میں مسلم لیگ کو کوئی مزاحمت بھی پیش نہ آئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف صوبے کی 99 فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی بلکہ ان میں اسلامی قومیت کا جذبہ اور شعور بھی اتنا مضبوط و صحت مند تھا کہ انہوں نے مسلم لیگ ہی کے پرچم تلے جمع ہونے کا فیصلہ کیا۔ کسی دوسری جماعت میں انہوں نے شاید ہی کشش محسوس کی ہو۔ قراردادِ پاکستان کی منظوری کے چار مہینے بعد، جولائی 1940ء کو کوئٹہ میں بلوچستان مسلم لیگ کا دوسرا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں مطالبۂ پاکستان کی پرزور تائید کی گئی اور قائداعظم محمد علی جناح پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا۔

جون 1943ء میں قائداعظم کوئٹہ تشریف لائے۔ یہاں ان کا نہایت عظیم الشان اور پرتپاک طریقے سے خیر مقدم کیا گیا۔ ریلوے سٹیشن پر ان کی ایک جھلک دیکھتے ہی ہزاروں افراد نے قائداعظم زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے بلند کیے۔ قائداعظم کے استقبال کے لئے صوبے کے دوسرے شہروں سے بھی بہت سے لوگ کوئٹہ پہنچے ہوئے تھے۔ ریلوے سٹیشن سے جب موٹر کاروں، بگھیوں، اونٹ گاڑیوں کے جلوس میں ہزاروں افراد پیدل بھی جا رہے تھے تو ان کا ایک سرا قندھاری بازار میں مسلم لیگ کے دفتر تک پہنچا تو دوسرا سرا ابھی تک ریلوے سٹیشن سے روانہ بھی نہیں ہوا تھا۔ جلوس کی گزرگاہ کے دو رویہ بھی لوگ قطاروں میں کھڑے تھے۔ جگہ جگہ استقبالیہ محرابیں، خیر مقدمی بینر اور رنگ برنگ جھنڈیاں نصب تھیں۔ اس سے قبل ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی شخصیت کا ایسا

پرجوش و والہانہ استقبال کیا گیا ہو۔

قائداعظم نے بلوچستان میں دو مہینے قیام کیا۔ یوں تو انہوں نے اپنی زندگی میں ملک کے تمام علاقوں کے دورے کیے لیکن یہ شرف صرف بلوچستان کو حاصل ہے کہ انہوں نے اسے اتنی طویل مہمان نوازی کا موقع دیا۔ اپنے قیام کے دوران انہوں نے صوبے کے حالات کا بڑی اچھی طرح جائزہ لیا۔ بیشمار لوگوں نے آپ سے ملاقات کی عزت حاصل کی اور مقامی مسائل پر آپ سے تبادلۂ خیال کیا۔ متعدد جماعتوں اور تنظیموں کے وفود نے بھی آپ سے ملاقات کی۔

جولائی 1943ء میں صوبائی مسلم لیگ کا تیسرا سالانہ اجلاس قاضی محمد عیسیٰ کی صدارت میں منعقد ہوا جس سے قائداعظم نے بھی خطاب کیا اور اہل بلوچستان کو مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہونے کی دعوت دی۔ اس اجلاس میں متعدد قراردادیں بھی منظور کی گئیں جن میں صوبائی خودمختاری کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ ایک اور قرارداد میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ کوئٹہ میں ڈگری کالج اور صوبے کے دوسرے علاقوں میں زنانہ مدارس قائم کیے جائیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس وقت بلوچستان بھر میں ایک ہی ہائر سیکنڈری سکول قائم تھا جو کوئٹہ میں غالباً 1939ء میں قائم کیا گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اسے ڈگری کالج بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ صوبے کے بلدیاتی اداروں میں نامزدگی کا طریق کار رائج تھا، چنانچہ مسلم لیگ کے اجلاس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ نامزد بلدیاتی اداروں کی جگہ منتخب بلدیاتی ادارے قائم کیے جائیں۔ اجلاس میں قاضی محمد عیسیٰ نے مسلمانانِ بلوچستان کی طرف سے قائداعظم کو ایک تلوار نذر کی جسے قبول کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ”آپ نے مجھے جو تلوار عنایت کی ہے وہ صرف مسلمانوں کی حفاظت کے لئے اٹھے گی۔ لیکن سرِ دست آپ کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ تعلیم ہے، کیونکہ علم تلوار کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور ہے لہٰذا علم حاصل کیجئے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر ضرورت پڑی تو ہم اپنا سب کچھ یہاں تک کہ جان بھی قربان کر دیں گے۔ لیکن اس مقصد کے لئے پہلے تیاری کرنی چاہیے۔ ہم بلاوجہ قربانی نہیں چاہتے۔“

بلوچستان میں قائداعظم کی تشریف آوری اور ان کے آٹھ ہفتے کی قیام کا نتیجہ یہ ہوا کہ

صوبے کے طول و عرض میں تحریکِ پاکستان کے حق میں ایک حیرت انگیز جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ انہی دنوں خواتین کا بھی ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں لیڈی ہارون، صدرِ جلسہ کی حیثیت سے شریک ہوئیں۔ محترمہ فاطمہ جناح نے بھی شرکت کی اور بیگم قاضی عیسیٰ نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے تحریک پاکستان کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی۔ بلوچستان میں اپنے قیام کے دوران قائداعظم، خان قلات میر احمد یار خان مرحوم کی دعوت پر قلات بھی تشریف لے گئے جہاں انہوں نے چار دن قیام کیا اور ریاست کی اہم شخصیتوں نے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد زیارت بھی گئے۔ پشین میں بھی ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا غرضیکہ آپ کی رابطۂ عوام کی مہم خاصی کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور رائے عامہ کو ہموار کرنے اور انہیں تحریکِ پاکستان سے روشناس کرانے میں بڑی مدد ملی۔ صوبے کے مختلف شہروں میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم ہو گئیں اور وقفے وقفے کے بعد ان کے اہتمام میں جلسے بھی منعقد ہوتے رہے غرضیکہ تھوڑے ہی عرصے میں بلوچستان گویا مسلم کا صوبہ بن گیا۔

ستمبر 1945ء میں قائداعظم دوبارہ بلوچستان کے دورے پر تشریف لائے۔

اس دورے میں آپ نے چند روز کے لئے مستونگ میں بھی خان قلات کے مہمان کی حیثیت سے قیام کیا۔ اکتوبر کے مہینے میں کوئٹہ میں دو بڑے جلسے منعقد ہوئے جن سے آپ نے خطاب کیا۔ آپ نے کہا کہ برصغیر میں مسلمانوں کے مفاد کی نمائندگی اب مسلم لیگ ہی کا فرض ہے۔ دوسری ہندو جماعتوں میں اب مسلمان برائے نام ہی رہ گئے ہیں کیونکہ مسلمانوں کو یہ گوارا نہیں ہے کہ ملک میں ہندو راج قائم ہو جائے۔ آپ نے مسلمانوں کو اس مقصد کے لئے اتحاد قائم کرنے کی اپیل کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کانگرس کے جھوٹے پروپیگنڈے کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ اگر ملک میں ہندو راج قائم ہو گیا تو مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو جرمنی میں یہودیوں کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔ کانگرس کا مقصد آزادی حاصل کر کے مسلمانوں کو سنگینوں کے بل پر ختم کرنا ہے، لیکن ہمارا مطالبہ بالکل واضح ہے۔ ہم مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کی آزاد اور خودمختار ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے مسلم لیگ کے لئے چندے کی اپیل کی۔ جس کے

جواب میں اہلِ بلوچستان نے آبادی کے تناسب سے دوسرے تمام صوبوں سے کہیں زیادہ رقم آپ کی خدمت میں پیش کی۔ ایک صاحب نے جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے، آپ کی خدمت میں چاندی کی دو سلاخیں بھیجیں جن کا وزن ساڑھے پانچ ہزار تولے تھا۔ مقامی شیعہ ایسوسی ایشن نے دو ہزار پانچ سو روپے کی اور مسلمان ریلوے ملازموں نے چھ سو روپے کی تھیلیاں پیش کیں۔

یہ قائداعظم کا دوسرا دورہ بلوچستان تھا، جس میں آپ نے تقریباً پانچ ہفتے یہاں قیام فرمایا۔ اب یہاں مسلم لیگ کی جڑیں عوام میں بہت گہری جا چکی تھیں اور یہ صوبہ قیام پاکستان کے لئے اتنا ہی بے قرار تھا جتنے مسلم اکثریت کے دوسرے صوبے۔ اس کا ثبوت بعد میں پیش آنے والے واقعات سے ملتا ہے خاص طور پر اس واقعہ سے کہ جب جولائی 1946ء میں دستور ساز اسمبلی کے لئے بلوچستان سے ایک نمائندے کے انتخاب کا مرحلہ سامنے آیا تو باوجود اس کے کہ کانگرس نے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے تھے کہ دولت کے بل بوتے پر اس کا نمائندہ منتخب ہو کر دستور ساز اسمبلی میں پہنچ جائے، اسے سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے 65 مجموعی ووٹوں میں سے بمشکل دس ووٹ حاصل ہوئے اور نواب محمد خان جوگزئی واضح اکثریت کے ساتھ کامیاب ہو گئے۔

1946ء میں مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ اس کے ارکان میں جن حضرات کے پاس سرکاری خطابات ہیں، وہ اپنے خطاب حکومت کو واپس کر دیں۔ بلوچستان نے قائداعظم کے اس ارشاد پر بھی لبیک کہا اور متعدد مسلم لیگیوں نے خان بہادری وغیرہ کے خطابات واپس کر دیئے۔ قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ کی جدوجہد بالآخر کامیاب ہوئی اور جون 1947ء میں وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قیامِ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اس حقیقت کو تاریخ کا سرٹیفکیٹ حاصل ہے کہ انگریز نے آخری دم تک کانگرس کا ساتھ دیا کہ جس طرح بھی ہو سکے پاکستان کے قیام کو روکا جائے، لیکن جب تمام مذموم چالیں ناکام ثابت ہوئیں تو اس طے شدہ اصول کے باوجود کہ وہ صوبے پاکستان میں شامل ہوں گے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، بھی یخ لگا دی گئی کہ بلوچستان کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے یہاں ریفرنڈم کرایا جائے گا۔ یہ ہندو اور انگریز کی ایک گہری سازش

تھی۔ ان دنوں صوبے کا ایجنٹ گورنر جنرل جیفرے پوائر تھا جس نے ریفرنڈم سے چند روز قبل صوبے کا بجٹ شائع کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ خسارے کا صوبہ ہے اور پاکستان اس کا مالی بوجھ اٹھانے کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ اس بجٹ کو بنیاد بنا کر کانگرس نے بھی پاکستان کے خلاف زبردست پروپیگنڈے کی مہم چلائی اور صوبے کے ممتاز افراد کو رشوت دینے کی بھی کوشش کی گئی لیکن سب کوششیں اکارت گئیں اور شاہی جرگے اور کوئٹہ میونسپلٹی نے پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر پاکستان کے دشمنوں کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ کوئٹہ میونسپلٹی کے آٹھ غیر مسلم ارکان، سرے سے اجلاس ہی میں شامل نہ ہوئے۔ اس طرح مشترکہ اجلاس میں شریک سب کے سب ارکان نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے کر ہندوؤں اور انگریزوں دونوں کی مذموم چالوں کو خاک میں ملا دیا۔

قیام پاکستان کے بعد قائداعظم گورنر جنرل پاکستان کی حیثیت سے فروری 1948ء میں سبی تشریف لائے۔ اہلِ بلوچستان نے آپ کے والہانہ استقبال کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ بتا سکتے ہیں کہ دھپاں سے لے کر شہر تک چھ سات میل لمبے جلوس میں درجنوں موٹر گاڑیاں، جھنڈیوں اور محرابوں سے آراستہ گزرگاہ پر کس طرح رواں دواں تھیں اور دورویہ قطاروں میں کتنی خلقت اپنے محبوب قائد کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب کھڑی تھی۔ یہ بلاشبہ ایک تاریخی جلوس تھا جس کی نہ پہلے کوئی مثال ملتی ہے اور نہ بعد میں۔ سبی میں آپ نے شاہی دربار سے خطاب کیا۔ آپ نے کہا: ''پاکستان کا آئین سال ڈیڑھ سال میں تیار ہو گا لیکن اس دوران میں کسی نہ کسی شکل میں جمہوریت کا آغاز ہو جانا چاہئے۔'' چنانچہ اس مقصد کے لئے گورنر جنرل کے ایجنٹ کو ضروری معاملات میں مشورہ دینے کے لئے ایک مشاورتی کونسل قائم کی جائے گی۔ آپ نے سرکاری افسروں کے ایک نمائندہ اجتماع سے بھی خطاب کیا اور انہیں دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کی تلقین کی۔

اسی سال جون میں آپ نے بلوچستان کا دوسری دفعہ دورہ کیا اور کوئٹہ میں ایک عظیم الشان اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے اہلِ بلوچستان کو تلقین کی کہ وہ صوبہ پرستی کی بجائے پورے پاکستان کے مفاد کو مقدم رکھیں۔ آپ نے فرمایا کہ اب ہم سب پاکستانی

ہیں، ہم نہ بلوچ ہیں، نہ پٹھان ہیں، نہ سندھی ہیں اور نہ پنجابی وغیرہ۔ ہمیں پاکستانیوں ہی کی طرح سوچنا اور عمل کرنا چاہئے اور اس بات پر فخر ہونا چاہئے کہ ہم پاکستانی کہلاتے ہیں۔
آپ نے کہا میں بلوچستان میں خاص طور پر دلچسپی رکھتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ یہ بھی دوسرے صوبوں کی طرح پاکستان کے معاملات میں اپنا پورا حصہ ادا کرے۔ اس دوران آپ سٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے لئے کراچی تشریف لے گئے لیکن صحت چونکہ بہت کمزور ہو چکی تھی اس لئے واپسی پر زیارت تشریف لے گئے کہ شاید وہاں کی پرفضا اور صحت بخش آب و ہوا میں صحت بحال ہو جائے۔ لیکن انسانی کوششیں بہرحال خدا تعالیٰ کی تقدیر ہی کے تابع ہوتی ہیں۔ 11 ستمبر کو کوئٹہ سے کراچی جانے کے فوراً بعد یہ سفر، سفرِ آخرت ثابت ہوا اور اسی دن سہ پہر کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

قائد اعظم کے آخری ایام بھی بلوچستان ہی میں گزرے جس سے آپ کو ہمیشہ ہمدردی اور دلچسپی رہی، جس کے مفاد کے لئے آپ نے برصغیر میں سب سے پہلے آواز بلند کی اور جس نے قائد اعظم کی اپیل پر انگریزوں اور ہندوؤں کی سازش کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان میں اپنا واضح اور درخشاں کردار ادا کیا۔

زیارت میں قائد اعظمؒ کے آخری ایام

حاجی غلام نبی یکم مارچ 1915ء کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ والد بزنس مین تھے۔ حاجی غلام نبی نے 1936ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور 1973ء میں سیکشن آفیسر ہوم ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے۔ آپکو قائد اعظمؒ کے خدمتگار کی حیثیت سے بانی پاکستان کے ساتھ کافی عرصہ گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ کوئٹہ ریذیڈنسی جہاں حضرت قائد اعظمؒ قیام پذیر ہوئے تھے وہاں حاجی غلام نبی نے بطور ریذیڈنسی اسسٹنٹ خدمات انجام دیں۔ پاکستان کے 50 سالہ یوم آزادی پر حاجی غلام نبی صاحب کا پہلا اور شاید آخری انٹرویو روزنامہ نوائے وقت نے آزادی کی گولڈن جوبلی اشاعت میں شائع کیا تھا۔
یہ انٹرویو اس دور میں کوئٹہ میں نوائے وقت کے نامہ نگار جناب عزیز بھٹی مرحوم نے لیا تھا۔ حاجی غلام نبی کی زبانی قائد اعظمؒ کی کوئٹہ میں مصروفیات اور ان کی بلوچستان سے محبت کا اندازہ اس انٹرویو کو پڑھنے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ انٹرویو ملاحظہ فرمائیں۔

س: حاجی غلام نبی صاحب آپ نے پہلی بار قائد اعظمؒ کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟

ج: اپریل 1948ء میں جب قائد اعظمؒ گورنر جنرل کی حیثیت سے کوئٹہ تشریف لائے تھے اور کوئٹہ ریذیڈنسی (موجودہ گورنر ہاؤس) میں قیام کیا تھا میں وہاں اسسٹنٹ کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہا تھا۔

اس وقت ایجنٹ ٹو گورنر جنرل امبروز ڈنڈاس تھے ایک سٹینو گرافر نوازش علی شاہ تھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے ہمراہ ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح بھی آئی تھیں۔ قائد

اعظمؒ کے ملٹری سیکرٹری کرنل جی نوولز (G. Knowels) تھے۔ دو اے ڈی سی تھے ایک فلائٹ لیفٹیننٹ آفتاب اور دوسرے نیوی کے مظہر اس وقت سیکرٹری محمد امین تھے۔ قائد اعظمؒ نہ صرف یہ کہ صحت مند بلکہ ہشاش بشاش بھی نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے سٹاف کو بتایا تھا کہ وہ کم از کم ایک ہفتے تک یہاں قیام کے لیے آئے ہیں شام کو بارش ہو رہی تھی کہ قائداعظمؒ نے کار میں سیر کا پروگرام بنا لیا۔ انہوں نے سفید رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چند روز قیام کے بعد واپس چلے گئے اور جون میں پھر آئے۔ کوئٹہ میں مختصر قیام کے بعد زیارت چلے گئے۔ پھر جون کے آخر میں کراچی چلے گئے جہاں انہوں نے اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی تقریب سے جو یکم جولائی کو ہوئی خطاب کیا۔

قائداعظمؒ کی صحت جون کے آخر میں ہی خراب ہونے لگی تھی۔ ان کے ڈاکٹروں میں کرنل الٰہی بخش اور ڈاکٹر امیر محمد ریاض شاہ شامل تھے۔ قائداعظمؒ جولائی میں ہی پھر کوئٹہ آ گئے تھے اور یہاں سے زیارت چلے گئے تھے یہاں وہ دو ماہ رہے۔ میں کوئٹہ اور زیارت میں ان کی خدمت کے لیے موجود تھا۔ قائداعظمؒ کو زیارت بہت پسند تھا چنانچہ انہوں نے زیارت کو اپنا موسم گرما کا صدر مقام بنا لیا تھا اور ان دنوں ان کا سیکرٹریٹ بھی عملاً زیارت منتقل ہو گیا تھا۔ قائداعظمؒ غالباً 7 یا 8 جولائی کو زیارت پہنچے تھے۔ زیارت ریذیڈنسی پر گارڈ سلامتی دینے کے لیے موجود تھی۔ ڈپٹی کمشنر بی ایم ایم بیلکن، سردار سارنگزئی اور دوسرے معتبرین استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ قائداعظمؒ کی کار آ کر رکی تو میں نے کار کا دروازہ کھولا۔ قائداعظمؒ بہت کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے دوبارہ کار سے باہر آنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ میں نے ان کی چھڑی کار سے نکال کر دروازے کے ساتھ کھڑی کر دی۔ تیسری کوشش پر قائداعظمؒ کار سے باہر آئے چھڑی پکڑی اور چبوترے پر پہنچ گئے اور گارڈز سے سلامی لی۔ اور زیارت ریذیڈنسی کے بالائی منزل پر چلے گئے۔ پھر اس کے بعد نیچے نہیں اترے۔ وہ علالت کے باعث روز بروز کمزور ہوتے چلے گئے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے عظیم بھائی کی دیکھ بھال اور تیمارداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

قائداعظمؒ کی علالت کے باعث ڈاکٹروں نے ان سے ملاقاتوں پر پابندی لگا

دی تھی۔ غالباً 8 ستمبر کو قائداعظمؒ کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو انہیں سٹریچر پر ڈال کر نیچے اتارا گیا اور کوئٹہ پہنچایا گیا۔ زیارت میں قائداعظمؒ کے خدمت گار کے طور پر عبداللہ جان (بیرا) تھا۔ جب قائداعظمؒ کو کوئٹہ ریذیڈنسی لایا گیا تو ان کو موشن لگے ہوئے تھے۔ جسم کوئی خوراک قبول نہیں کر رہا تھا۔ موشن اس تیزی سے آ رہے تھے کہ تقریباً ہر نصف گھنٹے بعد چارپائی کی چادر تبدیل کرنی پڑتی تھی۔ ریذیڈنسی کے جس حصے میں قائداعظمؒ کو رکھا گیا تھا وہاں میرے سمیت ریذیڈنسی کے عملے کے کسی رکن کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح سخت اداس اور پریشان تھیں۔ ان کی آنکھیں جاگنے کی وجہ سے سوجی ہوئی اور نمناک تھیں۔ 11 ستمبر کو جب قائداعظمؒ کو کوئٹہ سے کراچی لیجایا گیا تو ریذیڈنسی پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ ایمبولینس آئی اور قائداعظمؒ کو اسٹریچر پر لایا گیا۔ ہم میں سے کسی کو قریب جانے کی اجازت نہ تھی اس لیے ہم اپنے عظیم قائد کو آخر وقت میں نہ دیکھ سکے۔ ریذیڈنسی کی گیلریوں میں پردے لگا دیئے گئے تھے۔ البتہ ہم نے محترمہ فاطمہ جناح کے زور زور سے زار و قطار رونے کی آواز سنی تھی۔ قائداعظمؒ کو شدید علالت اور بے ہوشی کی حالت میں ریذیڈنسی سے لیجایا گیا تھا۔

س: قائداعظمؒ کی خاص بات جو آپ نے زیادہ شدت سے محسوس کی ہو؟

ج: ان کی تو پوری زندگی مثالی اور نمونہ ہے بہرحال میں نے دیکھا کہ وہ وقت کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ جون میں جب قائداعظمؒ زیارت میں تھے تو سندھ سے ایک تین رکنی وفد ملنے کو آیا۔ قائداعظمؒ نے مجھے کہا کہ ایک وفد آ رہا ہے اس کا استقبال کرنا اور ڈاک بنگلے میں بٹھا کر چائے وغیرہ سے خاطر تواضع کرنا جب وہ فریش ہو جائیں تو میرے پاس لانا۔ صبح دس بجے یہ وفد پہنچ گیا۔ میں نے قائداعظمؒ کی ہدایت پر عمل کیا وفد کے ارکان آپس میں جو باتیں کر رہے تھے اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ملک کا دارالحکومت کراچی سے منتقل کرانا چاہتے ہیں۔ وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنا موقف دوہرا رہے تھے۔ قائداعظمؒ کو وفد کی آمد کی اطلاع دی گئی اور پھر انہیں قائد اعظم کے پاس لیجایا گیا۔ تقریباً پون گھنٹے بعد جب وفد ملاقات کر کے باہر نکلا تو اس کے ارکان اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ دارالحکومت کراچی میں ہی رہنا چاہیے۔

س: قائداعظمؒ کی پسند کے سلسلے میں کچھ بتا سکیں گے؟

ج: قائداعظمؒ ہلکا فرنیچر پسند کرتے تھے یعنی ہلکے اور چھوٹے چھوٹے پیس (سال آرٹیکلز) وہ فرنیچر پر چمکدار پالش پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ زیارت میں انہوں نے مجھے بلا کر اس بارے میں ہدایات دیں اور کہا کہ فرنیچر میں لکڑی کی اپنی رگیں نظر آنی چاہئیں چنانچہ ریذیڈنسی کے پورے فرنیچر کو ''مینشن پالش'' کروائی گئی۔

س: قائداعظمؒ کھانے میں کیا پسند کرتے تھے؟

ج: اس بارے میں مجھے معلوم نہیں۔ البتہ جب قائداعظمؒ کوئٹہ ریذیڈنسی میں تھے تو سابق کمشنر شاہ زمان کی ہمشیرہ خاص طور پر قائداعظمؒ کے لیے گوشت کا شوربہ بھجوایا کرتی تھیں۔ یہ شوربہ کمشنر کے پرسنل اسسٹنٹ حاجی عبدالحمید لایا کرتے تھے جو بعد میں گورنر ہاؤس کوئٹہ کے کنٹرولر بھی رہے۔ سنا تھا کہ قائداعظمؒ سوپ بھی شوق سے پیتے ہیں۔

س: کوئی ایسی بات جو قائداعظمؒ میں آپ نے خاص طور پر محسوس کی ہو؟

ج: قائداعظمؒ میں ''ول پاور'' اور قوت فیصلہ بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ بعض اوقات وہ تھکاوٹ محسوس کرتے تو سر کی مالش بھی کراتے تھے۔ اس سلسلے میں کوئٹہ کے ایک ہیئر ڈریسر رحمت کی خدمات حاصل کی گئیں تھیں۔ اس نے ایک بار قائداعظمؒ کے سر کی مالش کی تو قائداعظمؒ کو نیند آ گئی قائداعظمؒ نے کہا کہ آئندہ مالش یہی کیا کریگا۔ قائداعظمؒ جب ایک بار زیارت سے کراچی جانے لگے تو رحمت کو بلا کر کہا کہ میں جلدی واپس آ جاؤنگا تم زیارت میں ہی رہو گے۔ چند دن کے بعد ایسا ہوا کہ ایک جیپ کوئٹہ جا رہی تھی رحمت بھی اس پر سوار ہو گیا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں کل کوئٹہ سے واپس آ جاؤنگا۔ اتفاق سے راستے میں جیپ الٹ گئی اور رحمت نائی کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ قائداعظمؒ کراچی سے زیادرت پہنچے تو رحمت کے بارے میں دریافت کیا۔ جب انہیں جیپ الٹنے کا واقعہ بتایا گیا تو انہوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اسے منع کیا تھا کہ زیارت سے مت جانا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک زیارت کا ایک نائی رمضان قائداعظمؒ کے سر کی مالش کرتا رہا۔ اسے معاوضہ کے طور

پر روزانہ بیس روپے ہم دیا کرتے تھے پھر یہ معاوضہ 50 روپے کر دیا گیا تھا۔

قائداعظمؒ جب پہلی بار کوئٹہ ریذیڈنسی میں آئے تو ان کی کار ریذیڈنسی کا ایک ڈرائیور رحیم بخش ڈرائیو کر رہا تھا۔ قائداعظمؒ نے ہدایت کی کہ آئندہ میں جب بھی کوئٹہ آؤں میری گاڑی یہی ڈرائیور چلایا کریگا (رحیم بخش جہلم کا رہنے والا تھا) اس وقت تو ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی لیکن بعد میں جب زیارت میں قائداعظمؒ نے اچانک اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ریس کورس دیکھنا چاہتے ہیں تو رحیم بخش ہی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا زیارت کے قریب ''چوتیر'' کے مقام پر جب قائداعظمؒ نے واپس چلنے کو کہا تو جگہ بہت تھوڑی تھی اردگرد پہاڑیاں تھیں یا پھر گہری کھائیاں تھیں۔ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا قائداعظمؒ اور محترمہ فاطمہ جناح پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ نہایت تنگ جگہ پر رحیم بخش نے چار پانچ مرتبہ گاڑی آگے پیچھے کی لیکن ذرہ برابر بھی جھٹکا نہیں لگا اس کی مہارت دیکھ کر اندازہ ہوا کہ قائداعظمؒ نے اس کا انتخاب کیوں کیا تھا۔

س: قائداعظمؒ نے ریس کورس گراؤنڈ دیکھنے میں دلچسپی کا اظہار کیوں کیا تھا؟

ج: یہ بھی دلچسپ واقعہ ہے۔ برسوں پہلے ایک چھوٹا طیارہ انجن میں خرابی کے باعث زیارت میں کریش لینڈنگ پر مجبور ہوا تھا۔ اس میں جانی نقصان نہیں ہوا تھا اس کے حوالے سے اس جگہ کو ''لینڈنگ گراؤنڈ'' کہتے ہیں۔ قائداعظمؒ یہ جگہ اس مقصد کے لیے دیکھنا چاہتے تھے کہ کیا یہاں طیاروں کے اترنے کے لیے رن وے بن سکتا ہے؟ انہوں نے اس بات کا اظہار یہ کہہ کر کیا تھا کہ کاش یہاں طیاروں کے اترنے کا بندوبست ہو سکے۔ قائداعظمؒ علاقے کو سیاحت کے نقطہ نظر سے ترقی دینا چاہتے تھے۔

س: کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ کے لیے پہلی قراقلی ٹوپی کوئٹہ میں خریدی گئی تھی جو اب جناح کیپ کہلاتی ہے؟

ج: میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ جب میں نے قندھاری بازار (موجودہ شارع اقبال) میں واقع ایم ایم اکرم اینڈ سنز سے قائداعظمؒ کے لیے قراقلی کی تین ٹوپیاں خریدی تھیں تو اس سے پہلے بھی قائداعظمؒ کے پاس ایسی ٹوپیاں موجود تھیں اس کے

علاوہ یہ بھی سنا تھا کہ محمد علی کی دوکان سے بھی ٹوپی خریدی گئی ہے۔

نواب محمد خان جوگیزئی مرحوم نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خاص طور پر جب برٹش بلوچستان میں اس مقصد کے لیے ریفرنڈم کرایا گیا کہ یہ علاقہ ہندوستان کا حصہ بنے گا یا پاکستان میں شامل ہوگا؟ تو یہ نواب محمد خان جوگیزئی تھے کہ جنہوں نے ایجنٹ ٹو گورنر جنرل سے صاف طور پر کہا کہ ہم نے پاکستان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور میں نے ہندوستان اسمبلی کی نشست چھوڑ دی ہے میں پاکستان قانون ساز اسمبلی میں بیٹھوں گا۔ شاہی جرگہ کے باقی ارکان نے تائید کی اور اس طرح برٹش بلوچستان پاکستان کا حصہ بن گیا۔ نواب محمد خان جوگیزئی یکم جنوری 1885ء کو قلعہ سیف اللہ (ژوب ڈویژن) میں پیدا ہوئے اور 1908ء میں انہوں نے جوگیزئی (کاکڑ) قبیلے کے سردار (تمندار) کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں۔ جب ان کے والد غازی نواب بنگل خان جوگیزئی کا انتقال ہوا۔ نواب محمد خان جوگیزئی کا انتقال 13 نومبر 1987ء کو 93 سال کی عمر میں ہوا۔

نواب محمد خان جوگیزئی ہندوستان کی اسمبلی میں بلوچستان کی واحد سیٹ پر 19 جولائی 1946ء کو منتخب ہوئے تھے بعد میں انہوں نے قائداعظم سے ملاقات کے بعد اعلان کیا تھا کہ وہ ہندوستان کی اسمبلی کی بجائے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں بیٹھیں گے۔ 29 جنوری 1947ء کو شاہی جرگہ اور بلدیہ کوئٹہ کے ارکان ٹاؤن ہال کوئٹہ میں جمع ہوئے اے جی جی اس مرحلے کو ٹالنا چاہتا تھا لیکن نواب جوگیزئی نے کہا کہ ہم مزید انتظار نہیں کرسکتے اور نہ ہی ہمیں سوچنے کے لیے وقت چاہیے ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ بلوچستان پاکستان میں شامل ہوگا۔ باقی ارکان نے تائید کی اور اس طرح برٹش بلوچستان پاکستان کا حصہ بن گیا۔ بلوچستان کی چاروں ریاستوں قلات، لسبیلہ، خاران اور مکران کے والیان نے اپنی ریاستیں 1948ء میں پاکستان میں رضا کارانہ طور پر ضم کیں۔

برٹش بلوچستان کا فیصلہ کرنے کے لیے ریفرنڈم میں رائے دہندگان شاہی جرگہ (54 ارکان) اور بلدیہ کوئٹہ (11 ممبران) کے ارکان تھے۔ شاہی جرگہ کا چیئرمین اے جی جی ہوتا تھا جبکہ وائس چیئرمین نواب محمد خان جوگیزئی تھے۔ وہ 1934ء سے تادم مرگ اس منصب پر فائز رہے۔ نواب محمد خان جوگیزئی کے بڑے بیٹے نوابزادہ تیمور شاہ جوگیزئی

نواب محمد خان جوگیزئی کے انتقال کے بعد نواب بنے وہ فوج میں میجر بھی رہ چکے تھے۔ 1940ء کو مسلم لیگ کے جس کنونشن میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی اس میں نواب محمد خان جوگیزئی نے اپنے بڑے بیٹے نوابزادہ تیمور شاہ جوگیزئی اور داماد کو خاص طور پر بھجوایا تھا جبکہ ان کے ایک چھوٹے صاحبزادے نوابزادہ جہانداد شاہ جوگیزئی لاہور میں زیر تعلیم ہونے کے باعث پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ نوابزادہ تیمور شاہ جوگیزئی سے چھوٹے اور نوابزادہ جہانداد شاہ کے بھائی نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگیزئی کی بھی تحریک پاکستان کے سلسلے میں بڑی خدمات میں خاص طور پر ریفرنڈم کے وقت انہوں نے پاکستان کے حق میں جو مساعی کیں وہ تاریخ کا حصہ ہیں۔ نوابزادہ جہانگیر شاہ اور نوابزادہ جہانداد شاہ جوگیزئی سول سروس میں تھے اور اعلیٰ سول عہدوں سے ریٹائر ہوئے۔ جہانگیر شاہ جوگیزئی سینٹ آف پاکستان کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔

نوابزادہ جہانداد شاہ نے ایک ملاقات میں بتایا کہ 23 مارچ 1940ء کے کنونشن کے موقع پر قاضی محمد عیسیٰ مرحوم اپنی پہلی بیوی پیاری بیگم کے ہمراہ فلیٹیز ہوٹل میں قیام پذیر تھے ہم بلوچستان کے کچھ طلبہ ان سے ملنے گئے لیکن ملاقات نہ ہوسکی بیگم قاضی عیسیٰ (پیاری بیگم) نے ہمیں چائے پلائی اور پوچھا کہ آپ لوگ قاضی صاحب سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ ہم نے بتایا کہ ''ہم قائداعظمؒ سے ملنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے قاضی صاحب کے پاس آئے ہیں کہ وہ ہمیں قائد سے ملاقات کا وقت لے دیں'' بیگم قاضی عیسیٰ نے کہا کہ قاضی صاحب کو میں یہ بات بتادونگی۔ ہم باہر نکلے تو عبدالمنان کاکڑ نے جو نوجوان تھے اور بعد میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے سالار بھی بنے ہم سے کہا کہ منٹو پارک میں جہاں کنونشن ہے اس کے گیٹ پر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ قائداعظمؒ وہاں سے گزریں گے تو ملاقات ہو جائیگی۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا قائداعظم آئے تو خان کاکڑ نے قائد کو بتایا کہ ہم بلوچستان کے طلبہ ہیں اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ نواب جوگیزئی کے صاحبزادے ہیں۔ اس پر قائداعظم نے نہایت شفقت سے میرے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا ''پاکستان کے لیے کام کرو'' میں قائد سے ملاقات اور ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کبھی بھلا نہیں سکتا۔ 1947ء میں نوابزادہ جہانداد شاہ جوگیزئی نصیر آباد میں تحصیلدار تھے لیکن

سرکاری ملازمت کے باوجود ان کا دل پاکستان کے لیے دھڑکتا تھا۔ نوابزادہ جہانداد شاہ کی تاریخ پیدائش 21 دسمبر 1922ء ہے اور نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگیزئی ان سے ایک سال بڑے ہیں۔ یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ جوگیزئی، کاکڑ قبیلے کی شاخ ہے اور سرداری جوگیزئی کے پاس ہے۔ بلوچستان کے پشتونوں میں کاکڑ سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ نواب تیمور شاہ جوگیزئی مرحوم بلوچستان اسمبلی کے رکن اور ایک سے زائد مرتبہ صوبائی وزیر رہ چکے تھے۔ ان کے ایک اور بھائی نوابزادہ یوسف جوگیزئی بھی ایک بار ایم پی اے منتخب ہوئے تھے۔ آجکل کاکڑ قبیلے کے سربراہ نواب تیمور شاہ مرحوم کے پوتے نواب ایاز جوگیزئی ہیں جو قومی اسمبلی کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ تحریک پاکستان میں سردار عثمان جوگیزئی نے بھی نمایاں طور پر حصہ لیا تھا وہ مسلم لیگ بلوچستان کے جنرل سیکرٹری بھی تھے۔ ان کے بیٹے سردار وزیر احمد جوگیزئی، وفاقی وزیر، قومی اسمبلی کے رکن اور ڈپٹی سپیکر رہ چکے ہیں۔ جوگیزئی قبیلے کی پاکستان کے لیے بڑی خدمات ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ نواب محمد خان جوگیزئی مرحوم جب تک حیات رہے انہیں یہ اعزاز حاصل رہا کہ بلوچستان کی طرف سے ملکی اور غیر ملکی سربراہوں، مہمانوں اور دوسری ممتاز شخصیات کا خیر مقدم کرتے ہوئے ''سپاسنامہ'' پیش کریں۔

فضل احمد غازی تحریک پاکستان کے جانثاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کو قائد اعظمؒ کے سپاہی کی حیثیت سے ان کے ساتھ خدمات انجام دینے کا موقعہ ملا۔ 14 اگست 1997ء کو روزنامہ نوائے وقت میں آپکا انٹرویو اس دور کی یادیں تازہ کرتا ہے۔

س: مسلم لیگ کے ساتھ آپ کی وابستگی کے محرکات کیا تھے؟

ج: ''تحریک پاکستان اور پاکستان کے خواب کی تعمیر''، لیکن اس کا ذریعہ یا سبب۔ قاضی محمد عیسیٰ مرحوم بنے۔ جن سے ہمارے دیرینہ خاندانی تعلقات تھے۔ میرے دادا اور قاضی عیسیٰ کے دادا اکٹھے افغانستان سے آئے تھے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس وقت صورت کیا تھی؟ 1937ء میں بلوچستان میں دو سیاسی جماعتیں تھیں۔ ایک ''انجمن وطن'' اور دوسری ''جمعیت علماء ہند'' ان دونوں کا انڈین کانگرس سے براہ راست تو کوئی تعلق نہ تھا البتہ ان کی پالیسیاں کانگرس کی پالیسیوں سے مطابقت رکھتی

تھیں۔ 1937ء میں ہی مسلم لیگ کے حامیوں کا ایک اجلاس موجودہ میزان مارکیٹ کے قریب ہوا۔ جس کا مقصد مسلمانوں کے درمیان اتحاد، اتفاق اور بھائی چارے کی فضا پیدا کرنا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت ملک جان محمد کاسی مرحوم نے کی تھی جو بعد میں بلوچستان مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے سالار اعلیٰ بنے۔ قاضی محمد عیسیٰ مرحوم 1938ء میں لندن سے بیرسٹر بن کر لوٹے تو انہوں نے قائداعظمؒ سے ملاقات کی اور اس کے بعد یہاں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ یہاں کے قبائلی لوگ ہندوؤں کی اقتصادی بالادستی کا شکار تھے چنانچہ مسلم لیگ کی صورت میں انہیں رہنمائی کرنے والی ایک روشنی نظر آئی اور وہ سب اس طرف چل پڑے اور لوگ جوق در جوق مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرنے لگے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بلوچستان میں مسلم لیگ ایک فعال جماعت بن گئی اور 23 مارچ 1940ء کو جب لاہور میں قرارداد پاکستان کی منظوری کا مرحلہ آیا تو بلوچستان سے بڑی تعداد میں لوگ اس اجلاس میں شریک ہوئے بلکہ اس اجلاس کی حفاظت کا بیشتر کام بلوچستان مسلم لیگ کی نیشنل گارڈ نے ہی سنبھالا تھا۔ لاہور کے اجلاس میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا کہ اس اجلاس یا جلسے میں داخلے کے لیے مخصوص بیج کا لگانا لازم تھا۔ جب قائداعظمؒ آئے تو انہوں نے بیج نہیں لگا رکھا تھا لہٰذا انہیں گیٹ پر روک لیا گیا۔ اس سے قائداعظمؒ بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ ''یقیناً نیشنل گارڈ کا ڈسپلن اسی طرح کا ہونا چاہیے'' نواب صدیق علی خان نے قائداعظمؒ کو مخصوص بیج لگایا تب وہ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ دوسری جگہوں کی طرح بلوچستان میں بھی مسلم لیگی کارکن انتھک محنت اور خلوص سے کام کرتے تھے اور اپنے قائد کے ایک اشارے پر جان قربان کرنے کو تیار ہوتے تھے۔ پورے صوبے میں مختصر عرصے میں مسلم لیگ مضبوط اور فعال جماعت بن کر ابھری تو اس سے مخالفین میں کھلبلی مچ گئی۔ چنانچہ انہوں نے لورالائی میں ایک جلسہ کیا۔ جس میں ایک مولوی کی قیادت میں یہ فتویٰ دیا گیا ''جو مسلم لیگ میں شامل ہوگا وہ کافر ہے'' اس کے جواب میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے ایک مقامی رہنما مولانا عبدالعلی نے جو جید عالم دین ممتاز ادیب اور مقبول شاعر بھی تھے پشین میں جہاں قاضی عیسیٰ مرحوم کا گھر تھا تقریباً چار سو علماء کو جمع کیا۔

اس عظیم الشان اجتماع میں دیئے جانے والے فتوے کی مذمت کرتے ہوئے کہا گیا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی جماعت ہے جو مسلمانوں کے لیے ایک آزاد و خودمختار ملک کے حصول کے لیے کوشاں ہے لہٰذا اس میں شامل نہ ہونے والے تو کافر ہو سکتے ہیں شمولیت اختیار کرنے والے سچے مسلمان ہیں۔ مسلم لیگ بلوچستان میں مقبولیت کے منازل طے کر رہی تھی کہ 1943ء میں قائد اعظمؒ پہلی بار کوئٹہ آئے ان کا شاندار استقبال ہوا۔ قندھاری بازار (موجودہ شارع اقبال) کی ایک عمارت کی بالکنی سے انہوں نے استقبالی اجلاس کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''عوام کے اس جوش خروش کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ بلوچستان پسماندہ یا سیاسی شعور میں پیچھے ہے''۔

قاضی محمد عیسیٰ مرحوم نے 1940ء میں قائد اعظمؒ کو بلوچستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی تھی لیکن پھر یہ طے پایا تھا کہ پہلے بہادر یار جنگ، مولانا قدیر خان، نوابزادہ لیاقت علی خان دورہ کریں گے۔ اس کے بعد قائد اعظمؒ کے دورے کا پروگرام رکھا جائے گا۔ قائد اعظمؒ 1943ء میں دورے پر آئے تو تقریباً ایک ماہ تک یہاں رہے۔ وہ مستونگ اور پشین سمیت صوبے کے مختلف علاقوں میں گئے۔ انہی دنوں میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی یہاں بنیاد رکھی گئی۔ 1946ء کے الیکشن کی انتخابی مہم میں قائد اعظمؒ کے ساتھ دوسرے علاقوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کی طرح بلوچستان مسلم لیگ، ایم ایس ایف اور نیشنل گارڈز کے کارکن بھی تھے۔ ان میں میں بھی شامل تھا بلکہ مجھ پر ایم ایس ایف کی آرگنائزیشن کی ذمہ داری بھی تھی۔ انتخابی مہم میں نئی دہلی میں ایک رات قائد اعظمؒ نے اچانک کہا کہ صوبہ سرحد کا دورہ کریں گے اس پر انہیں بتایا گیا کہ یہاں آپ کی زیادہ ضرورت ہے قائد اعظمؒ نے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ''میری اس وقت صوبہ سرحد میں زیادہ ضرورت ہے۔ یہاں میری قوت موجود ہے'' استفسار کیا گیا کہ کونسی قوت؟ قائد اعظمؒ نے ایم ایس ایف کے کارکنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ ہے۔ قائد اعظمؒ کے اس پر اعتماد جملے سے نوجوانوں میں نیا جوش و خروش پیدا ہو گیا الیکشن میں بھائی حسین لال جی کو ایسی شکست ہوئی کہ ضمانت تک ضبط ہو گئی۔ قائد اعظمؒ صوبہ سرحد کے قصبے میں تھے جہاں انہیں انتخابی نتیجے سے آگاہ کیا گیا۔

س: قائد اعظمؒ کی شخصیت میں وہ کونسی کشش اور خصوصیات تھیں کہ برصغیر کے مسلمان ان کی قیادت میں متحد ہو گئے؟

ج: قائد اعظمؒ کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا۔ وہ جو کہتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے مسلمانان برصغیر کو ان کی قیادت پر اعتماد تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ قائد اعظمؒ کی قیادت میں پاکستان بن کر رہے گا۔

پاکستان ایک منزل تھی جس کی طرف لوگ رواں رواں تھے۔ قائد اعظمؒ کی استقامت کے حوالے سے ایک واقعہ سناتا ہوں کہ کوئٹہ میں قاضی عیسیٰ کے گھر قائد اعظمؒ کے ساتھ محترمہ فاطمہ جناح اور ہم لوگ بیٹھے ہوئے ایک بار یو پی کے ایک مسلم لیگی نے قائد اعظمؒ سے کہا کہ زلزلہ آ گیا۔ سب لوگ بھاگ کر باہر آ گئے لیکن قائد اعظمؒ نہیں آئے۔ جب ہم لوگ واپس ان کے کمرے میں گئے تو کیا دیکھا کہ وہ اپنی نشست پر اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں کافی کا کپ تھا اور دوسرے ہاتھ میں سگار تھا ہمیں دیکھ کر کہنے لگے ''وہ بھی تمہاری طرح بزدل تھے جو کربلا کے میدان میں اپنے سربراہ کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے'' اس پر قاضی عیسیٰ نے کہا ''وہ بھاگ کر واپس نہیں آئے تھے۔ دیکھئے ہم تو واپس آ گئے ہیں''۔ قائد اعظمؒ نے نہایت سنجیدگی سے اپنے مخصوص انداز میں انگشت شہادت بلند کرتے ہوئے ''حقیقی اتحاد، تنظیم اور یقین وہ ہے جو خطرے کے وقت بھی قائم رہے اور انتشار کا شکار نہ ہو''

قائد اعظمؒ کی شخصیت نہایت متاثر کن تھی۔ ایک جلسے میں قائد اعظم تقریر کر رہے تھے۔ تقریر انگریزی زبان میں تھی۔ علامہ عبدالعلی جو اردو، پشتو، فارسی اور عربی کے بہت بڑے عالم تھے۔ لیکن انگریزی نہیں سمجھتے تھے لیکن پھر بھی روئے جا رہے تھے۔ قاضی عیسیٰ نے پوچھا کہ آپ کیوں روئے جا رہے ہیں؟ تو مولانا عبدالعلی مرحوم نے کہا انگریزی تو میں نہیں سمجھتا لیکن قائد اعظمؒ کی آواز بڑی پرکشش ہے۔ لہجے سے لگتا ہے کہ قائد اعظمؒ کسی ظالم کے خلاف بول رہے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے قائد اعظمؒ سے پوچھا تھا کہ آپ پاکستان کی تعمیر کس بنیاد پر کرنا چاہتے ہیں؟

قائد اعظمؒ نے جواب دیا تھا ''میں پاکستان کی تعمیر معاشی عدل اور استحکام کی بنیاد

پر کروں گا"۔

بلوچستان نے تحریک پاکستان کے دوران ہر مرحلے میں بھرپور حصہ لیا۔ دہلی اور بہار میں فسادات ہوئے تو متاثرین کی امداد کے لیے عطیات جمع کئے گئے۔ اپنی آبادی کے اعتبار سے اس میں بلوچستان کا حصہ دوسروں سے کم نہیں تھا۔ دہلی اور بہار فسادات میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر ہر طرح کا ظلم کیا۔ کنویں مسلمانوں کی لاشوں سے بھر گئے تھے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑ دئے گئے تھے۔ ہمیں ان مہاجرین کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے جانتے ہوئے بھی بہار اور دہلی پاکستان کا حصہ نہیں بن سکتے بے پناہ قربانیاں دیں۔

س: پاکستان کے حال اور مستقبل کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: قائداعظمؒ نے جس پاکستان کا خواب دیکھا اور جدوجہد کی۔ یہ پاکستان اس کی تعبیر نہیں۔ کاش ہم قائد کے فرمان اتحاد، تنظیم، یقین محکم پر عمل کرتے تو آج پاکستان مضبوط اور خوشحال ہوتا۔ قائداعظمؒ کے انتقال کے بعد سب کچھ گڑبڑ ہو گیا۔ میرے سمیت بہت سے مسلم لیگی کارکنوں کو جیلوں میں ڈالا گیا، اذیتیں دی گئیں۔ اب بھی ہم چاہتے ہیں کہ قائداعظمؒ کی تعلیمات کو مشعل راہ بنا دیا جائے تا کہ ملک ان کے خوابوں کی تعبیر بن سکے۔ پاکستان کے مستقبل سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ پاکستان کا مستقبل انشاء اللہ روشن ہوگا۔

❖■❖■❖

بلوچ سراپا احتجاج کیوں ہوئے؟

میر غوث بخش بزنجو بھٹو دور میں بلوچستان کے گورنر تھے اور ان کا تعلق عوامی نیشنل پارٹی سے تھا "نیپ" کی حکومت توڑی گئی۔ جماعت پر پابندی لگ گئی اور اس کے تمام سرکردہ لیڈر گرفتار ہو گئے۔ وفاقی حکومت کی طرف سے "نیپ" کے خلاف سپریم کورٹ میں ریفرنس پیش کیا گیا۔ میر غوث بخش بزنجو نے سپریم کورٹ میں خود پر دائر مقدمہ بغاوت میں جو بیان دیا۔ اس کا مطالعہ تاریخ کے کئی بند دَر وا کرتا ہے اور حکومت کی یکطرفہ کارروائی کے مضمرات بھی سامنے لاتا ہے۔ عین ممکن ہے آپ کو اس بیان کے مندرجات سے مکمل اتفاق نہ ہو لیکن اس سے "جزوی اتفاق" بھی یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ تالی صرف ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔

غوث بخش بزنجو، عطا اللہ مینگل، خیر بخش مری اور سردار اکبر بگٹی بلوچستان کی سیاسی تاریخ کے اہم کردار رہے ہیں۔ بلوچستان کی مسلح بغاوت کی قیادت کرنے والے مری قبائل کے سربراہ خیر بخش مری کو باغی "جنرل شیروف" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آج بلوچستان کی سیاست سردار اکبر بگٹی اور عطا اللہ مینگل کے گرد گھوم رہی ہے۔ عطا اللہ مینگل کے صاحبزادے بھی بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بھی رہے ہیں اگرچہ حکومت نے ان دونوں شخصیات کے متبادل بلوچ لیڈر شپ پیدا کرنے کی بہت کوشش کی ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان کے علاوہ دوسرے بلوچ لیڈروں کو ان کے اپنے حلقے کے لوگ بھی ڈھنگ سے نہیں پہچانتے۔ آیئے غوث بخش بزنجو کا سپریم کورٹ کا بیان پڑھیے کہ ماضی آپ کو حال کی

سمجھ اور مستقبل کے خدشات کی تصویر دکھاتا ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بحیثیت نیشنل عوامی پارٹی کے بانی ممبروں میں سے ایک کے نیشنل عوامی پارٹی کے پس منظر، اس کے اجزائے ترکیبی، ملک کے اس وقت کے معروضی حالات کے پیش نظر نیشنل عوامی پارٹی کی ضرورت اور اس کے بنیادی اغراض و مقاصد کا ذکر کروں۔ نیز اس حقیقت پر بھی مختصر روشنی ڈالوں کہ موجودہ حکومت نے نیشنل عوامی پارٹی پر کیوں پابندی لگانا ضروری سمجھا۔ پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد قائداعظم وفات پا گئے اور اس کے بعد جلد ہی نوابزادہ لیاقت علی خان کو انگریز کی پروردہ نوکرشاہی نے قتل کیا جس کے بعد پاکستان کلیتاً نوکرشاہی کے قبضے میں چلا گیا۔

لیاقت علی خان کے قتل اور نوکرشاہی کے عوام کے اقتدار پر قبضہ کا اصل مقصد پاکستان کو بغیر کسی رکاوٹ کے کلیتاً مغربی سامراج کی نوآبادی، ملک کے کہنہ مشق جاگیردار اور نودولیتے طفیلی سرمایہ دار اور ان کے بیرونی آزمودہ کار سرپرستوں کے استحصال کی آماجگاہ بنانا تھا۔

حکمرانی کے آداب سے ناواقف اجرتی تابعدار نوکرشاہی نے صرف عوام و ملک کی دولت کی لوٹ کھسوٹ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مغربی سامراج اور سرمایہ دار کے ایجنٹ کی حیثیت سے ملک کو مختلف جنگی معاہدوں میں جکڑ کر اس کی آزادی و خودمختاری کو بے معنی بنا دیا۔ پاکستان کی حیثیت بین الاقوامی برادری میں ایک آزاد و خودمختار مملکت سے گھٹ کر سامراج کے جھولی بردار کی بنی اور عملی طور پر پاکستان مغربی سامراج کی نوآبادی میں تبدیل ہوا۔

پاکستان اپنے عظیم ہمسایوں روس اور چین کے خلاف جاسوسی اور سازشوں کے اڈہ اور ہندوستان کی غیر جانبداری جمہوریت اور مغربی سامراج سے سرکشی کے خلاف نکیل کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ ان تابعدار اجرتی حکمرانوں کے طرز حکمرانی کا نچوڑ یہ تھا کہ خود اور بیرونی سرمایہ دار سے ملک اور عوام کا استحصال کرنا، مغربی سامراج کے ایجنٹ کی حیثیت سے سامراج کی ترتیب دی ہوئی بین الاقوامی حکمت عملی اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا اور اپنے ہمسایوں کے خلاف مخبری کے فرائض سرانجام دینا۔ حکمران طبقے کے اس طرز عمل سے

ہمارے تمام چھوٹے بڑے ہمسایہ ممالک ہم سے نالاں و بیزار ہو گئے روس و چین جیسے طاقتور ہمسایہ ممالک پاکستان کو ایشیا کے قلب میں ناسور کا پھوڑا سمجھنے لگے۔

ملک کے اندر غربت و افلاس بدانتظامی و بداعتمادی خود پروری و اقربا پروری بے انصافی و نااہلی کی وجہ سے انتشار، بے اطمینانی اور بداعتمادی کی جو فضاء پیدا ہوئی تھی یہ اس وقت اپنے انتہا کو پہنچی جب 1955ء میں بین الاقوامی سامراج کی خواہش اور تقاضوں کو پورا کرنے اور ملک کے اندر نوزائیدہ طفیلی سرمایہ دار اور بیرونی سرمایہ دار کے بے روک ٹوک استحصال کی راہ سے تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کی خاطر مشرقی بنگال کی عددی اکثریت اور موجودہ نئے پاکستان میں مختلف وحدتوں کی خودمختاری کو مملکت پاکستان کے اتحاد و سلامتی کے نام پر ٹھکانے لگا دیا گیا۔ وحدت مغربی پاکستان اور برابری کی سکیم پیریٹی کو روبکار لا کر ملک میں انتشار اور پاکستان کی شکست و ریخت کا بیج بویا گیا۔

چنانچہ ان حالات نے ملک کے ان تمام مخلص و دیانتدار سیاسی کارکنوں، صاحب فراست و بصیرت افراد کو جو انگریز سامراج کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں صف اول کے ہراول دستے میں شامل تھے اس امر پر مجبور کیا کہ پاکستان کی آزادی، سالمیت اور وقار کے تحفظ کے لئے ایک ایسی تنظیم بنائیں جو ملک کے حکمران ٹولے کی چیرہ دستیوں اور نااہلیوں سے ملک کو نجات دلائے۔ چنانچہ 1956ء میں لاہور میں موجودہ پاکستان کے تمام حصوں سے جنگ آزادی کے مخلص سپاہی جمع ہوئے اور انہوں نے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی جس کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل تھے۔

ا : پنجاب سے "آزاد پاکستان پارٹی"

ب : سندھ سے "سندھ محاذ" و "سندھ ہاری پارٹی"

ج : صوبہ سرحد سے "خدائی خدمت گار"

د : بلوچستان سے "استمان گل" اور "ورور پشتون"

مندرجہ بالا سبھی جماعتیں ملک میں بگڑے ہوئے حالات کے پیش نظر اپنی انفرادیت کو ختم کر کے ایک جماعت میں مدغم ہوئیں جس کا نام "پاکستان نیشنل عوامی پارٹی" رکھا گیا۔

انہی حالات سے متاثر ہو کر مولانا بھاشانی اور ان کے ساتھی، مسٹر سہروردی کے ساتھ اختلاف کر کے عوامی لیگ سے علیحدہ ہوئے اور ''بھاشانی گروپ'' کے نام سے کام کرنا شروع کیا۔ پاکستان نیشنل عوامی پارٹی اور عوامی لیگ (بھاشانی گروپ) کے رہبروں نے اس امر کو محسوس کیا کہ اگر ملک میں ایک موثر تنظیم کو جنم دینا ہے تو یہ ضروری ہے کہ ملک کے دونوں حصوں میں اس کا عمل دخل ہو۔ چنانچہ 1957ء میں پاکستان نیشنل عوامی پارٹی اور عوامی لیگ (بھاشانی گروپ) کے اتحاد سے موجودہ ''پاکستان نیشنل عوامی پارٹی'' نے جنم لیا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے اکثر و بیشتر کارکن اور رہبر آل انڈیا مسلم لیگ کے صف اول کے کارکنوں میں سے تھے۔ اس جماعت کے چار بنیادی مقاصد حسب ذیل ہیں۔

1: مملکت پاکستان کی سالمیت آزادی و خود مختاری کی حفاظت۔

2: پاکستان کے لئے ایک غیر جانب دار آزاد و غیر وابستہ خارجہ پالیسی کی تشکیل۔

3: پاکستان سے اندرونی و بیرونی اقتصادی و سیاسی استحصال کو ختم کرنا۔

4: وحدت مغربی پاکستان کو ختم کر کے نئے سرے سے لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تشکیل اور ہر بالغ شہری کے حق ووٹ کو محفوظ کرنا۔

یحیٰی خان حکومت اور موجودہ حکومت کی طرف سے نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی اور اس کے رہبروں کے خلاف بے بنیاد اور خود ساختہ اور تراشیدہ الزامات کی وجہ یہ ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی مطلق العنانیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

جنرل یحیٰی خان اور اس کے ہمرکابوں کی ناعاقبت اندیشانہ فکر و عمل کے نتیجے میں جب پاکستان ٹوٹ گیا تو جنرل یحیٰی خان نے عوام کے غیض و غضب سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ملک کے باقی ماندہ چار صوبوں کا اقتدار اپنے نامزد نائب وزیراعظم اور نمائندہ خصوصی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو چیئرمین پیپلز پارٹی کے حوالے کیا۔ بجائے اس کے کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو جمہوری طریقوں اور جمہوری اداروں کے ذریعے ملک کا اقتدار سنبھالتے، انہوں نے فوجی طریقہ کار کو ترجیح دی اور فوجی حاکمیت میں ایک نئے اور انوکھے باب کا اضافہ کیا کہ ایک سویلین مارشل لاء حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے سربراہ مملکت بنے، یہ عمل خود حکمران پارٹی کے ذہن کا آئینہ دار تھا کہ وہ باقیماندہ پاکستان میں کس قسم کی حکومت اور

نظام رائج کرنا چاہتی تھی۔

موجودہ حکمرانوں کی ہمہ اختیاری کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹ تھی تو وہ پاکستان نیشنل عوامی پارٹی تھی جس پر جنرل یحیٰی خان نے اس لئے پابندی لگائی تھی کہ وہ جنرل یحیٰی خان کی ملک دشمن اور ناعاقبت اندیشانہ پالیسیوں اور اقدامات کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھی چونکہ ملک کی باقی تمام جماعتیں معہ پیپلز پارٹی، مشرقی پاکستان میں فوج کشی اور طاقت کے استعمال کے بارے میں یحیٰی خان کی ہمنوا اور معاون تھیں اور جنرل یحیٰی خان نیشنل عوامی پارٹی کو اپنا ہمنوا نہیں بنا سکا تو اس نے صداقت اور جمہوریت کی اس واحد آواز کو دبانے کے لئے نیشنل عوامی پارٹی پر ملک دشمنی کا الزام لگا کر اس پر پابندی عائد کی تاکہ پاکستان کی سالمیت اور اتحاد کی طرف داری میں جو واحد صدائے حق بلند ہو رہی تھی، اسے خاموش کیا جائے۔

مسٹر بھٹو اس صورتحال سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ نیشنل عوامی پارٹی سے پابندی ہٹا کر اور حکومت میں نیشنل عوامی پارٹی کو پیپلز پارٹی کا طفیلی بنا کر محاذ آرائی کو ٹال دیں گے اور ملک میں ہمہ اختیاری طرز نظام کو خوش اسلوبی سے نافذ کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

چنانچہ نیشنل عوامی پارٹی پر سے پابندی ہٹانے کے بعد نیشنل عوامی پارٹی کے صدر کو مرکز میں دو وزارتوں کی پیش کش کی گئی اور حکومت میں شمولیت کی دعوت دی گئی مگر ان کی توقع کے خلاف نیشنل عوامی پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ نیشنل عوامی پارٹی اس وقت تک حکومت میں شمولیت اور پیپلز پارٹی کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگی جب تک مارشل لاء نہ ہٹایا جائے یا مارشل لاء ہٹانے کے لئے ایک قریب ترین تاریخ مقرر نہ کی جائے، جمہوریت بحال نہ ہو اور جمہوری عمل اور اداروں کو دوبارہ روبکار نہ لایا جائے۔ یہ وہ نکتہ تھا جہاں سے نیشنل عوامی پارٹی اور موجودہ حکمرانوں کے درمیان مخالفت شروع ہوئی۔ اس کے بعد حکومت نے نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ جتنے بھی سمجھوتے کئے، وہ سب اس غرض کے پیش نظر تھے کہ نیشنل عوامی پارٹی کو عوام سے کاٹ کر ملک میں ہمہ اختیاری کی راہ ہموار کی جائے مگر جب برسراقتدار حکمرانوں نے محسوس کیا کہ نیشنل عوامی پارٹی کی بجائے

وہ خود عوام سے کٹتے جا رہے ہیں تو انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی کے رہبروں کی کردار کشی اور نیشنل عوامی پارٹی پر جھوٹے الزامات تراشنا شروع کیے۔

بلوچستان اور سرحد سے نیشنل عوامی پارٹی کے گورنروں کو معاہدہ کے برخلاف برخاست کرنا، بلوچستان کی دستور اور آئینی حیثیت کو دستور کی خلاف ورزی کر کے برطرف کرنا، بلوچستان میں بڑے پیمانے پر فوج کشی، لندن پلان اور عراقی سفارت خانے سے برآمد شدہ روسی اسلحہ کے بے بنیاد الزامات نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے راہنماؤں پر ملک دشمنی کا الزام اور ہندوستان اور افغانستان اور غیر متعلقہ واقعات سے نیشنل عوامی پارٹی کو متعلق بنا کر نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگانے اور اسے توڑنے کا جواز پیدا کیا گیا۔

6 مارچ 1972ء کے معاہدے کے تحت پیپلز پارٹی نے اس حقیقت کو تسلیم کیا تھا کہ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کی مخلوط پارلیمانی پارٹی واضح اکثریت کی حامل ہے اور اس مخلوط پارلیمانی پارٹی کو ان دو صوبوں میں حکومت بنانے کا دستوری حق حاصل ہے۔ اس معاہدے کے وقت صوبائی حکومتیں وجود میں نہیں آئی تھیں اور تمام صوبوں میں گورنروں کی حکومتیں قائم تھیں۔ نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلمائے اسلام کے اس مطالبے کو تسلیم کیا گیا کہ ان کے گورنر مقرر کر کے حکومت ان کے حوالے کی جائے۔

گورنروں کی تقرری کے بعد بلوچستان اور صوبہ سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلمائے اسلام کی (جن متذکرہ اسمبلیوں میں اکثریت تھی) مخلوط حکومتیں قائم ہوئیں۔

ہمارے خلاف یہ الزام درست نہیں کہ بلوچستان اور صوبہ سرحد کی صوبائی حکومتیں سنبھالنے کے بعد ان صوبائی حکومتوں نے مرکز سے محاذ آرائی کی پالیسی شروع کی اور اپنی دستوری ذمہ داریوں کی خلاف ورزی کی۔

حقیقت حال یہ ہے کہ بلوچستان اور صوبہ سرحد کی صوبائی حکومتوں نے نہیں بلکہ وفاقی حکومت نے اپنی تمام دستوری اور قانونی ذمہ داریوں کو زیر کر کے ان دو صوبائی حکومتوں کو ناکام بنانے کے لئے محاذ آرائی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شروع کی

جس کی تفصیل یہ ہے:

(1) نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلمائے اسلام کی صوبہ سرحد و بلوچستان کی صوبائی اسمبلیوں کی واضح اکثریت کے باوجود پانچ ماہ تک وفاقی حکومت دستور کے خلاف اپنے گورنروں اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں کے ذریعے ان صوبوں میں حکومت چلاتی رہی اور اکثریتی پارٹی کو حکومت حوالے نہیں کی، حالانکہ جن دو صوبوں میں یعنی پنجاب و سندھ میں پیپلز پارٹی کی اکثریت تھی، وہاں روز اوّل سے ہی حکومت اکثریتی جماعت کے حوالے کی گئی، عوام کے دباؤ اور حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر بلوچستان اور صوبہ سرحد میں مرکزی حکومت کو اکثریتی پارٹی کو حکومت کے حوالے کرنا پڑی، تو اسی روز سے وفاقی حکومت نے صوبائی حکومتوں کو ناکام بنانے کی سازش کو بھی عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ بظاہر وفاقی حکومت تعاون کا شور وغل مچا رہی تھی مگر اندرونی طور پر وہ تمام ذرائع جو وفاقی حکومت کے پاس مہیا ہو سکتے تھے ان کو ہر دو صوبوں کی حکومتوں کو ناکام بنانے کی خاطر استعمال کرتی رہی۔ مثال کے طور پر حسب ذیل اقدامات اختیار کیے گئے۔

تمام سیکرٹری اور محکموں کے سربراہ بلوچستان میں براہ راست مرکز یا پنجاب و سندھ سے متعلق تھے جہاں پر پیپلز پارٹی کی حکومتیں قائم تھیں۔ ان کے ملازموں کی ترقی و تنزلی کا تعلق ان حکومتوں سے تھا۔ خاص کر ملازموں سے دستوری تحفظ لیے جانے کے بعد ان اعلیٰ و ادنیٰ افسران کی حیثیت نجی خدمتگاروں سے زیادہ بہتر نہ رہی تھی۔ اس لیے وہ ہر وقت اپنے فرائض منصبی بجالانے کے لیے مرکز کے اشاروں اور ہدایات کے منتظر رہتے اور علی الاعلان صوبائی حکومتوں (سرحد بلوچستان) سے تعاون نہ کرنے کا عملی اقدام اور اعلانیہ طور پر صوبائی حکومتوں کے احکامات کو نظر انداز کرتے رہے۔

(2) ان اعلیٰ افسروں کو جو مرکز پنجاب اور سندھ سے متعلق تھے، یقین دلایا گیا کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتیں چند روز کے لیے ہیں، اس لیے ان سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے اپنی عاقبت خراب نہ کریں۔

(3) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ہر وقت مرکزی وزراء کا تانتا لگا رہتا تھا اور وہ بغیر کسی کی

پردہ داری کے نمایاں طور پر صوبائی حکومتوں کے خلاف مختلف طبقوں میں ان کی خواہش اور ضرورتوں کے مطابق ان کو سبز باغ دکھاتے ،صوبائی حکومتوں کے خلاف آمادہ بہ مخالفت کرتے اور ساتھ ہی ساتھ یہ وزراء عوام کو یہ بھی یقین دلاتے کہ عنقریب بھٹو صاحب ان حکومتوں کو ختم کر دیں گے ۔بعض مواقع پر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان وزراء کا فرض اولین یہی ہے کہ وہ ان مذکورہ صوبائی حکومتوں کو ناکام بنائیں۔

(4) ان وفاقی وزراء نے ان دو صوبوں میں امن عامہ کو خراب کرنے کی خاطر بلوچستان اور سرحد میں لٹ بند آبادکاروں کو ابھارا کہ جو اراضیات ان کے پاس بٹائی کی شرائط کے تحت ہیں، ان پر قبضہ کرلیں اور مالکان اراضی کو ان کے حقوق سے محروم کریں۔ اس طرح چھوٹے بڑے مالکان زمین اور ان لوگوں کو جو بٹائی کی شرائط کے تحت ان زمینوں کو آباد کر رہے تھے دست و گریباں کر دیا اور ان لٹ بند آبادکاروں کو کسان (ہاری) کا نام دے کر ان کی پشت پناہی کی گئی ، حالانکہ سندھ اور پنجاب میں ان کا کاشتکاروں کی سختی سے سرکوبی کی جو مالک زمین کا مالکانہ ادا نہیں کرتے تھے۔ وفاقی حکومت کو بارہا کہا گیا کہ اس طرح سے امن عامہ میں خلل اور فساد کا ہونا یقینی ہے۔ اس کا بہتر اور صحیح طریقہ یہ تھا کہ زمینداری کی تنسیخ کا اعلان کر کے زمین حکومت اپنے قبضے میں لے لیتی اور پھر بین الاقوامی طور پر آزمودہ اور تسلیم شدہ طریقہ کار کے مطابق زمین کسانوں میں تقسیم کی جاتی ۔جیسا کہ سندھ اور پنجاب میں حکومت نے زمینداری کو محدود کرنے کے بعد زائد زمین کو قبضے میں لے کر تقسیم کرنے کے اس آزمودہ کار طریقے کو اختیار کیا۔ ہمارے مشورہ اور بار بار تجویز کے باوجود حکومت نے ان پر کان نہیں دھرے کیونکہ حکومت کو زمینداری کی تنسیخ یا کسانوں کو زمین دینے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ان کا واحد مقصد لوگوں کو آپس میں لڑا کر بلوچستان میں امن خراب کرنا تھا۔اس لیے انہوں نے ہمارے تعاون اور پیش کش کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہی صورت حال صوبہ سرحد میں بھی پیدا کی گئی۔

(5) پٹ فیڈر میں مرکزی وزراء کے ذریعے مقامی لوگوں کو پنجابی آبادکاروں کے خلاف اکسا کر فساد کروادیا اور پھر تمام ذرائع ابلاغ کو حرکت میں لا کر اس خود پیدا کردہ فساد کو

اس طرح پیش کیا گیا کہ بلوچستان کی حکومت پنجابیوں کو بلوچستان سے نکالنا چاہتی ہے اور اس بات کی انتہائی کوششیں کی گئیں کہ بلوچوں اور پنجابیوں کو کوئٹہ اور بلوچستان کے دیگر علاقوں میں بھی لڑایا جائے مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

پٹ فیڈر میں گو وہ وقتی طور پر مقامی لوگوں کو آپس میں اور پنجابی آبادکاروں سے لڑانے میں کامیاب ہوئے اور اس میں ایک شخص مرا اور کچھ لوٹ مار بھی ہوئی مگر حکومت بلوچستان نے بہت جلد اس سازش پر قابو پالیا اور اسے مزید بڑھنے سے روکا۔

(6) خان عبدالصمد خان مرحوم کے ذریعے پشتون اور بلوچوں کو لڑانے کی کوششیں کی گئیں اور اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر رقم خرچ کی گئی۔

(7) اکبر بگٹی کے توسط سے ان کے لڑکے سلیم بگٹی کو اس کام پر آمادہ کرایا کہ وہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو لے کر مسٹر احمد نواز بگٹی کو جو نیب کے صوبائی وزیر تھے، استعفیٰ دینے پر مجبور کرے، چنانچہ خان محمد کلیم بگٹی کی قیادت میں پچاس سے زائد بگٹیوں کو مسلح کر کے بلوچستان سیکرٹریٹ بھیجا گیا تا کہ فساد اور کشت و خون ہو اور اکبر بگٹی کو لندن اس غرض سے بٹھایا گیا تھا کہ موقع آنے پر اس کو واپس بلا کر ان دوسرے تخریب کاروں کے سرغنہ کی حیثیت سے بلوچستان میں سرگرم عمل کیا جائے ، جن کو اس سے قبل وفاقی حکومت نے قانون شکنی اور بدامنی پھیلانے کے لئے سرگرم کیا تھا۔

(8) سردار دودا خان زرکزئی (صدر قلات مسلم لیگ) کو ہتھیار اور مالی امداد دے کر آر سی ڈی روڈ اور جھالاوان کے علاقے میں متعین کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے آر سی ڈی روڈ پر حکومت بلوچستان کے افسران تک کو روک کر ان کی تلاشیاں لینی شروع کیں ۔جب حکومت بلوچستان نے اس کی گرفتاری کے وارنٹ نکالے تو صدر نے باقاعدہ چیف سیکرٹری کے ذریعے اس کو راولپنڈی بلایا اور اسے تحفظ دیا اور پھر کراچی میں اس وقت تک اس کو بٹھایا جب تک کہ بلوچستان کی قانونی حکومت کو برطرف نہ کیا گیا۔

(9) میر نبی بخش زہری اور کوئلہ اور سنگ مرمر کے دوسرے کان مالکوں کے ذریعے بلوچستان اور خصوصاً کوئٹہ شہر میں افراتفری پھیلانے کی کوششیں کی گئیں، اور نبی بخش

زہری جھالاوان میں سردار دودا خان کو تخریب کاری کے لئے ہتھیار، راشن وغیرہ مہیا کرتا تھا۔ جب بلوچستان حکومت نے زہری کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کئے تو اس کو کراچی میں تحفظ دیا گیا اور حکومت بلوچستان کے بار بار مطالبے پر حکومت سندھ اس کے لئے تیار نہیں ہوئی کہ حکومت بلوچستان کے جاری کردہ وارنٹ کو پذیرائی بخشے یہاں تک کہ گورنر بلوچستان کی موجودگی میں وفاقی وزیر داخلہ خان قیوم نبی بخش زہری کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نیشنل اسمبلی کے برآمدے میں دانستہ طور سے بے نیازی اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتا رہا۔

(10) جام لسبیلہ غلام قادر کو لسبیلہ میں تخریب کاری کے لئے مقرر کیا گیا تھا، جب جام لسبیلہ کے خلاف بلوچستان کی حکومت نے ان تخریب کاریوں اور دوسرے مقدمات میں وارنٹ نکالا تو اس کو بھی کراچی میں رکھا گیا۔ یہاں تک کہ حیدرآباد کے ایک جلسہ عام میں مسٹر بھٹو نے جو اس وقت صدر مملکت تھے، برسرعام اپنی تقریر میں کہا کہ یہ جام صاحب جو سامنے بیٹھ کر سگریٹ کے دھوئیں پھونک رہا ہے، اگر میں نہ ہوتا تو یہ اس وقت جیل میں ہوتا۔

(11) بلوچستان اور صوبہ سرحد میں جن مجرموں کے خلاف صوبائی حکومتوں نے مختلف مقدمات کے سلسلے میں وارنٹ نکالے، وفاقی حکومت نے انہیں تحفظ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتیں وفاقی حکومت اور حکومت سندھ کے نزدیک پاکستان کے صوبوں کی حکومتیں نہیں، بلکہ دو ایسی متحارب حکومتیں ہیں جن کے مخالفوں اور ان کے مجرموں کو پناہ دینا ان کے لئے لازمی تھا۔

(12) جب شہزادی اشرف پہلوی صدر پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے بلاوے پر کوئٹہ آئیں تو ملک کے تمام صوبوں کے گورنر اور مرکزی وزراء بھی صدر کے ساتھ کوئٹہ آئے، وزیر داخلہ قیوم خان اپنے ہمراہ سرحد سے چالیس کے قریب اپنے رضا کار بھی لے آیا تھا۔ اپنے ان رضا کاروں سے اس نے شہر میں گڑبڑ کرا دی اور ان رضا کاروں نے فائرنگ کر کے ایک نوجوان کو شہید کیا اور عین اس وقت جب شہزادی گورنر ہاؤس میں ڈنر پر جانے کے لئے تیار تھیں تو ایک بہت بڑا جلوس لاش لے کر

گورنر ہاؤس پہنچا۔ شہر سے لے کر گورنر ہاؤس تک کسی نے نہ اس جلوس کو روکا اور نہ اس کی اطلاع وزیر اعلیٰ یا کسی دوسرے وزیر کو دی۔ ظاہر ہے کہ یہ سوائے وزیر داخلہ اور وفاقی حکومت کی منشا کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ شہزادی اشرف پہلوی کو یہ بتایا جائے کہ بلوچستان کی حکومت نااہل ہے اور حالات پر اس کی گرفت یا قابو نہیں۔

(13) اکبر بگٹی کو لندن سے منگوالیا گیا تا کہ وہ اپنی مطلوبہ تخریب کاری کا کردار سرانجام دے سکے، چنانچہ جب اکبر بگٹی کراچی ائرپورٹ پر اترے تو ان کی حفاظت اور پیشوائی کا باقاعدہ انتظام کیا گیا۔ اس نے ملک واپس پہنچ کر یہ شور مچانا شروع کیا کہ بلوچستان کی حکومت اور نیشنل عوامی پارٹی پاکستان کے خلاف بیرونی ممالک سے ہتھیار منگوا رہے ہیں اور بہت بڑے پیمانے پر بلوچستان میں ہتھیار آ چکے ہیں اور بلوچستان کے مختلف علاقوں میں چھاپہ مار ٹریننگ کیمپ کھلے ہوئے ہیں اور بڑے پیمانے پر وہاں رضا کار چھاپہ مار جنگ کی تربیت لے رہے ہیں۔

اکبر بگٹی کے لئے باقاعدہ پیپلز پارٹی اور وفاقی حکومت کے ایما پر جلسے ترتیب دیئے گئے اور لاہور میں بڑے پیمانے پر ایک جلسہ منعقد کیا گیا اور اکبر بگٹی نے اس جلسے میں خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر بیرونی ہتھیاروں کی بلوچستان میں آمد، چھاپہ ماروں کی تربیت اور عنقریب چھاپہ مار تحریک کے شروع ہونے کا واویلا کیا اور دعویٰ کیا کہ اگر بلوچستان کی حکومت کو ہٹا کر اس کو موقع دیا جائے تو وہ اپنے تمام تر دعوؤں کو درست ثابت کرے گا مگر جب بلوچستان کی دستوری حکومت کو غیر آئینی طور پر برخاست کر کے حکومت اکبر بگٹی کے سپرد کی گئی تو از اں بعد نہ تو چھاپہ مار رضا کاروں کے تربیتی کیمپوں کی نشاندہی کی گئی اور نہ ہی بیرونی ہتھیار برآمد کئے جا سکے۔

(14) جب عراقی سفارتخانے سے ہتھیار برآمد کئے گئے تو اس امر کو بڑے زوروں سے اچھالا گیا کہ یہ ہتھیار بلوچستان میں تقسیم کرنے کے لئے لائے گئے ہیں۔ ان ہتھیاروں کو روسی ہتھیار بتایا گیا اور تمام ملک میں ان کی نمائش کی گئی اور یہ تاثر دیا گیا کہ بلوچستان میں بغاوت کی تیاریوں میں روس کا ہاتھ ہے۔

(15) لندن پلان کا ڈرامہ رچا کر اس کے ذریعے نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے رہبروں کی کردار کشی کی گئی۔

(16) گورنرز کانفرنس کے طے شدہ فیصلوں کے مطابق مختلف صوبوں کے ان ملازموں کو جو حکومت بلوچستان کے ملازم نہیں تھے بلکہ وحدت مغربی پاکستان کے ٹوٹنے پر ان کو زائد کر کے بلوچستان میں رکھا گیا تھا واپس کیا گیا جو وفاقی حکومت پنجاب سندھ سرحد اور بلوچستان کے مشترکہ اور متفقہ فیصلہ کا نتیجہ تھا۔ اس فیصلے پر پنجابیوں میں نفرت پھیلانے کی خاطر تمام ذرائع ابلاغ کو بروئے کار لایا گیا اور پراپیگنڈے سے ملک مین یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ بلوچستان کی حکومت نے تمام پنجابیوں کو ملازمت سے علیحدہ کیا ہے، حالانکہ گورنرز کانفرنس کا متذکرہ فیصلہ تمام صوبوں میں زائد ملازمین کے بارے میں یکساں طور پر نافذ العمل تھا۔

(17) مرکزی حکومت خود براہ راست لاکھوں من چاول کا پرمٹ بطور سیاسی رشوت چمن کے لئے جاری کرتی رہی جو کہ افغان سرحد پر ایک معمولی سا قصبہ ہے۔ یہ پراپیگنڈہ کرنے کی کوشش کی گئی کہ حکومت بلوچستان سمگلنگ کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔

(18) بلوچستان میں دیہی پولیس کے نام سے گورنرز کانفرنس کے فیصلے کے مطابق صوبائی حکومت نے ایک فورس بھرتی کی، مگر بعد میں جب بلوچستان کی حکومت کو برطرف کیا گیا تو وفاقی وزراء نے یہ تاثر دیا کہ بلوچستان کی حکومت نے ایک پرائیویٹ لشکر بنایا تھا جس کو وہ پاکستان کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے، حالانکہ وہی اس وقت بلوچستان پولیس ریزرو (B.P.R) کے نام سے موجود ہے۔ صرف اس کے کمانڈر کرنل عثمان کو علیحدہ کیا گیا اور بعد میں اس کو گرفتار کیا گیا۔ صرف فورس کا نام تبدیل کیا گیا، حالانکہ وہ پہلا نام یعنی پولیس بھی وفاقی حکومت کی تجویز کے مطابق گورنرز کانفرنس میں طے ہوا تھا۔

(19) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلمائے اسلام کی مخلوط حکومت کے برسر اقتدار آتے ہی، ان ہر دو صوبوں میں امن و امان کا موثر ذریعہ سول آرمڈ فورسز تھی، جو پاکستان بننے سے قبل ان دو صوبائی حکومتوں کے لئے مخصوص تھی

اور آئی جی فرنٹیئر کور گورنر سرحد کا سیکرٹری ہوتا تھا اور ڈی آئی جی بلوچستان کے اے جی جی (AGG) کا سیکرٹری ہوتا تھا۔ اس فورس کو صوبوں کے اختیار سے لے کر ہر دو صوبوں کو امن عامہ قائم کرنے کی موثر قوت سے محروم کر دیا گیا اور اپنے سوچے سمجھے منصوبوں کو بلا روک ٹوک عملی جامہ پہنانے کی راہ ہموار کر لی۔

(20) جب وفاقی حکومت کی یہ تمام کارروائیاں ناکام ہوئیں اور وہ بلوچستان میں بڑے پیمانے پر امن عامہ میں خلل ڈالنے میں ناکام ہوئی اور بلوچستان میں جمہوری عمل میں رکاوٹ پیدا نہ کر سکی تو آخر میں تمام پردوں سے برہنہ ہو کر آخری داؤ لگانے پر آمادہ ہوگئی۔

چنانچہ اس سازش کی ابتدا اس طرح کی گئی کہ جام غلام قادر کے لڑکے یوسف کو جو لس بیلہ میں پیپلز پارٹی کا صدر تھا، مع بلوچستان میں پیپلز پارٹی کے صدر امان اللہ گچکی کے، اس لئے بیلہ بھیجا گیا کہ وہ اپنے کو گرفتار کرائیں تاکہ باقی منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ مسٹر یوسف کے خلاف پہلے سے 124 الف کے تحت حکومت بلوچستان کے وارنٹ تھے اور وہ کراچی جا چکے تھے جب وہ لس بیلہ میں داخل ہوئے تو پولیس نے ان کو روکا، مسٹر امان اللہ گچکی نے پولیس افسروں کو گالی گلوچ کی اور مسٹر یوسف کی گرفتاری کی مزاحمت کر کے حکام کے فرائض منصبی میں مداخلت کی اور افسران کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اسے حراست میں لے لیں۔ اس کے فوراً بعد اصل منصوبہ روبکار لایا گیا۔

نبی بخش زہری، جام غلام قادر، سردار دودا خان زرکزئی اور اکبر بگٹی کے زیر سرپرستی (جو بلوچستان کے مختلف علاقوں میں وفاقی حکومت کی طرف سے تخریب کاری کے سرغنہ تھے) جاموٹ و دیگر قبائل کے چند لوگوں کو ہتھیار دے کر لس بیلہ میں فساد کرانے کیلئے بھیجا گیا۔ ان تخریب کاروں نے اپنا سب سے پہلا نشانہ دائرہ کے قریب ٹیلی فون اور ٹیلی گراف لائن کو بنایا اور یہ اعلان کیا گیا کہ اگر جام یوسف کو رہا نہیں کیا گیا تو اسے زبردستی رہا کرا لیں گے اور حکومت کو اس امر کا نوٹس دیا گیا صوبائی حکومت نے ان تخریب کاروں کی سرکوبی کے لئے ملیشیا کو حکم دیا کہ وہ ان کو گرفتار کریں۔ پہلے تو ملیشیا نے ان کا تعاقب کیا، تخریب کاروں نے ملیشیا پر فائرنگ کی، مگر دوسرے روز بجائے اس کے کہ ملیشیا تخریب

کاروں کا پیچھا کرتی، واپس اپنے ہیڈکوارٹر آ گئی۔ جب ان سے وزیراعلیٰ نے تخریب کاروں کا پیچھا کرنے کو کہا تو انہوں نے واشگاف الفاظ میں بتایا کہ ہمیں ہمارے مرکز سے حکم ملا ہے کہ ہم ایسا نہ کریں۔ اس نازک صورتحال میں وزیراعلیٰ عجیب مشکل سے دوچار ہوئے۔ ایک طرف علاقے میں امن وامان اور حکومت کا وقار داؤ پر تھا تو دوسری طرف وہ واحد موثر قوت یعنی سول آرمڈ فورس جو نیم صدی سے زائد عرصہ سے بلوچستان میں امن وامان قائم رکھنے کا ذریعہ تھی اس نے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی سے انکار کیا۔ مجبوراً وزیراعلیٰ نے دیہی پولیس کو جس کے جوان اب تک مختلف مقامات پر زیرتربیت تھے، منگوایا اور مقامی لوگوں سے بھی اپیل کی گئی کہ وہ امن قائم کرنے اور تخریب کاروں کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لئے ان کا ساتھ دیں۔

جب دیہی پولیس اور عوام نے ان تخریب کاروں کا پیچھا کیا اور ان کے سرپرستوں کو یقین ہو گیا کہ وہ اب عوام کی قوت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے ہیں تو وفاقی حکومت نے فوج کو لسبیلہ میں داخل ہونے کا حکم دیا، حکومت بلوچستان کی طرف سے بیلہ میں فوج کی مداخلت پر احتجاج ہوتا رہا اور مزید فوج لسبیلہ بھیجی جاتی رہی بلکہ سارے بلوچستان میں مختلف جگہوں پر فوج اور ملیشیا کی خبریں آنے لگیں اور تمام ذرائع ابلاغ کے ذریعے بلوچستان دیہی پولیس اور ان چند رضا کاروں کو جو وزیراعلیٰ کی اپیل پر امن قائم کرنے کے لئے اس کی مدد کرنے آئے تھے، پرائیویٹ لشکر اور قبائلی لشکر کا نام دیکر ملک کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ وزیراعلیٰ نے اپنی قبائلی مخالفت کی بنا پر لسبیلہ پر حملہ کروایا ہے، حالانکہ جب پولیس نے لاہور میں ہڑتال کی اور بے قابو ہوئی اور لوگوں نے اس کو فرو کیا تو ان کے اس اقدام کو لاہور کے لوگوں کی سیاسی بیداری اور جمہوری شہکار بنا کر پیش کیا گیا، مگر جب بلوچستان کے لوگوں نے ان کے فرستادہ تخریب کاروں کے خلاف پولیس کا ہاتھ بٹایا تو بلوچستان کی دیہی پولیس کو پرائیوٹ لشکر اور جن لوگوں نے رضا کارانہ طور پر حکومت کی مدد کی، انہیں قبائلی لشکر کا نام دیا گیا۔ یہ ایک بام ودر ہوا کا طریقہ کار پیپلز پارٹی کی طرز حکمرانی کا مخصوص پہلو ہے۔ سندھ میں اگر سینکڑوں لوگ لسانی فسادات میں بے گھر ہوتے اور مرتے ہیں اور اس پر کراچی کے لوگ صوبائی حکومت کو مستعفی ہونے کو کہتے ہیں تو اس کے جواب

میں تمام مرکزی وزراء بیک زبان یہ کہتے ہیں کہ دستوری حکومت سے استعفیٰ کا اس قسم کا مطالبہ جمہوری اقدار کے خلاف ہے مگر جب مرکزی حکومت بلوچستان میں اپنے تخریب کاروں کی پشت پناہی میں فوج بھیج کر صوبے کے ایک ضلع کو فوج کی باقاعدہ تحویل میں دیتی ہے اور اس کے بعد بلوچستان کی دستوری حکومت کو برخاست کرتی ہے تو اس کو بلوچستان کی حکومت کی امن عامہ قائم کرنے میں ناکامی اور نااہلی کا نام دے کر تمام آداب کو پس پشت ڈال کر اپنے اس غیر آئینی اقدام کو بروقت کارروائی کا نام دیا جاتا ہے۔

(21) بلوچستان کی آئینی حکومت کو برطرف کرنے کے بعد بلوچستان کے مختلف علاقوں میں عوام کے جمہوری احتجاج کے خلاف اور ان کے آئینی حقوق کو سلب اور پامال کرنے کی غرض سے فوجی کارروائی کا آغاز کیا گیا جس کا پہلے سے وفاقی حکومت نے اہتمام کیا تھا۔

(22) 1970ء کے عام انتخابات میں بلوچستان سے پیپلز پارٹی کا ایک بھی ممبر صوبائی یا قومی اسمبلی میں منتخب نہیں ہو سکا تھا، مگر بعد میں بلوچستان کی صوبائی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی اکثریت تھی اور بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت بنی اور سینٹ میں بلوچستان سے اس جماعت کے تین ارکان آئے یہ اکثریت کیسے اور کہاں سے آئی؟ حالانکہ بلوچستان میں دوبارہ عام انتخاب نہیں ہوئے، ظاہر ہے کہ صوبائی اسمبلی میں یہ اکثریت اور پیپلز پارٹی کے ممبروں کی سینٹ میں موجودگی غیر آئینی طریقہ کار برہنہ طاقت اور سیاسی رشوت کے نتیجے میں پیپلز پارٹی کو حاصل ہوئی۔ نیشنل عوامی پارٹی کے ممبروں پر جھوٹے مقدمات بنا کر ان کی نشستیں خالی کی گئیں اور پھر بلا مقابلہ اپنے نمائندوں سے ان کی جگہیں پر کی گئیں، نیز اسمبلی میں دوسری جماعتوں اور آزاد ممبروں کو گن اینڈ گولڈ کے ذریعے ہمنوا بنایا گیا۔ اس سے بڑھ کر دستور کی خلاف ورزی اور بے حرمتی کیا ہو سکتی ہے۔

(23) نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت کی مخلوط حکومت کو غیر آئینی طور پر برخاست کرنے کے بعد اکبر بگٹی اور جام غلام قادر کو وفاقی حکومت کی طرف سے نیشنل عوامی پارٹی کی دستوری حکومت کے خلاف تخریب کاریوں کے سرانجام دینے کے صلے میں بالترتیب

گورنر اور وزیر اعلیٰ بلوچستان مقرر کیا گیا۔

جام غلام قادر کا بحیثیت وزیر اعلیٰ تقرر آئین کی آرٹیکل 3/3 کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ دستور کے مذکورہ آرٹیکل کے تحت وزیر اعلیٰ تقرری کے لئے کل ممبران اسمبلی کے اکثریتی ووٹ حاصل کرنا لازمی ہے۔ جس کی کوئی پروا نہیں کی گئی۔

مورخہ 6 جون 1973ء کو 12 ممبران صوبائی اسمبلی کے دستخطوں سے جو آرٹیکل کی منشا 1/4 کی بجائے اسمبلی کی قطعی اکثریت تھی، وزیر اعلیٰ جام غلام قادر اور اس کی حکومت کے خلاف دستور کی آرٹیکل (2)54 کے تحت عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی جسے نظر انداز کیا گیا اور صوبائی اسمبلی کی موجودگی میں صوبائی بجٹ آرڈیننس کے ذریعے آئین میں ترمیم کر کے پاس کیا گیا جو کہ آرٹیکل 125 کی منشاء کے خلاف ہے۔

اب میں ان واقعات کا مختصر ذکر کروں گا کہ نیشنل عوامی پارٹی نے کس حد تک جمہوریت کی بحالی، ملک کی سالمیت اور اتحاد کے لئے وفاقی حکومت سے تعاون کیا:

ان دونوں صورت حال کو سامنے رکھ کر عدالت خود فیصلہ کر سکتی ہے کہ کس نے اپنی دستوری ذمہ داریوں کو نظر انداز کیا اور کس نے محاذ آرائی شروع کی۔

1: جب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اختیار سنبھالا تو اس نے نیشنل عوامی پارٹی کے صدر خان عبدالولی خان کو بلا کر تعاون کے لئے کہا۔ مسٹر عبدالولی خان نے جمہوریت کی بحالی اور باقی ماندہ پاکستان کی سالمیت اور اتحاد کی خاطر غیر مشروط طور پر بھٹو سے تعاون کا اعلان کیا۔

2: عبوری دستور اور پھر موجودہ دستور کی تشکیل میں نیشنل عوامی پارٹی نے سوائے ان مواقع کے جہاں جمہوری اقدار کی نفی ہوتی تھی۔ ہر منزل پر تعاون کیا۔

3: بھٹو کے بیرونی دوروں پر اپنے اہم ممبران کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دی، تاکہ بیرونی ممالک کی حکومت پر واضح ہو کر صدر کو سارے ملک کا اعتماد حاصل ہے۔

4: جب صدر کی حیثیت سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ہندوستان گئے تو صوبہ سرحد کے گورنر (جو کہ نیشنل عوامی پارٹی کے اہم رکن ہیں) ان کے ہمراہ شملہ گئے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان دونوں کی اسمبلیوں نے جہاں پر نیشنل عوامی پارٹی کی اکثریت اور حکومتیں

تھیں، اعتماد کی قرارداد پاس کیں۔

5: شہزادی اشرف پہلوی کی آمد پر باوجود ناموافق حالات اور وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان کی شرارت کے حالات کو اعتدال پر رکھا اور بھٹو کی خواہش کے مطابق سب کچھ عملدرآمد ہو۔ ظاہر ہے کہ عام حالات میں بھی اگر بلوچستان کی حکومت نہ چاہتی تو یہ سب کچھ ممکن ہی نہیں تھا۔

6: جب بھٹو نیشنل عوامی پارٹی کے دور حکومت میں صوبہ سرحد یا بلوچستان آئے، گورنر تمام وزراء اور نیشنل عوامی پارٹی کے ہزاروں کارکنوں نے انہیں خوش آمدید کہا اور ان کا استقبال کیا، کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ نہیں ہے جس کو انہوں نے محسوس کیا ہو۔

7: تمام مسائل میں، چاہے وہ قومی تھے یا بین الاقوامی نیشنل عوامی پارٹی نے وفاقی حکومت کے ساتھ تعاون کیا۔

8: شملہ معاہدہ کے موقع پر نیشنل عوامی پارٹی تھی جس نے نیشنل اسمبلی میں واضح اور نمایاں طور پر حکومت سے تعاون کیا۔

ہم پر دوسرا بڑا الزام یہ ہے کہ ہم نے نظریہ پاکستان اور پاکستانی قومی تشکیل کی تائید و حمایت سے انحراف کیا، چار قومی نظریے کی زبان، نسب اور نسل کی بنیاد پر تشہیر کی اور وفاقی حکومت کے خلاف بلوچ اور پشتون قومیتوں کے حصول حق خود ارادیت کی خاطر محاذ آرائی اختیار کی۔

• یہ الزام کہ نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے راہبروں نے نظریہ پاکستان کی تائید و حمایت میں اپنے عمل اور قول سے گریز کیا ہے، سرتاپا بے بنیاد اور حقیقی طور پر غلط ہے، بلکہ جس نظریہ پاکستان کا اس وقت ڈھول پیٹا جا رہا ہے۔ یہ مبہم، من گھڑت اور بعد کا خود تراشیدہ تصور ہے جس کے بارے میں اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ کس کی اختراع اور ایجاد ہے مملکت غیر ذی شعور جغرافیائی حدود کا ایک مخصوص اور متعین خطہ ہوتا ہے نظریہ فکر انسانی کے نتیجے میں جنم پاتا ہے اس فکر اور قدر کی صلاحیت کا سوائے انسان کے کسی اور مخلوق نے ابھی تک نمایاں طور پر ثبوت پیش نہیں کیا۔ انسانی سوچ اور شعور مختلف ہوتا ہے اور نظریہ چونکہ فکر کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لئے ہر فرد گروہ یا جماعت کے نظریہ کا یکساں ہونا ممکن نہیں، مملکت

کا نظریہ دراصل اس میں آباد، اس گروہ، فرد یا جماعت کا نظریہ ہوتا ہے جو مملکت کے اقتدار پر قابض ہو۔ ایک جمہوری مملکت میں مختلف جماعتوں کی اقتدار کے لئے جدوجہد حقیقت میں مختلف نظریوں کا تصادم ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک مملکت کی بھلائی اپنے نظریہ میں دیکھتا اور سمجھتا ہے اور یہی انداز فکر حقیقت میں جمہوریت کی جان ہے۔ وحدانی نظریہ کا تخیل حقیقت میں بادشاہت و ہمہ اختیاریت اور مطلق العنانیت کی جبریت کا مظہر ہوتا ہے۔

پیپلز پارٹی، اس کی حکومت اور اس کے راہنما ہر اس تصور اور خیال کو بے اختیار سینے سے لگانے کو بے تاب ہوتے ہیں جس میں ہمہ اختیاریت کی کوئی رمق ہو۔ ورنہ جو لوگ برصغیر کی جدوجہد آزادی سے وابستہ اور تحریک پاکستان سے متعلق تھے، جن میں خود قائداعظم اور دوسرے مسلم لیگی رہنما شامل ہیں، وہ نظریہ پاکستان کے اس نوادر و تصور سے قطعی نا آشنا اور بیگانہ تھے۔ قائداعظم یا ان سے قبل کے مسلم لیگی راہنماؤں اور مسلم لیگ کے بانیوں نے تحریک پاکستان یا برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق کے حصول کی جدوجہد کے دوران کبھی اس قسم کا کوئی تصور اور نظریہ پیش نہیں کیا۔ جب تک قائداعظم زندہ رہے، انہوں نے کبھی اس نظریہ سے اپنے تعلق اور وابستگی کا اظہار نہیں کیا اور نہ اس کا اپنی تقریروں میں ذکر کیا بلکہ۔ بانی پاکستان اور دیگر مسلم لیگی قائدین کے نزدیک تقسیم برصغیر اور قیام پاکستان برصغیر کے دو بڑے فرقوں (ہندو مسلم، کے اختلافات کو دور کرنے، جیو اور جینے دو کے اصول کو عملی جامہ پہنانے کی مختلف تجاویز اور حل میں سے ایک ناگزیر حل تھا۔ یہ الزام اس وقت تک تشنہ جواب رہے گا جب تک سائل اس کی تشریح و تعریف نہ کرے، اس نظریے کے بانی، سرچشمہ اور منبع کی واضح نشاندہی نہ کرے، جہاں تک پاکستانی قوم کے تشکل کا تعلق ہے، نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے راہبروں نے کبھی اس کی مخالفت نہیں کی اور جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے راہبروں نے زبان، نسل اور نسب کی بنیادوں پر ''چار قوموں'' کی تشہیر کی ہے، سوائے اس کے کہ سائل نے اپنی جہالت اور نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے رہبروں کے بارے میں اپنی بے خبری اور جہالت کا مظاہرہ کیا ہے اور کچھ نہیں۔ نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے رہبر اس قسم کے فسطائی نظریہ قوم کے سخت مخالف ہیں اور ہم نسل انسانی کی یگانگت اور وحدت میں یقین رکھتے ہیں اور ایسی جمہوریت میں

یقین رکھتے ہیں جو انسانی اقدار اور انسانیت کی سربلندی اور عظمت کی قائل ہو۔

نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے رہبروں نے ''پانچ قومی تصور'' کا قولاً و فعلاً کبھی اظہار یا تشہیر نہیں کی اور نہ اس سلسلے میں وفاقی حکومت سے محاذ آرائی کی، البتہ جہاں تک پاکستان میں مختلف قومیتوں کے حقوق کا تعلق ہے، نیشنل عوامی پارٹی نے ہر وقت اس کی تائید و حمایت کی ہے اور شروع سے یہ نیشنل عوامی پارٹی کے دستور العمل کا جز چلا آ رہا ہے۔

ہمارے نزدیک پاکستان کی مختلف قومیتیں پاکستانی قوم کے اجزائے ترکیبی اور جز و لانیفک ہیں۔

مملکت پاکستان اور پاکستانی قوم خود ان مختلف قومیتوں کے رضا کارانہ اتحاد اور ان کی طرف سے اپنے معین اور متعین جغرافیائی حدود کے اشتراک کا نتیجہ ہے ان قومیتوں کے وجود سے انکار، پاکستان اور پاکستانی قوم کے وجود سے انکار کے مترادف ہے اور پاکستان میں انتشار اور بداعتمادی پیدا کرنا ہے۔ صرف یہ نہیں کہ یہ قومیتیں پاکستان کو وجود میں لانے کی ذمہ دار تھیں بلکہ یہی قومیتیں مملکت پاکستان کی بقا اور تحفظ کی ضامن ہیں۔ ان مختلف قومیتوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار کر کے ان میں بددلی اور بداعتمادی پیدا کرنا یا ان کے حقوق سے انکار کر کے ان قومیتوں کو اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد اور جنگ پر مجبور کرنا، پاکستان کی سالمیت اور اتحاد کے خلاف واضح سازش سے کم تر نہیں۔

10: یہ الزام بھی غلط ہے کہ بلوچستان کی صوبائی حکومت نے وفاقی حکومت کے اقتدار کو للکارا۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کی حکومت اور گورنر کی معلومات اور اطلاع کے بغیر کوسٹل گارڈز لس بیلہ کے مختلف علاقوں میں اچانک سرگرم عمل ہوئے، یہاں تک کہ ڈپٹی کمشنر اور متعلقہ حکام کو اس کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے کئی بار مقامی لوگوں کے ٹرک اور بار برداری کے جانوروں کی راہگیری کی اور بعض مقامات پر لوگوں کے گھروں کی تلاشی لی۔ اپنی مرضی اور منشا کے مطابق سپاہی مقامی روایات اور حالات سے بے خبر گھروں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کا باعث ہوئے اور لوگوں کو شارع عام پر زدوکوب کیا گیا جس پر ڈپٹی کمشنر نے وزیر اعلیٰ بلوچستان کو اس کی اطلاع دی اور وزیر اعلیٰ نے ڈپٹی کمشنر کو ہدایت کی کہ وہ کوسٹل گارڈز کے حکام کو مطلع کریں کہ جب بھی وہ

اپنا آدمی اندرون علاقہ بھیجیں تو مقامی انتظامیہ کو مطلع کر کے ان سے ایک ذمہ دار افسر ساتھ لیں تا کہ ان علاقوں میں کشیدگی پیدا نہ ہو۔

جہاں تک حکومت بلوچستان اور وزیراعلیٰ بلوچستان پر اس الزام کا تعلق ہے کہ انہوں نے دانستہ طور پر امن وامان قائم کرنے والے اداروں کا ڈھانچہ تباہ کیا، غلط کیا، غالباً اس سے مسٹر بھٹو کی مراد گورنرز کانفرنس کے اس فیصلے کے مطابق ان زائد پولیس ملازمین کی اپنے صوبوں میں واپسی سے ہے۔ جن کے وہ ملازم تھے اور جن کی وحدت مغربی پاکستان ٹوٹنے کے بعد عارضی طور پر بلوچستان میں رکھا گیا تھا اور جنہیں بعد میں حکومت بلوچستان نے وفاقی اور متعلقہ صوبائی حکومتوں (پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد) کے متفقہ فیصلے کے تحت واپس کیا۔

جب مسلح افراد کو بلوچستان میں تخریب کاری کے سرغنوں کے ذریعے لسبیلہ میں وفاقی حکومت کی سرپرستی میں مسلح تخریب کاری کے لیے بھیجا گیا اور ملیشیا نے وفاقی حکومت کی ہدایت پر صوبائی حکومت کے احکامات کو عملی جامہ پہنانے اور امن وامان قائم کرنے سے انکار کر دیا تھا وزیراعلیٰ بلوچستان نے دیہی پولیس کو امن وامان قائم کرنے میں ان کا ساتھ دیا، جن کو بعد میں وفاقی حکومت کے زیر کنٹرول ذرائع ابلاغ اور وفاقی وزراء نے پرائیویٹ لشکر اور قبائلی لشکر کا نام دیا۔ ہتھیار اس لیے منگوائے گئے تھے حالات کے مزید بگڑنے اور مزید ہتھیاروں کی ضرورت پڑنے پر پریشانی نہ ہو۔ جہاں تک اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس کو فارغ کرنے کا تعلق ہے، یہ عجیب بات ہے کہ صوبے کا وزیراعلیٰ اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس کو حکم دیتا ہے کہ فلاں مقدار اور فلاں جگہ پر اسلحہ مہیا کیا جائے اور وہ وزیراعلیٰ کے حکم کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ میرے نزدیک ایسے افسر سے چارج دوسرے افسر کے حوالے کرنے کا حکم وزیراعلیٰ کی طرف سے ایک انتہائی نرم اور محتاط اقدام تھا۔ ظاہر ہے کہ جب تک وفاقی حکومت کی طرف سے اس افسر کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو وہ حکم عدولی کی جرات نہیں کر سکتا تھا اور اب وفاقی حکومت کی طرف سے اس افسر کے اس اقدام کو سراہنا اور اس کی طرف داری سے اس بات کو مزید تقویت ملتی ہے کہ اس کی ملیشیا نے جو کیا، وہ وفاقی حکومت کے ایماء پر تھا۔ یہ غلط ہے کہ لسبیلہ کے واقعہ میں 42 افراد مارے گئے اور بڑے

پیمانے پر لوٹ مار ہوئی، کل اموات کی تعداد آٹھ سے زائد نہیں تھی۔ وزیراعلیٰ بلوچستان خود اس موقع پر پہنچے تھے کہ کہیں لاتعلق اور پرامن لوگوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔ اس واقعہ میں جو آٹھ افراد مارے گئے تھے، ان میں سے دو افراد ملیشیا کے تھے جو اس وقت ہلاک ہوئے جب ٹرک میں سوار جوان سے غلطی سے گولی چل گئی تھی۔ دو افراد حکومت اور دیہی پولیس کے مارے گئے اور چار تخریب کار مارے گئے۔ اس تعداد اور لوٹ مار کو اس لئے بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا کہ وفاقی حکومت کو بلوچستان کی صوبائی حکومت کے خلاف کارروائی کرنے کا جواز میسر ہو، تخریب کاروں کے سرغنوں جام لسبیلہ اور اکبر بگٹی کے لئے فنڈز حاصل کرنے میں آسانی ہو اور ضلع لسبیلہ کو فوج کے حوالے کرنے کا بہانہ ملے۔

11: یہ غلط ہے کہ وفاقی حکومت سے محاذ آرائی کی وجہ سے یا صوبہ سرحد اور بلوچستان کے گورنروں کی طرف سے اپنی ذمہ داریوں سے لاپرواہی یا ان کو خاطر میں نہ لانے یا مختلف گروہوں یا فرقوں میں بے چینی پیدا کرنے اور بدانتظامی کی وجہ سے فوج بھیجی گئی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ وفاقی حکومت اچھی طرح سے جانتی تھی کہ جب وہ اپنے پہلے سے تیار کردہ منصوبے کے تحت صوبے کی دستوری اور قانونی ہر دلعزیز حکومت اور صوبہ سرحد اور بلوچستان کے گورنروں کو جو اپنی تمام زندگی ان لوگوں کی خدمت میں گزار چکے ہیں، غیر آئینی طور پر برخاست کرے گی تو ان صوبوں کی بھاری اکثریت جنہوں نے نیشنل عوامی پارٹی کو ووٹ دے کر اقتدار دلایا تھا، وفاقی حکومت کے اس غیر آئینی اور غیر جمہوری عمل کے خلاف احتجاج کرے گی۔ اس جمہوری احتجاج کے خلاف انتقامی اور مثالی تعزیری اقدام کے لئے پہلے سے فوج کو تیار کیا گیا تھا جو بلوچستان کے مختلف علاقوں میں اس وقت تک پہنچ چکی تھی، جبکہ وفاقی حکومت اپنے کارندوں کے ذریعے انتشار پذیر اور امن سوز کارروائیوں سے مایوس ہو کر لسبیلہ میں برہنہ طاقت استعمال کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اس لئے یہ درست نہیں کہ فوج گورنروں کی سہل کاری یا وفاقی حکومت کے احکامات اور اپنے فرائض منصبی سے روگردانی کی وجہ سے بھیجی گئی تھی۔

یہ غلط ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی نے پاکستان کے خلاف مسلح جدوجہد کا فیصلہ یا

ارادہ کیا تھا اور نہ سردار خیر بخش مری نے کسی مرحلے پر اپنے قبائلی لوگوں کو یہ ہدایت دی تھی کہ عنقریب بلوچستان کی صوبائی حکومت کو ہٹایا جائے گا اور ان کے رسم و رواج یا ذرائع پیداوار کو ان سے چھینا جائے گا، اس لئے وہ پاکستان اور وفاقی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائیں اور سڑکیں نہ بنانے دیں۔

اصل صورت حال یہ ہے کہ جب بلوچستان کی دستوری حکومت کو آئین کے خلاف برطرف کیا گیا اور بلوچستان کے لوگوں نے اس کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور اپنے جمہوری حق کو استعمال میں لا کر احتجاج کیا تو وفاقی حکومت ان کو عبرت ناک سزا دینے کے لئے سول آرمڈ فورسز اور فوج کو حرکت میں لائی، تا کہ لوگ مرعوب ہو کر اپنے حقوق کے مطالبے کی جرات نہ کریں۔

چونکہ موجودہ حکومت ان نئے حکومت میں آنے والوں پر مشتمل ہے جو بلوچوں اور بلوچستان کی تاریخ اور روایات سے بیگانہ اور ناواقف ہیں اور ذہنی طور پر ہر مسئلے کا ہر جگہ حل محض طاقت کو سمجھتے ہیں، اس لئے انہوں نے تمام بلوچستان میں فوج اور سول آرمڈ فورسز کو پھیلا کر علاقوں کی ناکہ بندی کی، لوگوں تک راشن اور دوسرے ذرائع زیست پہنچنے کے تمام راستے مسدود کیے گئے جس کی وجہ سے بلوچستان کے لوگ اپنی روایات کے مطابق اس امر پر مجبور ہو گئے کہ اپنی عزت، مال و جان کی خاطر موجودہ حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائیں۔

ظاہر ہے کہ جب لوگوں پر زندگی کے تمام راستے بند کر دیئے جائیں، ان کی عزت وآبرو اور جان و مال محفوظ نہ ہوں، ان کے آئینی اور قانونی حقوق کو طاقت سے پامال کیا جائے تو ہر معزز اور غیرت مند شخص اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان پر کھیل جائے اور یہی کچھ بلوچستان میں ہوا۔ بلوچستان کے لوگوں نے نہ کسی شخص یا پارٹی کے اکسانے پر اور نہ خود کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وفاقی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے بلکہ وفاقی حکومت کی زیادتی اور ناعاقبت اندیشی نے ان کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ اپنی عزت وآبرو کی خاطر ہتھیار اٹھائیں۔

سردار خیر بخش مری کو کیسے علم ہو سکتا تھا کہ وفاقی حکومت، بلوچستان کی حکومت کو

برطرف کر رہی ہے۔ یہ علم تو ان اشخاص کو ہو سکتا تھا جو بلوچستان میں عنقریب ہونے والی تخریب کاری اور تباہ کاری کے منصوبے کے بانی تھے۔

13:۔ یہ درست نہیں کہ نیشنل عوامی پارٹی نے وفاقی حکومت کے خلاف گالی گلوچ اور غیر مہذب اقدام کی مہم شروع کی تھی یا قائد اعظم کی ہتک کی یا ملک میں تشدد کا پرچار کرنے سے قانونی حکومت کو طاقت سے برطرف کرنے کی مہم شروع کی۔ نیشنل عوامی پارٹی گزشتہ اٹھارہ سالوں سے پاکستان کی سیاست میں نمایاں حیثیت سے سرگرم عمل ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی نراجی اور تشدد کی سیاست پر یقین نہیں رکھتی اور اس کی لیڈر شپ سنجیدہ اور مہذب افراد پر مشتمل ہے جن کے نزدیک گالی گلوچ اور سبک سری معیوب ہے۔

پاکستان کی سیاست میں کردار کشی، سبک سری، غنڈہ گردی، سیاسی قتل، بے حرمتی اور غیر مہذب طریقہ کار کا سہرا پیپلز پارٹی اور اس کی لیڈر شپ کے سر ہے۔ پاکستان کی سیاست میں پیپلز پارٹی کے نمودار ہونے سے قبل معزز شہریوں کی کبھی تذلیل نہیں کی گئی۔ سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی کردار کشی، جلسہ جلوسوں میں غنڈہ گردی، دوسری سیاسی جماعتوں کے پرامن اور آئینی عمل کو تشدد کے ذریعے ناممکن بنانا، سیاسی قتل، گھیراؤ جلاؤ کا سہارا لے کر ملک بھر میں جمہوری عمل کو تشدد اور طاقت کے ذریعے ناممکن بنانا، امن وامان قائم کرنے والی قوتوں کو بلا روک ٹوک سیاسی غرض سے برہنہ طور پر استعمال میں لانے کا سہرا بھی پیپلز پارٹی اور اس کے رہنماؤں کے سر ہے۔ پیپلز پارٹی کے ملکی سیاست میں نمودار ہونے سے قبل پاکستان کی سیاست میں یہ سب کچھ دیکھنے میں نہیں آیا۔

مسٹر بھٹو کی حکومت کا یہ الزام کہ نیشنل عوامی پارٹی تشدد کے پرچار کے ذریعے ملک کی قانونی حکومت کو طاقت سے ہٹانا چاہتی تھی، کس قدر دیدہ دلیری کی بات ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی پر تو تشدد کا پرچار کر کے ملک کی قانونی حکومت کو طاقت سے ہٹانے کا الزام ہے مگر پیپلز پارٹی کی وفاقی حکومت نے تشدد کے بدترین عمل یعنی فوجی کارروائی سے بلوچستان کی آئینی اور قانونی حکومت کو جو جمہوری عمل کے نتیجے میں عمل میں آئی تھی، برطرف کیا، لیکن اسے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاتا۔

میری ایک تقریر پر بھی اعتراض کیا گیا جو میں نے برس ہا برس پیشتر دار العلوم

قلات میں کی تھی۔تقریر کا پس منظر قلات میں انگریزوں کی آمد سے قبل کی تاریخ، انگریزوں اور قلات کے صد سالہ معاہدوں اور پاکستان کے قیام کے وقت، قلات اور پاکستان کے تعلقات کی روشنی میں خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

1666ء میں بلوچوں کے قمبرانی قبیلے کی ایک نمایاں شخصیت میر احمد نے مملکت قلات کا سنگ بنیاد رکھا اور پہلے خان قلات کی حیثیت سے اس نے 1695ء تک اس آزاد اور خود مختار مملکت پر حکومت کی۔ خان میر نصیر خان اول کے دور تک جو 1695ء 1750ء تک کا زمانہ تھا، قلات جو اس وقت بلوچستان کے نام سے موسوم تھا، اس میں موجودہ پاکستانی و ایرانی بلوچستان، ڈیرہ غازی خان، خان گڑھ (موجودہ جیکب آباد) کراچی اور ضلع داؤد کا کوہستانی علاقہ شامل تھے۔

انگریزوں نے فارورڈ پالیسی کے تحت 1839ء میں بلوچستان پر حملہ کر کے خان میر محراب خان کو شہید کیا اور اس کی جگہ میر شاہنواز خان کو جو خوانین قلات کے خاندان میں سے تھا، خان بنایا، مگر خان محراب خان کے لڑکے نصیر خان دوئم نے کئی لڑائیاں لڑ کر شاہنواز خان کو نکال کر دوبارہ اپنے والد کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔

انگریز نے جب محسوس کیا کہ بلوچوں سے لڑ کر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور وسط ایشیا کے ساتھ درہ بولان کے راستے تجارت قائم نہیں رکھ سکتا اور نہ وسط ایشیا کی تجارت جو اس وقت ساری کی ساری سونمیانی بندر سے ہوا کرتی تھی، ممکن ہوتی ہے تو اس نے خان میر نصیر خان کے ساتھ 1842ء میں معاہدہ کیا اور اس کے بعد 1947ء تک انگریز برصغیر پر قابض رہے، ان کے تعلقات قلات کے ساتھ مختلف معاہدوں کی صورت میں رہے اور آخری معاہدہ 1876ء کا تھا جس میں سابقہ معاہدوں کی طرح قلات کی آزادی و خودمختاری کو بحال رکھا گیا اور یہ دونوں ہندوستانی ریاستوں میں شمار نہیں ہوتے تھے۔

1947ء میں جب انگریزوں نے برصغیر کو چھوڑنے، ہندوستان اور پاکستان کو دو آزاد و مختار ریاستیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو 11 اگست 1947ء کو ایک اعلامیہ کے ذریعے جو دہلی سے نشر ہوا، حکومت پاکستان نے حکومت قلات کی آزادی کو تسلیم کیا اور اس امر کو بھی تسلیم کیا کہ ریاست قلات ہندوستانی ریاست نہیں، بلکہ اس کے تعلقات براہ راست

حکومت برطانیہ کے ساتھ معاہدوں کے ذریعے ہیں۔

15 اگست 1947ء کو خان آف قلات نے باقاعدہ رسمی طور پر ریاست قلات کی آزادی و خودمختاری کا اعلان کیا۔

14 دسمبر 1947ء کو یعنی اس اعلان کے کوئی چار ماہ بعد خان آف قلات نے ریاست کی پارلیمنٹ کے ہر دو ایوانوں دارالعلوام اور دارالامراء کے اجلاس طلب کئے اور پاکستان سے الحاق کا مسئلہ ہر دو ایوانوں کے سامنے علیحدہ علیحدہ پیش کیا، چنانچہ دارالعوام کے باون نمائندگان اور دارالامراء کے سینتیس ممبران نے متفقہ طور پر پاکستان سے الحاق کو مسترد کر دیا۔

میری جس تقریر کا حوالہ دیا جاتا ہے، وہ ایک آزاد خود مختار مملکت کی پارلیمنٹ کی کارروائی کا حصہ ہے جس کی آزادی و خودمختاری کو 11 اگست 1947ء کے اعلامیہ کے مطابق پاکستان نے تسلیم کر لیا تھا اور مذکورہ اعلامیہ پر محمد علی جناح (قائداعظم) اور نواب زادہ لیاقت علی خان دونوں کے دستخط موجود ہیں۔

ملاحظہ ہو (کارروائی) دہلی کانفرنس منعقدہ 4 اگست 1947ء جس کے شرکاء حسب ذیل تھے:۔

1۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرے ہند

2۔ لارڈ ازمے

3۔ قائداعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان

4۔ نواب زادہ لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان۔

5۔ خان میر احمد یار خان، خان آف قلات۔

ملاحظہ ہو اعلامیہ 11 اگست 1947ء جس میں حکومت پاکستان نے حکومت قلات کی آزادی و خود مختاری کو تسلیم کیا۔ یہ دستاویزات حکومت پاکستان کے وزارت خارجہ اور میر احمد یار خان سابقہ خان آف قلات کی تحویل میں ہیں، لہٰذا عدالت انہیں وہاں سے منگوا سکتی ہے۔

نیشنل عوامی پارٹی کو توڑنے پر حکومت ہندوستان اور افغانستان کے ردعمل اور

پراپیگنڈے کو نیشنل عوامی پارٹی کے ہمسایہ ممالک (ہندوستان اور افغانستان) سے روحانی تقویت اور مالی امداد حاصل کرنے کا ثبوت بتانا اور موجودہ وفاقی حکومت کا حکومت افغانستان اور ہندوستان سے اپنے تلخ تعلقات کو چھپانا بددیانتی سے کم نہیں۔ ہندوستان اور حکومت افغانستان کا نیشنل عوامی پارٹی کی طرفداری حب علیؓ پر منحصر نہیں، بلکہ بغض معاویہؓ کا نتیجہ ہے۔

اگر ایک حکومت کسی دوسرے ملک کے غلط عمل کو اپنے مفاد کے پیش نظر اچھالتی اور برا کہتی ہے، اس کو کسی جماعت یا فرد پر چسپاں کر کے اپنی مخالف جماعت یا فرد کے خلاف کارروائی کرنا بددیانتی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ یہ درست نہیں کہ حکومت افغانستان، پاکستان اور موجودہ حکومت کی اس لئے مخالفت کر رہی ہے کہ اس کا نیشنل عوامی پارٹی سے کوئی رشتہ ہے، حقیقت حال یہ ہے کہ 1834ء سے جب رنجیت سنگھ نے دریائے سندھ سے پار افغانستان کے علاقوں کو میر دوست محمد خان سے چھین کر پنجاب کا حصہ بنایا، اس وقت سے لے کر آج تک حکومت افغانستان ہر اس حکومت کی مخالفت کرتی آئی ہے جو اس علاقے پر قابض رہی ہے چاہے وہ سکھ تھے یا انگریز یا اب پاکستان ہے۔ پاکستان کے قیام اور اقوام متحدہ میں پاکستان کے داخلے کے وقت نیشنل عوامی پارٹی کا وجود نہیں تھا، لیکن حکومت افغانستان نے پاکستان کی اقوام متحدہ میں شمولیت کی مخالفت کی اور پاکستان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ افغانستان نے انگریزوں سے بارہا ان علاقوں کا مطالبہ کیا اور انگریزوں کے انکار پر اس نے اپنے تعلقات روس سے جوڑنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں انگریزوں اور افغانستان کے درمیان تین جنگیں ہوئیں۔ افغانستان نے کسی دور میں بھی ان علاقوں سے دستبردار ہونے کے تصور کو قبول نہیں کیا، بلکہ ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں اس کی جدوجہد جاری رہی۔

حکومت افغانستان کے کسی خاص طرز فکر و عمل کو نیشنل عوامی پارٹی کے تعلقات کا نتیجہ بنا کر پیش کرنا سوائے بہانہ جوئی کے اور کچھ نہیں۔

بلوچستان میں وفاقی حکومت کی جانب سے دانستہ جو بدامنی پیدا کی گئی، اگر افغانستان یا کوئی اور حکومت اس کا فائدہ اٹھاتی ہے تو اس کی ذمہ داری سوائے وفاقی حکومت

کے کسی دوسرے پر عائد نہیں کی جاسکتی۔

یہی طرز عمل موجودہ حکومت کے پیش رو یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان میں اختیار کیا۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے آئینی اور جائز حق سے انکار کیا گیا اور وہاں کے لوگوں کے جمہوری احتجاج کو فوجی کارروائی اور طاقت سے دبانے کی کوششیں کیں جس کے نتیجہ میں پاکستان ٹوٹ گیا۔ بعینہ وہی طریقہ کار بلوچستان میں اختیار کیا گیا ہے اور اس فطری قانون اور حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ آگ میں ہر وقت اور ہر جگہ جلانے کی طبعی خاصیت موجود ہے جب بھی اس میں ہاتھ ڈالا جائے گا چاہے وہ بنگال ہو یا بلوچستان، وہ طبعی خاصیت کے تحت ضرور جلائے گی۔"

وفاقی حکومت کے وزراء اور ان کی طرح جاہل خوشامدی یہ کہتے نہیں تھکتے کہ مشرقی پاکستان ہماری قوت کے مرکز سے دور تھا، وہاں پر فوجی کارروائی تسلی بخش طور پر نہیں ہوسکتی تھی اور ہندوستان نے روس کی سرپرستی کی بنا پر مداخلت کی۔ اس لئے ہم نے مشرقی پاکستان میں شکست کھائی۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر مشرقی پاکستان کے لوگوں کو طاقت سے دبایا جاتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ اور مشرقی پاکستان کے لوگ آئندہ پاکستان میں کس جذبے سے رہتے؟ اس میں شک نہیں کہ طاقت کے بل بوتے پر نوآبادیاں، سیاسی برتری اور مملکتوں کے سرحدی اور جغرافیائی حدود تو قائم اور مٹ سکتے ہیں، نئے غلام بنائے جاسکتے ہیں اور پرانے غلام آزاد ہوسکتے ہیں۔ مگر قوت کے ذریعے سے اتحاد، بھائی چارہ اور ایک قوم وجود میں نہیں آسکتی۔ تاریخ کے ہر دور میں جب کسی قوم نے تاریخ کے عمل کے نتیجے میں جنم لیا ہے، ہمیشہ مشترکہ سود وزیاں، رضا کارانہ، اتحاد اور ایک دوسرے کے حقوق و جذبات کے احترام اور حسن سلوک کی محتاج رہی ہے۔ تلوار کے وار اور بندوق کی نالی میں یہ صلاحیت کبھی نہیں رہی کہ وہ ایک قوم کو جنم دے۔

جتنے بھی اقبالی بیانات کروائے گئے ہیں وہ ڈر، لالچ اور بے پناہ اذیت رسانی یا اس کے ڈر کے نتیجے میں ہوئے ہیں۔ بلوچستان یا ملک کے کسی دوسرے حصے میں اقبالی بیان اخذ کرنے کا جو طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے، وہ کسی بھی ناکردہ گناہ کو تسلیم کرا سکتا ہے۔

بلوچستان میں مسٹر بھٹو کی حکومت کی طرح ایوب خان کے دور حکومت میں بھی

جمہوریت اور عوام کے ارادہ کے احترام کے تحفظ کے جرم میں فوجی کارروائی، بمباری اور نسل کشی کا ہر حربہ استعمال میں لایا گیا۔

بلوچستان میں لوگوں کے گھروں کو بمباری سے جلا کر خاکستر بنایا گیا۔ ان کے مال مویشی اور دوسرے ذرائع زیست لوٹ مار اور غارت گری سے تباہ کئے گئے۔ لاکھوں روپوں کے مال مویشی پنجاب اور سندھ کی مختلف منڈیوں میں نیلام ہوئے ''قلی کیمپ'' جیسے فوجی کیمپوں میں سینکڑوں لوگ قید و بند اور مختلف قسم کی اذیتیں برداشت کرتے رہے۔ یہ سب کچھ لوگوں کے جمہوری ارادہ اور خواہش کی سرفرازی کے جرم کی پاداش میں ہمارے ساتھ ہوا جبکہ مسٹر بھٹو جن کی حیثیت اس ریفرنس میں سائل کی ہے، اس وقت بھی ان مطلق العنان فوجی آمروں کے بغل بچوں کی حیثیت سے جمہوریت کے حامی اور عوام کے جمہوری ارادہ وخواہش کا احترام کرنے والوں پر ظلم ڈھا رہے تھے اور آج بھی وہ لوگ اب ہم کو لوگوں کے جمہوری ارادہ کی مخالفت کے الزام میں مجرم ٹھہرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وگرنہ ہم اس امر کا شدت سے اظہار کرتے ہیں کہ آزاد بلوچستان اور پاکستان سے باہر پشتونستان مسٹر بھٹو کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے کسی رہنما نے کبھی آزاد بلوچستان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

میر غوث بخش بزنجو، رہائی کے بعد کراچی آئے تو یوسف مستی خان کے گھر ٹھہرے تھے۔ بزنجو صاحب سے جو سوال جواب ہوئے، وہ حسب ذیل ہیں۔

س: بلوچستان میں مسٹر بھٹو نے فوج کشی کا جو حکم دیا، اس کی کوئی ایسی تفصیل بتائیے جو اب تک سامنے نہ آئی ہو؟

ج: میرے بھائی ایسی کونسی بات ہے، جو اب تک چھپی ہو۔ مسٹر بھٹو نے فوج کو اس مسئلے میں اس لئے الجھایا کہ وہ اپنی آمریت کو وسعت دینا چاہتے تھے، ایک ''وڈیرا'' اپنی ''زمینوں'' میں اضافہ کرنے کا خواہش مند تھا۔ علاوہ ازیں اس پالیسی سے وہ بعض ''بین الاقوامی'' فوائد بھی حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ جناب والا غیر ملکی ہوّے کو سامنے لا کر ذاتی اغراض حاصل کرنا ہمیشہ سے پاکستانی سیاستدانوں کا شیوہ رہا۔ مسٹر بھٹو بھی انہی میں سے ایک تھے۔ بھارت کی مثال ہی لیجیے۔ کیا یہ حقیقت

نہیں کہ پاکستان میں ہمیشہ سے حاکم، اس کا ہوا کھڑا کرتے ہیں اور عوام کے جمہوری اور بنیادی حقوق غصب کر لیتے ہیں۔ عزیز من کیا بھارتی حملے کے خوف کا مقابلہ اپنے لوگوں کو کچل کر ہی کیا جا سکتا ہے؟ ستم یہ ہے کہ ایسی ہی پالیسی ماضی میں فرنگی حکمرانوں نے بھی روا رکھی۔ اصولاً بنگلہ دیش کے قیام اور شملہ معاہدے کے بعد کسی پاکستانی حکمران کو اس طریق کار سے احتراز کرنا چاہئے تھا مگر مسٹر بھٹو نے ایسا نہیں کیا۔ بنگلہ دیش کے قیام میں اکثر پاکستانیوں کا یہ خیال تھا کہ مسٹر بھٹو بھی شامل ہیں۔ پنجاب میں یہ احساس شدت سے تھا۔ مسٹر بھٹو کہتے تھے کہ نفرت کا یہ احساس بڑھ کر انہیں اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے، لہٰذا انہوں نے بلوچستان کو قربانی کا بکرا بنایا ایک طرف اپنی لامحدود آمریت کو بڑھانے کے لئے بلوچستان کی قانونی حکومت توڑی، دوسری طرف یہاں فوجی کارروائی کر کے دوسرے صوبوں کو یہ تاثر دیا کہ وہ اپنے مخالفوں کی مرمت کرنے میں کس حد تک جا سکتے ہیں۔ بس یہی وہ کھیل تھا جسے موجودہ حکمرانوں نے سمجھ لیا اور انہوں نے درست فیصلے کئے۔

س: کیا یہ درست ہے کہ بلوچستان کی صوبائی حکومت کو توڑنے کے بعد بھی آپ سے خفیہ طور پر رابطہ پیدا کیا گیا تھا اور آپ سے تعاون کی اپیل کی گئی تھی؟

ج: رابطہ پیدا کرنے والوں کو کوئی نہیں روک سکتا، البتہ میں ضمیر فروش نہیں اور کسی شخص میں اتنی جرات نہیں ہو سکتی کہ مجھ سے میرا ضمیر خریدنے کی بات کرے۔

س: کیا حیدرآباد جیل میں آپ سے مصالحتی کوششیں کی گئیں؟

ج: جی ہاں! سیاسی قیدیوں کو ایسی پیشکشیں ہوتی رہتی ہیں، لیکن شرط یہ تھی کہ ہم کالعدم نیپ کا ساتھ چھوڑ دیں جو قطعی ناممکن بات تھی۔ خاص طور پر بزور طاقت تو ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

س: کیا آپ کے آج کل کالعدم نیپ کے افراد سے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں؟

ج: جی نہیں...... چھوٹی چھوٹی باتوں پر نقطہ نظر یا طریقہ کار کا اختلاف ہو سکتا ہے جو سیاسی پارٹیوں میں فطری امر ہے لیکن کسی بنیادی مسئلے پر کوئی اختلاف نہیں۔

س: لیکن شیر محمد مری نے ''صحافت'' ہی کو ایک انٹرویو میں یہ بتایا تھا کہ ان کے ولی خان

سے اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور یہ کہ ولی خان سابق حکومت سے صلح کرنے کے حق میں تھے لیکن بلوچ لیڈر نہ مانے۔

ج: میری معلومات کے مطابق یہ درست نہیں۔ شاید ان کے اختلافات ہوں، اس سلسلے میں وہی اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔

س: آپ پر دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ حیدرآباد ٹریبونل میں مسٹر بھٹو کی حکومت نے یہ الزام عائد کیا تھا کہ آپ نے بلوچستان کو پاکستان سے الگ کرنے کی کوششیں کیں اشتعال انگیز تقریریں کیں، بلوچستان کا پرچم تیار کیا، اسلحہ جمع کیا اور پرائیویٹ فور بنانے کی کوشش کی؟

ج: موجودہ حکومت کے سربراہ جنرل ضیاء صاحب اس سلسلے میں خود یہ فرما چکے ہیں ک ''وہاں تکلیف تھی، لیکن اصل الزام کی بجائے سیاست زیادہ تھی۔'' اس لئے موجود حکومت نے ٹریبونل توڑا، مقدمے واپس لئے اور بلوچستان میں عام معافی کا اعلا کیا ظاہر ہے کہ فوج سے زیادہ اصل حقائق سے کون آگاہ ہو سکتا تھا، جو گزشتہ سیا حکومت میں بھی احکام کی تعمیل کرتے ہوئے صوبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میرے خیا میں ہمارے جرم بے گناہی کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے۔

س: عراقی اسلحے کی برآمدگی کے بارے میں آپ کچھ بتانا پسند کریں گے!

ج: وہ ایک سیکنڈل تھا اور اس کی حقیقت سے پردہ اٹھانا میرا کام نہیں، ان اداروں او افراد کا ہے جو آج اس پوزیشن میں ہیں کہ ہر معاملے کو اندر سے دیکھ سکیں۔

س: بلوچ رہنما جناب اکبر بگٹی جو الزامات کی طویل فہرست کے بعد آپ کے مقابلے می نکلے تھے اور جنہیں بعد میں شاید ان خدمات کے صلے میں گورنر بھی بنایا گیا، آپ کے پرانے ساتھی اور ایک زمانے میں کالعدم نیپ کے صدر ہوا کرتے تھے، کیا آپ بتائیں گے کہ انہوں نے یہ کردار کیوں ادا کیا اور بعد ازاں خود بھی مستعفی کیوں ہو گئے؟

ج: کسی شخص کے بارے میں کچھ کہنا اچھا نہیں لگتا۔ میرے خیال میں ہمیں سیا جماعتوں اور نظریات کے حوالے سے بات کرنی چاہئے۔ انہیں جو مناسب اور فائ

مند نظر آیا، انہوں نے وہی کیا ہوگا۔

س: سیاسی نظام حکومت کے اعتبار سے آپ کس نظام کو پسند کرتے ہیں؟

ج: ایسے نظام کو جس میں عوام کی ضروریات پوری ہوں اور وہ ان کی روایات کے مطابق ہو۔

س: کیا آپ پارلیمانی نظام کے حق میں ہیں؟

ج: اس اعتبار سے حق میں ہوں کہ پاکستان کے لئے اسے قائداعظمؒ نے جاری کیا تھا اور ان کی رائے کو ہم بہرحال ترجیح دیتے ہیں، البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہمارا اقتصادی نظام اور مغربی جمہوریت، دونوں مستعار فلسفے ہیں اور ہمیں اپنی روایات اور ملکی ضروریات کے تحت ان پر نظرثانی کر لینی چاہیے، ایسا ہو جائے تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی، بلکہ بہتر نظام اور بہتر شکل سامنے آئے گی۔

س: جناب ایک اصطلاح گزشتہ دنوں نظام مصطفیٰ کی بھی سامنے آئی تھی اور پاکستان قومی اتحاد کی تحریک میں اسی کو بنیادی نعرہ بنایا گیا تھا۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: میں اس وقت جیل میں تھا۔ اس لئے میں نے اس کا دستور اور مختلف امور پر تفسیر و تشریح نہیں دیکھ سکا اور نہ میرے خیال میں بعض قائدین نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ نظام مصطفیٰ کیا ہوگا، اس کا سیاسی اقتصادی اور انتظامی ڈھانچہ کس نوعیت کا ہوگا، پہلے ہمیں یہ سب بتائیے پھر ہم اپنی رائے دے سکیں گے۔ محض نعرہ بازی سے تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آ سکتی اور نہ کوئی ذی شعور...... سیاست دان اپنی رائے دے سکتا ہے۔

س: گزشتہ دور حکومت میں سرداری نظام کے خاتمے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: اول تو یہ بات ہی غلط ہے کہ سرداری نظام کے خاتمے کا فیصلہ گزشتہ حکومت کا تھا، کیونکہ کالعدم نیپ نے اپنے دور حکومت ہی میں اس کی تجویز باقاعدہ طور پر وفاقی حکومت کو دی تھی، لیکن سابق وزیراعظم نہیں مانے، کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ اس کا

کریڈٹ خود لیں۔ ویسے ایک بات بنیادی طور پر سمجھ لیں سرداری نظام کوئی انتظامی مسئلہ نہیں آپ لاکھ اعلانات کریں جب تک قبائل میں تعلیم، صنعت معاش کے آزادانہ وسائل اور دیگر سہولتیں نہیں پہنچتیں، سرداری نظام کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے گا اور انتظامی حکام اسے ختم نہیں کر سکتے۔ ہم کم از کم اسی طور پر اس نظام کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

س: صوبائی خودمختاری کے مسئلے پر آپ کا موجودہ موقف کیا ہے؟

ج: وہی جو ہمیشہ سے تھا، یعنی صوبوں کو ان کے حقوق دو اور یہ حقوق ہم نے اپنے صوبے کے لئے نہیں بلکہ سارے صوبوں کے لئے مانگے جن میں پنجاب بھی شامل ہے اور سندھ اور سرحد بھی، لیکن ہماری بات کو غلط سمجھا گیا۔ گزشتہ دنوں جنرل ضیاء الحق صاحب سے ملاقات کے دوران میں بھی ہم نے یہ عرض کیا کہ جناب والا! آپ نے ٹھیک نتیجہ اخذ کیا ہے یہ مسئلہ سیاسی ہے اور ہم شروع سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ نہ ہم پاکستان کے مخالف ہیں اور نہ خدانخواستہ اس سے علیحدگی کا سوچ بھی سکتے ہیں، یہ سارا الزام ہم پر ان لوگوں نے اپنی اغراض کے لئے تھوپا تھا جو ہمیں اپنی بادشاہت کے راستے کی رکاوٹ سمجھتے تھے۔

س: آپ لوگوں کی گرفتاری کے دوران میں جو لوگ آپ کا یا جمعیت علمائے اسلام کا ساتھ چھوڑ گئے، کیا آپ انہیں واپس لیں گے؟

ج: سردست تو ہم خود کسی پارٹی میں نہیں، لیکن اگر ہم کسی پارٹی میں شامل ہوئے تو ضروری ہوگا کہ ساتھیوں کے مشورے سے چلیں۔ میری ذاتی رائے البتہ یہ ہے کہ جو چلے گئے، انہیں واپس آنے کے لئے کہنا لاحاصل ہے کہ جو پہلے ساتھ نہ چل سکے، اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ اب چلیں گے۔

س: کیا آپ کی رہائی سے بلوچستان کا مسئلہ بڑی حد تک حل نہیں ہو گیا؟

ج: وہ کیسے؟...... بلوچستان صرف غوث بخش بزنجو کا نام نہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ جنرل ضیاء الحق صاحب کے اس اعلان کے بعد کہ بلوچستان کا مسئلہ سیاسی ہے اس کا سیاسی حل تلاش ہونا چاہئے، بہتری کی صورت نظر آتی ہے مکمل جمہوریت اور عوام کے

مسائل کا حل بلوچستان ہی نہیں، سارے پاکستان کے عوام کا مسئلہ ہے۔ بلوچستان کے عوام اور سیاسی لیڈر البتہ اس جدوجہد میں جوان مقاصد کی خاطر شروع کی گئی، پاکستانی عوام کا ہراول دستہ بنے ہمارا نقطہ نظر یہی ہے۔

س: کیا آپ 1973ء کے آئین میں دیئے گئے صوبائی خودمختاری کے حقوق سے مطمئن ہیں؟

ج: سوال حقوق کی موجودگی کا نہیں، ان پر عمل ہونے کا ہے اور ہم یہ اطمینان چاہتے ہیں کہ چلئے 73ء کے مطابق ہی سہی، عوام کو وفاق کے بھی صوبوں کو یہ حقوق دیجئے اور اس امر کا اہتمام کیجئے کہ کوئی آمر انہیں ختم نہ کر سکے۔

س: بلوچستان کے بارے میں غیر ملکی طاقتیں اکثر مختلف قسم کے بیان دیتی ہیں۔ آپ ان بیانات پر تبصرہ کریں گے؟

ج: دراصل جغرافیائی طور پر پاکستان کا یہ صوبہ خلیج فارس کے کنارے پر ہے جہاں پر سے دنیا بھر کے لئے تیل کے جہاز گزرتے ہیں ایک زمانے میں امریکی حکومت نے اس حد تک دھمکی دی تھی کہ اگر تیل کے علاقوں پر قبضہ کرنا پڑا تو اس سے بھی دریغ نہیں کیا جائے گا اس پس منظر میں خلیج کے دہانے پر ''چوکیدار'' کی طرح کھڑے ہوئے بلوچستان کی بین الاقوامی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں تین طریقوں سے دبایا گیا، پریس پر پہرے بٹھا کر پاکستان کے دیگر صوبوں کے عوام کو باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ بلوچوں نے پاکستان سے علیحدگی کے لئے بغاوت کر دی ہے دوسری طرف فوج کو جو وطن عزیز کے دفاع کی ذمہ دار تھی ہمارے معاملات میں الجھا دیا گیا، تیسری طرف ہماری ہمسایہ طاقت ایران کو یہ غلط تاثر دیا گیا کہ کالعدم نیپ ان کے خلاف ہے اور اگر اس جماعت کی حکومت رہی تو ایرانی بلوچستان میں بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ یہ ایک منفی اور عیار ذہن کی سازش تھی اور آپ لوگوں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ گزشتہ مارچ میں عوام نے تحریک چلا کر سازش کو مکمل نہیں ہونے دیا۔

س: آپ کی نظر میں موجودہ قومی بحران کا حل کیا ہے؟

ج: استحصال پسندوں کے خاتمے کے بعد جمہوری اصولوں اور اعلیٰ اقدار کو فروغ دیا جائے، عوام کے معاشی اور جمہوری حقوق لوٹائے جائیں اور پاکستان میں آباد مختلف چھوٹی قومیتیں مل کر ایک قوم کی تشکیل کریں، بالکل اسی طرح جس طرح اسلام نے جغرافیائی اور لسانی عصبیتوں سے اوپر جا کر ایمان اور عقیدے کی بنا پر امت کا تصور دیا ہے جو قوم سے بھی بلند تر ہے۔

س: احتساب اور انتخاب کی بحث میں آپ کا ووٹ کدھر ہے؟

ج: احتساب ضروری ہے مگر صرف ووٹ مانگنے والوں کا نہیں، پاکستان کو یہاں تک پہنچانے والوں کا بھی، اور اس کے بعد انتخاب بھی ضروری ہے، لیکن صفائی شرط اول ہے۔

(ہفت روزہ صحافت مارچ 1978ء الیاس شاکر)

❖■❖■❖

سردار اکبر خان بگٹی کا ماضی اور حال

بلوچستان کا مسئلہ تین چار بلوچ سرداروں کو جانے بغیر کبھی سمجھ نہیں آ سکتا۔ خیر بخش مری شیر محمد مری غوث بخش بزنجو، سردار عطا اللہ مینگل اور سردار محمد اکبر خان بگٹی، غوث بخش بزنجو اور خان آف قلات۔ ان میں سے آج بلوچستان میں صرف دو اہم شخصیات سردار اکبر خان بگٹی اور عطاء اللہ مینگل اپوزیشن کی سیاست کر رہے ہیں۔ اس کے بعد جتنی بھی بلوچ لیڈر شپ ہے وہ ان کے بعد کی نسل ہے جو اپنا سیاسی اثر ورسوخ رکھنے کے باوجود آج بھی ہر مسئلے میں ان دونوں کو اپنا راہنما قرار دیتی اور ان ہی کے ذریعے معاملات کے حل کی متمنی رہتی ہے۔ سردار اکبر خان بگٹی اور حکومت کے درمیان آج تناؤ بنا ہوا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر الزامات لگا رہے ہیں۔ ان کی حقیقت کیا ہے، سردار اکبر خان بگٹی کے چار مختلف انٹرویو پیش خدمت ہیں جن سے ان کا مزاج ماضی اور حال سمجھنے میں آسانی رہے گی پہلا انٹرویو الیاس شاکر نے مارچ 1978ء میں لیا تھا جو ہفت روزہ صحافت میں شائع ہوا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

''نواب اکبر خان بگٹی، نواب مہراب خان کے صاحبزادے ہیں ان کے بڑے بھائی سردار عبدالرحمٰن پکے قوم پرست تھے، انگریز دشمنی میں انہیں جیل ڈال دیا گیا اور 1939ء میں نواب مہراب خان فوت ہوئے تو سرداری اکبر خان بگٹی کو سونپ دی گئی۔

نواب اکبر بگٹی نے ری پبلکن پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی تک کا سفر کیا اور وزیر مملکت بنے ہی تھے کہ ایوبی مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اس دور میں بگٹی صاحب کو اپنے بھائی

احمد نواز بگٹی کے خسر حاجی ہیبت خاں کے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا ہوئی جو بعد میں رحم کی اپیل پر عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ تین برس بعد ایک اور رحم کی اپیل پر وہ رہا ہو گئے اور ایک قبائلی روایت کی بنا پر انہوں نے مقتول کے بیٹے کو پچاس ہزار روپیہ خون بہا ادا کیا۔

قبائلی منافرت پھیلانے کے الزام میں انہیں جلد ہی پھر گرفتار کر لیا گیا۔

دسمبر 69ء میں اس شرط پر رہا ہوئے کہ پانچ سال تک کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیں گے۔ 70 کے انتخابات میں اسی لئے بگٹی صاحب نے خود شرکت نہ کی البتہ کالعدم نیپ کے لئے خاصا کام کیا۔

مسٹر بھٹو نے غوث بخش رئیسانی کو بلوچستان کا گورنر مقرر کیا تو اکبر بگٹی صاحب نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ بعد ازاں کالعدم نیپ کے مسٹر بزنجو گورنر بنا دیے گئے اور مینگل وزیر اعلیٰ اس پر جناب بگٹی مسٹر بھٹو سے جا ملے۔ ان کے ساتھ غیر ملکی دورے پر گئے۔ واپسی پر برطانیہ ٹھہر گئے۔ واپس آئے تو عراقی اسلحے کو بنیاد بنا کر کالعدم نیپ کے خلاف سلطانی گواہ بننے کی پیشکش کی اور کہا کہ کالعدم نیپ پاکستان کے خلاف کام کر رہی ہے اسی ہفتے مسٹر بھٹو نے کالعدم نیپ کی حکومتیں توڑ دیں اور مسٹر بگٹی بلوچستان کے گورنر مقرر ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ مسٹر بگٹی جلد ہی مسٹر بھٹو کی مطلق العنانی سے تنگ آ گئے۔ یوں بھی وہ صوبے میں امن و امان قائم رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے، اس لئے جلد ہی استعفیٰ دیدیا۔

مسٹر بھٹو کی حکومت کے خاتمے پر چند ماہ پہلے انہوں نے تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کی، بگٹی ذہین اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر شدید انانیت پسند سیاستدان ہیں، ان کے بڑے بیٹے سلیم بگٹی نے اپنے چچا احمد نواز بگٹی کا محاصرہ کر کے جو اس وقت کالعدم نیپ کے وزیر تھے، بہت شہرت پائی۔ ان کے چھوٹے بیٹے طلال بگٹی پر بیوی کے قتل کے الزام میں مقدمہ بھی چلتا رہا۔ بگٹی کے بیٹے کی شادی میر نبی بخش زہری کی بیٹی سے ہوئی۔ اس اعتبار سے دونوں رشتہ دار ہیں، ادھر جناب بگٹی کی ہمشیرہ شیر باز مزاری کی اہلیہ ہیں البتہ سیاسی اعتبار سے یہ تینوں شخصیتیں جدا جدا ہیں۔

س: کہا جاتا ہے کہ ماضی میں بلوچستان آگ میں جل رہا تھا، اس سلسلے میں آپ کا موقف کیا ہے؟

ج: یہ بات بالکل صحیح ہے، ماضی میں واقعی بلوچستان آگ میں جل رہا تھا۔ آج بھی انگارے باقی ہیں پہلے بڑی آگ تھی اب دھیمی پڑ چکی ہے جو کسی وقت بھی بھڑک سکتی ہے جب انگاروں پر مزید لکڑیاں ڈالی جائیں گی تو آگ دوبارہ بھڑک اٹھے گی، پانی ڈالا جائے گا تو بجھے گی، اس کا انتظام کر لو!!

س: آپ کے عہد گورنری سے لیکر 5 جولائی تک ہونے والے فوجی ایکشن کی وجہ کیا تھی؟

ج: فوجی ایکشن ہوا تھا، ساری دنیا جانتی ہے میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں۔ یہ کوئی چوری چھپے کی بات نہیں مگر یہ تیسری فوجی کارروائی تھی۔ 1948ء میں قلات پر حملہ ہوا۔ 1958ء میں دوبارہ وقفے وقفے سے قلات اور اطراف میں آرمی ایکشن ہوا۔ اور پھر بھٹو کے دور میں یہ مہربانی۔ جب یہاں کی حکومت کو معزول کیا گیا، بلوچستان میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی، اس بار اس جنگ کی تباہ کاریوں میں اضافہ ہوا ہر بار اس کی نوعیت پہلے سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہوتی گئی۔ اب پانچویں بار خدا ہی جانتا ہے کہ کیا ہو، خدا بلوچوں پر رحم کرے۔

فوجی ایکشن میں بلوچوں کا بہت نقصان ہوا، بے شمار مارے گئے تین چار لاکھ مویشی ہانک کر لے جائے گئے، ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کے مکانات مسمار کر دیئے گئے یا انہیں جلا دیا گیا، کھڑی فصلوں کو تباہ کر دیا گیا اور اناج کے ذخیروں پر قبضہ کر لیا گیا۔ میری رائے میں کئی لاکھ افراد آرمی ایکشن کے نتیجے میں بلوچستان چھوڑ کر چلے گئے۔

س: لیکن جناب یہ سب کچھ تو آپ کی گورنری کے زمانے میں شروع ہوا اور سابقہ کالعدم نیپ کی حکومتیں توڑ کر آپ ہی کو گورنر بنایا گیا تھا بلکہ آپ نے تو اس وقت مسٹر بھٹو کے ایکشن کی حمایت کی تھی۔

ج: اس وقت میں نے جو کچھ کیا وہ بھی بلوچوں کے مفاد میں تھا۔ اگر میں یہ نہ کرتا تو شاید اس سے بھی بڑی مشکل پیش آتی۔

س: کیا مسٹر بھٹو کے خلاف ہونے والی مزاحمت غلط تھی؟

ج: بلوچستان ہو یا کوئی اور خطہ...... وہاں ہونے والی مزاحمت کو کیسے غلط کہہ سکتے ہیں جبکہ عوام پر چڑھائی کروادی گئی ہو۔ کون اس کو غلط کہہ سکتا ہے۔

س: آپ کی نظر میں آرمی ایکشن کے بجائے مسٹر بھٹو کو بلوچستان کے مسئلے کا کیا حل تلاش کرنا چاہئے تھا؟

ج: مجھے نیپ کی حکومت توڑنے سے اتفاق نہیں تھا۔ میں نے بھٹو کو مشورہ دیا تھا کہ حکومت توڑنے کی بجائے اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کروانے کا اعلان کردو کسی منتخب حکومت کو صرف توڑ دینا صحیح قدم نہیں مسٹر بھٹو میری اس تجویز پر ٹال مٹول کرتے رہے کتراتے رہے وہ صرف مہلت مانگتے رہے۔ جس کے نتیجے میں بالآخر میں نے محسوس کیا کہ ان کا اسمبلی توڑ کر دو ماہ کے اندر اندر انتخابات کروانے کا کوئی پروگرام نہیں وہ صرف کالعدم نیپ کی حکومت معطل کرنے سے دلچسپی رکھتے تھے۔

س: آپ نے گورنری کے عہدے سے کیوں استعفیٰ دیا؟

ج: اس کی کئی وجوہات ہیں چند ایک میں پہلے بیان کر چکا ہوں بنیادی بات یہ تھی کہ میں نے گورنری کا عہدہ اس نیت اور مقصد کے لئے قبول کیا تھا کہ ہماری بدنصیب بلوچ قوم مدتوں سے مصیبت، غربت تکلیف اور ہر ایک کے ڈنڈے اور سنگین کی زد میں وقتاً فوقتاً ٹھوکریں اور ضربیں کھا رہی ہے۔ سوچا میں گورنر بن کر شاید ان کی تکلیفوں کا مداوا کر سکوں۔ مگر جلد ہی میں نے دیکھا کہ یہ صرف زبانی جمع خرچ تھا عملاً کچھ نہیں تھا...... بلکہ اس کی نسبت بھٹو صاحب کے عزائم اور منصوبے بلوچوں کے لئے تباہ کن تھے اس کے نتیجے میں ان سے جدا ہوا۔ میں ان بلوچوں کے قتل عام کی پالیسی میں مزید شریک نہیں رہ سکتا تھا۔ کالعدم نیپ کی حکومت کے جبری خاتمے کے بعد گوریلا جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس گوریلا کارروائی کا دائرہ خاصا وسیع تھا اور صوبائی حکومت اپنے وسائل کے مطابق اس پر قابو نہیں پا سکتی تھی۔ ان حالات کے بعد مسٹر بھٹو نے کہا کہ آپ صوبائی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے وفاقی حکومت سے امداد طلب کریں: کیونکہ اس سے قبل مسٹر بزنجو نے بھی بحیثیت گورنر، لسبیلہ فسادات کے نتیجے میں "آرمی ایڈ ٹو سول گورنمنٹ" طلب کی تھی۔ اور فوج اس وقت پہلی مرتبہ نیپ کے

دور حکومت میں بلوچستان میں داخل ہوئی اور جب میں نے اقتدار سنبھالا تو فوج موجود تھی۔

بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ فوج کو عملی میدان میں لایا جائے، حالانکہ میں اس میں احتیاط برت رہا تھا، لیکن روز بروز حالات اس حد تک بگڑ گئے کہ بالآخر مجبور ہو کر فوج کی امداد حاصل کرنی پڑی، لیکن فوج کے آنے کے بعد، سول انتظامیہ کی مرضی کو مکمل طور پر پس پشت ڈال دیا گیا۔ اب نظم و نسق براہ راست بھٹو کے ہاتھ میں چلا گیا، اس رویے پر میں نے احتجاج کیا، کیونکہ صوبائی حکومت کی موجودگی میں آرمی ایکشن کی ساری ذمہ داری ہماری تھی، اس لئے ہر اقدام ہماری ضرورت اور مشورے کی بنیاد پر ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ جواب دہ ہم تھے، لیکن ہم سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا، اس لئے ہم نے کچھ عرصہ انتظار کے بعد خدا حافظ کہہ کر خود کو آزاد کرا لیا۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ عملاً مستعفی ہونے سے بہت پہلے میں تحریری استعفیٰ دے چکا تھا۔ بھٹو صاحب منظور نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے تھوڑا سا وقت دو، میں دوبارہ انتخابات کرادوں گا۔

س: نیپ کی حکومت سے کیا غلطیاں ہوئی تھیں۔ جس کی وجہ سے اسے توڑنا ضروری تھا؟ آپ نے تو ان پر ملک دشمنی کے الزام لگائے تھے؟

ج: یقیناً غلطیاں ہوئی ہوں گی۔ کون ایسا انسان یا حکومت ہے جو غلطیاں نہیں کرتی، لیکن بھٹو صاحب آئینی اور قانونی طریقہ استعمال کرتے تو بہتر تھا۔ میں تو خیر لندن میں تھا، لیکن یہاں آ کر دیکھا کہ کوئی ایسی غلطی نہیں تھی جس کی بنا پر بلوچستان میں فوجی کارروائی ضروری ہو۔ یہ صحیح ہے کہ نیپ کی حکومت کے دور میں عدم تحفظ کا احساس تھا۔ لاقانونیت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ سیاسی مخالفین تھے جن کے خلاف انتقامی کارروائی کی گئی تھی، لیکن مسٹر بھٹو نے اس سے زیادہ مظالم اور تشدد کئے۔ نیپ کے کچھ وزیر رشوت ستانی، جرائم اور اقربا پروری میں بھی آگئے تھے جو کم از کم ان کو زیب نہیں دیتا تھا کیونکہ ان لوگوں نے برسوں سے ایک مقصد اور نظریہ کی خاطر قربانیاں دیں، جدوجہد کی، لوگوں کو سیاسی حقوق سے آگاہ کیا اور جب انہی کے رفقاء برائیوں میں ملوث ہو جائیں تو لوگوں کا مایوس ہونا یقینی امر ہے۔ یہ سب کچھ عام آدمی کی

توقعات کے خلاف تھا۔

س: بگٹی صاحب، یہ لندن پلان کا کیا ڈرامہ تھا۔ اس سلسلے میں آپ کا نام بھی خاصہ استعمال ہوا اور بعد میں آپ نے بھی کالعدم نیپ کے خلاف ملک توڑنے کے الزامات عائد کئے؟

ج: لندن پلان تو کئی ہیں۔ ان کا اکثر ذکر آتا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ اس میں کتنی صداقت ہے، لیکن وقتاً فوقتاً انہیں استعمال کیا گیا۔ یہ جو مشہور لندن پلان ہے جس کا بھی ذکر ہوا اور کافی اچھالا گیا، اس کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ 72ء میں ولی خان عطاء اللہ مینگل، شیر محمد مری، ریٹائرڈ جنرل جیلانی (نیپ کا ملوی ایکسپرٹ) ملک غلام جیلانی، دوستانہ، یوسف ہارون، محمود ہارون، شیخ مجیب الرحمٰن اور بندہ......؟ بیک وقت لندن میں تھے۔ جب اتنے نالائق لوگ ایک شہر میں جمع ہو جائیں تو کچھ نہ کچھ تو پلان بنا ہوگا، جس کا مجھے علم نہیں تھا۔

ہاں ملک غلام جیلانی مجھ سے اکثر ملتے رہے ہیں۔ وہ میرے دوست ہیں دولتانہ نے مجھے ایک بار کھانے پر بلایا تھا۔ ولی خان اچانک آکسفورڈ اسٹریٹ پر ملے جنرل جیلانی مجھ سے تین بار ملے۔ شیر محمد مری تو اکثر ملتے تھے۔ میں نے ایک بار دولتانہ سے پوچھا کہ تم نے سیاست کیوں چھوڑ دی، تو وہ کہنے لگے کہ میں نے راہ فرار اختیار کی ہم نے اپنی پگڑی بچائی ہے وہاں بھٹو ہماری دال گلنے نہیں دیتا۔ یہاں آ کر ہم نے اپنی آنکھیں چھپائی ہوئی ہیں۔

مجیب الرحمٰن سے میں نے سقوط ڈھاکہ کے المیے پر بھی بات چیت کی، جسے وقت آنے پر بتاؤں گا۔ آپ کوئی عدالت تو سجائیں اور سارے غداروں کو ایک قطار میں کھڑا کریں۔ پھر ہم بھی وہاں آ کر بتائیں گے کہ کون کتنا بڑا محب وطن ہے۔ پاکستان ہماری آنکھوں کے سامنے ٹوٹا ہے۔ سب نے دیکھا ہے دن دہاڑے ٹوٹا ہے۔ اس میں بہت سے لوگ ملوث ہیں۔ جبکہ عام طور پر ملک توڑنے کی ذمہ داری اکثر مسٹر بھٹو اور جنرل یحییٰ پر ڈالی جاتی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں۔

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے ملک نہیں توڑا، یہ بھی شریک تھے

لیکن ان کے علاوہ بھی کئی اور افراد ہیں، جن کا اتنا ہی بڑا ہاتھ ہے، جتنا کہ یحییٰ اور بھٹو کا۔

اس کے ساتھ ساتھ، ہمارے ملک کے کئی نام نہاد محب وطن اور حب الوطنی کے سرٹیفکیٹ جاری کرنے والے اخبارات اور ان کے ایڈیٹر بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔ آپ ان سے کیوں نہیں پوچھتے۔ ان کو بھی غداروں کی صفوں میں کھڑا کر دو۔ انہوں نے اخبار بیچنے کے لئے ملک بیچا۔ فتنہ وفساد پھیلا سیاستدان نفرت بوتا ہے، لیکن پرورش کون کرتا ہے۔ سرخیاں کون لگاتا ہے۔ ان کی سرخیاں لگانے کے شوق کی وجہ سے ملک 1971ء میں انسانی لہو سے سرخ ہوا۔

س: بلوچستان کے عوام کے حقیقی مسائل کیا ہیں؟

ج: یہ ایک لمبی داستان ہے۔ ایک مسئلہ نہیں کہ آدمی آسانی سے بتا دے پورا صوبہ مسائلستان بنا ہوا ہے۔ پاکستان میں ایک عام آدمی کو جو حقوق، سہولتیں اور اطمینان حاصل ہے، وہ ہمیں نہیں۔ ہمارا سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ ہمیں آج تک کسی نے صحیح معنوں میں پاکستانی تسلیم نہیں کیا اور ہمارے ساتھ بھی بھائی چارہ کا سلوک نہیں کیا۔ بلکہ ہر وقت اور ہر دور میں ہر چیز سے ہر شے سے ہمیں دانستہ محروم کیا گیا۔ عام آدمی میں شدید احساس محرومی ہے، ہر ذہن ایک ہی مسئلہ پیش کرتا ہے، بلوچستان کا حقیقی مسئلہ۔

س: آپ کی نظر میں بلوچستان کا مسئلہ نمبر 1 کیا ہے؟

ج: سب سے پہلا مسئلہ سیاسی ہے، دوئم معاشی، سوئم معاشرتی!!

س: بلوچستان میں سیاسی قوت کونسی ہے؟

ج: بلوچستان جو کہ احساس محرومی میں گھرا ہوا ہے اس کی کیا قوت ہے۔ اس کا فیصلہ آپ خود کیجئے! لوگوں سے معلوم کیجئے! یہ آپ کا کام ہے، میرا نہیں، البتہ اگر آپ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں تو مجھے ضرور بتائیے گا۔

س: بلوچستان میں 1970ء کے انتخابات میں جو سیاسی صورت حال بنی تھی کیا آئندہ عام انتخابات میں بھی وہ صورت حال برقرار رہے گی؟

ج: نہیں، ایسا نہیں ہوگا! ابھی تو یہ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ انتخابات ہوں گے بھی یا

نہیں۔ہوں گے تو کب ہوں گے۔

س: موجودہ حکومت سیاستدانوں کا احتساب کر رہی ہے کیا آپ اس کی رفتار سے مطمئن ہیں؟

ج: کہتے ہیں کہ احتساب ہو رہا ہے، لیکن لگتا ہے کہ اس کی رفتار بہت ڈھیلی ڈھالی ہے۔ حق اور انصاف کی بات یہ ہے کہ سب کا احتساب ہو۔ سروسز کا بھی احتساب ہو۔ آخر صرف سیاستدان ہی تو چور نہیں، بڑے بڑے چور بیٹھے ہیں۔

س: کیا پیپلز پارٹی آج بھی ایک سیاسی قوت کی حیثیت سے ملک میں موجود ہے؟

ج: سندھ اور پنجاب میں اچھی خاصی قوت ہے۔ اگر اس کا وجود واقعی ختم ہو گیا ہوتا تو شاید الیکشن جلدی ہو سکتے۔

س: پنجاب کی سیاسی سوچ کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ج: میرے خیال میں مسٹر بھٹو کو ہٹاتے وقت ہمیں کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ سارا پنجاب اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ قومی اتحاد کی ریڑھ کی ہڈی یا سپورٹر مڈل کلاسیز اور چھوٹے تاجر تھے۔ یہ لوگ شہروں میں خاصے اثر انداز ہوتے ہیں اور اسی رو میں کئی افراد آئے، لیکن پیپلز پارٹی مزدور طبقے، دبے ہوئے، کچلے ہوئے اور محروم طبقوں میں مقبول ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ خاصی بڑی تعداد میں ہیں، ان کی حمایت میں ابھی کوئی فرق نہیں آیا، وہ اب بھی بھٹو کے ساتھ ہیں۔

س: آپ نے تحریک استقلال میں کیوں شمولیت کی؟

ج: میں 1958ء میں ری پبلیکن پارٹی کا ممبر تھا۔ صرف چند مہینوں کے لئے...... اس کے بعد ایوب خان کا مارشل لاء آ گیا اور تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگ گئی۔ اس کے نتیجے میں ہماری پارٹی ختم ہو گئی۔ پھر کچھ برسوں کے بعد پابندی ہٹی تو دوسری پارٹیاں تو زندہ ہو گئیں لیکن ہماری پارٹی زندہ نہیں ہوئی۔ اس لئے ہم رنڈوے رہے۔ اس دوران ہم نیپ کے ہمدرد اور دعا گو تھے لیکن سیاسی طور پر آزاد اکتوبر کے انتخابات میں، جو کہ نہیں ہوئے ہم آزاد تھے، ہمارا آزاد گروپ تھا مگر جب اعلان ہوا کہ انتخابات غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی ہو گئے تو ہم نے اپنے ساتھیوں سے

مستقبل کے بارے میں صلاح مشورہ کیا اور پاکستان کی آئندہ آنے والی سیاست کا تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان کی پچھلے تیس سال کی سیاست ایک طرف اور آئندہ سیاست کا رخ، سمت، راہ دوسری طرف ہو گی۔ جس کا ماضی کی تیس سالہ سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ جس میں آزاد اور آزاد گروپ کا کوئی مقام نہیں ہو گا اور ہمارا راستہ خطرات سے بھرا پڑا ہے لہٰذا اس سیاسی پارٹی میں شمولیت کی جائے جو ہماری نظر میں ان تمام مسائل کا صحیح طریقے سے حل پیش کر سکے۔ اس صورت میں فیصلہ ہوا کہ تحریک استقلال ہی وہ جماعت ہے جو باقی پارٹیوں کی نسبت ہماری ضروریات، نظریات اور مسائل کو بہتر انداز میں سمجھ سکتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک صحیح معنوں میں قومی بنیاد کی پارٹی ہے اور اس کی لیڈر شپ صاف ستھری اور بے داغ ہے۔ اس کا پروگرام بالخصوص صوبائی خودمختاری...... وہ دوسری پارٹیوں کی نسبت ہمارے جذبات سے زیادہ قریب تر ہے۔ اس کے برعکس قومی اتحاد کی پارٹیوں کی اکثریت پاکستان کے قیام کے خلاف تھی اور شاید آج بھی ہے اس لئے ہم اس میں شامل نہیں ہوئے۔

س: کیا قومی اتحاد پاکستان کے عوام کو متبادل سیاسی قیادت فراہم نہیں کر سکتا۔

ج: قومی اتحاد ایک غیر فطری جمگھٹا ہے جو تیزی سے ٹوٹ رہا ہے، ان کا دیر تک یکجا رہنا ہی غیر فطری ہے۔

س: پنجاب کے کچھ سیاسی حلقے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ تمام سیاسی پارٹیوں کو ختم کر کے انتخابات کرائے جائیں۔ اس پر آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

ج: مگر یہ فیصلہ کون کرے گا کہ کون باصلاحیت ہے۔ کیا یہ فیصلہ حنیف رامے کریں گے جنہوں نے یہ مشورہ دیا۔ ایوب کے وقت میں بھی ایسا ہوا تھا۔ رامے صاحب زمانے کی رفتار کو 1963ء کی طرف موڑنا چاہتے ہیں جب پارٹیاں ہی ختم ہو جائیں تو انتخابات کیونکر ہوں۔ یہ ایک ذہین دانشور کی احمقانہ تجویز ہے۔ دانشوروں نے عقل کا ٹھیکہ تو نہیں لیا۔ یہ رامے صاحب کے ذہن کی فرسٹریشن کا ردعمل ہے۔ کوئی انہیں لیڈر تسلیم نہیں کر رہا تھا تو وہ سب کے پیچھے پڑ گئے اور ان کا نقطہ نظر یہ نظر آتا ہے کہ ''میں'' نہیں تو کوئی بھی نہیں۔

س: حال ہی میں صدارتی نظام کی حمایت میں بھی بعض حلقوں سے آوازیں آئی ہیں۔اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: ہمیں صدارتی نظام کی ''برکتوں'' کا بڑا تلخ تجربہ ہے،ہم اس کو دہرانا نہیں چاہتے۔

اگست 1997ء کو قیام پاکستان کے 50 سال مکمل ہونے پر ملک کے مقتدر اخبارات نے آزادی کی گولڈن جوبلی تقریبات کے حوالے سے خصوصی ایڈیشن شائع کئے تھے روزنامہ نوائے وقت نے سردار اکبر خان بگٹی کا انٹرویو پاکستان کے گزشتہ 50 سال کے حوالے سے شائع کیا جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔یہ انٹرویو سعید خاور نے لیا تھا۔ملاحظہ فرمائیں:

نوائے وقت: نواب صاحب! ہم اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہے ہیں،قوموں کی عمر میں 50 سال کوئی بڑی عمر نہیں ہوتی، پھر بھی یہ نصف صدی کا قصہ ہے اور اسے کسی طرح سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا،سود وزیاں کے حوالے سے آپکا تجزیہ کیا ہے؟

نواب اکبر بگٹی: پچاس سال پلک جھپکتے ہی گزر گئے، یوں لگتا ہے کہ جیسے پانچ دس برس کی بات ہے۔ہم نے آدھی صدی گزار دی ہے، میرے خیال میں ہماری کارکردگی زیادہ مثالی نہیں رہی ہے، ہم نے ملک اور قوم کو مایوس کیا ہے اور وہ کچھ نہیں کر سکتے جو کچھ کر سکتے تھے یا کر سکنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔پایا کم اور گنوایا زیادہ ہے۔سب سے بڑا نقصان تو ہم نے اپنا یہ کیا ہے کہ ملک کا آدھا حصہ گنوا دیا اور یہ حقیقت بڑی تلخ ہے کہ اب ملک آدھا رہ گیا ہے اور بلحاظ آبادی دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہم نے ملک کی نصف سے زائد آبادی کھو دی ہے۔یعنی ملک کی اکثریت ہم نے گنوا دی ہے اور اب ہم اقلیت میں ہیں۔ پچاس سالوں میں ہوتا یہ کہ ہمارے درمیان قربتیں ہوتیں۔ بھائی چارہ کو فروغ ملتا، اخوت اور محبت قائم ہوتی، لیکن یہ نہیں ہو سکا، اس کے برعکس ہمارے درمیان فاصلے پیدا ہوئے ہیں۔ نفرتیں پروان چڑھی ہیں، اختلافات کے بیج بوئے گئے اور مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔ ان پچاس سالوں میں مذہبی اور لسانی منافرت کو ہوا دی گئی ہے اور لوگوں کو باہم اس قدر لڑایا گیا ہے کہ یکجہتی کی فضا پیدا نہیں ہو سکی۔فرقہ واریت تو اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب یوں لگتا ہے کہ یہ

مسلمان اکثریت کا ملک نہیں بلکہ مختلف مذاہب کا ملک ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹ کر اپنے مذہب کی بالادستی تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ایک اچھی سوچ اور مقصد لے کر ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا لیکن اب یہ طے شدہ بات ہے کہ ہم اپنی منزل سے بھٹک گئے ہیں۔شروع شروع میں ہمارے اندر عزم سفر بھی تھا، مشترکہ منزل کی جستجو بھی تھی، محبت اور یگانگت کے رنگ ہر شعبے اور ہر طبقے میں نمایاں تھے، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ذوق سفر ماند پڑتا گیا، راہیں اختلافات اور مشکلات کی گرد میں گم کر دی گئیں اور نفرتوں کو گلے لگا لیا گیا۔ جب ہم نے یہ ملک حاصل کیا تو اس وقت اگر ہمارے درمیان محبتیں نہیں تھیں تو نفرتیں بھی نہیں تھیں۔ مذہبی تضادات بھی اتنے زیادہ نہیں تھے، لوگ ایک دوسرے کو برداشت اور قبول کرتے تھے مگر اب کوئی اپنے وجود کے علاوہ دوسرے وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے، اب تو صورتحال اتنی گھمبیر ہو چکی ہے کہ ہم کسی دوسرے کے وجود کا سایہ بھی برداشت کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ اسلام محبت، اخوت اور امن کا درس دیتا ہے لیکن ہم دعویٰ تو مسلمان ہونے کا کرتے ہیں لیکن ہماری اصلیت یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے ہیں۔ مساجد میں قتل ہو رہے ہیں، امام بارگاہوں پر حملے کئے جاتے ہیں۔ ہم دیوانگی کی اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ اب ہمارے ہاتھوں سے خدا کا گھر بھی محفوظ نہیں رہا۔ جس سماج میں خدا کے گھر کا احترام باقی نہ رہے وہاں خدا کا احترام کیسے باقی رہ سکتا ہے اور جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم خدا اور اس کے رسول ﷺ کے لئے سب کچھ کر رہے ہیں وہ کفر بکتے ہیں بلکہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ دھوکا کر رہے ہیں۔ خدا اور اس کا رسول ﷺ قطعاً اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ایک دوسرے کا گلا کاٹیں اور ایک دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالیں۔ بدقسمتی سے آج ہم اپنی 50 ویں سالگرہ پر اس مقام پر کھڑے ہیں کہ شیطان بھی ہمارے کرتوتوں سے شرمارہا ہے۔

نوائے وقت: ایسی بات نہیں، قوموں کی زندگی میں کٹھن مراحل آتے ہیں اور غلطیاں بھی ہوتی ہیں لیکن بہتری کا امکان تو ہر وقت موجود رہتا ہے؟

نواب اکبر بگٹی: میں یاسیت پسند انسان نہیں ہوں لیکن ہم منفی رویوں میں اتنا آگے نکل چکے ہیں کہ راہ راست پر آنے کے امکانات دم توڑ چکے ہیں اور بہتری کے آثار تقریباً ختم ہو چکے ہیں اور مجھے نہیں لگتا کہ ہم اپنی ان عادتوں سے باز آئیں جو کہ اب بہت پختہ ہو چکی ہیں اس لئے میں بہتری کے لئے زیادہ پر امید نہیں ہوں۔

نوائے وقت: یہ جو آپ نے قومی منظر نامے کا نقشہ کھینچا ہے اور قدروں سے پسپائی کی تصویر پیش کی ہے، اس کا سبب کیا ہے؟ اس کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟ آپ اس ساری صورتحال کا ذمہ دار کس کو ٹھہراتے ہیں؟

نواب اکبر بگٹی: اس صورتحال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ صرف پاکستان میں نہیں ہے، دنیا بھر میں یہی ہو رہا ہے، ہر خطہ بیگانگی کے اس عفریت کا شکار ہے لیکن یہ خاص طور پر دنیا کے ان ممالک میں ہو رہا ہے جو خود کو مسلمان کہتے ہیں۔ وہ چاہے عرب ہو یا عجم اس کی تخصیص کے بغیر تمام مسلمان ملکوں میں کچھ پاکستان سے ملتے جلتے حالات موجود ہیں اور وہاں ایسے حالات و واقعات کی شدت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی اور سیاسی دہشت گردی کا مرکز ومحور صرف عالم اسلام ہی کیوں ہے تو میرے پاس اس کا جواب نہیں ہے کیونکہ میں عقل کل نہیں ہوں۔ البتہ اس حد تک معاملہ صاف ہے کہ پاکستان اور دیگر اسلامی ملکوں میں مذہبی منافرت کا اہم سبب فرقہ پرستی ہے۔ ہر فرقہ دوسرے فرقے کے وجود کو مٹانے پر تلا ہوا ہے اور بزور طاقت اپنے آپ کو منوانے کے درپے ہے۔ ہر فرقہ مذہبی فریضہ جان کر دوسرے فرقے کو دبا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ مخالفین کو صراط مستقیم پر لا رہا ہے او مسلمان بنا رہا ہے۔ مسلمان ایسے تو نہیں بنتے، اسلام تلوار کے زور سے یا جبر سے نہیں پھیلا اور پھر مسلمانوں کے ہاتھوں ہی مسلمانوں کا قتل عام کہاں کا اسلام ہے۔ یہ خدا کے احکامات سے صریحاً روگردانی ہے، اس کے اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن ایک اہم وجہ میں نے بیان کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مذہبی عصبیت کو روکنے میں ع کرام بھی اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں ناکام رہے ہیں اور بعض مواقع پر علما کرا فرقہ واریت اور مذہبی گروہ بندی کو ہوا دینے کا سبب بھی بنے ہیں جن سے فرقہ پر

میں شدت پسندی کو فروغ ملا ہے۔

نوائے وقت: نواب صاحب: ضروری نہیں کہ شکست وریخت بالادستی کے لئے ہو، ممکن ہے پاکستان میں یہ فضا کسی بڑی تبدیلی کی طرف اشارہ ہو اور ہم معاملے کو سمجھنے میں ہی ناکام رہے ہوں؟

نواب اکبر بگٹی: تبدیلی کا مادہ انسان کی فطرت اور سرشت میں شامل ہے۔ تغیر و تبدیلی انسان اور اس کی کائنات کا ناگزیر وصف ہے۔ انسانی زندگی کے تضادات بھی تبدیلی کی طلب کو بڑھاتے ہیں اور دنیا تبدیلیوں کی امید پر ہی استوار ہے، ہم فلسفے کی طرف نکل آئے اور مجھے خدشہ ہے کہ ہم فلسفے کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر اصل موضوع سے ہٹ جائیں گے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ انسان تبدیلی چاہتا ہے اور تبدیلی کے لئے ہی سرگرداں رہتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر تبدیلی بہتری اور اصلاح کیلئے ہے تو سر آنکھوں پر۔ لیکن اگر یہ تبدیلی تباہ کن ہے اور سب کیلئے نہیں بلکہ کسی ایک گروہ کے لئے ہے تو پھر وہ تبدیلی نہیں تخریب ہے اور یہ زندگی کی حقیقتوں سے انحراف کے مترادف ہے۔

نوائے وقت: ہمارے بعض لوگ تمام خرابیوں کی جڑ ''سسٹم'' کو قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ''سسٹم'' انگریز کا عطا کردہ ہے جو ہماری قومی روح کے منافی ہے، انگریز نے اقتدار تو چھوڑ دیا لیکن اپنے ''سسٹم'' کا پھندہ ہمارے گلے میں ڈال گیا ہے جس کی وجہ سے ہم ابھی تک اس کے دام فریب میں ہیں اور آزادی حاصل کرنے کے باوجود غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، آپ اس منطق سے اتفاق کرتے ہیں۔

نواب اکبر بگٹی: یہی تو خرابی ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا نزلہ سسٹم پر گراتے ہیں۔ انگریز نے یہ سسٹم ہمیں ہماری دھرتی چھوڑتے ہوئے اچانک نہیں دیا بلکہ یہ سسٹم اس نے ہمیں بہت پہلے دیا جب اس نے ہمارے اوپر حکومت کرنا شروع کی تھی۔ یہ سسٹم آزادی دیتے وقت اس نے ہم پر مسلط نہیں کیا۔ انگریز برصغیر پاک و ہند میں بہت عرصہ رہے وہ جب تک یہاں رہے یہی سسٹم چلاتے رہے اور بڑی مہارت سے چلاتے رہے۔ اب ان کے جاتے ہی تو یہ سسٹم بگڑ نہیں گیا۔ بلکہ وہ یہ

سسٹم چلانے میں مخلص تھے۔ ان کے مقاصد مثبت تھے لیکن بدقسمتی سے ہم اس سسٹم کو اس مہارت، اخلاص اور مستعدی سے نہ چلا سکے جس طرح سے انگریز چلا رہے تھے۔ اب اس میں سسٹم کا کیا قصور؟ قصور تو ہمارا ہے کہ ہم بنی بنائی چیز کو بھی چلانے کے اہل نہیں ہیں۔ ہم نے انگریزوں سے تو آزادی حاصل کر لی اور پھر باہم دست و گریبان ہو گئے اور ایک دوسرے کی آزادی چھیننے لگے۔ اس میں انگریز یا اس کے قائم کردہ سسٹم کا کیا قصور ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ملکہ برطانیہ دورے پر آئیں تو ایک شخص ان کی گاڑی کے نیچے لیٹ گیا۔ ملکہ بھی حیران رہ گئی اور اس سے استفسار کیا کہ کیا چاہتا ہے تو اس نے ہاتھ باندھ کر کہا کہ خدا کے واسطے واپس آؤ اور حکومت دوبارہ سنبھال لو۔ کیونکہ ہم خود کو نہیں سنبھال سکے تم لوگ ہی آ کر ہمیں سنبھالو۔ اس سے بڑھ کر خرابی کیا ہو سکتی ہے کہ ہمیں آزادی راس ہی نہیں آ رہی۔ ہم کہتے ہیں کہ انگریز ہم پر یہ سسٹم مسلط کر گیا ہے، چلو مان لیا لیکن یہ سسٹم تو ہر جگہ موجود ہے اور ہر جگہ کامیابی سے چل رہا ہے وہاں تو سسٹم میں کیڑے نہیں نکال جاتے بلکہ ہر جگہ یہ سسٹم کامیابی سے چل رہا ہے۔

آسٹریلیا میں بھی یہی سسٹم ہے، وہاں کیوں خرابیاں نہیں ہیں۔ نیوزی لینڈ میں بھی یہی سسٹم ہے وہاں خرابیوں کی شکایت کیوں نہیں ہے۔ کینیڈا میں بھی یہی سسٹم ہے اور بہت خوبصورتی سے رواں دواں ہے۔ اگر آپ اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے اس سسٹم کو نہیں چلا سکے تو کسی اور کو یا سسٹم کو موردِ الزام نہ ٹھہرائیں۔ اس کا مطلب ہے کہ خرابی سسٹم میں نہیں بلکہ سسٹم چلانے والوں میں ہے۔ خرابی سسٹم میں نہیں بلکہ سسٹم چلانے والوں میں ہے۔ خرابی خود ہمارے اندر موجود ہے اور ہم دوسروں پر انگلیاں اٹھاتے پھر رہے ہیں۔ انگریزوں نے ہمیں کوئی مخصوص یا نرالہ سسٹم نہیں دیا بلکہ وہی سسٹم دیا ہے جو وہ خود چلا رہا تھا اور چلا رہا ہے مگر وہاں تو خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ البتہ جب سے ہمارے لوگ وہاں جا کر آباد ہوئے ہیں تو وہاں بھی نقائص اور خرابیاں جنم لینے لگی ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خراب ہم خود ہیں اور الزام دیتے ہیں انگریز کو اور اس کے دیئے ہوئے سسٹم کو۔ میں اور نواب خیر بخش مری 1953ء میں ملکہ کی تاجپوشی میں شرکت کے لئے گئے تھے تو انگلستان

بہت مثالی لگا تھا لیکن اس وقت ہمارے لوگ وہاں نہیں پہنچے تھے، اب وہاں جا کر دیکھیں انگلستان پہلے جیسا نہیں ہے کیونکہ ہمارے لوگ جہاں جاتے ہیں اپنی تمام خرابیاں ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ جب ہم خود کو ٹھیک نہیں کر سکتے تو الزام دوسروں پر دھر دیتے ہیں۔ ملائیشیا بھی تو مسلمان ملک ہے اور وہاں بھی انگریز سسٹم چھوڑ کر گیا ہے لیکن وہ لوگ ہم سے بہت آگے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں جوہر تھا اور انہوں نے اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر دکھایا۔ ہمارے پاس بھی سسٹم تو وہی ہے لیکن ہم پسپائی کی طرف گامزن ہیں۔ تو میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خرابیاں ہم خود پیدا کرتے ہیں اور اپنی برائیوں کی کالک دوسروں کے چہروں پر مل دیتے ہیں۔

نوائے وقت: آپ کی باتوں سے اخذ ہوتا ہے کہ ہم نے قیام پاکستان کے مقاصد سے انحراف کیا ہے جس کی وجہ سے ہمارے لئے مشکلات پیدا ہوئی ہیں؟

نواب اکبر بگٹی: جب پاکستان قائم ہوا تو میں نوجوان تھا، میں جناح صاحب سے دوبار ملا بھی تھا، انہوں نے کہا کہ ہم مسلمانوں کے لئے علیحدہ گھر بنانا چاہتے ہیں۔ جہاں جمہوری اور اسلامی روایات کی پاسداری ہوگی، مساوات قائم کی جائے گی تاکہ سب کے ساتھ یکساں سلوک ہو، انہوں نے کسی کا گلا کاٹنے یا ہاتھ کاٹنے کی بات کبھی نہیں کی تھی، ایسی کوئی بات مجھے یاد نہیں ہے۔ اب نہ تو وہ جمہوری اور اسلامی روایات دکھائی دیتی ہیں۔ نہ مساوات ہے۔ ہم نے اپنی قدروں کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ ہم وحشیانہ سماج کی طرف گامزن ہیں اور عملاً سماجی جانور بنتے جا رہے ہیں۔ ہم نے بڑے خراب حالات میں سفر کا آغاز کیا، اب اس سے بھی زیادہ برے حالات کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم جس راستے پر گامزن ہیں اس کا اختتام اندھے کنوئیں پر ہوتا ہے جو ہمارے وجود کو آناً فاناً نگل لے گا۔

نوائے وقت: نواب صاحب: مان لیا، ہم میں خرابیاں بھی ہوں گی اور نصف صدی پر محیط قومی تاریخ میں ہم سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہوں گی، لیکن اس انحطاط کا ذمہ دار آپ کی نظروں میں کوئی مخصوص ادارہ یا طبقہ ہے کہ پوری قوم؟

نواب اکبر بگٹی: نہیں، میں اس بگاڑ کا سبب کسی ایک ادارے، طبقے یا کسی ایک شخص کو قرار

نہیں دیتا، میں سمجھتا ہوں اس انحطاط کے ہم سب ذمہ دار ہیں۔کوئی معصوم یا پارسا ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔البتہ عام لوگوں کی معاملات پر گرفت نہ کبھی رہی ہے اور نہ ہے اور اس لئے عام آدمی کو خرابیوں کا قصور وار نہیں ٹھہریا جاسکتا لیکن جب آپ بحیثیت ایک قوم بات کریں گے تو پھر ہم سب ملکی تباہی کے ذمہ دار سمجھے جائیں گے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ ہم سب قومی مجرم ہیں۔لیکن آپ ذمہ داریوں کا تعین کرنا چاہیں گے تو وہ لوگ زیادہ قصور وار ہیں جو معاشرے میں زیادہ موثر اور بالا دست ہیں۔ان میں مذہبی جماعتیں، سیاست دان اور پھر دوسرے ادارے آجاتے ہیں۔

نوائے وقت: آپ موثر سیاسی رہنما ہیں، یہ ملک ہم سب کا ہے، ہمیں اس کو انحطاط سے نکال کر آبرومندانہ طریقے سے زندگی کی راہ پر چلانا ہے اور یہ ہمارا قومی فرض بھی ہے، ملک کو اس مشکل اور الجھن سے نکالنے کے لئے آپ کی تجاویز کیا ہیں۔؟

نواب اکبر بگٹی: بات بڑی تلخ ہے لیکن کہے بغیر چارہ نہیں کہ اب ہمارے پاس پانے کے لئے کچھ نہیں، جو کچھ تھا وہ ہم نے گنوادیا، اب ہم کچھ پانے اور کچھ کھونے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ہم نے اس ملک پر بڑا ظلم کیا ہے اور اپنے آپ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ہم سے اتنی غلطیاں سرزد ہو چکی ہیں کہ ہم اس سٹیج پر قیام پاکستان کے حقیقی مقاصد پر عمل کر کے بھی کچھ نتائج حاصل نہیں کرسکتے۔یہ کار دارد ہے۔ہاں البتہ کوئی معجزہ رونما ہو تو ملک کو تباہی سے بچایا جاسکتا ہے، ورنہ اب قوم میں قومی روح بیدار کرنا تقریباً ناممکن سی بات ہوگئی ہے۔ہم بڑی سرعت کے ساتھ تباہی کی طرف دھکیلے جارہے ہیں اور یہ کام ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیا ہے۔ہماری تباہی میں غیروں سے زیادہ ہمارا اپنا ہاتھ اور دخل ہے۔میں مایوس انسان نہیں ہوں اور نہ ہی مایوسی کی باتیں کررہا ہوں بلکہ ایک حقیقت ہے جو بیان کررہا ہوں۔بدقسمتی سے ہمارے لچھن روز اول سے ہی درست نہیں تھے اور پھر ہم نے کبھی بھی اپنا قبلہ درست کرنے کا نہیں سوچا، نتیجتاً تباہی ہمارا مقصدرا ٹھہری ہے۔جب پوری قوم "میں نہ مانوں" کی ضد پر اڑی ہوئی ہو تو پھر تباہی سے بچنا محال ہوتا ہے۔ملک میں خرابیاں اچانک پیدا نہیں ہوئیں بلکہ غلطیاں کرنے، نقصان اٹھانے اور پھر وہی غلطیاں دہرانے سے ہم

ناقابل حل مسائل کا شکار ہوتے چلے گئے ہیں۔اس سے بڑھ کر بدقسمتی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہم پچاس سالوں میں ملک کو ایک آئین بھی نہیں دے سکے۔میری رائے یہ ہے کہ 1973ء کا آئین ایک مکمل آئین نہیں ہے بلکہ اسے ایک اچھا آغاز قرار دیا جاسکتا ہے لیکن اس آئین کو قومی امنگوں اور تقاضوں کا آئینہ دار تصور نہیں کیا جاسکتا۔1973ء کا آئین ایک عارضی آئین تھا جس پر ہم مزید کام نہیں کرسکے۔بھٹو صاحب نے جب 1973ء کے آئین کا اعلان کیا اور یہ اخبارات میں شائع ہوا تو صحافی میرے پاس آئے اور اس پر تبصرہ مانگا۔میں ان دنوں گورنر بلوچستان تھا، میں نے 1973ء کے آئین پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ آئین نامکمل ہے اور اس میں خامیاں ہیں۔خاص طور پر صوبائی خودمختاری کے حوالے سے اس میں بعض تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔یہ اچھا آغاز ہے لیکن اس پر مزید کام کیا جائے اور اسے مکمل کیا جائے۔دوسرے روز میرا یہ تبصرہ چھپا تو بھٹو صاحب ناراض ہوگئے اور کہا کہ تم نے بڑا ظلم کیا ہے اور یہ کیا کہہ دیا ہے مجھے یقین ہے کہ تم نے ایسا نہیں کہا ہوگا۔میں نے انہیں بتایا کہ میں نے یہ بیان پڑھا ہے اور یہ درست ہے، میں نے ایسا ہی کہا تھا اور اب بھی اس پر قائم ہوں۔انہوں نے کہا کہ تم تردید کرو مگر میں نے انکار کردیا۔ بدقسمتی سے اس آئین کو بہتر نہیں بنایا گیا جو کہ ضروری تھا۔بلکہ اگلے ادوار میں اسے مزید بگاڑ دیا گیا اور اسے ترامیم کے ذریعے مسخ کر کے رکھ دیا گیا۔ہمارے ملک میں آئین نہ ہونے کے برابر ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ہم پچاس سالوں سے آئین کے بغیر چل رہے ہیں اور پچاس سالوں سے ملک آئینی بحران کا شکار ہے۔

(انٹرویو 10 جولائی 1997ء "بگٹی بولک" کراچی)

سہیل وڑائچ کے نام سے کون آشنا نہیں خصوصاً اردو صحافت میں انٹرویو کے حوالے سے انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔قریباً تمام شعبہ ہائے زندگی کی سرکردہ شخصیات سے انہوں نے انٹرویو کئے ان کے انٹرویوز کے اب تک چار مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔سہیل وڑائچ نے اپنی کتاب "پنجاب سے نفرت کیوں"؟ میں جن سیاسی شخصیات کے انٹرویو شامل کئے ہیں۔ان میں سردار محمد اکبر خان بگٹی بھی شامل ہیں۔جن کے

متعلق سہیل وڑائچ لکھتے ہیں۔

''سابق گورنر وزیراعلیٰ بلوچستان نواب اکبر بگٹی سے ملاقات ایک منفرد تجربہ تھا وہ اپنی گفتگو، اپنی چال رہن سہن اور اپنی عادات واطوار ہر لحاظ سے منفرد ہیں اپنی عمر کی ستر سے زائد بہاریں دیکھنے کے باوجود ان کی گفتگو میں جوانوں کا سا لہجہ ہے ان کی چال ڈھال میں کہیں خمیدگی نہیں ہے وہ فرشی نشست پر بغیر کسی تکیے یا سہارے کے گھنٹوں بیٹھتے ہیں اور تھکتے نہیں ان کا رہن سہن ایک قبائلی سردار کے ثقافت اور رواجات سے بھرپور ہے وہ صبح اٹھ کر اب بھی روزانہ اپنے قبیلے کا احوال معلوم کرتے اور ان سے باقاعدہ ملاقاتیں کرتے ہیں وہ دنیا کے تازہ ترین حالات سے بھی ہر طرح باخبر رہتے ہیں پاکستان کے بڑے شہروں میں بہت دور ڈیرہ بگٹی میں مقیم ہونے کے باوجود کراچی سے ان کے لیے انگریزی کتب اور اخبارات آتے ہیں کافی ہو یا جدید دنیا کی کوئی نعمت وہ بھی ڈیرہ بگٹی جیسی دور افتادہ جگہ پر مہیا ہے۔

نواب اکبر بگٹی بغیر کسی سرکاری عہدے کے اپنے علاقے کے بلا شرکت غیرے حکمران ہیں ان کے علاقے میں انہی کا حکم چلتا ہے وہ انگریزی کتب کے دلدادہ ہیں اور کئی بار ڈیرہ بگٹی کالج کے اساتذہ اور طلباء کو مختلف امور پر لیکچرز دے چکے ہیں بلوچ قبائل کے حوالے سے ان کا عالمانہ مقالہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اکبر بگٹی 1927ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم ڈیرہ بگٹی اور کوئٹہ میں حاصل کی اور پھر کراچی چلے گئے جہاں انہوں نے پہلے مختلف سکولوں اور بعد ازاں کراچی گرامر سکول میں تعلیم پائی 1939ء کے اواخر میں ان کے والد کے انتقال کے بعد ان کے سر پر سرداری کی پگڑی باندھی گئی ان کی کم عمری کے باعث ان کے ایک کزن میر جمال خان کو عارضی طور پر قبیلے کا سربراہ مقرر کیا گیا اور انہیں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے چیفس کالج بھیج دیا گیا 1945ء میں قبیلے کے عارضی سربراہ کے خلاف بغاوت ہوئی تو انہیں اپنے علاقے میں جانا پڑا۔ مئی 1946ء میں انہیں باقاعدہ طور پر سردار کی حیثیت سے اختیارات سونپے گئے 1946ء سے تا حال وہ بگٹی قبیلے کے سردار کی حیثیت سے گردش ماہ وسال کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔

نواب اکبر بگٹی نے بھرپور سیاسی زندگی گذاری ہے وہ جیل کی تنگ و تاریک

کوٹھڑیوں کے اسیر بھی رہے اور اقتدار کی غلام گردشوں کے امیر بھی ان کی سیاسی شخصیت میں پارہ بھرا ہے وہ کئی سیاسی جماعتوں میں رہے لیکن بالآخر اب ان کی سیاسی جماعت جمہوری وطن پارٹی تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور بلوچستان کی بڑی جماعتوں میں سے اہم ترین جماعت ہے نواب اکبر بگٹی پاکستانی سیاست کے بہت سے اہم واقعات کے عینی شاہد ہیں بلوچستان میں فوجی آپریشن کے وقت وہ صوبے کے گورنر تھے وہ بھٹو کے دوست بھی رہے اور ان کے مخالف بھی، اسی طرح وہ بے نظیر بھٹو کے اتحادی اور مخالف رہے نواز شریف سے بھی ان کا اسی قسم کا رشتہ رہا نواب اکبر بگٹی سے گفتگو جنرل مشرف کی فوجی حکومت کے آنے کے بعد ہوئی جس میں انہوں نے کھل کر اظہار گفتگو کیا آیئے اس گفتگو میں شریک ہوں۔

س: اکبر بگٹی صاحب! آپ کو خارزار سیاست میں اترے پچاس سے بھی زائد برس گزر چکے ہیں آپ جیل میں رہے اقتدار کے مزے بھی لئے آپ یہ فرمائیں کہ پاکستان ترقی کیوں نہیں کر رہا آخر ہمارے ملک کے حالات ہی کیوں برے ہیں۔ دنیا کی کئی قوموں نے ترقی کی وہ اپنے آپ میں بہتری لائے ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

اکبر بگٹی: بالکل صحیح بات ہے آپ بھی ترقی کر سکتے ہیں رکاوٹ تو کوئی نہیں ہے کیونکہ جب آپ ترقی کرنا چاہیں تو آپ کر سکتے ہیں اور جب آپ پیچھے جانا چاہیں تو پھر آپ پیچھے چلے جاتے ہیں یہ تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔

س: آپ کے حیال میں حالات کیسے ٹھیک کیے جائیں؟ ہم ترقی کس طرح کر سکتے ہیں؟

اکبر بگٹی: میرے پاس تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے یہ آپ خود تجزیہ کریں کہ کیا طریقے ہیں لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اگر آپ خود ٹھیک کرنا چاہتے ہوں کیونکہ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ کیا آپ خود ٹھیک کرنا بھی چاہتے ہیں کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں یا صرف دکھاوے کے لیے ہے کہ تبدیلی آنی چاہیے۔

س: پنجاب کے لوگوں کی استحصالی قرار دینا فیشن بن چکا ہے وہاں کے لوگ تو خود استحصال کا شکار ہیں آپ پنجاب کے مظلوم لوگوں کو کس طرح استحصالی قرار دیتے ہیں؟

اکبر بگٹی: اگر آپ استحصال کرتے ہیں تو آپ اکیلے اس میں شامل نہیں ہوتے بلکہ آپ

کے ساتھ آپ کے عزیز رشتہ دار یا کوئی سو دو سو لوگ اس میں شامل ہوں گے مثلاً اگر پنجاب سے کوئی افسر یا چپراسی بلوچستان میں آ کر نوکری کرتا ہے اور وہ وہاں بے روزگار ہے یہاں آ کر مستقل روزگار پر لگتا ہے تو کئی لوگوں کے لیے رزق کا باعث بنتا ہے اور اس کی وجہ سے یہاں کتنے لوگ روزگار سے محروم ہوں گے۔ اگر اس سے پوچھیں تو وہ کہے گا کہ میں نوکری کر رہا ہوں میں کسی کا استحصال نہیں کر رہا لیکن وہ انجانے میں اس استحصال میں شامل ہے بنیادی بات یہ ہے کہ پاکستان بننے کے کچھ عرصے بعد پاکستان میں تین طاقتوں کی مثلث نے قبضہ کیا اور یہ قبضہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے اور اس نے ہماری شہ رگ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ یہ جو تین طاقتیں ہیں ان میں سب سے اوپر فوج ہے اس میں زیادہ لوگ پنجاب سے ہیں سندھ اور بلوچستان کے لوگ تو نہ ہونے کے برابر ہیں صوبہ سرحد کے لوگ 7 یا 8 فیصد ہیں دوسرے نمبر پر پاکستان کی افسر شاہی ہے ان میں بھاری اکثریت پنجاب سے ہے تیسری طاقت معاشی مفادات ہیں اس میں بھی بھاری سے بھاری اکثریت پنجاب سے ہے ان تینوں نے مل کر پاکستان کو جکڑ رکھا ہے ان تینوں کے مفادات یکساں ہیں یہ ملک کو اچھا چلا رہے ہیں یا برا چلا رہے ہیں مگر چلا یہی رہے ہیں کبھی وردی والا صاحب خود آتا ہے پریڈ کرتے ہوئے جیسا کہ آج کل ہے یہ ایوب خان کے وقت سے شروع ہوا پھر کبھی افسر شاہی آ جاتی ہے جیسے غلام محمد، سکندر مرزا اور چودھری محمد علی آئے ان کے کالر تبدیل ہو جاتے ہیں تیسرے کبھی ضرورت پڑے تو معاشی مفادات کے لوگ لائے جاتے ہیں جیسے ذوالفقار بھٹو اور نواز شریف کو لایا گیا ان کے معاشی مفادات بھی مثلث کے دو دوسرے اداروں سے ملتے تھے۔

س: بھٹو اور نواز شریف کو آپ کیسے معاشی مفادات کی پیداوار قرار دے رہے ہیں؟

اکبر بگٹی: مسٹر بھٹو ان تینوں طاقتوں کے ایجنٹ تھے انہوں نے کہا کہ میں آپ کے لیے کام کروں گا انہوں نے بھی سوچا کہ یہ ہمارے طبقے کا آدمی ہے ہمارے کام بھی کرے گا بھٹو پنجاب سے نہیں تھے انہیں باہر سے لائے بھٹو بہت تیز آدمی تھے انہوں نے ان کے کام کیے اور جب ان طاقتوں نے دیکھا کہ اب یہ ہمارے کام کا نہیں یا ہمارے

ساتھ مزید نہیں چل سکتا تو اسے لٹکا دیا۔

میاں صاحب کے ساتھ جو پچھلے دنوں ہوا مجھے ایک دوست نے فون کیا کہ میاں صاحب بچ گئے ایک شعر ہے کہ:

جان بچی سو لاکھوں پائے
لوٹ کے بدھو گھر کو آئے

میں نے کہا تو یہ بدھو، وہ تو عقلی اور ذہنی طور پر ڈپٹی سیکرٹری بننے کے بھی اہل نہیں تھے وہ نالائق آدمی تھے ضیاء الحق کے بعد جب پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے تو میں بلوچستان سے منتخب ہو کر آیا لیکن انہوں نے ہمیں تو وزیر اعلیٰ تک نہ بننے دیا ہماری اسمبلی کو توڑا گیا، اسلام آباد میں بے نظیر کے خلاف اپوزیشن کے لوگ مثلاً نوابزادہ صاحب اور لوگ جو مستقل اپوزیشن ہے وہاں پر میں نے نواز شریف کو بیٹھے ہوئے پہلی بار دیکھا تو میں نے پوچھا یہ کون ہیں تو مجھے بتایا گیا کہ یہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہیں شکل سے تو اچھے ہیں وہاں مختلف باتیں اور تقریریں ہوئیں لیکن یہ بے چارے خالی ذہن تھے یہ بولنا نہیں جانتے تھے ہم سمجھے کہ ہو سکتا ہے یہ خاموش طبیعت کے ہوں پھر جب ہماری گورنمنٹ بنی تو نیشنل اکنامکس کونسل (NEC) کی میٹنگ تھی وہاں پر قومی کیک تقسیم ہونا تھا بے نظیر وزیر اعظم تھیں اور اجلاس کی صدارت کر رہی تھیں تمام وزیر اعلیٰ موجود تھے میاں صاحب میرے قریب اور بے نظیر کے بائیں جانب پر بیٹھے تھے (طنزیہ انداز میں) ویسے پنجاب کو دائیں جانب بیٹھنا چاہئے تھا (قہقہہ) بہرحال میں نے دیکھا کہ میاں صاحب کے پاس ایک فائل تھی وہ اسے کھولتے اس میں آدھے صفحے کا کوئی ٹائپ شدہ حصہ تھا اسے وہ پڑھتے پھر آنکھیں بند کر کے اسے دہراتے جیسے وہ حفظ کر رہے ہوں ایسا انہوں نے چار پانچ مرتبہ کیا پھر مرکز کے وزراء اور ماہرین بولے پھر صوبوں کی باری آئی تو پہلے پنجاب کا نمبر تھا میاں صاحب نے پھر وہی فائل کھولی اور رٹا لگا کردہ صفحہ پڑھا۔ بیڑا غرق کیا اور پھر بولے کہ مزید فنانس منسٹر بولیں گے شاہ محمود قریشی جوان آدمی تھے اچھا بولا۔ مجھے پہلی بار وہاں محسوس ہوا کہ یہ وزیر اعلیٰ نہ بول سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں میں نے پھر کسی مسئلہ پر اعتراض کیا کہ ہم یہ نہیں کر سکتے۔ میاں صاحب ایک دم سے بولے کہ میں بلوچستان کے موقف کو سپورٹ کرتا ہوں پھر کسی نے

پوچھا کہ بلوچستان کی ''اپوزیشن'' کیا ہے تو میاں صاحب بولے میں نہیں جانتا بگٹی صاحب سے پوچھیں بس جو یہ کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے اس وقت سے لے کر اب تک انہوں نے محنت کی پہلے تو وہ تین منٹ سے زیادہ تقریر بھی نہیں کر سکتے تھے اب تو وہ آدھا گھنٹہ یا اس سے بھی زیادہ تقریر کر لیتے تھے خیر اچھی بات ہے انہوں نے پریکٹس کی محنت کی مگر بنیادی طور پر بدھو ہی رہے جس کی وجہ سے اب وہ جیل میں ہیں تو یہ ہیں آپ کے اصلی حاکم!!

س: آپ نے جس مثلث یا تکون کا ذکر کیا ہے آپ بھی تو اس کا حصہ بنتے رہے ہیں ایک بار آپ وزیر اعلیٰ بنے ایک بار گورنر بنے آپ بھی تو بالواسطہ طور پر اسی مثلث کے شریک کار رہے ہیں؟

اکبر بگٹی: وزیر اعلیٰ تو میں عوام کے ووٹوں سے بنا اس میں پاور فیکٹر کا کوئی دخل نہیں تھا اس پاور فیکٹر نے مجھے قبول کیا ہوگا کہ ٹھیک ہے دوسری بار ہم زیادہ ووٹوں سے آئے لیکن انہوں نے روکے رکھا ہمیں نہیں آنے دیا اور پھر تاج جمالی کو لے آئے حالانکہ ان کے صرف دو آدمی تھے اور انہیں وزیر اعلیٰ بنوا دیا گیا۔

س: اقتدار میں آنے سے کون روکتا ہے اور کس طرح روکتا ہے؟

اکبر بگٹی: یہ تو میں نہیں جانتا میں نے تو صرف نشاندہی کی ہے۔

س: آپ کئی حکومتوں کا حصہ رہے ہے آپ ری پبلکن پارٹی کے دور میں بھی وزیر رہے ہے؟

اکبر بگٹی: ری پبلکن پارٹی میں تو میں مہینے سے بھی کم رہا اس وقت ہمیں ان طاقتوں کا علم نہیں تھا یہ 1958ء کی بات ہے اس وقت میری عمر 30 سال تھی اس عمر میں اندرونی معاملات اور کام کرنے کے ڈھنگ کو جاننا بڑا مشکل تھا پھر آہستہ آہستہ سیکھا 1958ء میں پارلیمنٹ میں، میں ممبر تھا وہاں میاں افتخار الدین صاحب بھی ممبر تھے بڑی دھواں دار تقریر کرتے حکومت پر ٹوٹ پڑے تھے مثال کے طور پر ایک جوان آدمی جو حکومت کے کام سے ناواقف تھا تقریر پر واہ واہ کرتا پھر ایک وزیر باہر جا رہا تھا تو میاں صاحب بھی پیچھے گئے اور کان میں کچھ کانا پھوسی کرنے لگے میں اب دیکھ رہا ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے میاں صاحب نے دروازہ کھولا وزیر صاحب چلے گئے۔ میاں صاحب واپس سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے پھر کوئی دوسرا وزیر جا رہا تھا میاں صاحب پھر

پیچھے گئے اور کانا پھوسی کرنے لگے میاں صاحب دروازہ خود کھولتے اس زمانے میں وردی والا یعنی سارجنٹ ایٹ آرمز باہر کی طرف کھڑا ہوتا تھا جو دروازہ کھولتا میاں افتخار الدین دروازہ کھولتے پھر واپس آ جاتے اب میری سمجھ میں نہ آئے کہ یہ سب کیا ہے پھر میں نے ایک پرانے پارلیمینٹیرین سے پوچھا کہ میاں صاحب تو تقریریں کرتے ہیں تو وہ بولے کہ تم ابھی نئے ہو یہ ہر طرف چلتا ہے چاپلوسی بھی ہے اور تقریر بھی ہے۔ جہاں سے بھی کام بنے۔ یہ بھی ایک سبق تھا جو ہم نے سیکھا۔

پنجاب کے ایک اور صاحب تھے شاید میاں عبدالباری ان کا نام تھا انہوں نے ہم سے وعدہ کر کے بھی ہمیں ووٹ نہ دیا لوگ ان کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ بہت ایماندار ہیں ایک بار اگر وعدہ کر لیا تو پورا ضرور کرتے ہیں لیکن انہوں نے ہمارے ساتھ وعدہ خلافی کی۔

س: آپ تو 1947ء سے سیاست میں سرگرم ہیں اتنی لمبی سیاسی زندگی تو پاکستان میں نوابزادہ صاحب کے بعد صرف شاید آپ ہی کی ہے؟

اکبر بگٹی: خیر نواب صاحب تو ہم سے 10 بارہ برس بڑے ہیں پچھلی اسمبلی میں ہم ساتھ تھے تو لابی میں صحافی ان کے پاس آئے کشمیر پر بات ہو رہی تھی اس کا حل کیا ہے میں نے کہا کہ اس کا حل ہے مگر آپ لوگ چھاپیں گے نہیں انہوں نے کہا کہ نہیں ہم چھاپیں گے میں نے کہا کہ کشمیر کا ایک حل ہے کہ انڈیا پاکستان جنگ لڑیں تو اگر پاکستان جنگ جیت گیا تو کشمیر پاکستان کا اور اگر انڈیا جیت گیا تو کشمیر انڈیا کا اس کے علاوہ اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے اس پر نواب صاحب بولے کہ You are war monger یعنی آپ تو جنگ کے شعلوں کو ہوا دے رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ نواب صاحب سے تو کشمیر آپ کو نہیں ملے گا بعد میں نواب صاحب کو کشمیر کمیٹی کا چیئر مین بنا دیا گیا میں نے کہا کہ نوابزادہ اور فضل الرحمٰن دونوں کو بے نظیر لوریاں دے رہی ہے اور وہ لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ میں نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ باتوں سے کشمیر جیت لیں تو کیا بات ہے۔ میرے خیال میں اب بھی اس کا حل یہی ہے۔

س: آپ چاہتے ہیں کہ پنجاب کے لوگ مارے جائیں کشمیر کے جہاد میں اورفوج میں زیادہ لوگ پنجاب ہی کے ہیں؟

اکبر بگٹی: میں نے پنجاب نہیں پاکستان اور انڈیا کہا ہے اور اس لڑائی کو دونوں کشمیر بھارتی مقبوضہ کشمیر اور پاکستانی کشمیر تک محدود رکھا جائے پاکستان بھی اپنی فوج بھیج دے اور انڈیا بھی جو جیتے کشمیر اس کا ہو جائے بس اس کا یہی حل ہے۔ فائنل اور فیصلہ کن راؤنڈ اب ہو جانا چاہیے۔

س: آپ کی اس تجویز میں پاکستان کے مستقبل کے خلاف منصوبہ بندی نظر آتی ہے؟

اکبر بگٹی: بھئی میں تو کہتا ہوں کہ جنگ صرف کشمیر تک محدود رہے۔

س: لیکن جنگ سے پاکستان کی سلامتی کو خطرات لاحق ہوں گے؟

اکبر بگٹی: اگر آپ پہلے ہی ڈرے ہوئے ہیں شکست سے ڈرتے ہیں تو پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں؟

س: اب آپ پر الزامات کی بات ہو جائے کہا جاتا ہے کہ جب آپ ری پبلکن پارٹی کے دور میں وزیر بنے تھے آپ نے خان آف قلات کے خلاف ایکشن کی منظوری دی؟

اکبر بگٹی: یہ بات بالکل غلط ہے حقیقت یہ ہے کہ میں چند ماہ وزیر رہا مارشل لا لگنے سے چند روز پہلے کابینہ میں اسکندر مرزا نے بتایا کہ قلات کے حالات خراب ہو گئے اور خان آف قلات نے کراچی آنے سے انکار کر دیا ہے کابینہ کے اجلاس کے بعد میں نے اسکندر مرزا کو کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں خان آف قلات کو لے آتا ہوں اسکندر مرزا نے کہا اب تو بہت دیر ہو چکی ہے میرے خیال میں خان آف قلات کی معزولی بھی مارشل لا لگانے کی وجوہات پیدا کرنے کا بہانہ تھا کیونکہ جب مارشل لا لگایا گیا قلات میں بدامنی کا الزام بھی لگایا گیا حالانکہ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ قلات میں پاکستان کا جھنڈا اتارا تھا اس کا تو اپنا جھنڈا تھا ہی نہیں تو اسے اتارنا کیوں تھا میرا اس معاملے میں کوئی کردار نہ تھا۔

س: آپ پر یہ بھی الزام ہے کہ جب سقوط ڈھاکہ کے وقت پورا پاکستان سکتے کے عالم میں تھا آپ نے کوئٹہ میں جنرل اروڑہ زندہ باد کا جلوس نکلوایا تھا؟

اکبر بگٹی: میں اس وقت کوئٹہ میں اپنے گھر میں تھا جلوس نکلا تو جوانوں نے جنرل اروڑہ زندہ باد کے نعرے بھی لگائے جب جلوس ختم ہونے لگا تو مجھے بلانے آ گئے میں نے جانے سے انکار کر دیا اس واقعے کی حقیقت تو صرف اتنی ہے۔

س: آپ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ آپ میں سیاسی مستقل مزاجی بالکل نہیں ہے آپ چند دن ری پبلکن پارٹی میں رہے پھر اسے چھوڑ دیا پھر نیپ کے حمایتی بنے رہے پھر اسے چھوڑ دیا بلکہ ان کی حکومت ہی ختم کروا دی پھر بھٹو کے ساتھ ملے پھر ان کے خلاف ہو گئے تحریک استقلال میں گئے پھر اسے چھوڑ دیا غرضیکہ کسی بھی پارٹی میں آپ کا دل نہ لگا؟

اکبر بگٹی: مجھ پر ری پبلکن پارٹی چھوڑنے کا الزام کوئی نہیں لگا سکتا کیونکہ میں نے اس پارٹی کو نہیں چھوڑا بلکہ پارٹی نے ہمیں چھوڑ دیا کیونکہ پارٹی خود ہی قتل یا ختم ہو چکی تھی کیونکہ اس زمانے میں مارشل لاء نے تمام پارٹیاں ختم کر دیں تھیں اس کے بعد باقی پارٹیاں تو دوبارہ نہ ابھر سکیں اور میں آزاد ہو گیا۔

اس کے بعد میں تحریک استقلال میں شامل ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں مجھے احساس ہو گیا کہ میں نے یہ غلطی کی ہے پشاور کے اجلاس میں کچھ معاملات پر ہمارا اتفاق نہ ہو سکا واپس آ کر میں نے اصغر خان کو استعفیٰ بھیجا اس میں میں نے ارسطو کا قول لکھا کہ آپ بچے کو اندھیرے سے ڈرنے پر معاف کر سکتے ہیں لیکن اگر بڑا (بالغ) بھی روشنی سے ڈرے تو آپ کیا کریں گے۔ پتا نہیں ایئر مارشل صاحب اس کو سمجھے بھی کہ نہیں۔

س: آپ کے خیال میں وہ سیاسی پارٹیاں اس قابل نہیں تھیں کہ آپ ان میں رہ سکتے؟

اکبر بگٹی: میں ان سیاسی پارٹیوں میں نہیں تھا آپ نے کہا میں نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) میں تھا ایسا نہیں تھا میں کبھی بھی نیپ کا ممبر نہیں بنا۔

س: لیکن آپ نے تو 1970ء کے انتخابات میں نیپ کو سپورٹ تو کیا؟

اکبر بگٹی: سپورٹ تو آپ کسی کو بھی کر سکتے ہیں۔

س: آپ پر یہ بھی الزام ہے آپ نے بھٹو صاحب کے ساتھ مل کر قوم پرستوں کی حکومت گرائی چیف منسٹر ہاؤس کا کلپر بگٹیوں کے ذریعے محاصرہ کروایا اور صوبہ بلوچستان میں

مرکز کو مداخلت کرنے کا موقع فراہم کیا۔ سردار عطا اللہ مینگل نے بھی اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس وقت آپ بھٹو صاحب کے ساتھ سازش میں مکمل طور شریک تھے؟

اکبر بگٹی: مینگل صاحب نے آپ کو یہ نہیں بتایا میں تو اس وقت لندن میں تھا یہ تو غلط اطلاع آپ کو دی گئی ہے۔ تفصیل سے بتاؤں میں نیپ کا ہمدرد تھا کیونکہ میرے ساتھی نیپ میں تھے تو سارے نام نہاد بلوچ قوم پرست نیپ کے ساتھ تھے۔

س: آپ انہیں نام نہاد قوم پرست کیوں کہہ رہے ہیں؟

اکبر بگٹی: میں اپنے آپ کو بھی نام نہاد قوم پرست کہتا ہوں۔ لوگ مجھے بھی قوم پرست کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ کس جانور کا نام ہے آج کل تو قوم پرست کہلوانا ایک گالی بن گیا ہے اس وقت ہمارا ایک مشترک مقصد تھا کہ بلوچستان کے کچھ حقوق مل سکیں ہم اپنے پسماندہ لوگوں کے لیے کچھ کر سکیں ون یونٹ کا زمانہ تھا ہم نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہماری ایک بہت بڑی کامیابی یہ ہے کہ ہم سندھ اور سرحد نے مل کر ون یونٹ کو تڑوایا ہم نے صوبے آزاد کرائے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جنرل یحیٰی خان کا یہ ایک بڑا کامیاب قدم تھا جو اس نے اٹھایا کیونکہ اگر وہ یہ نہ کرتا تو جو بنگال میں بعد میں ہوا وہ پہلے یہاں پر ہوتا ایک شخص ایک ووٹ کی بنیاد پر انہوں نے الیکشن کروایا پھر ہمارے بلوچستان کے کچھ علاقوں اور قبائل ایسے ہیں جہاں پر ایک شخص ایک ووٹ کا طریقہ نہیں تھا میری رائے یہ تھی کہ یہاں پر بھی یہ ون مین ون ووٹ کا طریقہ رائج ہو تو جنرل یحیٰی خان نے ہمیں دعوت دے کر بلایا کہ آئیں اور بتائیں اپنی تجاویز دیں۔ خیر بخش مری، مجھے اور دوسرے لوگوں کو بلایا گیا یحیٰی خان نے کہا کہ لوگ تو اس خیال سے بھاگتے ہیں میں نے کہا کہ یہ خیال میرا ہے اور میرے خیال کے مطابق سب لوگوں کو ووٹ کا حق ہونا چاہئے ہمارے ساتھی نہ تو اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں اور نہ ہی اختلاف کرتے تھے لیکن میں نے اصرار کیا کہ یہ حق سب جگہوں اور سب لوگوں پر نافذ ہونا چاہئے یحیٰی خان نے کہا کہ سردار لوگ تو اس طرح کی بات نہیں کرتے اور انہوں نے اسی وقت نوٹیفکیشن جاری کر دیا اب جب الیکشن آیا تو میں اپنی سزا کی وجہ سے الیکشن لڑنے کے لئے نا اہل تھا یحیٰی خان نے حکم جاری کیا کہ نا اہل

قرار پانے والے لوگ انہیں اپیل کریں پاکستان میں صرف مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے درخواست تک نہیں بھیجی سب نے درخواست بھیجی اور سب اہل قرار پائے میں نے سوچا کہ اگر میرے ساتھی مجھے اہل سمجھیں گے تو میں الیکشن لڑوں گا اگر وہ مجھے اہل نہیں سمجھتے اور میں اپنے آپ کو اہل سمجھوں تو دوسرے دل میں کہیں گے کہ یہ گدھا ہے۔

اگر میرے ساتھیوں کو احساس نہیں ہے تو پھر میں اپلائی نہیں کروں گا اور نہ ہی الیکشن لڑوں گا اگر میرے ساتھیوں نے یہ ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ جا کر جنرل یحیٰی خان سے ملیں یا بات کریں تو ٹھیک ہے ورنہ ہم نے سوچ لیا تھا کہ اچھی بات ہے ہم بھی الیکشن نہیں لڑیں گے اب نیتوں کا حال تو اللہ جانتا ہے۔

س: تو پھر آپ نے 1970ء کا الیکشن نہیں لڑا؟

اکبر بگٹی: بالکل نہیں لڑا میں اپنے ساتھیوں کی دوستی کی بات کر رہا تھا کہ پھر انہوں نے ٹکٹیں تقسیم کیں ہم سب نے پہلے ایک جگہ بیٹھ کر یہ طے کیا کہ کون کہاں سے لڑے گا اور پھر پارلیمانی بورڈ کو نام بھیج دیئے تاکہ وہ ان ناموں کا اعلان کر دے میں نیپ کارکن نہیں تھا لیکن میں ہر میٹنگ میں شریک ہوتا تھا کیونکہ میرا خیال یہ تھا کہ سب میرے ساتھی ہیں الیکشن گزر گیا پھر خواتین کی مخصوص نشستوں کا انتخاب ہوا تو میں نے دیکھا کہ لوگوں کے تیور اور نگاہیں بدلنے لگیں۔

س: عوامی لیگ کے شیخ مجیب الرحمٰن کے دورہ بلوچستان کا قصہ کیا تھا؟

اکبر بگٹی: شیخ مجیب میرے دوست تھے وہ اور مولانا بھاشانی دونوں بلوچستان آئے شیخ مجیب الرحمٰن نے مجھے کہا کہ یہاں پر میری پارٹی بناؤ میں نے ان کی پارٹی کا صدر، جنرل سیکرٹری غرضیکہ پوری تنظیم بنوا دی بندے ہم نے دیئے فنڈز وغیرہ انہوں نے خود دیئے ان کی پارٹی نے الیکشن بھی لڑا اور ایک امیدوار نے تو بلوچستان میں خاصے ووٹ بھی لئے شیخ صاحب سے ہماری کافی دوستی تھی وہ بھی صوبائی حقوق کی بات کرتے تھے اور ہم بھی کرتے تھے پھر مولانا بھاشانی تو سرخ مُلّا تھے ان کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات تھے مجھے یاد ہے کہ ہم نے کوئٹہ میں مولانا بھاشانی کے اعزاز میں لنچ

دیا مولانا بھاشانی کے ایک سائیڈ پر میں اور دوسری سائیڈ پر نواب خیر بخش مری بیٹھے تھے روایت کے مطابق ہم نے دوسری پارٹیوں کے لوگ بشمول نبی بخش زہری بھی بلائے ہوئے تھے تقریب کے آغاز پر ہی نبی بخش زہری نے آواز لگائی کہ مولانا آپ تو نقلی سوشلسٹ ہیں آپ کے دونوں طرف نواب بیٹھے ہوئے ہیں تو مولانا بھاشانی نے جواباً کہا کہ یہ تو عوامی "نواب" ہیں تم کارخانہ دار ہو ہم تمہارا کارخانہ چھینیں گے۔

س: ذکر تو ہو رہا تھا نیپ سے آپ کے تعلقات بگڑنے کا؟

اکبر بگٹی: انتخابات کا دور مکمل ہوا تو نیپ کی ایک اور میٹنگ بلائی گئی ماضی کی طرح مجھے بھی فون پر اطلاع دی گئی میں میٹنگ میں شریک تھا میں نے محسوس کیا کہ آج مزاج کچھ بدلا بدلا ہے ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا کہ ہماری میٹنگ میں ایک اجنبی بیٹھا ہے میں سمجھا کسی اور کی بات کر رہے ہیں پھر ایک اور شخص اٹھا اس نے بھی کہا کہ اجلاس تب شروع ہوگا جب اجنبی شخص میٹنگ سے اٹھیں گے تب مجھے سمجھ آئی کہ یہ میرے بارے میں کہہ رہے ہیں میں میٹنگ سے اٹھ کر چلا گیا میرے کسی ساتھی نے مجھے روکا تک نہیں اور نہ کہا کہ یہ ہمارا ساتھی ہے۔

س: تعلقات کا مکمل خاتمہ کس وقت ہوا؟

اکبر بگٹی: شیخ مجیب نے اپنی دوستی کی وجہ سے مجھے ڈھاکہ مدعو کیا میں نے نیپ کو کہا کہ پارٹی کے کسی نمائندے کو بھی بھیجو خیر ہم دو لوگ وہاں گئے اجلاس میں شرکت کی جب ہم واپس کراچی آئے تو ہمارے آنے سے پہلے ہی بزنجو صاحب نے یہ بیان دیدیا تھا کہ اکبر بگٹی ہماری پارٹی کے نمائندے نہیں ہیں میں نے اس کے باوجود کوئی جواب نہ دیا۔

س: بھٹو صاحب سے اتحاد کیسے بنا؟

اکبر بگٹی: یہ بہت بعد کی بات ہے بھٹو صاحب نے تو مجھے بلا کر کہا کہ آپ گورنر بن جائیں میں نے کہا کہ نہیں یہ نیپ والوں کا حق ہے بھٹو نے کہا کہ وزیر بن جاؤ میں نے کہا کہ میں تو منتخب ہی نہیں ہوا بھٹو نے کہا کہ پھر سفیر بن جاؤ میں نے کہا کہ مجھے جلاوطن کرنا چاہتے ہو بھٹو نے کہا کہ تم چاہتے کیا ہو میں نے کہا کچھ بھی نہیں پھر بھٹو نے مجھے اپنے

ساتھ روس جانے کی دعوت دی وہ میں نے اس شرط پر قبول کر لی کہ میں بھٹو کی واپسی کے بعد کچھ عرصہ روس اور پھر یورپ چلا جاؤں گا چنانچہ ایسا ہی ہوا اصل میں بھٹو کے ساتھ ہمارے باپ دادا کے زمانے کے تعلقات تھے۔

س: بلوچستان سیکرٹریٹ کا گھیراؤ بھی تو بگٹی قبیلے کے لوگوں نے ہی کیا تھا؟

اکبر بگٹی: میں تقریباً دس ماہ یورپ میں رہا اس دوران مجھے علم ہوا کہ میرے بھائی احمد نواز بگٹی کو بلوچستان کی صوبائی کابینہ میں شامل کیا جا رہا ہے بعد ازاں انہیں وزیر بنا دیا گیا میرے قبیلے کے لوگ مشتعل ہوگئے کہ احمد نواز کو تو میری جگہ پر کرنے کے لئے منتخب کیا گیا تھا مگر وہ قبیلے کے مفادات کے خلاف کام کر رہے تھے چنانچہ بگٹی قبیلے کا ایک وفد احمد نواز کے پاس گیا اور انہیں کہا کہ آپ وزارت چھوڑ دو وگرنہ ہم آپ کو واپس اٹھا کر ڈیرہ بگٹی لے جائیں گے احمد نواز نے چند لوگوں کو اندر بلایا اور انہیں کہا کہ میں رات کو بگٹی ہاؤس آؤں گا جب لوگ بازار میں آگئے اور بکھر گئے تو انہوں نے بگٹی قبیلے کے سو افراد کو گرفتار کروا دیا اس دھوکے سے صرف پچیس افراد بچے جو بگٹی ہاؤس میں میرے بیٹے سلیم کے پاس آگئے فرنٹیئر کور نے گھر کا محاصرہ کر لیا اور اعلان کرنا شروع کر دیا کہ لوگ گرفتاری دیں بگٹی ہاؤس کی پانی بجلی اور ٹیلی فون کاٹ دیا گیا سلیم نے مجھے ہمسائے کے گھر سے لندن فون کیا اور صورتحال بتائی میں نے کہا کہ آپ نے کسی صورت میں سرنڈر نہیں کرنا اور کوئی ایسی صورتحال ہو تو سب سے پہلے گولی آپ کھائیں میں نے اسی وقت بھٹو کو فون کیا اور کہا کہ آپ میرے دوست ہیں یا دشمن بھٹو نے کہا دوست تو پھر میں نے پوچھا آپ نے وفاق کی نمائندہ فرنٹیئر کور سے میرے گھر کا محاصرہ کیوں کروا رکھا ہے بھٹو نے لاعلمی کا اظہار کیا اور اگلے ہی دن محاصرہ اٹھ گیا میں بھی اسی روز لندن سے آگیا میرا بلوچ طالب علموں اور قوم پرستوں نے استقبال کیا اس کے بعد میں نے ہر شہر میں جلسے اور جلوس منظم کئے اور لوگوں کو بتایا کہ ہم جن کو اقتدار میں لائے تھے ان کا ہمارے ساتھ کیسا سلوک ہے جب سارے بلوچستان میں جلوس نکل چکے تو ہم نے لاہور موچی دروازے میں بھی جلسہ کیا جس کے بعد بھٹو صاحب نے مجھے مدعو کیا۔

س: بگٹی صاحب، آپ نے نیپ والوں پر عراقی اسلحہ کیس بھی تو ڈلوادیا تھا؟

اکبر بگٹی: میں کراچی میں تھا جب میں نے سنا کہ عراقی سفارتخانے سے اسلحہ برآمد ہوا ہے عراقی سفیر نے کہا کہ اسلحہ تو برآمد ہوا ہے لیکن یہ بلوچستان میں استعمال کے لئے نہیں تھا؟

س: آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ اسلحہ بلوچستان کی آزادی کی تحریک کے لئے تھا؟

اکبر بگٹی: مجھے کیا علم میں نے تو نہ سفارتخانہ دیکھا نہ مجھے علم ہے لیکن اسلحہ کی برآمدگی کو سفیر نے بھی تسلیم کیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ ایک عراقی طالب علم کو اسی جرم میں عراق میں سزا بھی دی گئی ان کا اس اسلحہ سے تعلق ضرور تھا۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آزاد بلوچستان کی تحریک کو روس کی حمایت حاصل تھی؟

اکبر بگٹی: میرا روس کے ساتھ ذاتی تعلق تو صرف اتنا ہے کہ میں نے وہاں پر جمشید مارکر جو ہمارے سفیر تھے وہ مجھے اپنے گھر لے آئے اور میں بھٹو کے واپس آنے کے بعد انہی کے گھر رہا۔

س: کچھ لوگ تو روسی ٹینکوں پر بیٹھ کر پاکستان فتح کرنے کی بات کرتے تھے؟

اکبر بگٹی: میں نے تو نہ روس سے باہر روسی ٹینک دیکھا نہ روسی ٹینک پر کبھی چڑھا اور سیر کی کچھ اور کا پروگرام ہوگا تو ہوگا؟ میں بعد میں روس گیا نہ میرے بچے روس میں پڑھے کسی اور کے پڑھے ہوں تو مجھے علم نہیں۔

س: بھٹو نے آپ کو بلوچستان میں اقتدار کیسے سونپا؟

اکبر بگٹی: بھٹو نے مجھے اسلام آباد بلایا اور کہا کہ میں بلوچستان کی حکومت کو ڈسمس کر رہا ہوں بزنجو کو میں نے ڈسمس کر دیا ہے بھٹو نے کہا آپ مجھے بتاؤ کیا مجھ پر کوئی الزام لگا سکتا ہے کہ میں نے بگٹی اور نیپ کو لڑایا بھٹو نے کہا کہ میں تو اس معاملہ میں آنا نہیں چاہتا تھا لیکن اب بلوچستان کا جو حال ہو گیا ہے اس کے بعد مداخلت ضروری ہو گئی ہے میں نے اسی وجہ سے لندن سے واپسی کے بعد تم سے رابطہ بھی نہیں کیا پھر بھٹو نے کہا کہ گورنر مقرر کرنا وفاق کا استحقاق ہے میں تمہیں گورنر مقرر کرتا ہوں چنانچہ میں نے یہ پیشکش قبول کر لی چند دن بعد شیر باز خان مزاری میرے پاس آیا اور کہا اگر تم

گورنری چھوڑ دو تو تمہیں نیپ کے دوست معاف کر دیں گے میں ہنسا اور میں نے کہا کہ اب یہ تو وقت بتائے گا کہ کون کس کو معاف کرتا ہے پھر میں نے کہا کہ سردار صاحب آپ آئے ہیں تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے سوچ سمجھ کر اور اپنی خوشی سے گورنری قبول کی ہے اور میں اسے اس وقت چھوڑ دوں گا جب میرا دل چاہے گا میں نے کہا کہ اگر نیپ والوں کو احساس ہے تو وہ آئیں میں عطاء اللہ کو حکومت بنانے کی پیشکش کروں گا شیر باز نے کہا کہ بھٹو تمہیں ڈسمس کر دے گا میں نے کہا کہ تمہیں اس بات کی کیا فکر؟ سردار شیر باز نے کہا کہ ہمیں اس بات پر یقین نہیں آتا میں نے کہا کہ پھر اس کا تو کوئی علاج نہیں ہے میں نے کہا بھٹو سے مت ڈرو بھٹو کچھ نہیں کرے گا۔

س: پھر بھٹو صاحب سے بھی اختلافات ہو گئے؟

اکبر بگٹی: بھٹو سے میرا Love & Hate یعنی محبت اور نفرت کا ملا جلا رشتہ تھا بھٹو سے میرا جینٹل مین معاہدہ تھا کہ بلوچستان میں جو میں مناسب سمجھوں گا وہ ہوگا لیکن بھٹو صاحب فوج کو اور چیف سیکرٹری کو براہ راست ہدایت دینے لگے میں نے کہا کہ دیکھو ذمہ داری میری ہے اگر کل کوئی خرابی ہوتی ہے تو میں ذمہ دار ہوں گا بھٹو نے مجھ سے اتفاق کیا مگر چند روز بعد وہی سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا میں نے بھٹو سے کہا کہ میں مستعفی ہوتا ہوں تو بھٹو نے مجھے دوستی کا واسطہ دیا اور ہمارے درمیان طے ہو گیا کہ میں 31 دسمبر 1973ء تک گورنر رہوں گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

س: آپ نے اپنی گورنری کے دور میں 1973ء کے آئین میں دی گئی صوبائی خودمختاری سے اتفاق کیا تھا؟

اکبر بگٹی: میں نے تو اس آئین پر تنقید کی تھی جس روز آئین پاس ہوا میں کوئٹہ میں تھا میں نے اس روز صحافیوں کو کہا کہ یہ اچھی شروعات ہے لیکن اس میں یہ خامیاں ہیں اگلے روز مجھے بھٹو نے کہا کہ یہ آپ نے کیا کہہ دیا میں نے بھٹو کو کہا کہ ایسی کیا بات ہوئی بھٹو نے کہا تم میرے گورنر ہو میں نے کہا کہ میں نے اپنی روح نہیں بیچی میرے تاثرات کا اظہار بطور گورنر نہیں بلکہ بطور اکبر بگٹی ہے۔

س: کیا آپ بھی بلوچستان اور افغانستان میں کوئی تعلق دیکھتے ہیں؟ یعنی ایک نئی اور متحدہ مملکت کا؟

اکبر بگٹی: جب میں افغانستان میں تھا تو مجھے یہ سوال کیا گیا تھا کہ گریٹر افغانستان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے تو میں نے کہا کہ بلوچوں کا افغانستان سے کوئی تعلق نہیں بنتا میں گزشتہ کئی ہزار سال سے بلوچ ہوں پھر چند سو سال سے مسلمان ہوں بلوچ جنگ قادسیہ کے بعد مسلمان ہوئے اور پھر صرف گزشتہ 53 سال سے میں پاکستانی ہوں میں نے افغانستان میں واضح انداز میں کہا کہ میں اپنی پیٹھ کے سوار کو بدلنے پر تیار نہیں یعنی پنجابی کی بجائے افغان کو بٹھانے پر تیار نہیں میں اب پنجابی کے وزن کا عادی ہوں ہوسکتا ہے نیا سوار میری کمر توڑ دے۔

س: کیا آپ آزاد بلوچستان کے حامی ہیں؟

اکبر بگٹی: اگر آپ ہمیں یہ جدوجہد کروانا چاہتے ہیں تو ہم تیار ہیں۔

س: ہماری تو خواہش ہے کہ آپ سب پاکستان کے ساتھ مل کر چلیں؟

اکبر بگٹی: اگر ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں تو ہمیں کہیں دیکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی آزادی صرف پاگل آدمی اور جانور نہیں چاہتے ورنہ ہر کوئی آزادی چاہتا ہے۔

س: آپ آئین میں تبدیلیوں کے حامی ہیں؟

اکبر بگٹی: پچھلے سال ہماری پارٹی نے سینٹ میں یہ بل پیش کیا تھا کہ کس طرح سے کم سے کم آئینی تبدیلیاں کر کے بہتری لائی جاسکتی ہے۔

س: موجودہ فوجی حکومت کیسی جارہی ہے؟

اکبر بگٹی: (It is slumbling along) یہ لڑکھڑا کر یا ڈانوں ڈول ہو کر چل رہی ہے۔

س: طالبان کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟

اکبر بگٹی: میں طالبان سے ملا نہیں یہ جنرل نصیر اللہ بابر کی کھڑی کی ہوئی مصیبت ہے وہ خود بھی اس کا کریڈٹ لیتے ہیں۔

س: امریکہ سے پاکستان کے کیسے تعلقات ہونے چاہئیں؟

اکبر بگٹی: سب سے بہتر ہونے چاہئیں سب سے پہلے تو ہمیں ہمسایہ ملک بھارت سے تعلقات اچھے کرنے چاہئیں جس کے ہم ایک جزو رہے ہیں۔

س: تو کیا کشمیر کو بھول جائیں؟

اکبر بگٹی: اس کے لئے تو میں نے تجویز کیا ہے کہ محدود جنگ کر لی جائے۔

س: نواز شریف اور بینظیر کا تقابل کریں؟

اکبر بگٹی: نواز شریف تو بدھو ہیں وہ پتا نہیں کیسے اس مقام پر پہنچ گئے اور پھر وہیں واپس چلے گئے۔ بینظیر بھٹو کی بیٹی ہے جو سب سے بڑا سیاستدان تھا بینظیر نے تو بھائیوں کے دل تک نکال لئے ہیں۔

س: آپ بینظیر کے اس قدر خلاف کیوں ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آپ کے قبائلی معاملات میں دخل دیتی رہی ہیں؟

اکبر بگٹی: وہ ہر جگہ دخل دیتی ہیں۔

س: آپ نے کہا کہ قوم پرست گالی بن چکے ہیں وہ کیسے؟

اکبر بگٹی: اکثر قوم پرست کرپٹ ہو چکے ہیں اس لئے گالی بن گئے ہیں۔

س: تو آپ پونم کے مطالبات کو سپورٹ نہیں کرتے؟

اکبر بگٹی: کون پونم دیوی، ہمیں تو یہ علم نہیں کہ پونم ہے کیا اور اس کے کیا مقاصد ہیں۔

س: ہر سال کسی نہ کسی قبائل لڑائی کی خبر آتی ہے آپ لوگ اپنے قبیلے کو ان جنگوں سے منع کیوں نہیں کرتے؟

اکبر بگٹی: یہ تو ہوتا رہتا ہے آپ لوگ کارگل میں جنگ کو کیوں نہیں رکواتے آپ ہندوستان سے کیوں جھگڑتے ہو سیاچن پر کیوں لڑتے ہیں۔

س: آپ کے قبیلے میں ''ننگ'' کا کیا رواج ہے؟

اکبر بگٹی: ننگ کا مطلب ہے غیرت ہم کسی کو نہیں کہہ سکتے کہ وہ بے غیرت بن جائے۔

س: کیا آئین کو سبوتاژ کرنے والوں کو علامتی سزا ملنا چاہئے؟

اکبر بگٹی: کسی کو سزا ملے گی؟

س: کیا آپ ملک کے مستقبل سے اس قدر مایوس ہیں کہ کوئی تجویز بھی نہیں دیتے؟

اکبر بگٹی: بھئی کیا کہیں کچھ سمجھ نہیں آتا آئین کے خلاف اقدامات کرنے والوں کو سزا کون دے گا۔

س: بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ آپ کی رائے میں کیسا تھا؟

اکبر بگٹی: بھٹو کی پھانسی غلط تھی میرے خیال میں اگر نواز شریف کا تعلق پنجاب سے نہ ہوتا تو انہیں بھی پھانسی ہی کی سزا سنائی جاتی۔

س: کیا آپ سوشلسٹ ہیں؟

اکبر بگٹی: میں عوام دوست ضرور ہوں لیکن ان معنوں میں سوشلسٹ نہیں ہوں جن معنوں میں لوگ سمجھتے ہیں۔

س: 12 اکتوبر کو جو اقدام اٹھایا گیا اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟

اکبر بگٹی: فوج کا آنا ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔

س: فوج کا سیاست میں کیا کردار ہونا چاہیے؟

اکبر بگٹی: فوج کا سیاست میں کوئی کردار نہیں ہونا چاہیۓ اگر فوج کا سیاست میں رول ہو تو پھر وردی والے جرنیلوں کو ہی وزیر اعظم بنا دیں سیاستدانوں کی کیا ضرورت ہے۔

س: آٹھویں ترمیم کے خاتمے اور صدر لغاری کی رخصت کے وقت آپ کافی متحرک تھے؟

اکبر بگٹی: میں ان دنوں اسلام آباد گیا تھا نواز شریف فاروق لغاری کا مواخذہ کرنا چاہتے تھے میرے پاس ابھی تک وہ ڈرافٹ پڑا ہوا ہے جس کے ذریعے مواخذہ ہونا تھا میں نے کہا کہ ایسا کام نہیں ہونا چاہیۓ ملک کی بدنامی ہوگی نواز شریف اس پر مجھ سے ناراض بھی ہو گئے صدر لغاری کو امپیچ ہونے سے میں نے بچایا۔

س: قبائلی نظام کو ہم پنجاب کے لوگوں کیلئے سمجھنا مشکل ہے آپ آج کی جدید اور بدلتی ہوئی دنیا میں قبائلی نظام کا کس طرح سے دفاع کریں گے؟

اکبر بگٹی: ہمیں اس نظام کا دفاع کرنے کی ضرورت نہیں قبائلی نظام تو آپ کے پنجاب میں بھی ہے۔

س: کس طرح؟ پنجاب کے شہروں میں تو نہیں ہے؟

اکبر بگٹی: پنجاب میں جب الیکشن ہوتا ہے تو آرائیں، کشمیری، راجپوت ذاتوں کی بنا پر

لوگ جیتتے ہیں۔ یہ تو قبائلی نظام ہی برطانیہ جو ہم سے سات آٹھ سو سال پہلے ہاؤس آف کامنز جائیں جسے مدر آف پارلیمینٹ کہا جاتا ہے وہاں بھی قبائلی نظام ہے اسی طرح سکاٹ لینڈ میں بھی ابھی تک قبائلی نظام موجود ہے وہاں پر میگوائر میکریگر ہے میکنین ہے یہ سب مختلف قبائل ہیں اب تک ان کے پہناوے اور لباس بھی مختلف ہیں اسی طرح آئرلینڈ والے اپنی آزادی کے لیے کتنے سال لڑتے رہے۔ جب کوئی انگریز ویلز میں جاتا ہے تو وہ ویلش میں بات کرتے ہیں۔ گیلیک ایک بولی ہے جو سکاٹ لینڈ میں بولی جاتی ہے وہ اس لیے کرتے ہیں کہ انگریز اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرے۔ ملکہ الزبتھ کی جب 1953ء میں تاج پوشی ہوئی تو مجھے وہاں مدعو کیا گیا وہاں جن اسٹورز کے مالکان سکاٹش تھے انہوں نے لکھا ہوا تھا ملکہ الزبتھ اول تاجپوشی مبارک جبکہ انگریزوں نے لکھا ہوا تھا ملکہ الزبتھ دوم کو تاجپوشی مبارک میں نے تحقیق کی تو پتہ چلا ملکہ الزبتھ کے زمانے میں اسکاٹ لینڈ الگ ملک تھا اس لیے موجودہ ملکہ الزبتھ اسکاٹ لینڈ والوں کے لئے ملکہ الزبتھ اول ہے۔

جب کوئی بھی چیز پر وہاں یورپ میں تنقید کرتا ہے یورپ جو اتنا ایڈوانس ہو چلا ہے تو قبائلیت تو وہاں پر بھی ہے جس طرح برطانیہ میں انگیز حاکم ہے پنجابی یہاں حاکم ہے گویا ہمارا انگریز تو پنجابی ہوا نا (قہقہے) قبائلی نظام تو ساری دنیا میں موجود ہے برطانیہ میں ابھی تک ہاؤس آف لارڈز موجود ہے جہاں صرف لارڈز ہی آتے ہیں۔

س: پنجاب میں یہ تاثر ہے کہ بلوچستان میں سرداری نظام کی وجہ سے تعلیم عام نہیں ہو رہی سڑکیں اور ذرائع آمد و رفت میں ترقی نہیں ہو پا رہی؟

اکبر بگٹی: سرداری نظام کوئی سسٹم نہیں ہے قبائلی نظام سے سرداری نظام تو اس کا ایک جزو ہے۔ جیسے آپ کے ہاں چودھری یا ملک ہیں تو یہ کوئی سسٹم تو نہیں ہے وہ برادری کا جزو ہیں آپ نے خود دیکھا کہ یہاں پر کالج ہے اور یہ کوئی آج کل میں نہیں 20 سال پہلے سے بنا ہوا ہے ہائی سکول ہیں یہاں پر بکھری ہوئی آبادی ہے کہیں پر 4 یا پانچ لڑکے ہیں اور استاد 6 ہیں لوگ جہاں پر پانی، چارہ ہو وہاں پر چلے جاتے ہیں جس سڑک سے آپ لوگ آئے ہیں یہ میں نے جب میں وزیر اعلیٰ تھا بنوائی تھی ہم نے

حکومت کے تعاون کے بغیر بھی کچھ کچی سڑکیں بنائی ہیں۔ کیمونی کیشن کے بارے میں آپ کا آئیڈیا اور ہے مجھے یاد ہے کہ بھٹو دور میں ضیاء الحق نے کہا کہ بلوچستان میں تو سکول نہیں ہے سڑکیں نہیں ہیں مسجد نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ یوں کیوں نہیں کہتے کہ چھاؤنی نہیں ہے اصل چیز تو چھاؤنی ہے تا کہ ہم پر گرفت رکھ سکیں کیمونی کیشن کی آڑ میں چھاؤنیاں بنائی جاتی ہیں۔

س: اب تو یہاں پر چھاؤنی بھی ہے؟

اکبر بگٹی: بالکل ہے وہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہر قدم پر چھاؤنی ہونی چاہئے آپ لوگ ترقی کریں ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ ہم سے پوچھیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں یہاں پر پانی نہیں ہے وہ مہیا کریں پینے کا پانی پہلی ترجیح ہے کاشتکاری کیلئے پانی نہیں ہے لیکن آپ ہم پر اپنی ترجیحات ٹھونستے ہیں۔

س: آپ اپنے قبیلے کے سردار ہیں آپ کے اردگرد بے انتہا غربت ہے آپ کو کبھی کبھی یہ خیال تو ضرور آتا ہوگا کہ اردگرد کی غربت کو کیسے ختم کروں؟

اکبر بگٹی: یہ خیال تو آتا ہے لیکن غربت تو یورپ میں بھی ہے۔ اٹلی میں، اسپین میں بچے ننگے پاؤں سردیوں میں بھیک مانگ رہے تھے غربت ایک عالمی مسئلہ ہے۔

س: سنا ہے آپ ثابت سبز مرچ بہت کھاتے ہیں۔

اکبر بگٹی: جی ہاں، یہ تو وٹامن سی ہے۔

س: کہتے ہیں مرچ کھانے والا بڑا ترش مزاج ہو جاتا ہے۔

اکبر بگٹی: ہو سکتا ہے۔ پی این اے کی تحریک کے دوران جیل میں مچھلی آتی تھی تو کوئی کھانے کو تیار نہ تھا، میں نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے تو علم ہوا کہ پنجاب میں جن مہینوں کے ناموں میں ''ر'' نہیں ہوتی، مچھلی نہیں کھائی جاتی کیونکہ جماعت اسلامی کے ایک ساتھی کے بقول ان مہینوں میں مچھلی کھانے سے خارش ہو جاتی ہے، میں اس بات پر بہت ہنسا کہ کراچی، بلوچستان میں اور سارے یورپ میں مچھلی سارا سال کھائی جاتی ہے مگر پنجاب میں اس سے خارش ہو جاتی ہے، شاید مرچ سے مزاج تلخ ہونے کی بات بھی ایسی ہی ہے۔

س: محبت ایک فطری جذبہ ہے، کیا آپ کو بھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟

اکبر بگٹی: (قہقہہ لگاتے ہوئے) یہ ذاتی معاملہ ہے یہ اشاعت کیلئے نہیں ہے، ویسے محبت دنیا کا سب سے نازک ترین، مزیدار اور تکلیف دہ جذبہ ہے۔

س: شادی ارینجڈ ہونی چاہئے یا مرضی کے مطابق۔

اکبر بگٹی: کلچر کا فرق ہے، ہمارے ہاں ارینجڈ ہوتی تھی، اب مرضی بھی شامل ہو رہی ہے۔

س: لیکن آپ کے بارے میں تو مشہور ہے کہ آپ بہت سخت مزاج ہیں، خاندان کا کوئی فرد آپ کی مرضی کے خلاف نہیں چل سکتا؟

اکبر بگٹی: یہ صحیح ہے، میرے بیٹے میری مرضی کے خلاف نہیں چلتے۔ بھٹو نے سلیم کو ساتھ ملانے کی بہت کوشش کی، اسے بڑے سبز باغ دکھائے لیکن وہ قابو نہیں آئے۔

س: آپ اپنے بیٹوں سے بے تکلفی سے بات کرتے ہیں؟

اکبر بگٹی: وہ ایک حد تک رہتے ہیں، کوئی مسئلہ ہو تو بات بھی کرتے ہیں لیکن یہ بے تکلفی نہیں کہ مجھے کہیں یار کیا حال ہے؟

س: کیا آپ عورتوں کی تعلیم کے حامی ہیں؟

اکبر بگٹی: بالکل۔

س: آپ کے علاقے میں بچیوں کا کوئی سکول تو نظر نہیں آیا۔

اکبر بگٹی: سڑک کے پچھلی جانب موجود ہے۔

س: کیا آپ نے اپنے سب بچوں کو تعلیم دلوائی ہے؟

اکبر بگٹی: جی ہاں کسی کو کسی حد تک اور کسی کو کسی حد تک، جہاں جتنا ممکن تھا۔

س: جیل میں کتنا عرصہ رہے؟

اکبر بگٹی: کل ملا کر آٹھ سال جیل میں گزرے۔

س: آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ نے کس مقصد کے لئے جیل کاٹی؟

اکبر بگٹی: ضروری نہیں کوئی مقصد بھی ہو، بس ایک خیال ہوتا ہے، جیل تو ایک تربیت گاہ ہے یہ انسان کے کردار کو تعمیر کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

س: حسن کے بارے میں آپ کا کیا نقطہ نظر ہے؟

اکبر بگٹی: ایک بار میں کوئٹہ جیل میں تھا، مجھ سے پہلے وہاں کوئی افغان قیدی بند تھا، وہ قندھار سے کوئی بیج لایا، ایک رات میں نے دیکھا کہ اس قدر خوب صورت پھول کھلا ہوا ہے کہ میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا، پھول کا نام تھا ''گل شب نوری'' اس کی خوشبو بھی بہت اچھی تھی۔

س: سنا ہے آپ میں لچک بالکل نہیں ہے، ایک بار جس سے ناراض ہو گئے بس عمر بھر ناراضگی چلتی ہے؟

اکبر بگٹی: نہیں ایسا نہیں ہے۔ اب ایک تو بنیادی غلطی ہے اور دوسری چھوٹی موٹی غلطی ہے جیسے نوکر پانی گرا دے تو آدمی تھوڑی دیر کے لئے ناراض ہوتا ہے پھر راضی ہو جاتا ہے، ایک آدمی کوئی دھوکا دیتا ہے، ایک بار نہیں دوسری بار۔ ایک انگریزی مقولہ ہے کہ اگر ایک شخص مجھے دھوکا دے تو اس پر لعنت اگر وہی شخص مجھے دوبارہ دھوکا دے تو اس پر پھر لعنت لیکن اگر وہی شخص مجھے تیسری بار دھوکا دے تو پھر مجھ پر لعنت۔

س: کیا آپ علم نجوم اور پتھروں کے اثرات پر یقین رکھتے ہیں؟

اکبر بگٹی: صوفی شاعر کبیر نے کہا ہے۔

دُنیا کیا بانوری پتھر پوجن جائے
گھر کی چکی چھوڑ کر باہر پتھر پوجن جائے

اس کا مطلب یہ ہے کہ باہر پوجنے کی بجائے روٹی دینے والی چیز چکی کی پوجا کیوں نہیں کرتے۔ میں طبعیتاً شک پرست (Sceptic) ہوں۔

س: زندگی میں سب سے تکلیف دہ لمحہ کونسا تھا؟

اکبر بگٹی: سوچوں گا وہ کونسا لمحہ تھا۔

س: سنا ہے آپ نے اپنے بیٹے سلال بگٹی کی موت کا بہت غم کیا ہے۔

اکبر بگٹی: ہر باپ اپنے بیٹے کی موت کا بہت غم کرتا ہے، شاذ و نادر ہی کوئی باپ ایسا محسوس نہ کرتا ہو۔

س: لیکن جس طرح آپ نے محسوس کیا ہے شاید ہی پاکستان میں کسی نے اس طرح محسوس کیا ہو۔

اکبر بگٹی: کوئی دوسرا کس طرح بتا سکتا ہے کہ میں نے کیسا محسوس کیا ہے۔

س: بالکل بتا سکتا ہے، آپ نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا آپ دو تین سال گھر سے نکلے ہی نہیں؟

اکبر بگٹی: میرا وطن ہے، گھر ہے، پہلے لوگ کہتے تھے بیٹھتا نہیں ہے، اب میں بیٹھتا ہوں تو کہتے ہیں کہ ادھر ہی رہتا ہے (قہقہہ) جو بھی کریں لوگ اعتراض کرتے ہیں۔

س: آپ پر اپنے چچا کے قتل کا الزام تھا؟ آپ اس الزام میں جیل بھی گئے، کیا یہ سچا الزام تھا؟

اکبر بگٹی: میں کیا کہہ سکتا ہوں، مجھے موت کی سزا سنائی گئی پھر عمر قید ہوئی پھر مجھے چھوڑ دیا گیا۔ اصل میں سردار باز محمد خان کاکڑ جوگیزئی نے ایوب خان کو پگڑی کا واسطہ دیکر میری رہائی کی درخواست کی اور اس طرح میں رہا ہوا۔

س: زندگی میں کبھی خوف محسوس کیا؟

اکبر بگٹی: خوف تو ہر وقت محسوس ہوتا ہے، انسان تو خوف اور جہالت کا پتلا ہے، انسان کی زندگی خوف اور جہالت کے گرد ہی گھومتی ہے۔

س: کبھی کبھی آپ کا دل چاہتا ہوگا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلا جاؤں۔

اکبر بگٹی: میں اب بھی Relaxed ہوں، میرا پوتا میری جگہ پر فیصلے کرتا ہے، سلیم کراچی میں ہے وہ سانگھڑ کی اسٹیٹ کی دیکھ بھال کرتے ہیں، سلیم کے بعد جمیل ہے جو پی پی ایل میں ہے، اس کے بعد ریحان اور طلال ہیں، سلال سب سے چھوٹا تھا۔

س: سرداری کی آمدن کہاں کہاں سے آتی ہے؟ ذرائع آمدن کیا ہیں؟

اکبر بگٹی: ہماری زمینیں دو طرح کی ہیں، ایک ذاتی ملکیت ہے جو بیٹوں میں تقسیم ہوتی ہے جبکہ ایک کراؤن لینڈ ہوتی ہے جو صرف سردار کو ملتی ہے جو سردار کے عہدے کو چلانے کے لئے ہوتی ہے پھر لنگر ہوتا ہے جس میں روز آنے والے لوگ کھانا کھاتے ہیں۔

س: پاکستان کا کونسا علاقہ پسند ہے۔

اکبر بگٹی: سنتے ہیں کہ شمالی علاقہ بہت خوبصورت ہے لیکن میں کبھی بھی وہاں گیا نہیں!

س: موسیقی سنتے ہیں؟

اکبر بگٹی: موسیقی روح کی غذا ہے لیکن اب میں کافی عرصے سے موسیقی نہیں سنتا۔

س: کبھی مصلحت میں جھوٹ بولتے ہیں؟

اکبر بگٹی: اگر کسی کو جان کا خطرہ ہو اور اس کا دشمن اس کا پتا پوچھے تو پھر شاید میں مصلحت سے کام لے لوں۔

س: انسان کا اس کائنات میں آنے کا کیا مقصد ہے؟

اکبر بگٹی: (قہقہہ لگاتے ہوئے) ہوسکتا ہے یہ بھی ایک حادثہ ہو۔

س: ایک شک پرست (Sceptic) کا یہی جواب ہونا چاہیے۔

اکبر بگٹی: یہی کہہ سکتا ہوں کہ ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔

س: آپ کس بات پر نادم ہوتے ہیں؟

اکبر بگٹی: ہاں کبھی ایسا ہو تو یہ خیال آتا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے ہی یہ کام کر دیا۔

س: آپ شکار کھیلتے ہیں؟

اکبر بگٹی: کھیلتا تھا جب ہم شکار ہو گئے تو شکار سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔

س: آپ کیسے شکار ہوئے؟

اکبر بگٹی: سیاسی شکار، پھر بعد میں شکاری ہوتے رہے۔

س: آپ کا معافی کے بارے میں کیا تصور ہے؟

اکبر بگٹی: اگر کوئی صدق دل سے معافی مانگے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔

س: لیکن جب کلپر قبیلے کی عورتیں معافی کے لئے آئیں تو آپ نے معافی نہیں دی۔

اکبر بگٹی: ہمارا رواج ہے کہ عورتوں کو عاجزی کے اظہار کے لئے بھیجا جاتا ہے ہم جواباً ان کے سر پر چادر دیتے ہیں جب کہ پنجاب میں عورتوں کو سڑکوں اور گلیوں میں گھسیٹا جاتا ہے، ہمارا تو رواج ہے کہ کبھی بھی عورتوں اور بچوں کو نہیں مارا جاتا کوئی بچہ جب تک کپڑے نہیں پہنتا اور بندوق اٹھانے کے قابل نہیں ہوتا اس کو نہیں مارا جاتا۔ بلوچوں کی یہ بھی روایت ہے کہ اگر دشمن کے گھر جائیں اور وہاں مرد نہ ہو تو عورتیں چائے پانی پلاتی ہیں، آپ دشمن کو پیغام دیتے ہیں کہ بزدل کیوں بھاگ گئے، میں پھر آؤں گا اور یہ کہہ کر عورتوں کو بہن کہہ کر ان کے سروں پر ہاتھ پھیر کر واپس آ جاؤں گا۔ قاتل

کے اہل خاندان کو ماں اور بہن کہہ کر پکارتے ہیں۔

ہمارے ہاں زنا شاذ و نادر ہوتا ہے جب کہ وہاں پر تو یہ فیشن ہے، اس لئے ہمارے رسوم اور طرح کی ہیں، ہم نے کلپر عورتوں کے سروں پر نئی چادریں ڈال کر ان کو واپس بھیج دیا، وہ ہماری مائیں بہنیں ہیں۔

س: مگر آپ نے انہیں معاف نہیں کیا؟

اکبر بگٹی: معاف کرنا کوئی فرض نہیں ہے، ہم نے انہیں عزت سے رخصت کر دیا۔

س: تو کلپروں سے آپ کا معاملہ ختم نہیں ہوا؟

اکبر بگٹی: وہ کلپر بندلانی ہیں، باقی تو سارے کلپر یہیں ہیں، اپنے فیصلوں کے لئے یہاں روزانہ آتے ہیں، کلپر بندلانیوں کے ساتھ معاملہ اسی طرح چل رہا ہے، کچھ ذمہ دار مارے گئے ہیں، کچھ رہتے ہیں، یہ سارے اب ملتان یا اس سے آگے آباد ہیں، اس لئے میرا یہی کہنا ہے کہ جان کے بدلے جان کا اصول ہی لاگو ہوگا۔ مسلمانوں کو خدا نے یہی راستہ دیا ہوا ہے۔

(مئی 2000ء ''جنگ سنڈے میگزین'' انٹرویو سہیل وڑائچ)

فروری 2005ء میں نواب اکبر بگٹی اور سیکورٹی فورسز کے درمیان ہونے والی جھڑپ کے بعد اُن کا غصہ بہت بڑھ چکا ہے۔ ان حالات میں "Daily Times" کے سرفراز احمد نے 16 جولائی 2005ء کو اُن سے انٹرویو کیا۔ اس چشم کشا انٹرویو کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

ڈیلی ٹائمز: چند ماہ پیشتر آپ نے بلوچستان کی تمام بڑی پارٹیوں کو واحد بلوچ نیشنلسٹ پارٹی میں مدغم ہونے کا نظریہ پیش کیا تھا۔ آپ کی اس تجویز پر چار پارٹیوں کے اتحاد نے جس میں آپ کی جمہوری وطن پارٹی بھی شامل تھی زیادہ مثبت ردعمل ظاہر نہیں کیا...... کیوں؟

نواب اکبر بگٹی: آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔ ہم نے تجویز دی تھی کہ اس وقت واحد بلوچ نیشنلسٹ پارٹی کی ازحد ضرورت ہے۔ یہ سارے حالات جس میں سے وہ (بلوچ) گزر رہے ہیں اور جو کچھ وہ کھو رہے ہیں واحد پارٹی کو اس طرف توجہ دینی

چاہئے اوران کی ضروریات پوری کرنی چاہئیں جس کے لئے موجودہ بلوچ جماعتوں، قوم پرست جماعتوں یانام نہاد قوم پرست جماعتوں سب کو واحد قوم پرست جماعت میں مدغم ہو جانا چاہئے۔ہم نے پیشکش کی کہ اگر دوسرے متفق ہوجائیں تو سب سے پہلے ہم اپنی جماعت ختم کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔اب تک مثال کے طور پر سردار عطاء اللہ مینگل نے کہا ہے کہ خیال تو بہت اچھا ہے مگر قابل عمل نہیں۔ڈاکٹر عبدالحئی نے بھی کہا کہ یہ خیال بہت اچھا ہے اور پھر اسے ہنسی میں اڑا دیا۔نواب خیر بخش مری نے کچھ بھی نہیں کہا۔ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ بھی اس سلسلے میں زیادہ پرجوش نہیں۔ میں چار جماعتوں کے اتحاد میں شامل جماعتوں کے بارے میں بات کر رہا تھا۔اس اتحاد سے باہر چھوٹی جماعتیں ہیں انہوں نے اس خیال کا خیر مقدم کیا ہے۔انہوں نے اپنی اپنی شناخت ختم کر کے مجوزہ پارٹی میں شامل ہونے کی پیشکش کی ہے۔بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے گروپوں نے ادغام پر آمادگی ظاہر کی ہے۔بلوچوں کی خاموش اکثریت بھی اس کی حامی لگتی ہے لیکن وہ ہمیشہ خاموش رہے ہیں۔اپنی اپنی سیاسی جماعتوں کے اندر فیصلہ سازی میں شاید ان کا زیادہ کردار نہیں ہے۔جہاں تک ہماری بڑی پارٹیوں کا تعلق ہے انہیں اپنی شناخت اور انداز فکر بنانے میں کئی سال لگے ہیں اب ایک واحد جماعت کے لئے وہ جماعت کی شناخت ختم کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ اس کا فائنل پروگرام کیا ہوگا۔

ڈیلی ٹائمز: آپ نے پروگرام کیوں فراہم نہیں کیا؟

نواب اکبر بگٹی: ہم ایسا کر سکتے تھے لیکن ہم نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا کیونکہ اس طرح ہم پر الزام لگ سکتا تھا کہ ہم اپنا ذاتی ایجنڈا اپنی جماعت کا ایجنڈا یا ذاتی خیالات کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ہم نے یہ سب کچھ ان کے لئے چھوڑ دیا ہے جو اس میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ اکٹھے ہو کر بیٹھیں گے اور طریق کار ڈھونڈ لیں گے۔وہ اتفاق رائے سے فیصلہ کر لیں گے کہ پروگرام کیا ہونا چاہئے،سیاسی یا اقتصادی یا سماجی یا سب کچھ انہیں ہماری طرف سے نہیں دیکھنا چاہئے۔اور ہم پر یہ الزام نہ آئے کہ ہم اپنے پروگرام اپنے خیالات کو فروغ دے رہے ہیں۔

ڈیلی ٹائمز: کیا اس سے یہ بات سامنے نہیں آتی کہ بلوچ رہنماؤں میں بداعتمادی کی فضا ہے کچھ دیگر پارٹیاں ہیں مثلاً سردار عطاء اللہ مینگل اور ڈاکٹر عبدالحئی کی جماعت جو وسیع البنیاد اتحاد پونم میں شامل ہیں،ہو سکتا ہے ان کے پاس آپ کی تجاویز کو رد کرنے کی معقول وجوہات ہوں۔

نواب اکبر بگٹی: بداعتمادی اور بدگمانیاں موجود ہیں۔اتنے سالوں میں کچھ بلوچ جماعتوں، گروپوں اور تنظیموں میں بداعتمادی پروان چڑھی ہے پھر بلاشبہ کچھ بلوچ جماعتوں (سردار عطاء اللہ مینگل اور ڈاکٹر عبدالحئی کی) پختونخواہ نے پونم اتحاد میں شمولیت اختیار کی۔چند ماہ قبل ہمیں بھی پونم میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔جب ہم نے ان کے پروگرام کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بلوچوں کی ضروریات پوری نہیں کرتا۔اسی بنا پر ہم نے پونم کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔وہ سمجھتے ہیں کہ وہ تمام بلوچ ضروریات کا احاطہ کرتے ہیں مگر ہم ایسا نہیں سمجھتے۔ماضی قریب میں ہمارا نقطہ نظر درست ثابت ہو چکا ہے لیکن یہ پونم کا داخلی معاملہ ہے انہیں بار بار تنقید کا نشانہ نہیں بنا سکتے۔

ڈیلی ٹائمز: آپ بلوچوں اور بلوچ رہنماؤں کے درمیان غلط فہمیوں اور بداعتمادی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔کیا آپ نہیں سمجھتے کہ نواب بگٹی ایک انتہائی مشکل اور حاکمانہ سوچ کا مالک انسان ہے جس کے ساتھ چلنا بہت مشکل ہے۔آپ اس سلسلے میں کیا فرمائیں گے؟

نواب اکبر بگٹی: اپنے اپنے انداز میں ہم سب مشکل لوگ ہیں۔کسی حد تک سبھی حاکمانہ ذہنیت کے مالک ہیں۔یہ انسانی فطرت ہے،ہر کوئی ہر ممکن حد تک حاکمانہ ذہنیت کا مالک ہوتا ہے لہٰذا یہ فطرتی بات ہے اگر آپ کو موقع ملے تو آپ مجھ سے یا کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ حاکمانہ انداز اختیار کریں گے۔

ڈیلی ٹائمز: آپ کو جاگیردارانہ سوچ والا ایک غیر جمہوری فرد سمجھا جاتا ہے جو کسی دوسرے کی حکومت میں شراکت گوارا نہیں کرتا۔

نواب اکبر بگٹی: آپ نے تین مختلف چیزوں کے بارے میں بات کی ہے۔بلوچستان میں

کوئی جاگیرداری نہیں ہے۔ ہم قبائلی طرز زندگی رکھتے ہیں۔ پنجاب جاگیرداروں
گڑھ ہے اور کسی حد تک سندھ بلوچستان میں ہم ابھی تک نہ کسی سٹیج میں داخل ہو۔
ہیں اور نہ ہی اسے بائی پاس کیا ہے۔ یہاں قبائلی نظام ہے اور سرداری اسی نظام
حصہ ہے۔

ڈیلی ٹائمز: لوگ کہتے ہیں کہ سرداری نظام میں کوئی نظام یا کلچر نہیں ہے۔

نواب اکبر بگٹی: سرداری اور قبائلی نظام لازم و ملزوم ہے۔ جب تک قبیلہ یا قبائلی نظام موجو
ہے سردار وڈیرہ معتبر مقدم سفید پوش بھی رہیں گے۔ جب تک یہ نظام ختم ہو جائے
تو یہ بھی نہیں رہیں گے۔ پنجاب میں سرداری نظام ذرا مختلف صورت میں موجود ہے
وہاں چودھری بڑے یا چھوٹے چودھری، راجہ، ماجا، پاجا اور خدا جانے کیا کیا کچھ
اسی طرح سندھ میں......بس اسے چھوڑیں۔ ہم ایک پسماندہ علاقہ ہیں آپ برطانیہ
چلے جائیں اگرچہ اب یہ چھوٹا برطانیہ ہے وہاں بھی میکڈونلڈ، میکلورڈ میک کریگر بر
یہ میک وہ میک سکاٹ لینڈ میں بے شمار قبائل ہیں۔ اپنے رنگ، اپنے لباس، اپنی
موسیقی آج بھی وہاں قبیلے کا سردار ہوتا ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام میں بھی ب
جمہوریت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

ڈیلی ٹائمز: بطور سردار آپ سے اختلاف کیا جاتا ہے؟

نواب اکبر بگٹی: کیا اختلاف؟

ڈیلی ٹائمز: چلیں اس طرح بات کرتے ہیں کہ آپ اپنے قبیلے کے کسی فرد کو آپ کی رائے
سے اختلاف کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ آپ سے اختلاف رائے کی کبھی
جرات نہیں کرے گا۔

نواب اکبر بگٹی: کیا اسے فوراً قتل کر دیا جاتا ہے؟ میں آپ سے پوچھتا ہوں (ہنستے ہوئے)
آپ نے اپنا فقرہ مکمل نہیں کیا، شاید آپ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر وہ اختلافی آواز
اٹھائے گا تو اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔

ڈیلی ٹائمز: چلیں قتل نہیں کیا جاتا۔ پہلے قدم کے طور پر اسے برادری سے نکال دیا جاتا ہے یا
پھر............

نواب اکبر بگٹی: جب آپ کچہری میں بیٹھتے ہیں تو آپ لوگوں کی رائے سنتے ہیں۔ اہم
معاملات کے بارے میں ہر کوئی اپنی رائے دیتا ہے پھر اتفاق رائے قائم کیا جاتا
ہے۔

ڈیلی ٹائمز: کیا آپ نہیں سمجھتے کہ بلوچستان میں آپ کی گورنرشپ آپ کے سیاسی کردار پر
بدنما داغ ہے؟

نواب اکبر بگٹی: کوئی ضروری تو نہیں۔

ڈیلی ٹائمز: آپ کی گورنرشپ کے دوران بلوچستان میں فوجی کارروائی ہوئی۔

نواب اکبر بگٹی: جب ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان میں فوجی آپریشن شروع کیا تو اس کے
تھوڑی دیر بعد میں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ جب گھمسان کی جنگ شروع ہوئی تو میں
چھوڑ گیا تھا۔ اس دوران خان آف قلات گورنر تھے۔ میں 1973ء میں گورنر تھا۔
میں 31 دسمبر 1973ء کو چھوڑ گیا تھا۔ اگر آپ ریکارڈ کا مطالعہ کریں تو آپ مرنے
والوں کی تعداد دیکھ سکتے ہیں (اور اس کا طریقہ)۔

ڈیلی ٹائمز: کیا آپ خود کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں؟

نواب اکبر بگٹی: نہیں میں خود کو ذمہ داری سے نہیں بچا رہا (زور دیتے ہوئے) میں خود کو
بری الذمہ قرار نہیں دے رہا۔ میں گورنر تھا، آپ تاریخ کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ آپ
تاریخ کو جھٹلا نہیں سکتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے کوئی زبردست معرکہ مارا تھا۔ اس
عرصے میں کوئی زبردست یا اچھا کام نہیں ہوا۔

ڈیلی ٹائمز: جمہوری وطن پارٹی اے آر ڈی کی اہم رکن ہے جس میں آپ نے اس وقت
تک ایک ذمہ دارانہ اور باقاعدہ کردار ادا کیا جب تک کہ آپ کے سینیٹر نے بلوچستان
کی صورت حال کے حوالے سے استعفیٰ نہیں دے دیا۔ آپ یا آپ کی پارٹی نے
اے آر ڈی کی باقی جماعتوں کو اعتماد میں لیے بغیر یکطرفہ طور پر یہ فیصلہ کیا۔

نواب اکبر بگٹی: یہ پارٹی کا معاملہ ہے، اے آر ڈی کا نہیں۔ ہم نے سینٹ سے استعفیٰ دیا
ہے مگر ہم ابھی بھی اے آر ڈی کا حصہ ہیں۔ اے آر ڈی کی صرف تین جماعتوں
پاکستان مسلم لیگ (ن) پاکستان پیپلز پارٹی اور جمہوری وطن پارٹی کو پارلیمنٹ میں

نمائندگی حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔ دلیل کے طور پر اگر ہم اسمبلیوں کو چھوڑ دیتے ہیں تو ہم ان لوگوں کی طرح جن کی اسمبلیوں میں کوئی نمائندگی نہیں ہے پھر بھی اے آر ڈی کا حصہ رہیں گے۔

ڈیلی ٹائمز: چودھری شجاعت حسین اور مشاہد حسین آپ سے مفاہمت کے لئے ڈیرہ بگٹی کے کئی دورے کر چکے ہیں۔

نواب اکبر بگٹی: آپ کن ملاقاتوں کی بات کر رہے ہیں۔ اس سال کی یا گزشتہ سال کی؟

ڈیلی ٹائمز: فروری کی ہلاکتوں کے بعد۔

نواب اکبر بگٹی: اچھا...... وہ یہاں آئے تھے اور میرے ساتھ خالصتاً ان (سوئی اور ڈیرہ بگٹی) معاملات کے حوالے سے رابطہ قائم کیا تھا لیکن انہوں نے بلوچستان کے دیگر تمام معاملات پر بھی بات چیت کی۔ میں نے کہا کہ میں بلوچستان یا بلوچستان کے سارے معاملات پر بات نہیں کر سکتا کیونکہ میرے پاس اس کا مینڈیٹ نہیں ہے۔ انہیں دوسری پارٹیوں اور لیڈروں سے بات کرنی چاہئے۔ ہماری گفتگو صرف بگٹی معاملات تک محدود رہی۔ بگٹیوں کی ہلاکت ان کے گھروں اور کاروبار کو پہنچنے والے نقصان وغیرہ۔ میرا دیگر معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ سردار عطاء اللہ مینگل نے آپ کے ساتھ انٹرویو میں کہا ہے (ہارڈ ٹاک، ڈیلی ٹائمز 28 مئی 2005ء) میں نے انہیں نہیں بتایا کہ میرے اور چودھری شجاعت حسین کے درمیان کیا طے پایا۔ میں انہیں دوبارہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان کچھ بھی طے نہیں ہوا سوائے ان معاملات کے جن میں ان کی کوئی دلچسپی یا مفاد نہیں ہے۔ میں انہیں دوبارہ یقین دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ انہوں نے میرے ساتھ بلوچستان کے تمام معاملات پر مذاکرات کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے انکار کر دیا کیونکہ یہ صرف ہمارا اپنا معاملہ تھا اس لئے اس کے بارے میں کسی کو رپورٹ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

ڈیلی ٹائمز: تو آپ نے ان کے ساتھ سوئی یا ڈیرہ بگٹی سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کی؟

نواب اکبر بگٹی: گزشتہ مہینے ہونے والی آخری ملاقات تک میں نے پورے بلوچستان کے متعلقہ معاملات کے بارے میں کوئی بات چیت نہیں کی تھی۔ وہ میرے ساتھ کوئی پیکج

پیکج کی بات کرنا چاہتے تھے میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ اپنا پیکج باقی بلوچستان کے پاس لے جائیں۔

ڈیلی ٹائمز: چودھری شجاعت حسین اور مشاہد حسین کے ساتھ آپ کے مذاکرات کا کوئی نتیجہ بھی نکلا؟

نواب اکبر بگٹی: کوئی خاص نہیں سوائے اس کے کہ جنگ بندی ہوگئی۔ ہمارے اور ایف سی کے 16 مورچے ہٹا دیئے گئے بس یہی کچھ۔

ڈیلی ٹائمز: کیا آپ ان باتوں کو دہرائیں گے جو آپ نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ذوالفقار کھوسہ سے کیں جب وہ ڈیرہ بگٹی میں بگٹی قبائل اور سیکورٹی فورسز کے درمیان تصادم کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں پر تعزیت کے لئے یہاں آئے تھے۔

نواب اکبر بگٹی: یہ حملہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا تھا (سیکورٹی فورسز کی طرف سے) اور ان کا ٹارگٹ میں تھا۔ وہ مجھے ختم کرنا چاہتے تھے۔ میں اپنے بیڈ روم میں ناشتہ کر رہا تھا یہ صبح دس بجے کا وقت تھا۔ کچھ فاصلے پر فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے ملازم سے کہا کہ وہ پتہ کرے کیا معاملہ ہے۔ میں نے کپڑے پہنے، ایک دو شیل گرنے شروع ہوگئے۔ جب میں اپنی کچہری کی طرف گیا تو میرے دائیں بائیں شیل گرنے لگے۔ جب میں کچہری میں داخل ہوا تو بڑے شیل ہمارے اردگرد گرنا شروع ہوگئے۔ میں ایک چھوٹے کمرے میں چلا گیا ایک شیل وہاں آ گرا جس سے چھ لوگ زخمی ہوگئے۔ ہم ایک دوسری جگہ کی طرف گئے مگر ایک شیل تین آدمیوں کو لگا جو مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر تھے۔ وہ تینوں مارے گئے، چار لوگ زخمی ہوگئے جن میں میرا اسیکرٹری بھی شامل تھا۔ شیل کرتے رہے ساٹھ سے زائد لوگ مارے گئے، سو سے اوپر زخمی ہوگئے جن میں 33 ہندو بھی شامل تھے۔ ایک زخمی ہندو خاتون کے مرنے سے اب یہ تعداد 34 ہوگئی ہے۔

ڈیلی ٹائمز: آپ کہتے ہیں کہ آپ ان کا ٹارگٹ تھے۔

نواب اکبر بگٹی: ہاں۔ دیکھیں اس دن وہاں سات جگہوں سے شدید فائرنگ ہو رہی تھی ان میں سے دو چار جگہوں سے میرے گھر پر فائرنگ کر رہے تھے۔ میری بیٹھک اور میری

کچہری پر 600 سے زائد شیل پھینکے گئے تھے۔ مشین گنوں سے ہزاروں گولیاں چلائی گئیں، ہمارے اوپر ہیلی کاپٹر سے بھی فائرنگ کی گئی۔

ڈیلی ٹائمز: حکومت کے مطابق یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب آپ لوگوں نے امن وامان کا سنگین مسئلہ پیدا کر دیا۔ سوئی پر حملہ کیا گیا اور کئی دنوں تک گیس کی سپلائی منقطع ہوگئی۔

نواب اکبر بگٹی: یہ ان کا طریق کار ہے (فوج) اسے کہتے ہیں (الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے) ڈاکٹر گوبلز کہتا تھا کہ اتنا جھوٹ بولو کہ سچ لگنے لگے۔

ڈیلی ٹائمز: تصادم کے بعد گرفتاریاں تو ہوئی تھیں۔

نواب اکبر بگٹی: گرفتاریاں معمول کی بات ہے۔

ڈیلی ٹائمز: کیا ان میں کچھ یا سب کو رہا کر دیا گیا ہے؟ خیر سگالی کے طور پر۔

نواب اکبر بگٹی: کوئی خیر سگالی نہیں نہ کوئی اور سگالی۔

ڈیلی ٹائمز: خیال کیا جاتا ہے کہ چودھری شجاعت حسین، مشاہد حسین کے دورے کے نتیجے میں حکومت نے جو پہلا کام کیا وہ آپ کے آدمیوں کی رہائی تھی تاکہ آپ کے ساتھ کوئی مفاہمت ہو سکے۔

نواب اکبر بگٹی: میرے ساتھ نہیں بلوچستان کے عوام کے ساتھ۔ ان کا خیال تھا کہ وہ یہ کام میرے ذریعے کر سکتے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس اس کا مینڈیٹ نہیں ہے یہ ان کی سر دردی تھی۔ ان کی پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ یا ان کی سفارشات...... کہ میں بھی ان کا ساتھ دوں۔ میں نے انہیں بتا دیا سوری یہ میرا مسئلہ نہیں۔

ڈیلی ٹائمز: صدر مشرف کہتے ہیں کہ آپ سردار مینگل اور نواب مری صرف یہ تین سرداران کے مخالف ہیں، باقی سارا بلوچستان ان کے ساتھ ہے۔

نواب اکبر بگٹی: بالکل درست، سو فیصد درست۔ انہوں نے کہا 70 سردار سرکاری سردار ہیں وہ ان کے ساتھ ہیں پھر انہوں نے اس میں ترمیم کی کہ 76 سردار ہیں وہ تو 200 کا دعویٰ بھی کر سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر وہ جو اپنے حقوق مانگتے ہیں جو اپنے حقوق کے لئے لڑ رہے ہیں۔ قدرتی بات ہے حکومت انہیں اپنا دشمن کہے گی۔

ڈیلی ٹائمز: لیکن ایک تصور یہ ہے کہ بلوچ سردار عوام کی غربت اور پسماندگی کے ذمہ دار ہیں۔

نواب اکبر بگٹی: کیا ہم ہیں؟ بالکل ٹھیک۔ ہم ان کے حقوق کی جدوجہد کر رہے ہیں اور حکومت کی طرف سے ہمیں گولے اور گولیاں مل رہی ہیں۔

ڈیلی ٹائمز: آپ آئینی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے مسائل کا حل کیوں نہیں ڈھونڈتے؟

نواب اکبر بگٹی: کونسا آئین؟

ڈیلی ٹائمز: 1973ء کا آئین۔

نواب اکبر بگٹی: بین الاقوامی قانون کے مطابق 1973ء کا آئین بلوچستان پر لاگو نہیں ہوتا۔ کیوں؟ کیونکہ اس وقت پارلیمنٹ میں بلوچستان کے پانچ منتخب نمائندے تھے ان میں سے تین نے اس آئین پر دستخط نہیں کیے۔ دو نے کیے تھے۔ اکثریت نے آئین پر دستخط نہیں کیے تھے۔ بلوچستان پر آئین کا نفاذ ہی نہیں ہوتا کیونکہ بلوچستان نے اس پر دستخط ہی نہیں کیے وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں غیر آئینی اور غیر قانونی ہے۔

ڈیلی ٹائمز: تو کیا آپ نیا آئین بنانے کے لئے آئین ساز اسمبلی کے مطالبے کی حمایت کرتے ہیں؟

نواب اکبر بگٹی: نہیں..... ہم نے آئینی ترمیمی بل سینٹ میں بھیجا تھا جو گزشتہ چار پانچ سالوں سے التوا میں پڑا ہے۔ ہم نے چودھری شجاعت حسین اور مشاہد حسین کو بتا دیا تھا کہ اگر وہ اس ترمیم کی حمایت کریں تو نئے آئین کی ضرورت ہی نہیں لیکن وہ مصنوعی قسم کی ترامیم کرنا چاہتے ہیں اور گن پوائنٹ پر ان کی منظوری چاہتے ہیں۔ مشاہد حسین سب کمیٹی کی رپورٹ تو آ گئی ہے لیکن دستوری سب کمیٹی کی رپورٹ کا ابھی انتظار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کنکرنٹ لسٹ میں کچھ ردوبدل ہو سکتا ہے۔ ہم نے کہا کہ کنکرنٹ لسٹ اب متروک ہو چکی ہے۔ یہ بیس سال پہلے ختم ہو چکی ہے وہ ہمیں کچھ فضول قسم کی چیزیں دینا چاہتے ہیں جن کی ہمیں ضرورت نہیں۔ جو ہم مانگتے ہیں اسے وہ نہیں مانتے جب آئینی سب کمیٹی کی رپورٹ آئے گی تو آپ بھی دیکھ لیں گے۔

ڈیلی ٹائمز: پارلیمانی کمیٹی رپورٹ پر بلوچ رہنماؤں نے جو بڑا اعتراض کیا ہے وہ یہ کہ اس نے مقررہ 90 دن کی بجائے 270 دن سے زائد وقت لیا۔

نواب اکبر بگٹی: یہ کوئی زیادہ اہم بات نہیں اگر آپ یہ کام دو ماہ میں نہیں کر سکتے، اگر اس سے فائدہ ہو سکتا ہے تو آپ دس ماہ بھی لے سکتے ہیں۔

ڈیلی ٹائمز: ڈاکٹر عبدالحئی کا کہنا ہے کہ کمیٹی نے مقررہ وقت سے زائد وقت لیا ہے۔

نواب اکبر بگٹی: یہ ڈاکٹر عبدالحئی کی بات ہے۔ وہ وقت والے پہلو پر زور دے رہے ہیں، میں مسئلے کے ٹھوس پہلو پر زور دے رہا ہوں۔ رپورٹ میں ٹھوس مواد کی کمی ہے۔

ڈیلی ٹائمز: صدر مشرف کہتے ہیں کہ حکومت بلوچستان پر توجہ دے رہی ہے۔ حکومت نے مکران ہائی وے، گوادر پورٹ اور میرانی ڈیم جیسے منصوبوں کے لئے 10 ارب روپے مختص کیے ہیں۔

نواب اکبر بگٹی: ان کی توجہ بلوچستان پر ہے مگر بلوچستان اور اس کے عوام کو تباہ کرنے پر۔ اپنی ہی پیداوار کے لئے حقوق کی بات کرنے والوں کو تباہ کرنے پر سب کچھ تباہ کرنے پر ان کی پوری توجہ ہے، یہ درست ہے۔

ڈیلی ٹائمز: کیا آپ نہیں دیکھتے کہ بلوچستان کے عوام ان ترقیاتی منصوبوں سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں؟

نواب اکبر بگٹی: کونسے ترقیاتی منصوبے؟ ترقیاتی منصوبوں کی باتیں دراصل عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہماری ضروریات سے اتفاق کر لیں۔ اگر آپ ان کو تسلیم کر لیں تو پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ لیجئے پانچ، دس یا بیس ارب روپے۔ اگر آپ بنیادی حقوق کو مسترد کرنا جاری رکھتے ہیں اور چند روپے دے دیتے ہیں "ہم تمہاری ہتھیلیوں پر بھکاریوں کی طرح رکھتے ہیں"۔

ڈیلی ٹائمز: بی ایل اے اور بی ایل ایف کے بارے میں کیا خیال ہے؟

نواب اکبر بگٹی: (مسکراتے ہوئے) باہر جائیں (بلوچستان میں کسی بھی جگہ) آپ کو وہ مل جائیں گی۔

ڈیلی ٹائمز: کیا مطلب؟

نواب اکبر بگٹی: ایک پلے کارڈ پر یہ پیغام لکھیں کہ آپ بلوچ لبریشن آرمی کی تلاش میں ہیں یہ کہ آپ ان سے ملنا چاہتے ہیں، وہ تم سے ملیں گے۔ وہاں وہ تم سے ملیں گے (طنزیہ)۔

ڈیلی ٹائمز: میں سمجھا نہیں۔

نواب اکبر بگٹی: اگر وزیر اعلیٰ جام یوسف صاحب کو وہ مل جاتے ہیں تو آپ کو کیوں نہیں۔

ڈیلی ٹائمز: کیا آپ ان کی اور ان کی سرگرمیوں کی حمایت کرتے ہیں؟

نواب اکبر بگٹی: وہ بلوچ ہیں، وہ میرے بھائی ہیں، ہر بلوچ ان کا ہمدرد ہے، ان کی جدوجہد بلوچوں کے حقوق کے لئے ہے، وہ اپنی جانوں کی قربانی دے رہے ہیں۔ کون احمق بلوچ اس سے انکار کرے گا اور کہے گا "ہم تمہارے دشمن ہیں" وہ بہت گدھا ہوگا یا غدار ہوگا۔

ڈیلی ٹائمز: وہ قومی اثاثوں اور تنصیبات کو نقصان پہنچا رہے ہیں پھر بھی؟

نواب اکبر بگٹی: کونسی تنصیبات؟

ڈیلی ٹائمز: مثلاً سوئی تنصیبات۔

نواب اکبر بگٹی: سوئی کی تنصیبات ہماری ہیں۔ فرض کریں ہم اپنی ہی دولت تباہ کر رہے ہیں تو اس سے آپ کو کیا لینا۔ آپ اسے ایک غلط نام دے رہے ہیں۔ ہم اسے "قومی" کہتے ہیں کیونکہ یہ ہماری ہے۔ یہ ہماری پیداوار ہے، آپ اسے کچھ بھی نام دے لیں...... قومی تنصیبات، قومی اثاثہ، قومی مصیبت، قومی بلا...... ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں یہ میری ہے، یہ ہماری ہے۔

ڈیلی ٹائمز: کیا قدرتی گیس کی فروخت سے حاصل ہونے والا منافع آپ کے اور اسلام آباد کے درمیان اصل نزاع ہے؟

نواب اکبر بگٹی: رائلٹی کی ادائیگی ایک آئینی تقاضا ہے۔ اس کے علاوہ دو اور بھی شعبے ہیں ڈویلپمنٹ سرچارج اور ایکسائز ڈیوٹی۔ ان سے بھی پانچ چھ ارب کا منافع بنتا ہے۔ سب سے زیادہ رقم ترقیاتی سرچارج سے حاصل ہوتی ہے پھر رائلٹی اور ایکسائز ڈیوٹی سے یہ سب صوبے یا صوبائی حکومت کو ملتی ہیں ان کا کسی کے پاس بھی جانے کا سوال نہیں ہے۔ مثلاً میں، ہم نے ریونیو کے ان تینوں شعبوں میں سے حصے کا مطالبہ نہیں کیا۔ ہمارا دعویٰ صرف یہ ہے کہ گیس بلوچوں کی ملکیت ہے۔

ڈیلی ٹائمز: کچھ بلوچ لیڈروں نے کہا ہے کہ حکومت بلوچوں اور پختونوں کو لڑانے کی

کوشش کر رہی ہے۔

نواب اکبر بگٹی: میں نہیں جانتا۔ ان سے پوچھیں۔ آپ یہ سوال سردار مینگل، ڈاکٹر عبدالحئی اور محمود خان اچکزئی سے پوچھیں وہ بڑی جماعتیں ہیں (پونم میں)۔

ڈیلی ٹائمز: کیا بلوچستان میں بلوچ بمقابلہ پشتون کوئی تنازع ہے۔

نواب اکبر بگٹی: یہ معمولی باتیں ہیں کوئی خاص نہیں۔ لیکن حکومت کوشش کر رہی ہے۔ دیکھیں ہم سمجھتے ہیں کہ بلوچ اپنی زمین پر رہ رہے ہیں اور پشتون اپنی زمین پر۔ آپ کی کوئٹہ یا اس کے گرد و نواح آمد تک شاید ہی کوئی ایسا جھگڑا ہو۔ اس سے بھی پرے آپ مشرق یا مغرب میں چلے جائیں ہر کوئی صدیوں سے اسی زمین پر رہ رہا ہے، یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔ جھگڑا کوئٹہ اور اس کے اردگرد ہے۔ یہی فساد کی جڑ ہے۔

ڈیلی ٹائمز: کیا اسے حل کیا جا رہا ہے؟

نواب اکبر بگٹی: میں نہیں کہہ سکتا، کون اسے حل کرنے والا ہے؟

ڈیلی ٹائمز: خود بلوچ اور پختون۔

نواب اکبر بگٹی: کیا حل کرنے والے ہیں۔

ڈیلی ٹائمز: اختلافات۔

نواب اکبر بگٹی: یہاں کچھ اور لوگ ہیں جو حل نہیں چاہتے۔ حکومت اور حکومتی ایجنسیاں جو بہت طاقتور ہیں وہ چاہتی ہیں یہ حل نہ ہوں۔ جھگڑا موجود ہے تو اس کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی ان کی حکمت عملی ہے۔

ڈیلی ٹائمز: آپ بلوچستان میں فوجی چھاؤنیوں کے قیام کے حکومتی منصوبوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ اب ایسی اطلاعات ملی ہیں کہ حکومت نے سوئی، کوہلو اور گوادر میں چھاؤنیوں کی تعمیر کو ملتوی کرنے کے فیصلے کا از سر نو جائزہ لیا ہے۔

نواب اکبر بگٹی: انہوں نے سوئی میں ابتدائی کام شروع کر دیا ہے۔ اطلاع کے مطابق وہ ستون تعمیر کر رہے ہیں اور 200 سے 1300 ایکڑ تک زمین کو لوہے کی تار سے مخصوص کر رہے ہیں۔

ڈیلی ٹائمز: کیا یہ آپ کے اور چودھری شجاعت حسین کے درمیان ہونے والی مفاہمت کی

خلاف ورزی نہیں ہے۔ کیا انہوں نے آپ کو یقین دہانی نہیں کرائی تھی کہ چھاؤنیوں کی تعمیر کو ملتوی کیا جا رہا ہے؟

نواب اکبر بگٹی: آپ کس ماہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟

ڈیلی ٹائمز: گزشتہ سال۔

نواب اکبر بگٹی: یہ بات چودھری شجاعت یا مشاہد حسین نے نہیں کی تھی یہ نیشنل سیکورٹی کونسل کے سیکرٹری طارق عزیز نے کہا تھا "فی الحال ہم چھاؤنیوں کی تعمیر ملتوی کر رہے ہیں" یہ گزشتہ سال کی بات تھی۔ اس وقت سے انہوں نے ابتدائی کام شروع کیا ہوا ہے۔

ڈیلی ٹائمز: اس کام پر آپ کا ردعمل کیا ہے؟

نواب اکبر بگٹی: لوگ اسے قبول نہیں کرتے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتے۔ یہ سب کچھ اسلحے کی طاقت سے کیا جا رہا ہے۔ عوام کی مرضی سے نہیں۔ دم دلاسا سے نہیں۔ ڈاکٹر شازیہ خالد کی طرح، اس کی آبروریزی کی گئی، اس کی مرضی کے خلاف۔

ڈیلی ٹائمز: اس کیس میں آپ نے فوج کے ایک کیپٹن کی گرفتاری اور اسے سزا دینے کی بات کی تھی۔

نواب اکبر بگٹی: اسے سزا ملنی چاہئے تھی۔ اگلے دن ڈاکٹر شازیہ نے بی بی سی سے جو کچھ کہا وہ میں نے سنا تھا۔ ہوسٹن میں ایک میٹنگ کے دوران باتیں کرتے کرتے وہ رو پڑی تھی، وہ چیخ رہی تھی کہ مجھے انصاف نہیں ملا۔ مجھے اٹھا کر ملک سے باہر پھینک دیا گیا جبکہ مجرم ملک کے اندر زندگی کے مزے اڑا رہا ہے۔ جو باتیں میں نے کی تھیں اس نے ان کی تصدیق کر دی ہے کہ وہی مجرم ہے۔ وہ یہاں بات نہیں کر سکتی تھی وہ بڑی خوفزدہ تھی اس کے لئے کوئی شخص باہر نہیں نکلا۔ صدر مشرف کہتے ہیں کہ وہ آدمی سو فیصد بے گناہ ہے، ہم کہتے ہیں کہ وہ دو ہزار فیصد مجرم ہے۔ مگر وہ وردی میں تھا، ایک چٹی بھائی۔ اب مختار مائی کے ساتھ گینگ ریپ ہوا۔ لوگ گرفتار ہوئے ان کو سزائیں بھی مل گئیں کیونکہ وہ عام آدمی تھے۔ مختار مائی بھی پنجاب سے تھی اور وہ لوگ بھی پنجاب کے تھے۔ مگر ڈاکٹر شازیہ میمن تھی اس کا تعلق سندھ سے تھا جبکہ ریپ کرنے والے کا تعلق پنجاب کی مقدس سرزمین سے تھا۔ مسلح افواج سے تھا، وہ ایک چٹی بھائی

تھا۔ یہ اصل وجہ ہے کہ ڈھاکہ میں آبروریزی کرنے والے کسی شخص کو سزا ملی۔ شیخ مجیب نے مجھے بتایا تھا کہ ایک لاکھ سے زائد عورتوں کو ریپ کیا گیا تھا۔ کیا آپ نے کسی شخص کو پکڑ کر جیل میں ڈالا۔

ڈیلی ٹائمز: ڈیلی ٹائمز کو ایک حالیہ انٹرویو میں آپ پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا الزام لگا ہے۔ خاص طور پر کلپروں کے ایک ذیلی قبیلے بندلانی کے حوالے سے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے انہیں انتہائی غیر انسانی حالات میں خیموں میں رہنے پر مجبور کر دیا ہے، وہ بے چارے حکومت سے ملنے والے چند سو روپوں میں گزارہ کر رہے ہیں، ان کی اس بدحالی کا ذمہ دار وہ آپ کو قرار دیتے ہیں۔

نواب اکبر بگٹی: کیا انہوں نے یہ کہا ہے؟

ڈیلی ٹائمز: ہاں یہ بات ریکارڈ میں موجود ہے۔ انہوں نے ڈیلی ٹائمز سے یہ بات کہی ہے۔

نواب اکبر بگٹی: جرنیلوں کا جھوٹ تو مشہور ہے۔ ہر جرنیل خاص طور پر پاکستانی جرنیل وہ بڑے سے بڑا جھوٹ بولتے ہیں، وہ آنکھ جھپکائے بغیر عوام پر الزام لگا دیتے ہیں۔ یہ ان کا وطیرہ ہے یہ کوئی نئی بات نہیں آپ جا کر دیکھ سکتے ہیں وہ گھروں میں رہ رہے ہیں۔ شاید کرائے کے یا خریدے ہوئے کچھ اچھے گھروں میں رہ رہے ہیں، کچھ بنگلوں میں اور وہ اپنے الاؤنس لے رہے ہیں۔

ڈیلی ٹائمز: مگر یہ الاؤنس ناکافی ہیں۔

نواب اکبر بگٹی: جنرل بابر کے زمانے میں انہوں نے بیت المال سے 6 سے 7 کروڑ روپے لیے تھے اور یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے۔ ہمارے پاس اس کی فوٹو کاپیاں موجود ہیں۔ ہم نے یہ دستاویزات اسمبلی میں پیش کی تھیں جہاں انہوں نے معاملہ ٹھپ کرا دیا۔ بیت المال کے اہلکاروں نے ان چیکوں اور دستاویزات کی فوٹو کاپیاں ہمیں فراہم کی تھیں۔ انہیں تو آئی ایس آئی کے بجٹ سے بھی فنڈ فراہم کیے جاتے ہیں وہ آسائش کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ان کو استعمال کر لیا جاتا ہے۔ انہوں نے دو دفعہ پہلے بھی استعمال کرنے کی کوشش کی ہے وہ لوگ ان کا ہتھیار

ہیں، ان لوگوں کو سپریم کورٹس سے سزائے موت ہو چکی ہے وہ اشتہاری مجرم ہیں۔ حکومت اعلیٰ عدالتوں کو مطلوب افراد کو پناہ اور الاؤنس دے رہی ہے قانون کی حکمرانی کہاں ہے؟ جنرل کے اپنے قانون کی حکمرانی کہاں ہے؟ محض ایک بات کے لئے وہ جھوٹا دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ تکلیف میں ہیں وہ کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہیں۔

ڈیلی ٹائمز: آپ کے خیال میں اس ملک کا مستقبل کیا ہے؟

نواب اکبر بگٹی: ملک کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ پاکستان نظریہ ضرورت کی پیداوار ہے پھر 70 کی دہائی میں نظریہ ضرورت کے تحت ٹوٹ گیا۔ آج کل بھی اسی نظریہ ضرورت کے تحت ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور آخر کار یہ نظریہ ضرورت کے تحت ختم ہو جائے گا۔

(بشکریہ ڈیلی ٹائمز 16 جولائی 2005ء)

ڈیلی ٹائمز میں شائع ہونے والے اس انٹرویو پر ایک انتہائی کہنہ مشق اور خصوصاً نواب اکبر بگٹی اور بلوچستان سے مزاج آشنا صحافی محترم نادر شاہ عادل کا تبصرہ بعنوان ''یہی ہے بگٹی سٹائل پالیٹکس'' جو روزنامہ ایکسپریس نے شائع کیا۔ صورت حال کی سنگینی کو سمجھنے کے لئے آپ کے مطالعے میں آنا لازم ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''جمہوری وطن پارٹی کے سربراہ نواب اکبر بگٹی کا تازہ ترین انٹرویو جو انہوں نے ڈیلی ٹائمز کے ایڈیٹر سرفراز احمد کو دیا ہے حسب دستور خاصا دھماکا خیز، چشم کشا اور شعلہ بار ہے۔ اس سے قبل سردار عطاء اللہ مینگل بھی اظہار خیال کر چکے ہیں، نواب بگٹی و سردار عطاء اللہ میں سیاسی اسٹریٹجی اور انداز نظر کا فرق واضح ہے لیکن ''رزمیہ گوئی'' کی مماثلت دونوں کو ایک وحدت میں پروتی ہے۔ جو سیاسی مبصرین، تجزیہ نگار، سیاست دان اور جنرل، نواب بگٹی کو قریب سے جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اس آتش گیر ''بگٹی'' کو جانتے ہی نہیں جو بلوچ جنگجویانہ سیاست کا منفرد رازداں ہے، دوست دشمن سب کی سیاسی نیتوں کی خبر رکھتا ہے، بلا کا ہارڈ لائنر ہے، دوٹوک باتیں کرتا ہے، اپنے موقف پر اڑ جاتا ہے تو پھر نہیں دیکھتا کہ اس کے نتیجے میں خدانخواستہ سوئی کی اینٹ سے اینٹ بجائی جائے گی یا بلوچستان شعلوں کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ نواب بگٹی نے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بھی عجیب پیش

گوئی کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ''اس ملک کا کوئی مستقبل نہیں'' پاکستان کا قیام نظریہ ضرورت کے تحت عمل میں آیا،اس کے بعد 70ء میں اسی نظریہ ضرورت کے تحت ٹوٹا، آج اسی نظریہ ضرورت کے تحت اختتام پذیر ہوگا۔ان کی برہمی کا عالم دیکھئے کہ وہ صدر جنرل پرویز مشرف کے حوالے سے ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ ''جنرل حضرات کی دروغ گوئی سے ہر شخص واقف ہے''۔اس انداز تکلم سے پتا چلتا ہے کہ چوہدری شجاعت اور مشاہد حسین کے پیکج اور مسائل کے اجتماعی حل کی سرکاری کوششوں کو وہ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔بگٹی کی سیاست آزمائش کی گھڑی میں مانند صور ارتعاش پیدا کرتی ہے۔میں نے نواب بگٹی کے در اور گھر پر دو بار عزت اور تین بار پیشہ ورانہ خفت اٹھائی ہے۔وہ اپنی گفتگو کو توڑنے مروڑنے پر متعلقہ رپورٹر کو نہیں بخشتے، سخت سرزنش کرتے اور ان کی ''انٹری بینڈ'' کردیتے ہیں۔ان سے گفتگو کرنے والا ہر نیا رپورٹر ابتدا میں مشکوک ہوتا ہے،ان سے بات چیت یا انٹرویو میں بگٹی صاحب محتاط رہتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک کوئٹہ سے باہر کے بیشتر رپورٹر یا سینئر صحافی بگٹی صاحب کے نزدیک ''پنجاب کے ایجنٹ'' ہی ہیں۔میری رپورٹنگ کے دنوں میں ان کا رویہ یہی تھا آج کل شاید بدل گیا ہو جس کا امکان کم ہے۔ان کا اعتماد حاصل کرنا مشکل مرحلہ ہے اور جب کسی پر اعتماد کرلیں تو کھل کر باتیں کرتے ہیں۔حس مزاح میں وہ بازی اس وقت لے جاتے ہیں جب سوال کرنے والے پر سوال الٹ دیتے ہیں۔عام طور پر تمام بلوچ لیڈروں کو اس بات کا تلخ تجربہ ہوا ہے،ان کی بات ایک عرصے تک میڈیا میں مسخ کر کے پیش کی جاتی رہی ہے، برس ہا برس تک بلوچستان کو قومی پریس نے حاشیوں میں جگہ دی آج بھی پتا نہیں چلتا کہ بی بی زبیدہ جلال نے گوادر میں پلاٹوں کی منسوخی کا جو مطالبہ کیا ہے اس کا ردعمل کیا ہوا اور کیا واقعی ان کا مطالبہ تسلیم کیا گیا۔

بلوچوں کی یہ شکایت بجا ہے کہ ہم لوگ قومی صحافت کے نقشے میں ابھرنے کی کوشش ہی میں 57 برس گزار گئے۔یہی شکایت جی ایم سید اور ولی خان کو بھی تھی۔سردار عطاء اللہ مینگل، سردار شیر باز مزاری اور نواب اکبر بگٹی میں میڈیا سے بوجوہ گریز پائی اور احتیاط کا سبب خود میڈیا کی اپنی صحافتی عصبیت سے منسلک ہے۔قومی میڈیا میں ایک زمانے تک ان ممتاز سیاست دانوں کو غداروں کے رنگ میں شرمناک طریقے سے پیش کیا گیا، اپنے طرز عمل

اور مروجہ صحافتی اقدار کی پاسداری کے تمام دعوؤں کے باوجود بلوچستان کے قومی حقوق کے مسئلے پر اسٹیبلشمنٹ کے ہمنوا اخباری پنڈتوں نے بارہا بلوچستان کے مسئلے اور بنیادی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔بلوچ لیڈروں کی تلخ نوائی کے اسباب ہمارے غیر جمہوری انداز فکر اور صحافتی جانبداری میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔سردار شیر باز مزاری کے مزاری ہاؤس میں اعتماد کے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے مجھے دو ماہ تک تگ و دو کرنا پڑی حالانکہ شیر باز مزاری کی شرافت کا میں تا قیامت معترف رہوں گا۔اس کی وجہ بھی بلوچ قوم پرستوں کو مطعون کرنے کی ریاستی پالیسی تھی۔ایک محتاط مزاری سردار میرا گھر پر خیر مقدم کرتے رہے۔مزاری صاحب کا ایک انٹرویو چھپا، جس روز ان سے ملاقات طے پائی اسی دن ان کا ایک کارٹون صفحہ اول پر چھاپا گیا جس میں وہ اور میر غوث بخش بزنجو ایک پل پر پریشان کھڑے ہوئے دکھائے گئے اور نیچے لکھا تھا ''سانوں نہر والے پل تے بٹھا کے......'' ہم نے وہ انٹرویو کس دل کے ساتھ کیا ہمارا دل ہی جانتا ہے۔مزاری صاحب کو بھی کئی بار ''مس کوٹ'' کیے جانے کی شکایت ہوئی۔قومی پریس حقیقی معنوں میں بلوچستان کے مسئلے کو قومی تناظر میں ناکام رہا، اگر اسے اخلاص نیت کے ساتھ پیش کرتا تو آج صدر مملکت کو یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ صرف ایک سردار بلوچستان میں گڑبڑ کر رہا ہے۔نواب اکبر بگٹی کو اردو پریس سے سخت شکایت رہی ہے۔بہت کم اخبار نویس ہوں گے جو اکبر بگٹی کے تند و تیز جواب کے وار سے بچے ہوں گے۔ مجھے نواب بگٹی کو قریب سے دیکھنے کا موقع 1986ء میں اس وقت ملا جب مری، بگٹی قبیلے کے لوگ وطن چھوڑ کر افغانستان نقل مکانی کر رہے تھے۔ان دنوں بگٹی صاحب نے اردو بولنے کو خود پر حرام کردیا تھا۔ان کا کہنا تھا کہ جنرل ضیاء کا جس دن دھڑن تختہ ہوگا، آمریت دفن ہوگی تب وہ اردو میں بات کریں گے۔میں ان سے ان کی کوئٹہ والی رہائش گاہ میں رات 8 بجے ملا۔ میرے وہم و گمان میں نہ تھا کہ ان سے گفتگو کی ابتدا اردو میں کر کے میں ان کے غضب کو آواز دوں گا۔سلام دعا کے پہلے ہی مرحلے میں مجھے ان کی برہمی نے چونکا دیا۔ No talk in urdu۔میں نے غلطی کا احساس کرتے ہوئے فوراً بلوچی اور انگریزی میں ملا جلا سوالاتی سلسلہ شروع کردیا۔میری مادری زبان بلوچی ہے۔نواب بگٹی نے میرے بلوچ ہونے کو بھی چیلنج کیا ''تو کجے بلوچے؟'' (تم کہاں کے بلوچ ہو؟) میں نے سید ملنگ شاہ ہاشمی، اپنی والدہ بانل دشتیاری، بھائی سید امداد حسین اور سید ظہور شاہ ہاشمی جیسے قد آور بلوچ دانشور و ماہر لسانیات

کے خاندانی حوالے دیے تب جا کران کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور پھر سارا انٹرویو روانی میں اختتام کو پہنچا۔ جب انٹرویو ختم ہوا تو انہوں نے نوائے وقت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''مسٹر مجید نظامی کتنا انٹرویو چھاپیں گے؟ میرا وقت تم نے کافی ضائع کیا اب دیکھوں گا کہ چھپتا کیا ہے؟''
جب انٹرویو مکمل چھپا جو اینٹی ضیاء الحق تھا تو کراچی کے بگٹی بلک میں میری عزت افزائی اسی نواب بگٹی نے کی۔ پھر کچھ دنوں بعد اسی جگہ بلوچستان کی سیاسی صورت حال سے متعلق مضامین پر مشتمل میری کتاب ''بلوچستان کا مقدمہ'' انہوں نے حقارت سے زمین پر پھینک دی اور کہا ''اردو کی اس کتاب کا میں کیا کروں؟'' اور یہی گھر تھا کہ جمہوری وطن پارٹی کے دم مست قلندر صفت رہنما رؤف ساسولی ہمیں انٹرویو کے لیے لے گئے۔ میری صورت دیکھتے ہی نواب صاحب سے نہ رہا گیا، خشمگیں نظروں سے رؤف ساسولی کو دیکھا اور کہا ''اسے کیوں لائے ہو؟'' بعد میں بگٹی صاحب کو سینئر صحافی صدیق بلوچ نے راقم کے بارے میں بریف کیا تو میرا نام ان کی گڈ بک میں چلا گیا۔ جو لوگ بگٹی صاحب کا انگریزی اخبار کو دیا گیا سلگتا ہوا انٹرویو پڑھیں گے تو انہیں محسوس ہوگا کہ وقت اور بگٹی ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔
تازہ ترین انٹرویو میں ان سے یہی سوال کیا گیا کہ ''لوگ آپ کو ایک غیر جمہوری انداز نظر رکھنے شخص سمجھتے ہیں جس کا ذہن جاگیردارانہ خمیر سے اٹھا ہے، جسے شراکت اقتدار و اختیار پسند نہیں؟'' نواب بگٹی کا جواب ملاحظہ ہو۔ ''آپ نے تین مختلف چیزوں کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ بلوچستان میں کوئی جاگیرداری نہیں، ہم قبائلی مرحلے میں ہیں، پنجاب میں مکمل جاگیرداری ہے، آپ کو سندھ میں بھی تھوڑا کچھ ملے گا، ہماری یہاں قبائلیت ہے اور سرداری اسی نظام کا ایک حصہ ہے۔'' ڈاکٹر شازیہ کے بارے میں بگٹی کے لب و لہجے کی جھنکار رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ ''ڈاکٹر شازیہ کی آبرو لوٹی گئی جس پر آرمی کیپٹن کو سزا ملنی چاہئے تھی، میں نے ڈاکٹر شازیہ کو ہوسٹن میں ہونے والے اجتماع میں روتے سنا، وہ رو رہی تھی، چلا رہی تھی کہ اسے پاکستان میں انصاف نہیں ملا، اسے ملک سے باہر پھینکا گیا جبکہ اس کی آبرو لوٹنے والے ملک میں مزے کر رہے ہیں۔ میں جو کچھ کہتا رہا اس کی شازیہ نے تصدیق کی۔ جنرل مشرف کہتے ہیں کہ وہ آدمی 100 فیصد بے گناہ تھا، میں کہتا ہوں وہ 2000 فیصد مجرم تھا۔ لیکن وہ پیٹی بند بھائی تھا، یونیفارم میں تھا۔'' یہی ہے بگٹی سٹائل پالیٹکس جس میں خاموش بلوچستان بولتا، گرجتا اور پھٹ پڑتا ہے۔

سردار عطا اللہ مینگل

''پونم'' کے سربراہ سردار عطا اللہ مینگل کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ایک مرتبہ نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم نے ایک واقعہ سنایا اور کہا کہ سردار سردار عطا مینگل نے ان سے کہا۔

''نوابزادہ صاحب اگر خدانخواستہ پاکستان ٹوٹ گیا تو ہم بلوچستان کا نام پاکستان رکھ لیں گے'' کسی بھی شخص پر محض غداری کا لیبل لگا دینا ہمارے ہاں ایک فیشن بن چکا ہے لیکن یہ کوئی جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ آخر اس ''غداری'' کا پس منظر کیا ہے؟ یہ بھی تو ممکن ہے جسے ہم غدار کہہ رہے ہیں وہ ہم سے زیادہ محب الوطن ہو۔ ہمارے ہاں فتوے تو بتاشوں کی طرح بانٹے جاتے ہیں۔ اگر ہمارا حافظہ کمزور نہیں ہوا یاد کیجیے کہ جی۔ ایم۔ سید پر کس نے غداری کا لیبل چسپاں نہیں کیا لیکن اسی مملکت خداداد کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے انہیں سب سے پہلے ''حب الوطنی'' کا سرٹیفکیٹ جاری کیا۔ شاید ہم نے جب الوطنی اور غداری کے تمغے بانٹنے کا کام بھی آمروں کو سونپ دیا ہے۔ سردار عطا مینگل کے خیالات جاننے کے لیے ان کے دو انٹرویو شامل اشاعت ہیں پہلا انٹرویو سہیل وڑائچ نے اپریل 2000ء میں لیا تھا وہ لکھتے ہیں۔

''سابق وزیر اعلیٰ عطا اللہ مینگل سے ملاقات صدمے سے کم نہیں تھی دبلے پتلے اور نرم خو سردار عطا اللہ مینگل سے مصافحہ کیا تو پاکستانی فوج سے برسرپیکار رہنے والے گوریلا لیڈر کے بارے میں نظریات اور تصورات کو شاید دھچکا لگا میرے خیال میں تو انہیں مسلح

تو منہ گرم گفتار اور بلند لہجہ ہونا چاہیے تھا لیکن وہ اس کے برعکس نکلے قوم پرست سیاست اور فوج سے گوریلا لڑائی کے دوران وہ اپنا بیٹا گنوا چکے ہیں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کا لہجہ کپکپا جاتا ہے اور ان کے لہجے میں تلخی آجاتی ہے وگرنہ وہ افہام وتفہیم اور مذاکرات میں یقین رکھنے والے ہیں۔

نصف صدی سے سیاست کی پرخار وادی کی مسافت کرتے ہوئے انہیں ہر طرح کی سختیاں جھیلنے کا تجربہ ہے گوریلا جنگ لڑی جیلوں میں رہے سرداری سے فارغ ہوئے، قتل کے الزامات لگے، جلاوطنی کی زندگی گزاری، غدار کہلواتے رہے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے صوبہ سرحد میں ان کی حکومت کو فارغ کیا اور بعدازاں ان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے صوبہ سرحد میں ان کی حکومت کو فارغ کیا بعدازاں میاں نواز شریف نے ان کے بیٹے عطاءاللہ مینگل کو بلوچستان کی وزارت اعلیٰ سے فارغ کردیا۔ دیا عطا اللہ مینگل نیپ کی سیاست میں ولی خان کے ساتھ رہے 1970ء کے بعد بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بنے اور بھر برطرف ہوئے، ملک بدر ہوئے، ملک میں جمہوریت بحال ہوئی تو ملک واپس آئے 1988ء سے 1999ء تک کے جمہوری دور میں وہ خود تو نہیں لیکن ان کا بیٹا متحرک رہے، تاہم ان دنوں وہ پنجاب، مرکز اور فوج سے ناراض ہیں اور چھوٹے اور محروم صوبوں کی تنظیم "پونم" کے روح رواں ہیں۔

جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت کے قیام کے چند ماہ بعد مینگل قبیلے کے سربراہ سردار عطاء اللہ مینگل سے ان کی کراچی ڈیفنس کی رہائش گاہ پر ایک طویل ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے کھل کر چھوٹے صوبوں کی محرومیوں اور شکایات کا ذکر کیا اور پاکستانی فوج کے رویے، پنجاب کے احساسات اور فیڈریشن کے قوانین کا تجزیہ کیا اور کہا کہ یہ سب ایک ہیں ان کے دکھ بھرے لہجے میں بھی اصلاح کا پہلو موجود ہے اور اگر ان کی باتوں پر عمل کیا جائے تو پاکستان کے پسماندہ صوبوں کی محرومیاں ختم ہو سکتی ہیں سردار عطاء اللہ مینگل اب کافی عرصے سے لندن مقیم ہیں۔ آیئے بلوچستان کے ایک تجربہ کار سیاسی دانشور کی حیثیت سے ان کے خیالات سنیں اور ان کی روشنی میں ملک میں اصلاح کی کوشش کریں۔

اب ملاحظہ فرمایئے سردار عطاء اللہ مینگل سے ملاقات:

س: آپ 1977ء تک کی سیاست میں بہت متحرک تھے، اس کے بعد آپ بیرون ملک چلے گئے جب واپس آئے تو ایسا لگا کہ جیسے آپ کی دلچسپی سیاست میں کم ہو گئی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

عطاء اللہ مینگل: میری سیاسی عمر بڑی مختصر ہے۔ لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں مجھے یہاں کی سیاست سے مایوسی ہونے لگی۔ کیونکہ ہمارے ہاں سیاست ایک ریاضت تھی لیکن اب سیاست کو وقت گزاری کے لئے بطور مشغلہ اپنایا جاتا ہے۔ اس ریاضت میں ہمیں، نہ خدا ملا نہ ہی وصال صنم ہوا۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے، اس کے باعث ہم اپنی چھوٹی سی منزل تک بھی نہ پہنچ سکے جس کے باعث میں مجبوراً باہر چلا گیا۔ اپنی مٹی سے وابستگی میری سب سے بڑی کمزوری ہے جو مجھے کھینچ کر وطن واپس لے آئی، اس وقت میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ سیاست نہیں کروں گا، دور بیٹھ کر ایک تماش بین کی طرح دیکھتا رہوں گا کہ لوگ کیا کررہے ہیں۔ مگر یہاں آکر جو حالات دیکھے تو اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا۔ اگر ایک انسان سڑک پر بیٹھا فریاد کررہا ہے تو انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اس کی طرف فوراً متوجہ ہوتا ہے اور مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سوچا یہاں کے حالات جب بہتر بنانے میں کوئی حصہ ڈال سکوں۔ کام کرنے کی خواہش بہت تھی مگر صحت کی وجہ سے مجبور تھا، 3 بار دل کا آپریشن کروا چکا ہوں، 1987,1977 اور 1998ء میں دل کے آپریشن کروانے کے بعد میں اپنے آپ کو صحت مند آدمی قرار دوں تو میرے سے بڑا جاہل کوئی نہیں ہوگا۔

س: شروع کی سیاست کے دور اور آج میں کوئی فرق محسوس کرتے ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: میں محسوس کرتا ہوں کہ پہلے کے مقابلے میں اب آزادی زیادہ ہے، بھٹو دور میں یہ آزادی کم تھی، میں ایوب دور میں سیاست میں آیا اس وقت بھی بولنے کی آزادی کم تھی، پریس پر پابندیاں تھیں اب پریس نسبتاً زیادہ آزاد ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے خود کو سب سے زیادہ دھوکا دیا ہے، ہم نے ہر موڑ پر یہ سمجھا کہ جن لوگوں نے ہمارے حقوق واپس نہیں کئے اب انہیں سمجھ آگئی ہوگی اب وہ ہمیں بھی

اپنی طرح کے انسان سمجھنے لگے ہوں گے۔ اب انہوں نے اپنے حالات، ماحول اور دنیا کی تاریخ سے کچھ نہ کچھ سیکھ لیا ہوگا، ہم نے اس خوش فہمی میں ہر موڑ پر نئے سرے سے آغاز کرنا چاہا۔

س: سردار صاحب! آپ کی فلسفیانہ گفتگو میں ابہام ہے، آپ ''ہم'' اور ''وہ'' کا نام لے رہے ہیں، کیا اس سے مراد بلوچستان اور فیڈریشن ہے، بلوچستان اور پنجاب ہے یا پھر سول سوسائٹی اور فوج ہے؟

عطاءاللہ مینگل: جب میں ہم کی بات کر رہا ہوں تو میری مراد بلوچستان ہوتی ہے جب میں وہ کی بات کرتا ہوں تو اس میں پنجاب، فیڈریشن اور فوج شامل ہیں۔ یہ تینوں نام ایک ہی چیز کے ہیں۔ میں ان تینوں کو ایک ہی سمجھتا ہوں اور خدا کرے کہ یہ اکٹھے ہی رہیں۔ لوگ اکثر یہ کہتے ہیں کہ آپ پورے پنجاب کو موردالزام ٹھہراتے ہیں۔ پنجاب میں بھی مظلوم طبقہ موجود ہے۔ جو آپ لوگوں کی طرح فریاد کرتے ہیں، ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ جو جن بوتل سے باہر نکلا ہے، یہ ہمارا نکالا ہوا جن نہیں ہے۔ اسے پنجاب نے بوتل سے باہر نکالا ہے اس کو پنجاب ہی واپس بوتل میں بند کر سکتا ہے۔ ہمارے بس میں نہیں ہے کہ اسے واپس بوتل میں بند کریں۔ پنجاب کا نام ہم اس لئے لیتے ہیں کہ یہاں کے لوگوں کو ہم بتا دیں کہ ہمیں شکایت آپ سب سے ہے۔ اگر آپ سب اس کے ذمہ دار نہیں ہیں تو اپنے جن کو سنبھالیں اور بوتل میں ڈالیں پھر ہمارے ساتھ بیٹھ کر بات کریں۔ یہ کیوں ان کے کہنے پر ہمیں غدار کہتے ہیں۔ جب ہمیں مار پڑتی ہے تو آپ لوگوں کی حس کیوں نہیں جاگتی۔ یا تو ہمیں بھائی مت کہو اور اگر ہمیں بھائی کہتے ہو۔ ہمیں مسلمان سمجھتے ہو تو کیوں تمہاری وہ انسانی حس نہیں جاگتی۔ ساڑھے چار سال تک بلوچستان پر فوجی آپریشن ہوتا رہا تو آپ لوگوں نے آواز تک نہیں اٹھائی، ایسا نہیں تھا کہ آپ لوگ لاعلم تھے۔ ہمارے کچھ ساتھی پنجاب میں ایسے تھے جو کہتے تھے کہ ہماری بات کوئی نہیں سنتا۔ ہم آپ کی باتیں اپنے حلقے میں نہیں لے جا سکتے۔ کیونکہ لوگ یہ سننا ہی نہیں چاہتے۔ آپ بتائیں کہ ایسی صورتحال میں کیا کریں۔ سو ہم نے یہ سوچا کہ لاہور کا بائیکاٹ کیا جائے اس وقت تک

لاہور نہیں جاؤں گا جب تک پنجاب ہمارے مسائل کو محسوس نہیں کرتا میرا کئی سال سے یہ خاموش احتجاج جاری ہے، میں گزشتہ کئی سال سے لاہور نہیں گیا۔

س: آپ پنجاب کو بڑے اچھے طریقے سے جانتے ہیں، آپ ماضی میں پنجاب کے دورے بھی کرتے رہے ہیں۔ پنجاب کے لوگوں کے بھی بہت مسائل ہیں وہ ہرگز کسی کا استحصال نہیں چاہتے، وہ تو سب سے محبت کرتے ہیں، آپ کے خیال میں اصل خرابی کہاں پر ہے؟۔

عطاءاللہ مینگل: یہاں میں اپنی شکست کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس بات کو سمجھ نہیں سکا کہ خرابی کہاں پر ہے، میرا ایک عام خیال ہے کہ خرابی پنجاب کے اس طبقے کی ہے جو ہماری بدحالی، تباہی اور استحصال سے کسی نہ کسی طرح فائدہ اٹھاتا ہے، اس طبقے کا خیال ہے کہ ہمارے حقوق ادا کرنے سے وہ نقصان میں رہے گا۔ جو بھی ہماری تباہی سے فائدہ اٹھاتا ہے، وہ ذمہ دار ہے۔ دوسرا وہ طبقہ جو فائدہ اٹھانے والوں کی مدد کرتا ہے وہ بھی برابر کا ذمہ دار ہے۔

س: اس طرح تو سارا پنجاب ہی ذمہ دار ٹھہرا۔

عطاءاللہ مینگل: اسی لئے تو ہم سارے پنجاب کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ بلاوجہ سارے پنجاب کو پھنساتے ہیں اس میں کچھ ایسے حقائق ہیں جن سے منہ موڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ نقصان ہوگا۔

س: آپ کی مایوسی کی وجہ کیا ہے: وہ خاص بات کیا تھی۔ جس نے آپ کی مایوسی کو بڑھایا؟۔

عطاءاللہ مینگل: ہم شروع سے ہی یہ کہہ رہے تھے کہ بلوچستان کے حقوق دیئے جائیں، بلوچستان میں جو پیدا ہوتا ہے کہ وہ بلوچوں کی ملکیت ہے، وہ ان کے حوالے کردو۔ ہم جو پیدا کرتے ہیں، وہ ہمارا ہے، آپ جو پیدا کرتے ہیں، وہ آپ کا ہے، باقی جو آپ اور ہم مل کر سنٹرل پول میں جمع کریں گے فیڈریشن کا ہوگا۔

س: یہ معیار تمام صوبوں کے لئے ہوگیا یا صرف چھوٹے صوبوں کے لئے؟

عطاءاللہ مینگل: یہ تمام صوبوں کے لئے ہے ہم جو چیز اپنے لئے چاہتے ہیں وہی چیز ہم

پنجاب کے لئے بھی چاہتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں آپ صوبائی خودمختاری دیں اور پنجاب کو نہ دیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو ہم پنجاب کے لئے صوبائی خودمختاری چاہتے ہیں تو وہ ہمارے معاملے میں اعتراض کیوں کرتا ہے۔ پنجاب شاید اتنا دور ہوگیا ہے کہ اسے صوبائی خودمختاری کی ضرورت نہیں ہے، آپ کو جو اللہ نے دیا ہے، ہم اس میں سے کچھ نہیں چاہتے لیکن ہماری سوکھی روٹی کو ہمارے لئے چھوڑ دیں۔

س: بلوچستان اور فیڈریشن کے حالات کس طرح خراب ہوئے؟

عطاء اللہ مینگل: 1958ء کے مارشل لاء میں پہلا ایکشن قلات پر کیا گیا، ان پر الزام تھا کہ انہوں نے بحریہ کے آفس سے پاکستان کا جھنڈا اتار کر اپنا لگالیا۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ کتا تمہارا کان لے گیا اور تم کتے کے پیچھے بھاگو بھئی پہلے تم اپنا کان تو دیکھو، ہے کہ نہیں۔ پہلے نیوی پر جا کر دیکھو تو سہی کہ وہاں پاکستان کا جھنڈا ہے بھی کہ نہیں اور کیا وہ جگہ اس قابل ہے کہ وہاں پاکستان کا جھنڈا لگایا جائے، وہ ایک زلزلے میں منہدم ہوئے کھنڈرات ہیں۔ وہاں کیوں کوئی پاکستان کا جھنڈا لگائے گا اس تباہ حال عمارت پر خان قلات اپنا جھنڈا کیوں لگائے گا، اس سنی سنائی بات کو انہوں نے الزام بنالیا۔ سکندر مرزا نے خان قلات سے کہا کہ تم یہ تحریک چلاؤ اور اپنی ریاست کی بحالی کا مطالبہ کرو، میں واحد سردار تھا جس نے اس سے اتفاق نہیں کیا حالانکہ اگر ریاست بحال ہوتی تو سب سے زیادہ فائدہ مجھے پہنچتا کیونکہ میں سردار تھا۔ وہ اگر خان بنتا تو میں پاٹے خان بن جاتا، میں اور خیر بخش مری دو آدمی تھے جنہوں نے اس بات کی مخالفت کی۔ ہم نے کہا کہ آپ ہماری امانت کی حفاظت نہیں کر سکے، ہم نے یہ امانت اپنے لوگوں کو واپس سونپی ہے۔ یہ لوگوں کی ملکیت ہے، انہیں یہ اختیارات واپس دیئے جائیں۔ اس پر میرے اور خان قلات کے مابین اختلافات پیدا ہوگئے، ہم نے بیان بازی کی لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ خان نے پاکستان کا جھنڈا اتار کر اور کوئی جھنڈا لگالیا ہو۔ اس طرح انہوں نے بہانہ بنا کر انہیں گرفتار کیا۔ مارشل لاء کو درست ثابت کرنے کے لئے انہوں نے ہمیں قربانی کا بکرا بنایا خان قلات کی گرفتاری کے بعد فوجی آپریشن سب سے پہلے میرے علاقے میں شروع ہوتا ہے،

اکتوبر میں مارشل لا لگا اور دسمبر میں میرے علاقے میں فوجی آپریشن شروع کیا گیا۔ اس میں ہمارے کچھ لوگ جاں بحق ہوئے کچھ فوجی بھی جاں بحق ہوئے۔ دوسرا آپریشن مارچ 59ء میں شروع ہوتا ہے اس میں بھی کچھ لوگ جاں بحق ہوتے ہیں پھر لوگوں سے قرآن پر حلف لے کر کہا جاتا ہے کہ تم پہاڑوں سے اتر آؤ، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جب لوگ آ جاتے ہیں تو انہیں پکڑ کر جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر کوئٹہ میں قلی کیمپ کھلتا ہے وہاں دو اڑھائی سو لوگوں کو بند کیا جاتا ہے جن میں نواب اکبر بگٹی، میر غوث بخش بزنجو اور علاقے کے دوسرے معتبرین شامل تھے۔ کوئی ایسی سزا نہیں تھی جو انہیں نہ دی گئی ہو۔ ان سب کو ٹارچر کیا گیا۔ دو اڑھائی سال تک ان کو بند رکھا گیا۔ کچھ لوگ اس کیمپ میں جاں بحق ہوئے، ان کو کھانے میں دو ہلکی سی پھلکیاں دی جاتی تھیں اور بہت سارے آدمیوں کے لئے چند سیر دال ابال کر دی جاتی تھی۔ وہ غسل خانے میں بھی فوجیوں کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتے تھے۔

س: اب پنجاب میں احتساب کے قوانین کے تحت جو لوگ جیلوں میں بند ہیں، ان کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔

عطاء اللہ مینگل: اللہ کرے ایسا ہو، تا کہ ان کو بھی پتہ چلے کہ جب انسان انسان کے ساتھ برا سلوک کرتا تو کیسا لگتا ہے۔ جب تک انسان کے اپنے بدن پر نہ بیتے، اسے دوسرے کا احساس نہیں ہوتا۔ ہماری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں مگر یہ ضرور خواہش کرتے ہیں کہ انہیں ہمارے دکھ کا احساس ہو۔ یہ نہیں کہ ہم ان کے لئے بددعا کر رہے ہیں۔ بلکہ ہم اپنے لئے نیک دعا کر رہے ہیں۔ آپ اعتبار کریں کہ مجھے میر گل خاں نصیر نے بتایا کہ بزنجو صاحب کو دوسرے گرفتار لوگوں سے الگ کر کے لے گئے اور ٹارچر کرتے رہے۔ ایک مہینے کے بعد جب واپس آئے تو میں بزنجو صاحب کو پہچان نہ سکا۔ وہ پہلے شیو کیا کرتے تھے۔ اب میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ داڑھی میں آرہے ہیں، میں نے سوچا کہ یہ کس کو پکڑ کر لا رہے ہیں۔ جب انہوں نے بات کی تو میں نے پہچانا کہ یہ تو غوث بخش بزنجو ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے، میں نے ان سے کہا کہ تمہاری یہ حالت انہوں نے کر دی ہے؟ تو وہ

بولے کہ چھوڑو اس بات کو ایسے معاملات میں سب چلتا ہے، یہی حال انہوں نے ہمارے سارے لوگوں کا کیا پھر اس کے بعد انہوں نے لوگوں کو سزائیں دیں، 7 لوگوں کو پھانسی دی۔ 8-7 آدمیوں کو عمر قید ملی، کئی جیل میں ہی مر گئے باقی آخری عمر میں آ کر رہا ہوئے میرے مایوس ہونے کی یہ وجوہات ہیں۔

اس کے بعد بات ایوب خان کے آئین پر آ کر ختم ہوتی ہے۔ انہوں نے جب آئین دیا تو ہم سچ مچ یہ سمجھ بیٹھے کہ جمہوریت شروع ہونے والی ہے، الیکشن میں حصہ لیں گے، وہ بات ختم ہوگئی، رات گئی بات گئی والی بات ہوگئی اب نیا سورج طلوع ہوگا، ہم نے الیکشن میں حصہ لیا میں اور خیر بخش مری دونوں کامیاب ہوگئے، ہم دو ہی ممبر تھے جو بلوچستان سے کامیاب ہو کر آئے۔

یہاں آ کر میں نے ایک ہی گستاخی کی کہ لوگوں کو بتایا کہ مارشل لاء پر امن مارشل لا نہیں تھا بلکہ بڑا خون خرابہ ہوا ہے لوگوں کو پھانسیوں پر لٹکایا گیا ہے دوسرے دن مجھے دھمکی دی گئی کہ میں آپ لوگوں کو دیکھ لوں گا آپ لوگوں نے ایسی بات کی ہے ہم نے کہا کہ ٹھیک ہے ہم بھگت لیں گے یہ ہماری قسمت اور مقدر ہے پھر اس کے بعد پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی جیلوں میں گئے ایک اور فوجی آپریشن شروع ہوگیا یہ آپریشن ساڑھے چار سال چلا۔ میں میرے والد رسول بخش اور میرا بھائی جیل میں تھا اس دوران میرے قبیلے کے پانچ سو لوگ جیل میں ڈالے گئے حتیٰ کہ میرا بیٹا بھی جیل میں بند کیا گیا۔ بزنجو صاحب بھی جیل میں تھے۔ خیر بخش بھی جیل گئے لیکن پھر انہیں ہائی کورٹ نے چھوڑ دیا۔ یوں ہم ساڑھے چار سال تک بغیر کسی وجہ کے جیل میں رہے۔

س: اس کا کوئی جواز تھا؟ جیل بھیجنے کی وجوہات تو ہوں گی؟

عطاء اللہ مینگل: جب ہم نے مخالفت کی تو میں اس وقت ڈھاکہ میں تھا ایوب خان کی حکومت نے میرے والد کے چچا کو میری جگہ سردار مقرر کیا۔ لوگوں نے اس پر حکومت سے کہا کہ یہ آپ کا اور عطاء اللہ کا سیاسی جھگڑا ہے آپ سیاسی طور پر اس کو جس طرح سے نبٹائیں گے ہم اس میں نہیں آئیں گے لیکن ہمارے قبائلی معاملات میں دخل نہ دیں پورے بلوچستان میں، میں شاید واحد سردار تھا جو الیکشن جیت کر سردار بنا تھا۔

میں جب دوبارہ سردار بننے کے لئے آیا تو باقاعدہ ریفرنڈم ہوا لوگوں نے مجھے منتخب کیا تھا مگر نواب آف کالا باغ نے کہا کہ میں تو نیا سردار مقرر کروں گا۔ چنانچہ میرے والد کے چچا کرم خان کو سردار بنایا گیا جب وہ سردار بن کر دن کے ایک یا دو بجے علاقے میں پہنچے تو رات کو 12 بجے ان کو قتل کر دیا گیا۔ میں ان دنوں ڈھاکہ میں تھا کراچی پہنچتے ہی مجھے اور میرے والد کو قتل کے الزام میں پکڑ لیا گیا میرا ایک بھائی گرفتاری سے محفوظ تھا جو خاندان کی دیکھ بھال کرتا تھا مگر ان سے یہ بھی برداشت نہ ہو سکا چنانچہ تین ماہ بعد وہ بھی گرفتار ہوگیا انہوں نے خیر بخش خان مری کے چچا کو سردار بنایا جونہی وہ اپنے علاقے میں گئے اسے بھی قتل کر دیا گیا۔ اکبر خان بگٹی کے چچا زاد کو سردار بنایا گیا جونہی وہ اپنے علاقے میں گئے قتل کر دیئے گئے یہ آپریشن بے نتیجہ ثابت ہوا۔ انہوں نے خود آ کر عام معافی کا اعلان کیا خان قلات کو بلایا ان سے معافی نامہ پڑھوایا کہ ان کو معافی کر دو۔ نہ ہمیں معافی کا پتا ہے اچانک آئے اور ضمانت دے کر چلے گئے، کیسی ضمانت، کیسی معافی سب کچھ بالا ہی بالا طے ہوگیا یہ ایوب خان کا دور تھا ان کے بعد یحیٰی خان آئے ہیں انہیں زیادہ وقت نہ ملا خیر انہوں نے یہ کام کیا کہ ون یونٹ توڑا اور صوبوں کو آزادی ملی۔ ہم بڑے خوش ہوئے کہ چلو صوبے بحال ہوئے اب ہمیں سب کچھ مل جائے گا۔ پھر سانحہ مشرقی پاکستان ہوگیا۔ ہم پھر اکیلے رہ گئے جب بھٹو صاحب آئے تو ہم سمجھے کہ اب صحیح حکومت آئی ہے بھٹو صاحب چونکہ خود چھوٹے صوبے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے وہ ہمارے مسائل کو سمجھیں گے یہ ہم نہیں جانتے تھے کہ صرف چھوٹے صوبے سے آنا کافی نہیں ہے اس کے لئے کچھ اور چیزوں کی بھی ضرورت تھی ہم الیکشن تو جیت گئے لیکن بھٹو صاحب ہمیں حکومت دینا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ اپنے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تو نہیں تھی لیکن مجبور ہو کر انہوں نے حکومت ہمیں دی کیونکہ فوج سرحدوں پر لگی ہوئی تھی۔

س: لیکن سنا تو یہ گیا ہے کہ بھٹو صاحب نے آپ کے کہنے پر گورنر بھی لگا دیا تھا پاکستان کی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا کہ وزیراعلیٰ کی مرضی کا گورنر لگایا گیا۔

عطاء اللہ مینگل: میں اس وقت وزیر اعلیٰ نہیں تھا گورنر پہلے لگایا گیا تھا اصل میں تو بھٹو صاحب نے غوث بخش رئیسانی کو پہلے گورنر بنایا لیکن اس پر مظاہرے شروع ہو گئے فوج ان دنوں سرحدوں پر مصروف تھی بھٹو کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا انہوں نے ہماری مرضی پر غوث بخش بزنجو کو گورنر لگا دیا کیونکہ مظاہرے روکنے کے لئے ان کے پاس کوئی فورس نہیں تھی ہمیں حکومت تو دیدی گئی لیکن پہلے دن سے بھٹو نے اسے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ جونہی گورنمنٹ بنی بھٹو صاحب نے اپنی شعبدہ بازی شروع کر دی انہوں نے ہڑتال کروائی کوئٹہ کی سڑکوں پر کوئی پولیس والا نہیں تھا ہم نے اپنے کارکنوں کے ذریعے ٹریفک کنٹرول کروائی۔ اصل میں پنجاب سے مصطفیٰ کھر نے اپنا بندہ بھیجا تھا جس نے بلوچستان کے پنجابی پولیس افسروں کو کہا کہ تم پنجاب آ جاؤ ہم تمہیں گھر کے قریب نوکری دیں گے۔ مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نے پنجابیوں کو نکالا حالانکہ پنجابی افسروں کی صوبے کو واپسی کا فیصلہ یحییٰ خان کے دور میں ہو گیا تھا میں نے صرف اس پر عمل کیا ہم آہستہ آہستہ اس پر عمل کرنا چاہتے تھے لیکن ہڑتال نے یہ راستہ بند کر دیا پولیس کے جانے سے پورا بلوچستان خالی ہو گیا امن و امان اور ٹریفک کو کنٹرول کرنا بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ آخر میں مجبور ہو کر ہم نے بھٹو صاحب سے کہا کہ اب ہماری یہ حالت ہو گئی ہے ان حالات میں ہم کس طرح حکومت چلا سکتے ہیں انہوں نے کہا کہ اپنی کوئی فورس بنالو۔ فرنٹیئر کانسٹیبلری کو تو انہوں نے ویسے ہی بنا دیا تھا ہم نے کہا کہ کس نام سے بنائیں تو انہوں نے کہا کہ کسی بھی نام سے بنالو انہوں نے کہا کہ پولیس کا نام نہ دو کیونکہ جو آئی جی آئے گا وہ پھر فیڈرل گورنمنٹ سے آئے گا اس لئے کچھ اور نام دے دیں۔ انہوں نے پھر جنرل جیلانی کو جو اس وقت آئی ایس آئی میں تھے بعد میں پنجاب کے گورنر بھی بنے ان کو بھیجا کہ جا کر فیصلہ کریں کہ کس نام سے فورس بنائی جائے۔ مجھے گورنر نے فون کیا کہ جیلانی صاحب آئے ہوئے ہیں آپ آئیں میں نے کہا کہ میں آ کر کیا کروں گا جو بھی نام رکھنا ہے رکھ لیں وہ کون سا اتنا بڑا مسئلہ ہے نام ہی تو رکھنا ہے۔ 12 بجے پھر فون آیا کہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا نام رکھیں کس نام کا کیا تاثر بنتا ہے آپ آئیں۔ میں نے کہا کہ آپ

کچھ مت کہیں ان سے کہیں کہ وہ جو بھی نام رکھیں گے ہمیں منظور ہو گا کوئی نام تو ان کے ذہن میں آئے گا۔ چاہے الو کا پٹھا رکھیں کچھ بھی رکھیں ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آخر میں انہوں نے دیہی محافظ نام تجویز کیا۔ یہ نام ان کا تجویز کردہ ہے بعد میں انہوں نے ہم پر الزام لگایا کہ ہم نے ذاتی فوج بنائی ہوئی تھی وہ یہی ذاتی فوج تھی تقریباً روزانہ ہی ان کے وفاقی وزیر بلوچستان آتے تھے اور ہمارے خلاف جلسے اور تقریریں کرتے تھے انہوں نے سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کرایا مجھے بعد میں پتا چلا ہمارے آئی جی نے بڑی عقل مندی سے معاملہ کو نبٹایا کچھ آدمیوں کو پکڑا پھر رہا کر دیا۔ اس وقت سردار بگٹی نے انہیں بھیجا تھا اور یہ وہی لوگ تھے جن کی اب اکبر خان بگٹی کے ساتھ لڑائی ہے۔ بھٹو صاحب نے کیا کچھ نہیں کیا، ہمارے خلاف ہر ہتھکنڈا استعمال کیا گیا۔

س: آپ کی حکومت پر عراقی اسلحہ استعمال کرنے کا الزام بھی تو عائد کیا گیا تھا؟

عطاء اللہ مینگل: میں جب بھٹو حکومت کے خاتمہ کے بعد لندن سے علاج کروا کے واپس آیا تو میری عراقی سفیر سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ حکومت نے عراقی سفارتخانے کے ایک افسر کے ساتھ ملی بھگت کر کے ڈپلومیٹک بیگ میں اسلحہ منگوایا اور پھر سفارتخانے سے برآمد کر لیا گیا ہمارے فرشتوں کو بھی اس اسلحہ کا علم نہیں تھا یہ جو اسلحہ برآمد کیا گیا کلاشنکوف تھی جبکہ ہمارے پاس ایک بھی کلاشنکوف نہیں تھی ہم نے کہا کہ آتا تو ہم ضرور لیتے لیکن آیا نہیں۔

س: آپ کی حکومت کو کس واقعے سے ختم کیا گیا؟

عطاء اللہ مینگل: اصل میں جونہی جنگی قیدی واپس آئے سرحدوں پر کشیدگی ختم ہوئی تو ساتھ ہی فوج نے ہمارے خلاف اسلحہ تان لیا ہماری حکومت ختم کرنے کی ٹائمنگ فوجوں کی سرحدوں سے واپسی کے ساتھ منسلک تھی آخری ڈراما یہ تھا کہ جام آف لس بیلہ اور اکبر بگٹی مرکزی حکومت سے ملے ہوئے تھے لس بیلہ کے ٹیلی فون خود ہی کٹوا دیئے گئے فوج اور رینجرز ہماری بات نہیں مانتے تھے لس بیلہ میں بغاوت شروع ہو گئی ہم نے دیہی محافظ بھیجے تو الزام لگا دیا گیا کہ قبائلی لشکر چڑھا دیا گیا بعد میں ہماری حکومت

کی موجودگی ہی میں فوج آ گئی ہم اقتدار میں تھے اور ہماری مرضی کے برخلاف فوج کام کر رہی تھی دراصل ہمیں اقتدار سے ہٹانے کے لئے منصوبہ بندی کی گئی اور یہ سب کچھ فوج اور مرکز نے کیا۔ اگر ان تمام چیزوں کو دیکھیں تو شروع سے لے کر آخر تک ایک عنصر نمایاں ہے کہ ان کو ہر موڑ پر ہمارے خلاف فیبریکیشن کی ضرورت رہی ہے ہمارے خلاف الزام تراشیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہمارے ساتھ ناانصافیاں کی گئیں کیا ہم اس ملک کا حصہ نہیں ہیں؟

س: آپ نے پنجاب پر کافی الزامات لگائے تصویر کا دوسرا رخ بھی موجود ہے قیام پاکستان کے ساتھ ہی آزاد بلوچستان کی تحریک شروع ہوئی بلوچستان میں مسلح مزاحمت ہوئی فوج کا مقابلہ کیا گیا تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے پنجاب کے ملازمین کو نکالا گیا تو یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ سب غلطیوں کا ذمہ دار پنجاب نہیں بلوچستان کے لوگوں اور رہنماؤں کی بھی تو کچھ غلطیاں ہوں گی انہوں نے بھی تو کوئی زیادتیاں کی ہوں گی؟

عطاء اللہ مینگل: دیکھیں ہم بھی تو انسان ہیں انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو غلطیاں زیادہ کرتا ہے اور صحیح کام کم کرتا ہے یہ اس کی فطرت کا حصہ ہے ہم قطعاً یہ نہیں کہتے کہ ہم فرشتے ہیں ہم سے اگر کوئی غلطیاں ہوئیں بھی ہیں تو ان غلطیوں کو سرزد کرنے کی وجہ میں پنجاب کا عمل دخل شامل ہے ہم نے ان کے ردعمل میں آ کر غلطیاں کی ہیں وہ بجائے ہماری غلطیوں کا سختی سے جواب دیتے انہیں چاہئے تھا کہ ہماری غلطیوں کی نشاندہی کرتے۔ جب ہم ان کی تسلی کرواتے کہ یہ ہم نے اس نیت سے کی ہے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ ہم پر اعتبار نہ کرتے آپ تعصب کی بات کرتے ہیں میں آپ کے ساتھ پنجاب میں چلتا ہوں میں زیادہ نہیں کہتا صرف جتنی میرے ہاتھ کی انگلیاں ہیں اتنے بلوچستان کے لوگ دکھا دیں جن کو پنجاب میں نوکری دی گئی ہے آخر اتنا بڑا صوبہ ہے کہ کچھ تو فراخ دلی ہونی چاہئے۔

س: مینگل صاحب اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بلوچستان کے لوگ پنجاب میں نوکری کے لئے جاتے ہی نہیں؟

عطاء اللہ مینگل: میں بلوچستان کی ایک جیل میں رہا آپ یقین کریں کہ وہاں پر 11 جیل وارڈن مقامی تھے اور 105 پنجاب سے تھے۔ کیا جیل وارڈن بھی بلوچستان میں نہیں مل سکتے تھے۔ ایک جیل وارڈن کام کرتا تھا اور دوسرا اس کا رشتہ دار گھر میں فارغ بیٹھا رہتا تھا۔ ایک آدمی آپ کے گھر کا سامان چرا کر لے جاتا ہے آپ اس کا ہاتھ جھٹکتے ہیں اس کا ہاتھ ٹوٹ جاتا ہے آپ اسے کہتے ہیں کہ میرا سامان مت چراؤ اب آپ بتائیں کہ اس میں سے بڑا مجرم کون ہے؟ اگر آپ ہمیں کچھ دیتے نہیں تو ہمیں برا بھلا بھی مت کہو۔

س: سردار صاحب، آپ قومی پائے کے سیاستدان ہیں لیکن آپ نے اپنی سیاست کو صوبہ تک محدود رکھا، قومی سطح پر سیاست نہیں کی اس کی کیا کوئی خاص وجہ تھی؟

عطاء اللہ مینگل: پہلے آپ مجھے اس قوم کا حصہ تو سمجھیں، مجھے کبھی اس ملک کا حصہ نہیں سمجھا گیا۔ اگر مجھے اس قوم کا حصہ سمجھا جاتا تو میری تباہی میں پنجاب میرے ساتھ ہوتا۔ جس دن پنجاب میری تباہی میں میرے دکھ درد میں میرے ساتھ شامل ہوگا اس دن میں اپنے آپ کو اس قوم کا حصہ سمجھوں گا۔

س: قوم پرستوں کے حوالے سے یہ سوچ بھی موجود ہے کہ جب تک روس طاقتور تھا اس وقت تک آپ سمیت بلوچستان کے سردار روس کی طرف دیکھتے تھے اور سرخ انقلاب لانا چاہتے تھے پاکستان سے آزادی بھی حاصل کرنا چاہتے تھے یہ تاثر پنجاب میں پایا جاتا ہے اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

عطاء اللہ مینگل: میرے خیال میں پنجاب میں ایک ایسا طبقہ بستا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کے مفادات کا وہ ٹھیکیدار ہے۔ ہم شروع سے لے کر آج تک اس کے اس دعویٰ کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس ملک میں آج تک جو بھی تباہی آئی ہے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اس طبقے کو اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ یہ جو نظریہ پاکستان کے ''مامے'' ہیں میں ان کو اتنا جاہل نہیں سمجھتا کہ وہ ان باتوں کو نہ سمجھیں۔ وہ یہ سب سمجھتے ہوئے اس قسم کے الزامات لگاتے ہیں۔ ان کی سوچ حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ جہاں تک ہمارے روس کے ساتھ تعلقات کا سوال ہے شروع سے لے

کر آج تک میں نے اپنے آپ کو نہ سوشلسٹ کہا ہے اور نہ میں سوشلسٹ رہا ہوں۔

ہمارے دوسرے ساتھی سوشلسٹ تھے۔ انہوں نے بھی کبھی یہ نہیں کہا وہ پاکستان سے الگ ہونا چاہتے ہیں، جن کا اٹھنا بیٹھنا روس کے سوشلسٹوں کے ساتھ تھا چونکہ ان کی بنیاد تو وہیں تھی، پتا نہیں کیوں یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ روس پاکستان کو توڑنے یا بلوچستان کو الگ کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا روس کے جن لوگوں کی رسائی ہم تک تھی انہوں نے مجھے کہا کہ ہم اس خطے میں کسی قسم کی ٹوٹ پھوٹ نہیں چاہتے، وہ جانتے تھے کہ اگر اس خطے میں کہیں بھی یہ ٹوٹ پھوٹ ہوئی تو روس بھی اس سے محفوظ نہیں رہے گا۔

سنٹرل ایشیا کا سارا حصہ روس نے اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔ ذرا سی تبدیلی سے سارا سنٹرل ایشیا متاثر ہو سکتا تھا۔ وہ کبھی بھی یہاں کسی صوبے کو پاکستان سے الگ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ یہ تاثر بالکل غلط تھا کہ روس پاکستان کو توڑنا چاہتا ہے۔ ہاں وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ امریکہ کی نسبت پاکستان ان سے زیادہ قریب ہو اور وہ ان کے زیر اثر رہے۔ جہاں تک بلوچستان کا تعلق ہے یہ حقیقت ہے کہ جن دنوں پاکستان بنا۔ بلوچستان ایک آزاد ملک تھا۔ یہ نہ بھولیں کہ بلوچستان جغرافیائی لحاظ سے جنوبی ایشیا کا حصہ نہیں ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے بلوچستان مشرقِ وسطیٰ میں آتا ہے۔ بلوچستان کی حیثیت ہندوستان کی باقی تمام ریاستوں سے مختلف تھی۔ یہ ایرانی پلیٹو میں آتا ہے۔

س: یہ بات واضح نہیں، آپ کس طرح بلوچستان کو الگ ملک سمجھتے ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: بلوچستان معاہدے کے تحت انگریزوں کے ساتھ تھا۔ ہندوستان کی باقی تمام ریاستیں انگریزوں نے خود بنائیں یا فتح کیں۔ بلوچستان انگریزوں کے ساتھ باقاعدہ معاہدے کے ذریعے جڑا ہوا تھا۔ خان قلات نے جو تاریخ لکھی ہے اس میں بھی معاہدے کی تفصیلات درج ہیں۔

س: کیا یہ درست ہے کہ خان قلات نے کہا تھا کہ انگریزوں کو ہم نے اپنی حفاظت کے لئے بلایا تھا اس لئے ان کے جانے کے بعد اب ہم آزاد ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: کوئٹہ، نصیر آباد، چاغی وغیرہ لیز شدہ علاقے کہلاتے ہیں۔ ریاست قلات

نے یہ علاقے انگریزوں کو لیز پر دیئے ہوئے تھے۔ اب کون سا ایسا بدبخت انسان ہوگا جو ہم سے اتنی کم ظرفی کی امید رکھے کہ ہم آزاد ملک تھے اور کہے کہ آپ نے غلامی قبول کیوں نہیں کی اب آپ لوگ اتنا ظلم تو نہ کریں۔

س: چلئے کسی نہ کسی طرح آپ پاکستان میں شامل ہوگئے، کیا خان قلات کی قائداعظم سے دوستی نہ تھی؟

عطاء اللہ مینگل: خان قلات نہ صرف قائداعظمؒ کے دوست تھے بلکہ قائداعظم کو اپنا باپ بھی کہتے تھے لیکن باپ بیٹے کے رشتے کا جو انجام ہوا اگر خان قلات زندہ ہوتے تو وہ ہی اس کا جواب دیتے۔ سب سے پہلے پھر بیٹے پر ہی چڑھائی ہوئی۔

خان قلات کے دور میں جب بلوچستان دیوان عام اور دیوان خاص دونوں نے فیصلہ کیا کہ ہم الحاق نہیں کرتے تو پھر مجبوراً پاکستان کو اس پر چڑھائی کرنا پڑی۔ لوگوں کی مرضی کے خلاف قبضہ کیا تو پھر یہ پاکستان کا فرض تھا کہ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتا۔ انہیں راضی کرنے کی کوشش کرتا ان پر ثابت کیا جاتا کہ پاکستان میں ان کی شمولیت ان کے فائدے کے لئے ہے نہ کہ اس کی تباہی کے لئے لیکن صورتحال اس کے برعکس رہی۔ اس دن سے لے کر آج تک جو بلوچی پیدا ہوا ہے اس کو اپنی حب الوطنی ثابت کرنے کے لئے جتن کرنے پڑتے ہیں کہ وہ پاکستان کے ساتھ محب وطن ہے، پیدائشی طور پر وہ ایسا نہیں ہوتا۔ پاکستان میں شامل ہونے کے بعد سے ہمارے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔ جب آپ جانتے ہیں کہ اس میں جبر کا عنصر شامل تھا تو آپ لوگوں کے دلوں سے اسے نکالنے کے لئے کوشش تو کریں۔ بجائے اس کے کہ آپ ہمیں غدار، باغی اور دشمن کہیں آپ کو تو محبت بڑھانے کے لئے کام کرنا چاہئے تھا۔

س: آپ کی باتوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ جو خان قلات کے بھائی پرنس کریم والی مسلح جدوجہد تھی اور وہ جو آزاد بلوچستان کے پمفلٹ پکڑے گئے تھے، اسلحہ پکڑا گیا تھا سب جھوٹ تھا؟

عطاء اللہ مینگل: نہیں...... پرنس کریم نے بغاوت کی تھی۔ بغاوت اس کا حق تھا۔ بغاوت ہر بلوچ کا حق تھا، آپ کسی کے ملک پر آ کر قبضہ کرتے ہیں تو کیا وہ جواب نہ دے۔

مثلاً اگر ہندوستان یا افغانستان یا کوئی اور ملک پاکستان پر حملہ کرتا ہے تو اگر پاکستان کے لوگ گلی کوچوں میں نکل کر یا پہاڑوں پر جا کر ان کی مخالفت کرتے ہیں تو کیا آپ انہیں غدار کہیں گے۔

س: پاکستان میں شمولیت کے بعد اگر پاکستان کے خلاف مسلح جدوجہد کی جائے گی تو اسے غداری ہی کہا جائے گا؟

عطاء اللہ مینگل: سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا تو آپ لوگوں کا اپنا ہی معیار ہے۔ لیکن ان کو آپ غازی کہیں گے ان کو آپ محب وطن کہیں گے کوئی بھی انہیں غدار نہیں کہے گا۔ اگر وہ مریں گے تو انہیں شہید کہیں گے۔

س: ان لوگوں کے بارے میں آپ کے احساسات اب بھی یہی ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا، پاکستان میں ہم شامل ہوئے ہم نے یہی سوچا تھا کہ اب ہمیں اس کے ساتھ گزارا کرنا ہے لیکن ہمیں ایسا نہیں کرنے دیا گیا۔

س: یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ بلوچ سردار روسی ٹینکوں پر بیٹھ کر افغانستان گئے تھے اور انہی ٹینکوں پر بیٹھ کر پاکستان واپس آنا چاہتے تھے، یہ خیال کہاں تک درست ہے۔

عطاء اللہ مینگل: قطعاً نہیں......روس تو وہاں اتنا عرصے سے تھا، کیا آپ نے ہم میں سے کسی کو روسی ٹینک میں دیکھا۔

س: آپ افغانستان میں تو تھے وہاں روسی فوج بھی تھی اور وہاں آپ روس نواز حکومت کے مہمان تھے۔

عطاء اللہ مینگل: ہم پاکستان کے ہاتھوں سے بھاگ کر گئے تھے، آپ یقین کریں کہ اگر اس وقت ہم نہ جاتے تو ضیاء کے دور میں بھٹو سے پہلے ہم سولی پر لٹک جاتے لیکن ہم اس کے لئے تیار نہیں تھے، کیونکہ ہم نے ضیاء کے تیور دیکھ لئے تھے۔ فوجی حکومت تھی......قانون تو کوئی تھا نہیں۔

س: جب پاکستان اور افغانستان میں کشیدگی تھی روس افغانستان میں آ چکا تھا اور بلوچ سردار وہاں پر گئے اس سے یہ نتیجہ نکالنا تو بڑا آسان ہے کہ ایک طرح سے انہوں نے

ان کی افغانستان میں روس کی آمد کو تسلیم کیا اور ظاہر ہے کہ روسی سرداروں کی مدد لینے سے بھی ہچکچاتے تو نہیں ہوں گے۔

عطاء اللہ مینگل: ہم نے غلطی یہی کی کہ ہم نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

س: وہ کیسے؟ کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا؟

عطاء اللہ مینگل: روس افغانستان آ چکا تھا۔ پاکستان اور افغانستان کے حالات بہت کشیدہ تھے، ہمارے وہاں زیادہ افراد موجود تھے: (طنزیہ انداز میں) چاہئے تو یہ تھا ہم اپنے اتنے آدمیوں کو کسی کام پر لگاتے۔ وہاں کی فورس اور دوسری فورس کو ساتھ ملا کر جتنا ہو سکتا پاکستان کو نقصان پہنچاتے لیکن ہم اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے اس پر آپ ہمیں جتنا برا بھلا کہیں آپ حق بجانب ہیں۔ یہ کوتاہی ہم سے ضروری سرزد ہوئی ہے۔

س: آپ نے پاکستان کو نقصان نہ پہنچانے کا جو فیصلہ کیا تھا تو آپ کی سوچ کیا یہ تھی کہ پاکستان کو نقصان نہیں پہنچانا یا آپ کی سوچ یہ تھی کہ یہ طریقہ کار غلط ہے؟

عطاء اللہ مینگل: ہم نے صرف اپنے آدمیوں کو بچا کر وہاں رکھا تھا ہم صرف اپنے بچاؤ کے لئے وہاں گئے تھے۔ آپ خود بتائیں کہ وہاں سے بلوچوں نے کون سی ایسی حرکت کی جس سے آپ کو نقصان پہنچا۔ کسی چوکی پر ہم نے حملہ کیا نہ کسی آدمی کو مارا، ہم نے صرف اپنی جان بچا کر وہاں پناہ لی۔

س: آپ یہ فرمائیں کہ قوم پرستوں کے درمیان اختلافات کہاں سے اور کس وجہ سے پیدا ہوئے۔

عطاء اللہ مینگل: یہ اختلافات دولت کی وجہ سے پیدا ہوئے، پیسے تو ہوتے ہی ہیں لیکن انہوں نے تو پیسوں کے انبار لگا رکھے تھے۔ اسلم بیگ نے خود کہا کہ میں نے 14 کروڑ روپے بنک سے نکالے۔ یہ تو انہوں نے خود بتایا تو پتا چل گیا پہلے تو پتا ہی نہیں تھا کہ اتنے پیسے ہیں۔ آرمی چیف کا کیا کام ہے کہ پرائیویٹ بنک سے اتنے پیسے نکالے۔ یہ پیسے انہوں نے قوم پرستوں کو توڑنے کے لئے استعمال کئے اور وہ کامیاب بھی رہے، انہوں نے صرف بلوچستان بلکہ سندھ میں بھی کام خراب ہی کیا۔

سندھ میں بھی یہ حال ہے۔

س: لیکن بلوچستان کے قوم پرست پاپولر ہیں۔ سندھ کے قوم پرست ابھی تک منتخب نہیں ہو سکے۔

عطاء اللہ مینگل: منتخب ہوں یا نہ ہوں جب آئین ہی نہیں بخشا گیا تو ہمیں کہاں چھوڑیں گے۔

س: لیکن آپ سب تو منتخب ہوتے رہے۔

عطاء اللہ مینگل: ہم پر زیادہ توجہ نہیں دی شاید اس لئے ان پر زیادہ توجہ اور پیسے خرچ کئے۔

س: آپ سردار ہیں اور باقاعدہ منتخب ہوئے یہاں پر اور خان بھی ہیں مثلاً خان آف قلات، نواب اکبر خان بگٹی، خیر بخش مری صاحب سوشلسٹ تھے ایک طرف سرداری ہے، ایک طرف قبائلی سسٹم ہے دوسری طرف سوشلزم ہے، ان چیزوں میں تو تضاد تھا کہاں عوام کی بات اور کہاں سرداری؟ کہاں سوشلزم اور کہاں قبائلی نظام؟

عطاء اللہ مینگل: مسلمان غیر مسلم سے مسلم بنتا ہے وہ مسلمان سے مسلمان تو نہیں ہوتا اگر ہم نے اپنا مذہب تبدیل کیا تو اس میں کوئی برائی تو نہیں ہے اگر ایک قبائلی سردار عوام کی بات کرتا ہے کیا یہ ایک بری بات ہے۔

س: کیا یہ صرف نعرہ تھا یا آپ شعوری طور پر اس پر بات کرتے تھے؟

عطاء اللہ مینگل: جی ہاں ہماری باقاعدہ میٹنگ ہوتی تھی ہم سوچ سمجھ کر یہ بات کرتے تھے۔

س: آپ سردار کس طرح منتخب ہوئے، سردار تو وراثتی طور پر طے ہوتا ہے؟

عطاء اللہ مینگل: میرے والد سردار تھے ہماری ریاست تھی نواب ان کا خطاب تھا، یہ خطاب منتقل نہیں ہوتے۔ اب تو خطاب پورے خاندان کو منتقل ہو جاتا ہے اس وقت ایسا نہیں تھا۔ میرے والد نے 25 سال تک سرداری کی۔ ان کے اکثر خان آف قلات سے اختلافات رہتے تھے پھر جب پاکستان بنا اور ریاستیں آزاد ہوئیں۔ میرے والد کی رشتہ داری جام آف لسبیلہ کے ساتھ تھی چونکہ جام آف لسبیلہ اور خان آف قلات میں اختلافات تھے اور یہ اختلافات شدت اختیار کر گئے اس وقت تک لسبیلہ کی

پاکستان میں شمولیت کو نہیں مانا گیا تھا خدشہ تھا کہ شاید ریاست قلات اور ریاست لسبیلہ میں جنگ ہو جائے۔ ہمارا قبیلہ ان دونوں کے درمیان میں ہے خان قلات نے والد صاحب کو پیغام بھیجا کہ لسبیلہ کو چھوڑ کر آپ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں والد صاحب کو خدشہ تھا کہ اگر میں یہاں سے چلا گیا تو خان قلات لسبیلہ پر حملہ کر دیں گے۔ اس وجہ سے انہوں نے انکار کر دیا۔ میں ان حالات میں لسبیلہ کو نہیں چھوڑ سکتا میری ان کے ساتھ پرانی رشتہ داری ہے جس کے باعث اختلافات زیادہ شدید ہو گئے۔ خان قلات اس وقت کافی طاقتور تھے، بعد میں والد صاحب نے لسبیلہ کو بھی چھوڑ دیا کیونکہ پاکستان سے الحاق کے بعد پاکستان نے لسبیلہ کا دفاع کیا تو والد صاحب کراچی چلے گئے وہ علاقے میں خان قلات کی وجہ سے نہیں جا سکتے تھے پھر یہ سلسلہ چلتا رہا خان قلات دوسرے آدمی کو سردار بنانا چاہتے تھے۔ انہیں حکومت پاکستان نے قبول نہ کیا اور والد صاحب کو خان قلات نے قبول نہ کیا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ والد صاحب پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ علاقے میں داخل نہیں ہو سکتے پھر اکرم خان سردار بننے کے لئے میدان میں آگئے اور مارے گئے۔ پھر مجھے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر مقابلہ پر آنا پڑا اس وقت بلوچستان اسٹیٹ یونین بن چکی تھی پھر اس اسٹیٹ یونین کے صدر نے آکر ریفرنڈم کروایا اور میں جیت گیا اس وقت سردار کی منظوری صدر پاکستان دیا کرتے تھے پھر میں 1954ء میں سردار منتخب ہو گیا۔ میں لسبیلہ میں پیدا ہوا۔ بلوچستان میں، میں پہلی بار 1952ء میں گیا میری عیش و عشرت کی مدت بلوچستان میں بڑی مختصر تھی اس کے بعد تو سیاست میں آگئے۔

س: آپ کہتے ہیں کہ آپ سوشلسٹ نہیں تھے تو کیا آپ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے حامی ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: میں خواہ مخواہ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں ملا ہوں مجھے کیوں مسعود اظہر کی فہرست میں شامل کرتے ہیں میں صرف ایک بلوچ نیشنلسٹ تھا، جمہوریت پسند تھا۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں تھا۔

س: بطور مدبر آپ کوئی درمیانہ راستہ نکالیں، سیکولر اسٹیٹ کی بات تو بہت سے لوگ کرتے ہیں۔

عطاء اللہ مینگل: اگر پاکستان کو آپ اسلامی ملک بنانا چاہیں گے تو آپ یہ کوئی نیکی کا کام نہیں کریں گے۔ آپ اپنے جذبات کی تسکین تو کریں گے لیکن اس ملک کے ساتھ نیکی نہیں کریں گے میری رائے میں اسے ایک سیکولر جمہوری ملک بن کر ہی چلنا ہوگا۔ آج کی دنیا میں اگر آپ نے اسے اس طرح دھکیلا تو پھر اس کے ساتھ ساتھ آپ کو ملک کا انجام بھی سوچنا ہوگا۔

س: موجودہ حالات میں کیا آپ۔ سمجھتے ہیں کہ سیکولر اور جمہوری نظام مستقبل میں کبھی اکٹھے آسکتے ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: سیکولر اور جمہوری نظام آسکیں گے۔

س: مارشل لا نافذ ہے اور بنیاد پرست طاقتور ہوتے جا رہے ہیں تو اس صورتحال میں کیا مستقبل نظر آتا ہے؟

عطاء اللہ مینگل: مجھے لگتا ہے کہ پرویز مشرف اس ملک کو بنیاد پرستی کی طرف نہیں جانے دیں گے۔

س: جمہوریت کا یہاں پر کیا مستقبل ہے؟

عطاء اللہ مینگل: جمہوریت کا لفظ تو ان کی کتاب میں شامل نہیں ہے۔ ہمارے ملک کا محل وقوع کچھ اس طرح سے ہے کہ ہم اپنی مرضی سے کوئی چیز نہیں بنا سکتے ہم باہر کی دنیا سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارے پڑوس میں انڈیا ایک اتنی بڑی جمہوریت ہے پھر ہم کس طرح ایک بنیاد پرست کے طور پر رہ سکتے ہیں تو اس لئے ہمیں سیکولر ہونا پڑے گا نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کو ایک جمہوری ملک بننا پڑے گا اس میں شک نہیں کہ ہم نے جمہوریت کو غلط استعمال کیا ہے ہمیں اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنا ہوگا لیکن پھر بھی جمہوریت کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں ہے کیونکہ اب تو دنیا سکڑ کر ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئی ہے کہ آپ کو اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرنا ہوگا بلکہ دنیا کی طاقتیں ہیں ان کو مدنظر رکھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ آزادی تو اب دنیا میں کہیں نہیں رہی اب تو یہ دیکھنا ہوگا کہ امریکہ کیا چاہتا ہے۔ یورپ اور ایشیا کیا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ آپ اپنی معیشت کو کس طرح چلا سکتے ہیں۔ بہت سے عنصر ہیں جن کو مدنظر

رکھنا ہوگا۔ اگر بات منشا سے ہوتی تو پرویز مشرف صاحب کوئی اور زبان بولتے لیکن وہ بھی جھجک کر بولتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ اس طرح سے آزاد نہیں ہیں جس طرح سے وہ رہنا چاہتے ہیں ان پر دباؤ بہت ہے اگر کوئی اس ملک میں ڈکٹیٹر شپ قائم کرنا چاہتا ہے تو میں آپ کو یقین سے کہتا ہوں کہ اگر اس ملک میں اصل جمہوریت کو پنپنے نہیں دیا گیا تو یہ ملک نہیں رہے گا اگر آپ ڈکٹیٹر شپ کو جمہوریت کا نام دیں گے تو لوگ اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ اسے مانیں۔

س: کیا آپ ملک نہ رہنے کا بھی امکان دیکھتے ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آپ جمہوریت کو کتنی جلدی ننگا کرتے ہیں۔

س: جمہوریت تو اس وقت بھی نہیں ہے؟

عطاء اللہ مینگل: نہیں ابھی تو کہہ رہے ہیں کہ ہم الیکشن کرالیں گے جس دن آپ بیانگ دہل اعلان کریں گے کہ کوئی جمہوریت نہیں ہے اور ہم ڈنڈے کے زور پر حکومت کریں گے جس دن یہ اعلان ہوا اس کے بعد میں 6 مہینے سے زیادہ کا وقت نہیں دیتا۔

س: ایسا تو نہیں ہے کہ جس دن ہم حقیقی جمہوریت کی طرف جائیں گے جس طرح روس گیا، ہماری سلامتی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

عطاء اللہ مینگل: روس جمہوریت کی وجہ سے نہیں ٹوٹا وہ اپنی معاشی تباہی کی وجہ سے ٹوٹا ہے۔ وہاں اتنی معاشی تباہی آچکی تھی جس کا ہمیں پتا نہیں تھا۔ بیرونی ممالک میں بھی روس کی اس حالت کا کسی کو علم نہیں تھا۔

س: پاکستان کے اندر آپ کے مسائل حل ہو سکتے ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: اگر ہمارا بھلا ہوگا تو اس ملک میں ہوگا۔

س: مینگل صاحب آپ کی سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی؟

عطاء اللہ مینگل: جی نہیں! میں شروع سے کہہ رہا ہوں کہ ہمیں دھکیلنے کی کوشش بہت کی گئی۔

س: کیا 20 سال پہلے بھی آپ کی یہی سوچ تھی؟

عطاء اللہ مینگل: جی 20 سال پہلے بھی میری یہی سوچ تھی کہ ہمارا بھلا اسی ملک میں ہے

ہمارے کان میں بار بار یہ کہا گیا کہ جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے، مصیبت یہ ہے کہ ہمیں کوئی راستہ نہیں ملتا۔ قسم خدا کی اگر ہمیں کوئی راستہ ملتا کہ ہماری بھلائی کہیں اور ہے تو ہم ضرور جاتے۔ راستہ ہی نہیں ملا تو ہم کہاں جاتے۔

س: کیا بلوچستان کے لئے راستہ آزادی نہیں ہے، کئی لوگ تو یہ بات کرتے ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: ہم کیسے آزاد رہ سکتے ہیں۔ ایک طرف افغانستان ہے وہ ہم سے زیادہ طاقتور ہے۔ ایک طرف ایران ہے جس کا پہلے سے ہی ہم پر دعویٰ ہے وہ بھی ہم سے زیادہ طاقتور ہے۔ ان کے درمیان میں کس طرح سے ہم ایک چھوٹا سا ملک چلا سکتے ہیں۔

س: کئی لوگ افغانستان سے معاملات اچھے کرنے کی بات کرتے ہیں۔

عطاء اللہ مینگل: آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ ہے۔ کیا ہم اتنے بیوقوف ہیں۔

س: کیا آپ نئے سورج کو نئی امید سے دیکھتے ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: کیونکہ کوئی اور راستہ نہیں ہے تو ہم یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ چلو آج نہیں تو کل کوئی اچھا دن آئے گا۔

س: آپ افغانستان بھی گئے؟

عطاء اللہ مینگل: میں وہاں زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ صرف ایک مہینے کے لئے گیا تھا میں لندن میں رہا۔ خیر بخش مری کو بھی لندن میں نہیں چھوڑا تو وہ گئے خیر بخش یہاں سے افغانستان جانے کے لئے نہیں گئے تھے وہ لندن گئے لندن سے پھر پیرس گئے وہاں ان کو روک لیا کہ آپ کو انٹری نہیں دیتے ان کے بچے لندن میں اور وہ خود پیرس میں تھے پھر جب کوئی اور راستہ نہ رہا تو انہوں نے افغانستان والوں سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم آ جائیں تو انہوں نے کہا کہ آ جائیں، تو وہ چلے گئے۔

س: افغانستان میں کس قدر حیران کن تبدیلیاں آئی ہیں کہ کہاں پر وہ ایک سوشلسٹ اور لبرل ملک تھا اب وہاں پر طالبان آ گئے ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: ہر جبر کا لوگ اسی طرح جواب دیتے ہیں۔

س: کیا پہلے جبر تھا اب ٹھیک ہے۔؟

عطاء اللہ مینگل: پہلے جبر تھا اب جنون ہے، نہ وہ ٹھیک تھا اور نہ یہ درست ہے۔ جنون کی بھی عمر کم ہوتی ہے اور جبر کی بھی۔

س: جبر کی تو کافی لمبی عمر ہوتی ہے؟

عطاء اللہ مینگل: جبر کی عمر اکثر ختم ہو جاتی ہے، جنون تو مختصر ہوتا ہے۔ جبر بھی زیادہ دیر نہ چل سکا اب جنون بھی زیادہ دیر نہیں چل سکے گا۔ اسے ایک منطقی انجام پر پہنچنا ہوگا۔

س: آپ عوامی سیاست کیوں نہیں کرتے۔ آپ جمہوریت کی بات کر رہے ہیں تو ملک میں جو پارٹیاں جمہوریت کی بحالی کی بات کریں گی ان کے ساتھ شامل کیوں نہیں ہوتے؟

عطاء اللہ مینگل: میں ذہنی طور پر ابھی تک اپنے آپ کو اس قوم کا حصہ ہی نہیں سمجھتا۔

س: جب تک آپ کسی کے ساتھ مل کر چلیں گے نہیں تو کیسے پتا چلے گا کہ آپ کے مسائل کیا ہیں جیسے سندھ کا پرائم منسٹر بنا، صوبہ سرحد کے لوگوں کو نمائندگی ملی، بلوچستان کو ایسا موقعہ نہیں مل سکا؟

عطاء اللہ مینگل: سندھ کے پرائم منسٹر کو لٹکا دیا گیا۔

س: پنجاب کے وزیراعظم کا بھی ٹرائل ہو رہا ہے۔

عطاء اللہ مینگل: وہ نہیں لٹکنے لگا اسے سزا دیں گے سزائے موت کا شاید ایک بار اعلان کریں لیکن پھانسی نہیں دیں گے کیونکہ وہ پنجابی ہیں۔

س: آپ کے خیال میں پنجاب کے لوگ مقدس ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: انہیں پھانسی نہیں ہوگی، ہم نہیں چاہتے کہ انہیں سزا ہو اور نہ ہی ہمیں اس سے کوئی خوشی ہوگی، سزا کا تصور صرف ہم جیسے چھوٹے صوبوں کے لئے ہے۔

س: کسی زمانے میں آپ اس خیال کے حامی تھے کہ چھوٹے صوبوں کی تحریک جیسا کہ ممتاز بھٹو کا فرنٹ تھا، مسائل کا حل ہے۔ کمزور طبقوں کے لئے آپ اب کیا دیکھتے ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: اس وقت تو پونم ہم جیسے چھوٹے صوبے کا رونا ہی رو رہی ہے تاہم اس نے اس سلسلے میں کوئی عملی اقدام نہیں کیا کہ کہا جائے اس نے یہ کیا ہے لیکن اگر سیاسی

سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں تو پونم چھوٹے صوبوں میں ایک طاقت ور تحریک کے طور پر ابھرے گی۔

س: فوجی حکومت کی طرف سے اجمل خٹک کو صدر بنانے کی تجویز زیر غور ہے اس سے بہتری ہو سکتی ہے؟

عطاء اللہ مینگل: وہ تو پونم چھوڑ کر چلے گئے ہیں میں نے ہی تو ان کے خلاف بغاوت کی تھی۔ ہمارا اجلاس ہو رہا تھا۔ وہ ہمارا اجلاس چھوڑ کر جی ڈی اے کے اجلاس میں چلے گئے، اسفندیار نے انہیں وہاں لے جا کر بٹھا دیا۔ ہم نے ان سے کہا کہ ہمارا اجلاس جاری ہے آپ انہیں کیسے لے جا سکتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ میری پارٹی نے مجھے بلایا ہے تو ہم نے کہا کہ پھر آپ کو آپ کی پارٹی مبارک ہو۔ ہم نے بڑے دکھ کے ساتھ ان کو الوداع کہا۔

س: خان عبدالولی خان کے ساتھ آپ کو اختلاف تھا؟ کہاں تو آپ ان کی گاڑی چلا کر خود ان کو بلوچستان کی سیر کروایا کرتے تھے اور کہاں آپ نے سیاسی راستے ہی الگ کر لئے؟

عطاء اللہ مینگل: میں ولی خان کی بے حد عزت کرتا ہوں وہ بزرگ ہیں ہمارے ساتھی رہے ہیں۔ اگر آج بھی وہ میرے سامنے آئیں اور میں ان کی گاڑی چلا سکا تو ضرور چلاؤں گا۔ سیاست بڑی بدبخت چیز ہوتی ہے۔ انسان اپنی پسند یا ناپسند کو قائم نہیں رکھ سکتا اور بہت سے دیگر عناصر ہوتے ہیں جو لوگوں کی قربت اور جدائی کی وجہ بن سکتے ہیں۔ مثلاً قومی مفادات اور سیاسی ضروریات۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ہم سمجھتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے کام آ سکتے ہیں تو ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ پھر ایک مقام ایسا آیا کہ ایسا لگا کہ جیسے خان ولی خان کو ہماری ضرورت نہیں رہی تو ہم نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ وہ کہیں کہ آپ اپنا راستہ ناپیں اور ہم بے آبرو ہو کر محفل سے نکلیں تو ہم پہلے ہی علیحدہ ہو گئے۔

س: آپ ولی خان اور بیگم نسیم ولی خان کی قیادت میں کوئی فرق محسوس کرتے ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: بہت فرق تھا۔ ولی خان کی سیاست میں قوم پرستی کے عناصر نمایاں تھے۔

بیگم ولی خان کی سیاست جدید تقاضوں کے مطابق تھی۔ ہم جیسے پرانے خیالات کے لوگ ان کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔

س: آپ نے بڑی احساس محرومی کا اظہار کیا آپ اپنے آپ کو اس ملک کا حصہ نہیں سمجھتے لیکن آپ خوش قسمت انسان ہیں کہ آپ باپ بیٹا دونوں وزیراعلیٰ بنے۔ پورے پاکستان میں کسی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہے۔

عطاء اللہ مینگل: ہو سکتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرے بیٹوں کو یہ گمان گزرتا کہ میں نے غلط سیاست کی ہے۔ انہیں بھی تجربہ ہو گیا اب وہ مجھے غلط نہیں کہیں گے۔

س: لیکن یہ خوش قسمتی تو بہرحال ہے دنیا کے کسی ملک میں یہ مثال نہیں ہے کہ باپ کے بعد بیٹا بھی وزیراعلیٰ بنے۔

عطاء اللہ مینگل: لیکن پرائم منسٹر تو بنے ہیں بھٹو اور بے نظیر۔

س: لیکن ہم تو چیف منسٹر کی بات کر رہے ہیں۔

عطاء اللہ مینگل: بیوقوف بنانے کے لئے تو سارے خاندان کو بیوقوف بنایا جا سکتا ہے۔ بھٹو کو بیوقوف بنایا گیا ان کی بیٹی کو بنایا گیا اور جہاں مجھے بنایا گیا وہاں میرے بیٹے کو بھی بیوقوف بنایا گیا۔

س: آپ اور آپ کے بیٹے میں سے کون بہتر چیف منسٹر تھا؟

عطاء اللہ مینگل: میں اپنے بیٹے سے کچھ کم خوش فہم واقع ہوا ہوں۔ وزیراعلیٰ بنتے وقت میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ بھٹو صاحب ہمیں زیادہ دیر تک نہیں چلنے دیں گے لیکن میرا بیٹا کسی حد تک خوش فہمی میں تھا کہ شاید اس کو کچھ عرصہ رہنے دیا جائے گا یہ فرق ہم میں ضرور تھا۔ بیٹے میں کچھ خامیاں تھیں اور میرے میں کچھ خوبیاں تھیں۔ وہ نواز شریف پر کچھ زیادہ اعتماد کر چکا تھا۔ وہ میرٹ پر چیف منسٹر بنا۔ اپنی پارٹی کی بنیاد پر بنا۔ اس کو ایک مخلوط گورنمنٹ میں جانا پڑا جو اکثر کمزور ہوتی ہے۔ پھر بھی اس کو یہ خیال تھا کہ شاید یہ حکومت زیادہ عرصے تک چلے اور میں اس یقین کے ساتھ بنا تھا کہ بھٹو صاحب ہمیں نہیں چھوڑیں گے جس دن انہیں موقع ملے گا وہ ہمیں ہٹا دیں گے۔ جب نواز شریف نے 8 ویں ترمیم کے بارے میں قدم اٹھایا جب سب کے دل میں

تھا کہ 8 ویں ترمیم ختم ہونی چاہیے۔ میں اس وقت اسمبلی کا ممبر نہیں تھا۔ نواز شریف نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں بن جاؤں گا شیر کا پتر۔ اس وقت تک میں نے نواز شریف سے پیارا آدمی نہیں دیکھا تھا۔ جس دن یہ ترمیم منظور ہوئی دوسرے دن انہوں نے سب کی دعوت کی میں بھی دعوت میں شریک تھا۔ میں نواز شریف، مصطفیٰ کھر، اجمل خٹک ہم سب ایک ہی ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ میں نے نواز شریف کو دیکھا تو ایسا لگا کہ یہ شخص نا آشنا ہے۔ انہوں نے فوراً آنکھیں بدل لیں۔ ہم کھانا کھا کر باہر نکلے گیٹ تک پہنچے ہی تھے گاڑی میں ابھی نہیں بیٹھے تھے میں نے اکبر بگٹی سے کہا کہ تم نے آج کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی انہوں نے کہا کہ کیا؟ میں نے کہا کہ کیا تم نے نواز شریف کو دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا کیوں؟ میں نے کہا کہ یہ کل والا نواز شریف تو نہیں ہے۔ یہ طوطا چشم آدمی ہے آپ کو اس کی آنکھوں میں کچھ دکھائی نہیں دیا؟ اکبر بگٹی نے کہا کہ میں نے نوٹ نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ مجھے صاف نظر آتا ہے کہ یہ وہ آدمی ہی نہیں ہے۔ اکبر نے مجھے بتایا کہ میں نے نواز شریف سے کہا ہے کہ عطاء صاحب ایسے کہہ رہے تھے انہوں نے کہا کہ میں نے تو ایسی کوئی چیز نہیں کی۔ انہوں نے یہ رائے کیوں دی؟ میں نے اکبر سے کہا کہ تم نے کیوں کہا میں نے تو ویسے ہی تم سے کہا تھا یہ شخص تو ملک کی دو تہائی آبادی کا مالک ہے۔ اسے تم نے ناراض کر دیا۔ جس آدمی نے ان کے ساتھ نیکی کی انہیں نواز شریف نے نہیں بخشا ہمارے اور سجاد علی شاہ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ میں سمجھتا تھا ان کے نام میں شریف کا لفظ رکھا گیا ہے، اس لفظ کا ان کے ساتھ کوئی تعلق بھی ہوگا لیکن بالکل نہیں ہے۔

س: جب بھٹو کو پھانسی ہوئی تو تمام تر اختلافات کے باوجود آپ کو دکھ تو ہوا ہوگا؟

عطاء اللہ مینگل: ہم نے اس کی موت پر شادیانے نہیں بجائے لیکن اگر یہ کہا کہ اس کے مرنے کا دکھ ہوا تو یہ بہت بڑا جھوٹ ہوگا۔

س: کہتے ہیں کہ بلوچستان اور سندھ میں عورتوں کے ساتھ بڑا ظلم ہوتا ہے آپ کی کیا رائے ہے۔

عطاء اللہ مینگل: عورتوں کا جو مقام آپ دیکھتے ہیں وہ ترقی یافتہ معاشرے کا ہے، جب

معاشرہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچے گا تو خواتین اپنا حق آپ سے چھین لیں گی۔ ہمارا معاشرہ ابھی اس مقام تک نہیں پہنچا۔ اس میں نہ بلوچوں کا قصور ہے اور نہ سندھیوں کا بلکہ یہ قصور ان لوگوں کا ہے جو معاشرہ کو اس مقام تک نہیں لے جا سکے، آپ ان لوگوں کو کوسیں جو معاشرہ کو ترقی یافتہ مقام تک نہیں لے جا سکے۔ اگر وہ لوگ اس معاشرے کو ترقی یافتہ بناتے تو ان کی عورتیں بھی آج پنجاب اور یورپ کی عورتوں کے برابر ہوتیں۔ اگر پنجاب کی عورت کو دیکھیں تو اس کے حقوق یورپ کی عورت کے مقابلے میں کم ہیں کیونکہ ان کا معاشرہ آپ سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ تو پھر آپ کیسے اس معاشرے کا مقابلہ اپنے معاشرے سے کرتے ہیں جب تک یہ معاشرہ ان کے برابر نہیں آئے گا کس طرح آپ ان کا مقابلہ ترقی یافتہ معاشرہ سے کریں گے۔

س: بے نظیر بھٹو سے ملاقات ہوئی؟

عطاء اللہ مینگل: بے نظیر جب وزیراعظم تھیں تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔

س: آپ نے ان کو کیسا پایا۔ کیا وہ اپنے باپ سے مختلف ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: ان کے والد بہت ہوشیار آدمی تھے، لیکن یہ اتنی ہوشیار نہیں ہیں۔

س: بھٹو..... ضیاء اور ایوب میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں۔

عطاء اللہ مینگل: ایوب سے میری ملاقات 15 منٹ کی ہے، ان دنوں میں ایم این اے تھا، وہ بھی ہجوم میں ہوئی کہتے ہیں کہ: 'Man speaks through his hat'' وہ نئے نئے فیلڈ مارشل اور صدر بنے تھے، انہوں نے اسمبلی بھی بنائی تھی۔ میں نے انہیں ایک عقلمند انسان پایا۔ ان کے اردگرد جو آدمی تھے وہ ہوشیار ضرور تھے لیکن وہ خود اتنے ہوشیار نہیں تھے۔ بھٹو صاحب بہت قابل آدمی تھے۔ بھٹو فطرتاً جمہوری آدمی تھے ہی نہیں ان کا جمہوریت سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو عوام کا آدمی کہتے ضرور تھے۔ میں جن دنوں وزیراعلیٰ تھا کراچی آیا ہوا تھا۔ دس پندرہ منٹ ان کے ساتھ بیٹھے جب ہم جانے لگے تو دروازے پر پہنچے تو بھٹو صاحب نے ہمیں آواز دی، وہ بیٹھے تھے اور میں کھڑا تھا اور کہا کہ کیا اس ملک میں جمہوریت چل

سکتی ہے۔ میں بڑا حیران ہوا اور میں نے کہا کہ پتا نہیں لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر اس ملک میں جمہوریت نہ رہی تو آپ بھی نہیں رہیں گے کیونکہ آپ کے لئے جمہوریت بہت ضروری ہے۔ وہ ہنس پڑے اور کہا کہ میں تمہیں ڈنڈے کے زور پر 15 سال تک اس ملک پر حکومت کر کے دکھاؤں گا۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ جمہوریت کی ضرورت ہے یا نہیں۔

س: ضیاء الحق کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

عطاء اللہ مینگل: وہ اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور تھے۔ گرمجوشی بڑی ظاہر کرتے تھے کہ ہر عام آدمی کو خود جا کر گاڑی میں بٹھاتا تھا اور دوسری طرف جو بات آپ کے ساتھ یہاں کرتا تھا وہاں جا کر مکر جاتا تھا۔ اس کی ٹائمنگ بڑی اچھی تھی، ہر کام کو بڑے صحیح وقت پر کرتا تھا۔ جس کے ساتھ زیادتی کرنی ہوتی تھی اس کا وقت مقرر ہوتا تھا۔ شائد اسٹڈی کرنے کے بعد وہ کوئی قدم اٹھاتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے مشورہ گیر اچھے ہوں لیکن وہ تھا بڑا منافق۔ اپنے مفاد کو آگے رکھتا تھا۔

س: آپ کے بگٹی اور مری صاحب کے ساتھ کیسے مراسم ہیں۔

عطاء اللہ مینگل: مری صاحب کے ساتھ میری نیازمندی ابھی تک ہے۔ ان کا طریقہ کار اپنا ہے، میرا اپنا ہے۔ وہ ایک میز پر 50 بار سوچتے ہیں اور پھر فیصلہ کرتے ہیں اور میں بغیر سوچے سمجھے فیصلہ کرتا ہوں اس لئے میری غلطیاں ان کی نسبت زیادہ ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ کوئی کام کرتے نہیں ہیں اس لئے ان کی غلطیاں کم ہوتی ہیں۔ وہ اتنی بار سوچتے ہیں کہ کام کا وقت ہی نکل جاتا ہے۔ انہیں خود بھی اس بات کا احساس ہے لوگ بھی ان سے کہتے ہیں، انہیں اس چیز کا ازالہ کرنا چاہئے بہرحال وہ اپنی عادت سے مجبور ہیں اور میں اپنی سے۔

بگٹی صاحب اور میں شروع سے اکٹھے رہے ہم دوست تھے میری ان کے بارے میں رائے یہ تھی کہ وہ دوست اچھے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں انہوں نے دانستہ مجھے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک دوبار کوشش کی کہ دوبارہ سے حالات ٹھیک ہوں کیونکہ میرا خیال تھا کہ انہوں نے اتنی بڑی غلطی کرنے کے بعد سوچا ضرور ہوگا لیکن میں نے

دیکھا ہے کہ جو انسان اس طرح کے کام کرتا ہے وہ شعوری طور پر ایسا نہیں کرتا بلکہ یہ اس کی فطرت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی فطرت کے سامنے مجبور ہوتا ہے۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بگٹی صاحب کو بار بار تکلیف نہ دی جائے اور نہ ہی آزمایا جائے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر وہ آج بھی بلوچستان کی بھلائی کے لئے کوئی کام کرنا چاہے گا تو میں ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔

س: سیاست میں فوج کا رول ہونا چاہئے۔

عطاء اللہ مینگل: نہیں...... بالکل نہیں اس ملک میں جو سب سے بڑی تباہی آئی ہے وہ یہی ہے کہ فوج کا بلاواسطہ یا بالواسطہ عمل دخل سیاست میں رہا ہے۔

س: سیاست دان بہت کرپٹ ہیں؟

عطاء اللہ مینگل: سیاست دانوں کو فوج نے کرپٹ کیا۔

س: وہ کیسے؟

عطا اللہ مینگل: لیاقت علی خان کو گولی لگنے کے بعد فوج نے عملی طور پر ملک کو ٹیک اوور Take over کر لیا جن کا نہ کوئی حلقہ تھا نہ قوم تھی نہ لوگ تھے آخر ان کے پیچھے کوئی طاقت تو تھی جو وہ ہم پر حکومت کرتے رہے وہ ''ہکلا'' (غلام محمد) ہم پر کتنے دن گورنر جنرلی کرتا رہا۔ آخر وہ کس کے بل بوتے پر کرتا رہا وہ صرف فوج کے بل بوتے پر ہم پر حکومت کرتا رہا آخر میں انہیں کہا کہ اب ہم یونیفارم میں آئے ہیں۔ ایوب خان آ گئے۔ ایوب خان کا کچھ عرصہ بڑا اصاف ستھرا گزرا لیکن ایوب خان کا آخری عرصہ جب ان کے عزیز رشتہ دار اور بیٹے فیکٹریاں لگانے لگے تو وہ ان کے ہاتھوں قیدی بن چکے تھے لیاقت علی خان سے لے کر یحیٰی خان تک کا دور فوج ہی کا دور تھا۔

(انٹرویو نگار، سہیل وڑائچ۔ 19 اپریل 2000ء جنگ سنڈے میگزین)

سردار عطاء اللہ مینگل سے دوسرا انٹرویو جو مئی 2005ء کو لیا گیا تھا۔ کراچی کے ممتاز صحافی شارق میر نے لیا۔ ان کے تاثرات اور سردار مینگل سے سوالات اور جوابات کا سلسلہ ملاحظہ فرمائیں۔

''بلوچستان، معدنی دولت کے ان گنت خزانے اپنے سینے میں چھپائے خاموش

پہاڑوں کی ایک ایسی سرزمین ہے جس کی جغرافیائی، معاشی اور سیاسی صورتحال نہ صرف پاکستان بلکہ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں بھی بہت اہمیت اختیار کر چکی ہیں۔ وطن عزیز کا ہر متفکر شہری یہ جاننا چاہتا ہے کہ آخر وہ کیا وجوہات ہیں جن کے باعث محبتوں کی یہ زمین آتش فشاں کی مانند لاوا اگل رہی ہے۔ اس حوالے سے گزشتہ دنوں اخبار جہاں نے بلوچستان کی ایک اہم اور بااثر شخصیت، بلوچستان کے سابق وزیراعلیٰ، بلوچستان نیشنل پارٹی کے سربراہ اور قوم پرست جماعتوں کے اتحاد ''پونم'' کے صدر سردار عطا اللہ مینگل سے خصوصی نشست کا اہتمام کیا، جس میں بلوچستان کے میگا پروجیکٹس، فوجی آپریشن، چھاؤنیوں کے قیام، ڈیرہ بگٹی اور کوہلو کی صورتحال، حکومتی پارلیمانی کمیٹی سے ہونیوالے مذاکرات، بلوچ نیشنلزم کی تحریک، بیرونی طاقتوں کی اس خطے میں دلچسپی سمیت بلوچستان کے مستقبل کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو ہوئی جو نذر قارئین ہے۔

س: سردار صاحب بلوچستان کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر آتے رہے ہیں، بلوچستان 2005ء، بلوچستان 2010ء، بلوچستان 2015ء نئی صدی کے آغاز پر آپ بلوچستان کا مستقبل کہاں دیکھتے ہیں؟

ج: اگر ہمیں ماضی میں کوئی امید کی کرن دکھائی دیتی تو میں یہ سمجھتا کہ بلوچستان کا مستقبل اس صدی میں بہت روشن ہوگا، لیکن پاکستان کی 57 سالہ تاریخ کو اگر دیکھا جائے تو وہ مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں کسی ایسی خوش فہمی کا شکار ہو جاؤں کہ اس صدی میں بلوچستان کامیابی یا خوشحالی کی منزل کی جانب گامزن ہوگا اور خاص طور پر اب جو نشانیاں ابھر کر سامنے آ رہی ہیں یا جو ارادے نظر آ رہے ہیں یہ ارادے کس کے ہیں اب میں پنجاب کا نام نہیں لوں کیونکہ لوگ کہیں گے کہ ہمیں پنجاب سے خواہ مخواہ کی مخاصمت ہے۔ بہر حال وفاق کے جو ارادے ہیں، اس میں مجھے بلوچستان کی عافیت کہیں نظر نہیں آ رہی۔ جتنی بھی باتیں ہیں یا جو وعدے کئے جا رہے ہیں وہ ساری کی ساری محض لفاظی ہے کہ ہم بلوچستان کی خوشحالی کے لئے یہ کر رہے ہیں وہ کر رہے ہیں، یہ سب باتیں کرنے والے سارے کے سارے 57 سال سے اندھے تھے جو انہیں اتنے عرصے بلوچستان کا خیال نہیں آیا اور آج اچانک انہیں بلوچستان کی

پسماندگی دکھائی دے رہی ہے اور ترقی کی سوجھ رہی ہے۔ ہم سوچ میں پڑ گئے ہیں کہ یہ ہمارے یار لوگوں کے دل میں اچانک کیوں خیال آیا کہ ہم بلوچستان کو جنت بنائیں گے، یہ اچانک خوشگوار تبدیلی کو دیکھ کر ہمیں احساس ہو چکا ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے لئے نہیں بلکہ اوروں کے لئے بن رہا ہے۔ اس ترقی کے پیچھے میں دیکھتا ہوں کہ بلوچستان کو بیک جنبش قلم، بیک حرکت قلب، بیک حرکت دست ایک ایسی کالونی میں تبدیل کیا جا رہا ہے جہاں اکثریت باہر کے لوگوں کی ہو اور بلوچوں کو اقلیت میں بدل کر یہاں کی مقامی آبادی کے تاریخی دعویٰ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ بلوچستان میں ترقی چاہے گوادر پروجیکٹ کے نام سے ہو یا کسی اور نام سے، ہم اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ ہم اگر ترقی کے خواہاں ہیں تو وہ ایسی ترقی ہو جو یہاں کے مقامی باشندوں کے لئے ہو، ہم مختلف پروجیکٹ کے نام پر اپنی تباہی، اپنے ملک کی تباہی بلوچستان کی تباہی نہیں چاہتے۔ ہم اس ترقی کے عوض اپنے تشخص، اپنی پہچان سے دستبردار نہیں ہونا چاہتے۔ پھر آپ نے دیکھا کہ حکومت سے ہونے والے مذاکرات میں بھی ہم نے ہمیشہ یہ موقف اختیار کئے رکھا کہ بندوق کی نال پر یا کسی بھی قسم کے دباؤ میں بات کرنے کے ہم قائل نہیں۔ سرکاری بندوقیں صاف کی گئیں تو ہم نے فوراً محسوس کر لیا کہ ان کا رخ یقیناً ہماری ہی طرف ہوگا، پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ بندوقیں ہماری طرف ہی اٹھیں، ہمارے لوگ مارے گئے۔ اب میں یہ کیا کہوں کہ کون سی چیز بیچ میں آئی اور انہیں یہ آپریشن روکنا پڑا، لیکن یہ آپریشن اس نیت سے شروع نہیں کیا گیا تھا کہ اسے روکا جائے۔ حکومتی پارلیمانی کمیٹی سے ہونے والے مذاکرات کے حوالے سے میں یہی کہوں گا کہ مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ ہم انہیں اپنی بولی سمجھا نہیں سکے یا یوں کہیے کہ ''وہ ترکی زبان کے علاوہ کچھ سمجھتے نہیں اور ہم ترکی جانتے نہیں۔'' پارلیمانی کمیٹی نے اب تک ہماری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اب تک تو یہ ہو رہا ہے کہ وہ کچھ اور کہہ رہے ہیں، ہم کچھ اور کہہ رہے ہیں۔

س: لگتا ہے کہ بلوچستان ایک عالمی دلچسپی کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ مثلاً خلیجی ممالک اور ایران کے توانائی کے منصوبوں کے لئے گزرگاہوں کی تعمیر یا گوادر اور دیگر علاقوں میں

تیل سے وابستہ امریکی مفادات، اسی طرح چین اور بھارت بھی اس خطے سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ مقامی باشندوں کے اپنے مفادات، اس کے علاوہ وفاق کے بھی مفادات ہیں۔ تو آپ یہ بتائیے کہ اتنے مفادات کی موجودگی میں بلوچ اپنے پورے تشخص کے ساتھ خود کو کیسے برقرار رکھ سکیں گے؟

ج: بات بڑی مشکل ہے، یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنی ہماری خواہش ہے، خود بلوچستان کی جیو پولیٹیکل حالات ہمارے لئے مسئلہ بن گئے ہیں۔ اگر اختیارات ہمارے پاس ہوتے تو یہ ہمارے لئے سونے کی کان ہوتی، لیکن بدقسمتی سے اختیارات ہمارے پاس نہیں ہیں، طاقت دوسروں کے ہاتھوں میں ہے اور ایسی طاقتور حکومتیں اس خطے میں اپنے مفادات اور گہری دلچسپی رکھتی ہیں جس کے مقابلے میں ہماری طاقت بہت محدود اور کم ہے۔ جس طرح آپ نے کہا کہ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اپنی تمام طاقت کے ساتھ، ایران اپنے محل وقوع کے لحاظ سے، خلیجی ممالک اپنے مال کی وجہ سے، افغانستان اپنی علاقائی اور سیاسی صورتحال کی وجہ سے، اس کے علاوہ آپ ہندوستان کو بھی اس خطے سے بے نیاز نہ سمجھیں اس کی بنیادی وجہ چین ہے۔ اگر چین بلوچستان سے بے نیاز نہیں، تو بھارت بھی نہیں۔ ان تمام بین الاقوامی مفادات کے پس منظر میں ایک عام بلوچ کے مفادات بہت پیچھے چلے گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ وہ اپنی آخری منزل پر جا چکا ہے۔ یہاں کا مقامی باشندہ اس سوچ میں مبتلا ہے کہ ہماری منشا اور ہمارے مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہمیں دیوار سے لگایا جا رہا ہے۔ اب اس صورتحال کو کوئی بھی خوبصورت نام دے دیں، چاہے آپ اسے انصاف کے تقاضے کہیں یا کچھ لیکن ہم جانتے ہیں کہ آج کی دنیا میں انصاف کا تقاضا وہی ہوتا ہے جو طاقت کے ذریعے عمل میں لایا جائے۔ آپ اسے عراقی صورتحال کے پس منظر میں دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ وہاں انصاف کے تقاضے وہ نہیں تھے جو کچھ وہاں کیا جا رہا ہے۔ عراقی کچھ اور چاہتے ہیں جبکہ طاقت کے ذریعے ان کے سر پر دوسری چیز تھوپی جا رہی ہے۔ اسی طرح بلوچستان کے معروضی حالات یا مختلف ممالک کی دلچسپیاں اس بات کی واضح طور پر عکاسی کر رہی ہیں کہ یہ بلوچوں

کے حق میں بالکل نہیں ہیں۔ البتہ کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ کسی شر میں سے خیر نکل آئے تو میں کہہ نہیں سکتا کہ دو بڑی طاقتیں آپس میں ٹکرائیں اور اس سے ہمارا کوئی فائدہ ہو جائے تو یہ الگ بات ہے۔

س: جس طرح حکومتی موقف ہے کہ بلوچستان کے یہ تین سردار ہیں، جبکہ زمینی حقائق سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ، نواب اکبر بگٹی اور خیر بخش مری سے ہی اسٹیبلشمنٹ کی نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔ آپ کے بعد کی نسل کی سیاسی تربیت کا مشاہدہ کیا جائے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اتنی زرخیز نہیں ہوئی یا وہ خشک ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کے بعد بلوچ نیشنلزم کی تحریک نوجوان نسل آگے بڑھا پائے گی؟

ج: آپ کے جو نظریات بلوچ نیشنلزم کے حوالے سے ہیں، کچھ عرصے قبل تک میرے بھی وہی تھے کہ نیشنلزم کی جو تحریک پہلے تھی، وہ اب ماند پڑتی جا رہی ہے۔ لیکن جب بلوچستان کا مسئلہ اٹھا اور جب ہم نے لوگوں سے رابطہ کیا اور ان سے جو مثبت جواب ملا، اس کی روشنی میں میں برملا یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اب بات 1970ء سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اب سیاسی لوگوں کی بات تو آپ چھوڑیں، ایک عام غریب بلوچ بھی اپنے مفادات اور حقوق کے لئے بہت باشعور ہو چکا ہے یہ اور بات ہے کہ ان غریبوں کی بے بسی بھی ان کے ساتھ ہے دوسری جانب ہم اتنے پڑھ لکھ کر بھی بے بس ہیں۔ بے بسی اپنی جگہ پر ہے لیکن وہ اپنے حقوق سے آگاہ ضرور ہو چکے ہیں۔ ہم جس نیشنلزم کے پیغام کو عام بلوچ تک نہیں پہنچا سکے تھے وہ آج اسٹیبلشمنٹ نے ہر بلوچ کے دروازے تک پہنچا دیا ہے۔ آج آپ کوئی بھی دروازہ کھٹکھٹائیں گے آپ کو بلوچ نیشنلزم کی صدا سنائی دے گی۔ سوائے ان چند بلوچ بیوروکریٹس کے جن کے مفادات ان کے نان نفقہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تقریباً 75 فیصد بلوچ، آج بلوچ نیشنلزم کی بات کر رہے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ بعض ایسے علاقے جہاں ہمیں گمان تک نہیں تھا کہ بلوچ حقوق کی بات سنی جا سکے گی، وہاں بھی لوگ اپنے حقوق کی باتیں کر رہے ہیں وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، انہیں اپنے حقوق سے

آگاہی ہو چکی ہے۔

س: یہاں کی لیڈر شپ میں شخصیات نمایاں ہیں اور میرے خیال میں وہ انتہائی بااثر اور طاقتور شخصیات ہیں۔ آپ ہیں، نواب خیر بخش مری یا نواب اکبر بگٹی ہیں، لیکن پھر بھی بلوچستان میں لیڈر شپ کا فقدان موجود ہے، آپ تینوں حضرات کے علاوہ تو ایک خلاء سا دکھائی دیتا ہے، کیا اسے پُر کرنے کی کبھی کوشش کی گئی ہے؟

ج: ہم اس عہد میں داخل ہو چکے ہیں، جہاں ہمیں انقلاب کی ضرورت ہے، اب ہمارے پاس وقت نہیں رہا، اس لئے ہم نے خود کو انقلاب کے سپرد کر دیا ہے، جس کا اہم حصہ ہمارے نوجوان ہیں، ہم بوڑھے آدمی باہر سے بیٹھ کر دعا کر سکتے ہیں، باتیں کر سکتے ہیں، ان کو سمجھا سکتے ہیں یا ان کی رہنمائی کر سکتے ہیں کہ اس انقلابی طریقے میں جانے کا طریقہ یہ ہے۔ یہاں کے مسائل حل ہونے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ بلوچستان کے لوگوں کو انقلابی طریقے کے لئے خود کو منظم کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ان جزئیات کی ضرورت نہیں جس کا آپ نے تذکرہ کیا ہے۔ آپ مشاہدہ کریں کہ بلوچستان کے مسئلے کو اٹھے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس دورانیہ میں لوگوں کو نہ میں نے سمجھایا، نہ نواب اکبر بگٹی نے اور نہ ہی خیر بخش مری نے انہیں سمجھایا، لوگ خود بخود اٹھ رہے ہیں، کہیں سے بلوچستان لبریشن فرنٹ بنا ہے، کہیں سے بلوچ لبریشن الائنس بنا ہے، کہیں سے کوئی جماعت بنی ہے۔ بلوچستان کے نوجوان باقاعدہ منظم طریقے سے اپنی کارروائی کر رہے ہیں۔ یقین کیجئے کہ ہم میں سے کوئی انہیں جانتا تک نہیں، حد تو یہ ہے کہ ہم میں سے کسی نے ان کی شکل تک نہیں دیکھی، وہ خود بخود اٹھ رہے ہیں، وہ خود بخود بلوچ حقوق کے لئے نکل رہے ہیں۔ یہ صورتحال کس کی پیدا کردہ ہے، یہ ہماری پیدا کردہ نہیں ہے، یہ حالات کی پیدا کردہ ہے۔ حالات بذات خود انہیں آگاہی اور شعور دیتے ہیں۔

س: وہ کہہ رہے ہیں کہ جی انہیں تو بارڈر کے دوسری طرف سے اسلحہ مل رہا ہے وغیرہ وغیرہ؟

ج: اس قسم کی باتیں ملک میں نئی نہیں ہیں۔ الزامات کا یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔ میں نے

حال ہی میں ایک ٹی وی انٹرویو میں ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ اگر ہمیں باہر سے امداد ملے گی تو ہم نالائق ہی ہوں گے جو اس امداد کو لینے سے انکار کریں گے۔ یہ تو باہر والے ہمیں اسلحہ دیتے ہی نہیں، یہ اور بات ہے۔ لیکن اگر کوئی ہمیں اسلحہ دے گا تو ہمارا وضو نہیں ٹوٹے گا، ہم کوئی ایسی بات کہیں گے نہیں جس سے ہمارا وضو ٹوٹ جائے۔

س: حال ہی میں امریکی سفیر نے بلوچستان کا دورہ کیا، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ امریکی فور اسٹار جنرل کی حیثیت رکھنے والے طاقتور سفیر ہیں، جنہوں نے حال ہی میں کچھ اہم رہنماؤں سے ملاقات کی، جن میں آپ بھی شامل تھے۔ امریکیوں کا کہنا ہے کہ سردار عطاء اللہ خان مینگل بڑے وسیع النظر سیاست دان ہیں اور ان کی بین الاقوامی معاملات پر بھی گہری نظر ہے، آپ سے جو ان کی ملاقات ہوئی، بلوچستان کی صورتحال کو ان کی ملاقات کے تناظر میں دیکھتے ہوئے آپ بتائیں کہ وہ اس مسئلے کو کیسا دیکھتے ہیں؟

ج: میرے خیال میں اس وقت بلوچستان کا معاملہ بہت سنجیدہ صورتحال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں صرف امریکی سفیر نے ہی نہیں، مجھ سے بھارتی سفیر اور جاپانی قونصل جنرل کے علاوہ فرانسیسی سفیر نے بھی ملاقاتیں کی تھی۔ وہ سب بہت زیادہ متحیر تھے کہ یہ بلوچستان کے لوگ اچانک کہاں سے ٹپک پڑے، پہلے تو ہم نے ان کے متعلق کوئی بات سنی ہی نہیں تھی۔ ان سب نے ہم سے پوچھا کہ ہم چاہتے کیا ہیں اور ان کے علاقے میں کیا ہو رہا ہے، یہ ایک طرح کی anxiety تھی کہ وہ معلوم کریں اس سلسلے میں ہم نے اپنی طرف سے کوئی من گھڑت بات بھی نہیں کی، جو حالات تھے وہ ہم نے انہیں بتائے کہ یہ حکومت ہمارے ساتھ کر رہی ہے اور ہم اس مسئلے پر حکومت کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہماری بات غور سے سنی۔

س: ایک باڈی لینگویج ہوتی ہے، چہرے کے تاثرات، آنکھوں یا ہاتھوں کے اشارے سے یا کسی اور بات سے امریکیوں نے کچھ ردعمل کا اظہار تو کیا ہوگا؟

ج: لگتا یہ تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس سے ناخوش نہیں ہیں، یعنی جو کچھ حکومت کر رہی

ہے اس سے بھی ناخوش نہیں ہیں اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس سے بھی ناخوش نہیں ہیں۔ یہ صرف ہمارا اندازہ ہے، ہوسکتا ہے کہ ہم غلط ہوں۔

س: ان دنوں سرکار اور بلوچ لیڈرشپ خاموش ہے، دونوں جانب سے خاموشی ہے، تندوتیز بیانات بھی نہیں دیئے جا رہے ہیں، جس سے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ حکومت سے کوئی باقاعدہ مفاہمت ہو چکی ہے؟

ج: دیکھیں جی! ڈاکٹر شازیہ کے کیس کے بعد بلوچستان ایک خاص دورانیہ سے گزر رہا ہے۔ اس معاملے کو ہم نے زیادہ اچھالنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ یہ مسئلے نواب اکبر بگٹی پر چھوڑ دیئے گئے ہیں، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہیں پتہ ہے کہ ڈاکٹر شازیہ کیس کیوں ہوا ہے؟ اس میں کون ملوث ہے؟ کون ملوث نہیں ہے؟ جہاں تک ان مسائل پر قائم ہونے والی کمیٹی کا تعلق ہے تو اس سے تو ہم پہلے ہی دستبردار ہو چکے ہیں۔ ہم نے اپنے خدشات بتائے لیکن محسوس ہو رہا ہے کہ ہم پر اب بھی بندوق تنی ہوئی ہے۔ انہوں نے ہمارے لوگ مارے، قید کئے تو اس صورتحال میں ان سے بات چیت نہیں ہوسکتی۔ ان سے بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ ڈاکٹر شازیہ والا کیس ہوگیا اور اس صورتحال میں اور تیزی پیدا ہوگئی، اس صورتحال کو بڑھاوا دینے کی بجائے ہم نے خاموشی اختیار کرلیا تاوقتیکہ ہم دیکھ لیں کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

س: سردار صاحب اس سلسلے میں عرض کروں کہ یہ صرف ڈاکٹر شازیہ کا معاملہ نہیں تھا، مسئلہ یہ تھا کہ کوہلو پر چڑھائی ہوئی، لوگوں کو زدوکوب کیا گیا، قید کیا گیا، لیکن اس واقعے پر ایسا کوئی بڑا ردعمل نہیں ہوا، آپ دیکھیں تو اب خیر بخش مری بھی زیادہ نمایاں نہیں ہیں۔

ج: کوہلو میں تو جی یہ اکثر جاتے ہیں کبھی یہ مرتے ہیں کبھی وہ مرتے ہیں۔ لوگ وہاں بھی ایسے ہی مر رہے ہیں جیسا کہ ڈیرہ بگٹی میں، آپ دیکھیں کہ اس علاقے کا مسئلہ بین الاقوامی فورم پر اٹھایا گیا، لیکن یہ مسئلہ حل ہوا ہے اب یہ کس طریقے سے حل کیا گیا ہے اس کی تفصیل ہمارے سامنے ہے، اس لئے ہم نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

س: ڈاکٹر شازیہ کیس کے بعد ساٹھ سے زائد ہلاکتیں ہوئی ہیں، مقامی لوگ قید کیے گئے اور باقاعدہ لڑائی کی ایک صورتحال پیدا ہوئی، ذرائع ابلاغ تو اس سلسلے میں خاموش ہیں، لیکن زمینی حقائق کیا کہتے ہیں۔ کیا واقعی سیز فائر چکا ہے یا ابھی تک کشیدگی باقی ہے؟

ج: یہ صورتحال ڈاکٹر شازیہ کیس سے شروع ہوئی جس کے بعد سیز فائر ہوا تھا جس کے لئے میں سرکار کی مہربانی بہت کم مانتا ہوں کہ ان کو ہم پر ترس آیا۔ انہوں نے تو کسی اور وجہ سے سیز فائر کیا۔ نہ اکبر بگٹی کی وجہ سے کیا اور نہ اپنی شرافت کی وجہ سے کیا ہے۔

س: اچھا کچھ تو ہوگی وہ بات، آپ کے خیال میں انہوں نے کیوں کیا سیز فائر یا کیوں کھایا ترس؟

ج: میں اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ان کی کوئی ایسی مجبوری تھی، جس کی وجہ سے انہوں نے اپنا ہاتھ روکا۔ اب یہ مجبوری ملکی ہو یا بین الاقوامی کوئی بھی ہو۔

س: ایسا کیوں ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کا، چودھری شجاعت اور مشاہد حسین کا سویلین چہرہ تو آپ کے ساتھ ہے، جبکہ دوسری جانب ملٹری کا لب ولہجہ بہت سخت ہوتا ہے، کہ مسئلہ یہ لوگ کر رہے ہیں اور ہم رٹ قائم کریں گے، ایسا کیوں ہے؟

ج: دیکھئے چودھری شجاعت اور مشاہد حسین یہ چاہتے ہیں کہ ہم بڑی شرافت سے پنجاب کی بالادستی کو قائم رکھیں۔ جبکہ فوج یہ جانتی ہے کہ ڈکشنری میں شریفانہ لفظ ہے ہی نہیں وہ کہتے ہیں ہمارے تو وہ انداز ہیں جو ہم نے بنگلہ دیش میں اختیار کئے تھے۔ اس سے کم ہمارے پاس گنجائش ہے ہی نہیں۔

س: اس تمام تر صورتحال میں ایک جملہ ''شریفانہ بالادستی'' کا بہت زیادہ استعمال کیا گیا۔ یہ کیا ہے اور بلوچستان کا اس پر کیا ردعمل ہے؟

ج: مقامی لوگوں یا بلوچوں کو پہلے احساس نہیں تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان میں اب بہت واضح تبدیلی آئی ہے۔ اس لئے کہ ان کو یہ بخوبی احساس ہو چکا ہے کہ بالادستی، بالادستی ہوا کرتی ہے، چاہے وہ شریفانہ انداز سے ہو یا جارحانہ انداز سے، مقصد دونوں کا ایک ہی ہے اور وہ ہے پنجاب کی بالادستی۔ مذاکرات ٹیم ہمیں گھما پھرا کر نیند

آور دوائی کھلانا چاہتے ہیں اور اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں جبکہ دوسرے کہتے ہیں کہ جناب بندوق ہمارے پاس ہے، طاقت ہمارے پاس ہے، ایسی کی تیسی بین الاقوامی ردعمل کی۔ جبکہ دونوں کے طریقہ واردات میں فرق یہ ہے کہ پہلے والے کہتے ہیں کہ نہیں بھئی طاقت سے نہیں پیار سے، کیونکہ اگر کوئی اور طاقت درمیان میں کود پڑی تو معاملہ انتہائی خراب ہو جائے گا۔ مذاکرات کرنے والے کچھ عقل کی بات کرتے ہیں جبکہ دوسرے کچھ جہالت کی۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ نتیجہ وہی نکلے گا چاہے چودھری شجاعت کی پالیسی ہو یا فوج کی پالیسی ہو فرق صرف تکنیک کا ہے، استحصال دونوں میں ہے۔ دونوں ہماری راہ عمل بدلنا چاہتے ہیں، دونوں ہمارے وسائل، ہمارے اثاثوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور ہماری دولت اور وسائل پر جب تک قبضہ نہیں ہو سکتا جب تک ہم اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ ہم ان مسائل کے حل کے لئے بالکل سیدھی بات جانتے ہیں کہ صرف تین محکمے دفاع کرنسی اور امور خارجہ وفاق کو دیئے جائیں، اس سے زیادہ نہ ہم ان کو کچھ دیں گے اور نہ اس سے زیادہ پر ہم سمجھوتہ کریں گے۔ ہم موٹی عقل کے لوگ ہیں موٹی اور سیدھی بات کرتے ہیں۔

س: اس معاملے کا ایک دفاعی پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ پاکستان کے ایک نیول چیف نے کہا تھا کہ پاکستان کے ساحلی علاقے پر ایک اور پانچواں صوبہ بننا چاہئے یا ایک اور مجوزہ صوبے کی باتیں ہو رہی ہیں کہ یہ صوبہ گوادر سے شروع ہو کر تھرپارکر تک چلا جائے گا۔ آپ اس تناظر میں کیا سوچتے ہیں اگر ایسا ہوتا ہے تو بلوچستان اور سندھ کا ردعمل کیا ہوگا؟

ج: دیکھیں جی! ایک آدمی زندہ ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ پیروں میں جان ہوتی ہے، اگر اسے تھپڑ مارا جائے گا تو دنیاوی اخلاقیات کی رو سے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بھی اس تھپڑ کا جواب کسی نہ کسی طرح واپس لوٹائے، البتہ اس کا ردعمل مختلف انداز سے ہو سکتا ہے کہ وہ تھپڑ کی شکل میں اس کا جواب دے، پتھر کی شکل میں یا اس کے منہ پر تھوک کر دے۔ اگر وہ جواب نہیں دیتا تو دنیا اس کو ملامت کرے گی اور بزدل کہے گی۔ دوسری طرف اگر آپ کسی مردے کو ماریں تو اس سے یہ گلہ نہیں کر

سکتے کہ اس نے کیوں ری ایکشن نہیں کیا، کیونکہ وہ تو مرا پڑا ہے۔ تو اگر جیسا کہ آپ نے کہا اگر ایسا کچھ ہوا اور ہم زندہ ہوئے تو یہ ہماری اخلاقی، قومی اور سیاسی ذمہ داری ہوگی کہ ہم اپنے بھرپور ردعمل کا اظہار کریں اور اگر ہمارا شمار مردوں میں ہوا تو کوئی کیا کہہ سکتا ہے کیونکہ مردوں سے تو کوئی گلہ نہیں کیا جا سکتا۔

س: پرائیویٹ چینل کو دیئے گئے اپنے انٹرویو میں آپ نے کہا تھا کہ اس سلسلے میں کچھ لوگ ہمدردی کا اظہار کریں گے، جبکہ کچھ لوگ دیکھیں گے کہ بھئی ان کے ساتھ زیادتی ہوئی مگر وہ عملی طور پر ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوں گے۔ آپ ایک طرف قوم پرست جماعتوں کے اتحاد "پونم" کے رہنما ہیں تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ سندھ، سرحد اور پنجاب میں سرائیکی اس مسئلے پر اشکباری کریں گے یا عملی طور پر آپ کا ساتھ دیں گے؟

ج: بحیثیت قوم تو ہم سب ایک ہیں، لیکن جہاں تک مفادات کی بات ہے تو پنجاب سے تو ہمیں کوئی توقع نہیں ہے۔ جہاں تک سرحد کا تعلق ہے تو اس کا ری ایکشن بھی اتنا ہی ہوگا کہ ہمارے ہمدرد کی حیثیت سے وہ اظہار افسوس کریں گے اور دو چار آنسو بھی بہائیں گے، ہم اس سے زیادہ ان سے کیوں توقعات وابستہ کریں کہ وہ دو قدم ہم سے آگے بڑھ کر ہماری مدد کریں گے اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کی مہربانی۔ رہا سوال سندھ اور بلوچستان کا، اگر سندھ بھی اس تقسیم کے عمل سے متاثر ہوتا ہے تو اسے ملانا پڑے گا اور اگر صرف بلوچستان کی تقسیم عمل میں لائی جاتی ہے تو اس صورتحال میں سندھ کا ری ایکشن بھی اتنا ہوگا کہ جتنا سرحد کا ہوگا۔ ان کے چونکہ دانت بلوچستان کے جسم میں گڑے ہوئے ہیں اس لئے اصل ری ایکشن تو بلوچستان میں ہوگا، وہ تو روئیں گے۔

س: بلوچوں کے کئی قبائل ہیں جو بلوچستان کے علاوہ سندھ، سرائیکی بیلٹ کے علاوہ کئی دیگر اضلاع ایسے ہیں کہ وہاں بلوچ آباد ہیں، کیا ان سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ کسی ایسی صورتحال میں آپ کا ساتھ دیں گے؟

ج: اگر میں یہ کہوں کہ ہم یہ توقع نہیں رکھیں گے تو یہ مناسب نہیں ہوگا۔ اگر انہوں نے

ایسی صورتحال میں مثبت ردعمل کا اظہار کیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم سے زیادہ خوش کوئی نہیں ہوگا۔

س: حکومت حلقوں کا کہنا ہے کہ بلوچستان کا مسئلہ صرف چند سرداروں کا پیدا کردہ ہے جو اس علاقے میں ترقی نہیں چاہتے، یہاں کے لوگوں کو تعلیم یافتہ نہیں ہونے دینا چاہتے تو اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج: میں اس حکومتی موقف کو بکواس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اگر یہ تین سرداروں کا مسئلہ ہے تو حکومت نے پارلیمانی کمیٹی کیوں تشکیل دی ہے، صدر صاحب بلوچستان میں آ کر معافیاں کیوں مانگتے ہیں؟ وہ افسوس کیوں کر رہے ہیں؟ وہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ بلوچستان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے؟ وہ خود کہتے ہیں 74 سردار تو ان کی جیب میں پڑے ہوئے ہیں، وہ خود یہ تسلیم کر رہے ہیں۔ یہ کمیٹیاں بنائی جا رہی ہیں، چودھری شجاعت حسین اور مشاہد حسین بلوچستان آ رہے ہیں، جا رہے ہیں، یہ دوڑ دھوپ کس لئے ہو رہی ہے؟ اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی؟ اگر اس صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کو شرم نہیں آتی تو ہم کیا کریں۔

س: ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلوچستان کے مسئلے پر نواب اکبر بگٹی فرنٹ مین کا کردار ادا کر رہے ہیں تو کیا بلوچستان کے مسائل کے کلی اختیارات نواب اکبر بگٹی کو تفویض کر دیئے گئے ہیں؟

ج: یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ ہم میں سے کسی ایک کے پاس بلوچستان کے مسائل کے کوئی کلی اختیارات نہیں ہیں۔ ہم نے جو بھی بات کرنی ہوگی بلوچستان کے عوام کو بھرپور اعتماد میں لیکر کرنی ہوگی۔ نہ ہم ڈکٹیٹر ہیں اور نہ ہمیں بلوچوں نے یہ کلی اختیار دیا ہے، نہ اکبر بگٹی کو، نہ مجھے اور نہ ہی خیر بخش مری کو دیا ہے۔ ہمیں جو کرنا ہوگا وہ اپنے تمام لوگوں کو اعتماد میں لے کر کریں گے۔ ابھی جو حکومت کی نواب اکبر بگٹی کے ساتھ بات ہوئی ہے وہ ڈیرہ بگٹی کے مسئلے پر بات ہوئی ہے۔ نواب صاحب نے بھی اپنے ایک بیان میں یہ واضح کیا کہ حکومت سے جو بات چیت ہوئی ہے وہ صرف ڈیرہ بگٹی کے مسئلے پر ہوئی ہے۔

س: سردار صاحب! یہ جو چھاؤنیاں بنانے کی بات ہو رہی ہے، خاص طور پر سوئی، کوہلو اور خضدار میں، اس حوالے سے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ گیس تنصیبات اور سوئی گیس لائنوں کی حفاظت کے لئے اقدامات ہو رہے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں ہم اقتدار کا دبدبہ چاہتے ہیں کہ بلوچستان میں ریاستی اقتدار موجود نہیں ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں یہ حکومتی رٹ ہے یا کوئی اور مفادات ہیں؟

ج: یہ بہت عجیب سی صورتحال ہے کہ انہیں 57 سال بعد ریاستی اقتدار بحال کرنے کی سوجھی ہے۔ اس سے قبل تو حکومت ایک لمبی عالم بے ہوشی میں تھی، حالانکہ یہ قبائلی علاقہ نہیں ہے جس طرح سرحد میں قبائل ہیں۔ یہ تو ریگولر علاقے تھے جہاں ڈی سی تھے، جہاں پولیس تھی، لیویز تھی، جہاں جہاں جس کو اپنا کام کرنا تھا وہ اپنا کام کر رہے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اختیارات کی تشریح کچھ اور ہی ہے۔ حکومت تو اس علاقے میں پہلے ہی سے موجود ہے لیکن حکومت جو رٹ لگا رہی ہے، وہ دراصل پنجاب کے استحصال کیلئے مکمل آزادی یا کھلی چھٹی کا نام ہے۔ پنجاب چاہتا ہے کہ اس کو کوئی رکاوٹ نہ ہو، وہ جس طرح اس کا جی چاہے وہ کرے، ویسے تو وہ جو جی چاہے کرتے رہے ہیں، اب ان کی نظر زیرزمین دولت پر ہے۔ ہمارے جو وسائل ہیں ان پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ بلوچستان میں انتقال آبادی ان کے پروگرام کا ایک بڑا حصہ ہے۔ ان تمام ارادوں کا نام انہوں نے حکومتی رٹ رکھا ہوا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس علاقے میں حکومت کی رٹ نہیں تھی؟ ان کو تو پہلے بھی چل رہی تھی، کیا انہوں نے خیر بخش مری کو حال ہی میں گرفتار نہیں کیا؟ یہی اکبر بگٹی تھے وہ کتنا عرصے جیل میں رہے یا خود میں تھا کہ مجھ پر مقدمات قائم کئے گئے۔ میں روزانہ پھانسی گھاٹ کے سامنے سے گزرتا تھا۔ کیا یہ رٹ نہیں تھی تو اور کیا تھی؟ جنرل ایوب خان کے دور حکومت میں ہمارے آدمی پھانسی پر چڑھے، جیل میں گئے، باقاعدہ فوجی آپریشن کیا گیا، مجھ سمیت میرے قبیلے کے ساڑھے چار سو آدمی محصور تھے، میں پوچھتا ہوں کہ وہ رٹ نہیں تھی؟ حکومت کو کیا رٹ چاہئے؟

س: میگا پروجیکٹس چل رہے ہیں، گوادر میں بندرگاہ اور کوسٹل ہائی وے، اس کے علاوہ

دالبندین اور خضدار میں بھی ہائی وے بن رہے ہیں، ان تمام پروجیکٹس کے مقامی سیاست یا جیو پولیٹکس پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

ج: میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ سارے پروجیکٹس انتقال آبادی کے لئے ہو رہے ہیں۔ اب دیکھیں کہ رتو ڈیرو جو ہے وہ وسطی ریاستوں کی طرف تو نہیں جاتا ہے وہ تو ایک گیٹ وے ہے بلوچستان کے لئے۔ یہ انفرااسٹرکچر جب مکمل جائے گا تو پنجاب سے لوگ آ کر یہاں آباد ہو جائیں گے۔ جس طرح کراچی سے بلوچستان کے لئے جو ہائی وے بن رہا ہے یہاں سے بھی فورسز، نیوی اور آرمی جائیگی تا کہ انہیں بنیادی سہولتیں فراہم کی جاسکیں۔ اس کے علاوہ کوئٹہ اور چاغی سے جو راستے بنیں گے وہ بھی اسی لئے بنیں گے۔ اس کے علاوہ یہ گزرگاہیں وسطی ایشیائی ریاستوں کے لئے بھی سودمند ثابت ہوں گی۔ جہاں تک ان میگا پروجیکٹس کا تعلق ہے تو یہ سب انتقال آبادی کی تیاریاں ہیں، اس لئے ہم یہ کہنا چاہتے کہ نہ ان پروجیکٹس کا احسان رکھیں اور نہ ہی ہمیں اپنا مقروض رکھیں۔

س: بلوچستان ایک بہت بڑا خطہ ہے جس طرح مغربی اور مشرقی پنجاب ایک دوسرے سے روابط بڑھا رہے ہیں، بھارت سے مشرقی پنجاب کے وزیراعلیٰ امریندر سنگھ، لاہور کے دورے پر تشریف لائے تھے، اس کے علاوہ ہریانہ کے وزیراعلیٰ بھی لاہور آئے، کیا بلوچستان کے لوگوں نے اپنے کیس کے سلسلے میں کہیں اور رجوع کیا ہے یا کہیں اور رجوع کرنے کا ارادہ ہے؟

ج: ہمارا گلہ تو یہ ہے کہ مغربی پنجاب کے وزیراعلیٰ نے مشرقی پنجاب کے وزیراعلیٰ سے تو میل محبت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اگر اس محبت کا آدھا بھی وہ بلوچستان کے ساتھ کر دیتے تو ہماری مشکلات اور مسائل خاصی حد تک کم ہو جاتے۔

(بشکریہ۔ اخبار جہاں 9 تا 15 مئی 2005ء)

❖■❖■❖

اب کون سی حجت باقی ہے؟

آپ نے دو اہم بلوچ سرداروں کے خیالات جان لیے۔ اُن کے ماضی کے حوالے سے اُن کے مزاج کو سمجھ لیا اور اس بات کا اندازہ بھی کر لیا ہوگا کہ پانی اب سر تک پہنچ چکا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم اب بھی رُک کر پیچھے مڑ کر دیکھ لیں اور جان لیں کہ ہم منہ اُٹھائے سرپٹ بھاگے چلے جا رہے ہیں جبکہ زمین ہمارے قدموں تلے مختصر ہو رہی ہے۔ بلوچستان کے آئی جی پولیس چوہدری محمد یعقوب بنیادی طور پر سپورٹس مین ہیں اور انہیں جاننے والے اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ ہمیشہ ''سپورٹس مین سپرٹ'' کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انہوں نے بلوچستان میں اچانک نوجوانوں میں سر اُٹھانے والی شورش کے حوالے سے کبھی کوئی جذباتی بیان بازی نہیں کی بلکہ ہمیشہ بڑا محتاط تبصرہ کیا ہے لیکن 15 جولائی 2005ء کے روزنامہ خبریں لاہور میں اُن کا ایک اہم بیان شائع ہوا ہے جسے میں آپ کی خدمت میں من وعن پیش کر رہا ہوں۔ چوہدری یعقوب صاحب نے ان خیالات کا اظہار روزنامہ خبریں کے رپورٹر ناصر اسلم راجہ سے اسلام آباد میں کیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں:

''بلوچستان کے آئی جی چوہدری یعقوب نے کہا ہے کہ صوبے میں دہشت گردوں کے خلاف بڑے آپریشن اور گرفتاریوں سے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں لیکن اب بھی خفیہ مقامات پر ان کی ٹریننگ جاری ہے۔ تربیت یافتہ دہشت گرد کو نہ صرف دو سو ڈالر ماہانہ دیئے جاتے ہیں بلکہ دھماکے کرنے، راکٹ مارنے اور بے گناہ افراد کو نشانہ بنانے کے لئے اضافی بونس بھی دیا جاتا

ہے۔ وہ ''خبریں'' کو خصوصی انٹرویو دے رہے تھے۔ آئی جی بلوچستان
چوہدری یعقوب نے بتایا کہ بلوچستان میں فروری کے بعد حالات بہتر ہو گئے
ہیں کیونکہ کوئٹہ اور گردونواح سے آپریشن کے ذریعے آٹھ اہم افراد کو گرفتار کیا
گیا ہے جس کیمپ سے ہم نے مری قبیلے کے لوگ پکڑے وہاں زمین میں تین
کے کنستروں میں اسلحہ دبا کر رکھا گیا تھا جس میں سے دھماکہ خیز مواد، ٹائم سیٹ
کرنے والی ڈیوائس، راکٹ لانچر، جدید گنیں ملیں جبکہ زمین کے اندر 20 سے
25 فٹ کی گہرائی میں خفیہ تہہ خانے بنا رکھے تھے اور یہ پورا کیمپ ایک بڑی
قلعہ نما عمارت میں تھا۔ آپریشن کے بعد وہاں چوکی قائم کر کے فورس لگا دی گئی
ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ گرفتار ہونے والے دہشت
گردوں نے تفتیش کرنے پر بتایا کہ انہیں فی کس دوسو ڈالر ماہانہ تنخواہ دی جاتی
تھی اور دیئے جانے والے ٹارگٹ کو حاصل کرنے کے بعد اضافی بونس یا
انعام دیا جاتا ہے۔ آئی جی پولیس نے بتایا کہ تفتیش کے ذریعے ہمیں یہ بھی
معلوم ہوا کہ رقم کراچی میں آتی اور پھر وہاں سے بلوچستان میں لا کر استعمال
کی جاتی تھی اور اس کے پیچھے قوم پرست لیڈر خیر بخش مری کا بیٹا ہیر بیار مری
ہے جو بیرون ملک رہتا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ
یقیناً گوادر پورٹ کے خلاف کچھ قوتیں کام کر رہی ہیں کیونکہ وہ پاکستان کو ترقی
کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتیں لیکن حکومت کا اس پر دلیرانہ سٹینڈ ہے۔ انہوں
نے بتایا کہ ہماری موثر کارروائی، آپریشن اور گرفتاریوں کے بعد دہشت گرد
دفاعی پوزیشن پر چلے گئے ہیں۔ ان کی کارروائیاں عارضی طور پر بند ہوئی ہیں
اور ہماری اطلاعات کے مطابق وہ اب بھی تربیت حاصل کر رہے ہیں اور
کارروائی کے لئے موقع تلاش کر رہے ہیں لیکن ان کی سرکوبی کے لئے حکمت
عملی ترتیب دے رکھی ہے۔ خفیہ علاقوں کے بارے میں سوال کے جواب میں
انہوں نے کہا کہ بلوچستان میں بہت سے ایسے علاقے ہیں جو اپنے محل وقوع
اور بعض سرداروں کی لڑائی کی وجہ سے نوگو ایریاز بنے ہوئے ہیں۔ ایک سوال

کے جواب میں انہوں نے کہا کہ بلوچستان میں کوئی فوجی آپریشن نہیں ہو رہا۔
سول فورسز کے پاس بھی اتنی اہلیت ہے کہ وہ ان دہشت گردوں کی سرکوبی کر
سکتی ہے۔ آرمی آپریشن کے نام پر صرف پراپیگنڈا ہو رہا ہے۔ پاک افغان
بارڈر کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ پاکستان
اور افغان اور ایران ایک بڑا بارڈر ہے۔ اس طویل بارڈر پر نظر رکھنا مشکل کام
ہے تاہم 10 ہزار ایف سی کے جوان بھرتی کیے جا رہے ہیں جو صرف بارڈر کی
نگرانی پر مامور ہوں گے۔

بلوچستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ قائم دہشت گردوں کے ٹریننگ کیمپس کی
خبریں اب ہمارے اخبارات کا معمول بن چکی ہیں۔ اسے ہماری بدقسمتی ہی سمجھا جائے گا
کہ ایک طرف تو بھارت ہے جو پاکستان کے خلاف دہشت گردی کے کیمپ چلانے کی جھوٹی
خبریں اُچھال کر پاکستان کی روشن خیال اعتدال پسندی'' کا امیج بگاڑنے میں کوشاں ہے اور
بھارتی ارباب حکومت کے بیانات کے ساتھ ہی مغربی پریس میں قوالی شروع ہو جاتی ہے،
بالکل اُسی انداز میں جیسے قوال جب کوئی مصرعہ کہتا ہے تو اُس کے ہمنوا اُس کی تکرار شروع کر
دیتے ہیں اور اُس وقت تک کرتے چلے جاتے ہیں جب تک کہ قوالی ختم نہ ہو جائے اور جب
ہم دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ غیر ملکی ایجنسیوں کی طرف سے پھیلائی جانے والی دہشت
گردی کا رونا روتے ہیں تو کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔

یہ سب کیا ہے؟

ہماری کامیاب خارجہ پالیسی کے دعوے کرنے والوں کے لئے لمحہ فکریہ! یا قومی
معاملات پر ہماری سنگدلانہ بے حسی کا شاخسانہ -- وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن اس تلخ حقیقت
سے انکار ممکن نہیں کہ بلوچستان کی موجودہ شورش ماضی کی شورش سے کئی گنا زیادہ خطرناک،
منظم اور غیر ملکی پشت پناہی کی حامل ہے۔

ممتاز کالم نگار ارشاد احمد حقانی نے اپنے کالم ''حرف تمنا'' میں بعنوان ''بلوچ
حلقوں کے سنگین خدشات کے ازالے کی ضرورت'' میں شاید یہی کچھ سمجھانے کی کوشش کی
ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''غالب غلط نہیں کہتا کہ کسی بھی کام کا آسان ہونا بہت مشکل ہے یہاں تک کہ آدمی کا انسان ہونا بھی بے حد مشکل ہے۔ غالب کا یہ شعر مجھے بلوچستان پر قائم پارلیمانی کمیٹی، اس کی سفارشات اور اس پر بلوچ حلقوں کے ردعمل سے یاد آیا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے پارلیمانی کمیٹی کا ایک حصہ بلوچستان کے بارے میں اپنی سفارشات پیش کر چکا ہے جن پر بلوچ حلقوں کا کوئی گرمجوشانہ ردعمل سامنے نہیں آیا۔ بلوچ سرداروں میں سے نواب اکبر بگٹی غالباً سب سے زیادہ عملیت پسند رہنما ہیں اور حالیہ بحران کے زمانے میں دوسرے بڑے سرداروں کے مقابلے پر سب سے زیادہ لچک بھی شاید انہی نے دکھائی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پارلیمانی کمیٹی کے چودھری شجاعت حسین اور سید مشاہد حسین ''بلوچستان کا مسئلہ'' حل کرنے میں مخلص ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ ابھی تک بلوچستان کی شکایات اور خدشات اپنی جگہ برقرار ہیں۔ گزشتہ دو چار روز میں نواب محمد اکبر خان بگٹی نے ذیل کی باتیں کہی ہیں:

1. ہم نے حکومت سے بار بار کہا ہے کہ گوادر میگا پراجیکٹس کے اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور آبادی کے امکانی رجحانات کے بارے میں ہمیں تفصیلی بریفنگ دی جائے لیکن ہمیں کسی بھی قسم کی معلومات فراہم نہیں کی گئیں صرف یہ کہا جاتا رہا کہ یہ ایک فری پورٹ ہوگا۔ بین الاقوامی تجارتی مرکز ہوگا اور یہاں سے وسط ایشیا تک اور دور دور کاروبار ہوگا۔ ہمیں ہماری استفسارات کا کوئی متعین جواب کسی بھی حکومتی حلقے نے آج تک نہیں دیا۔
2. ہمیں یہ اطلاع موصول ہوئی کہ چالیس پچاس میل چوڑی ساحلی پٹی کو مرکزی حکومت ''دفاعی زون'' کے نام پر بلوچستان سے کاٹ کر جدا کر دے گی۔ یہ اطلاع درست ہے تو بلوچستان افغانستان کی طرح ایک Land Locked (سمندر تک رسائی سے محروم) خطہ ہو جائے گا۔
3. بگٹی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ منصوبہ اب تک برقرار ہے کہ اس خطہ میں ایک بہت بڑا بحری اڈا بنایا جائے گا جسے امریکی سنٹرل کمان استعمال کرے گی جس کے نتیجے میں امریکہ خلیج کے ممالک بطور خاص ایران اور وسط ایشیائی ممالک کو اپنے زیر تسلط رکھ

سکے گا۔
4. بگٹی صاحب کا کہنا ہے کہ انہیں معتبر سرکاری ذرائع سے یہ پتا چلا ہے کہ گوادر میں دنیا کا سب سے بڑا گیس اور آئل ٹرمینل بنایا جائے گا۔ چونکہ گوادر، آبنائے ہرمز کے مقابلے پر، کھلے سمندر کی گہری بندرگاہ ہوگی اس لئے وسط ایشیا کے توانائی کے ذخائر یہاں لانا آسان ہوگا اور انہیں یہاں سے بڑے بڑے ٹینکرز کے ذریعے باہر کے ملکوں کو بھیجا جائے گا۔ گیس کو مائع شکل دی جائے گی اور اپنے مقام مقصود تک پہنچنے کے بعد پھر اسے گیس میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

نواب بگٹی کا کہنا ہے کہ جو بلوچ لیڈر گزشتہ دو سال سے گوادر کے منصوبے کے بارے میں ذہنی تحفظ کا اظہار کرتے رہے ہیں اب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خدشات حق بجانب تھے۔ ''یوں دکھائی دیتا ہے کہ گوادر بلوچوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اس میگا پراجیکٹ اور اس کے گردونواح میں بلوچوں کی حیثیت امریکہ کے ریڈ انڈینز سے مختلف نہیں ہوگی۔''

اب اگلے روز ایک اور بیان میں بگٹی صاحب نے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ سوئی کے مقام سے مقامی آبادی کو منتقل کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا گیا ہے لیکن لوگوں کو زبردستی ان کی زمینوں اور گھروں سے بے دخل کیا گیا تو ہم سب اس کی مزاحمت کریں گے۔ انہوں نے اپنے تازہ بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ ڈیرہ بگٹی کے علاقے میں فوجی آپریشن کے دوسرے مرحلے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ پارلیمانی کمیٹی کے ارکان سے جو سمجھوتہ ہوا تھا اس کے تحت عارضی مورچوں کو ہٹانے کے سوا کوئی بڑی پیش رفت نہیں ہوئی۔ بگٹی صاحب کا کہنا ہے کہ حکمرانوں کے خیال میں گزشتہ مارچ کے دوران ہونے والی پہلی فوجی کارروائی کے تمام مقاصد حاصل نہیں ہو سکے۔ اب وہ دوسرے مرحلے میں تمام مقاصد حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس وقت ڈیرہ بگٹی کے علاقے میں 13 ہزار کی فوجی نفری موجود ہے جبکہ بلوچستان کی سرحدوں پر سندھ اور پنجاب کے رینجرز بھی تعینات ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ متعلقہ حلقوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ ٹلی مٹ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں دو ہزار ایکڑ اراضی حاصل کی جائے تا کہ سوئی کے لوگوں کو وہاں منتقل کیا جا سکے۔ نواب بگٹی نے اور

بھی متعدد ایسے منصوبوں کا تذکرہ اپنے بیان میں کیا ہے جن کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ان پر عمل کیا گیا تو ہم اس کی بھرپور مزاحمت کریں گے۔ پھر بھی زبردستی کی گئی تو بڑا خون خرابہ ہوگا۔ ''مجھے یوں نظر آ رہا ہے کہ حکمران بلوچوں کو ریڈ انڈین بنا رہے ہیں۔'' بگٹی صاحب نے کہا ہے کہ موجودہ پارلیمانی سیاست بیکار محض ہے اور یہاں مرکزی اقتدار ہر چیز پر محیط ہے۔ یہ چیز بلوچ عوام کو انقلاب کی طرف دھکیل سکتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ 2007ء کے انتخابات کے منصفانہ اور شفاف ہونے کے بارے میں انہیں سخت اندیشے اور خدشات ہیں اور اس بات کا خدشہ پایا جاتا ہے کہ معاملات اور بھی زیادہ بگاڑ کی طرف چلے جائیں۔

یہ ایک ایسے بلوچ سردار کے خیالات ہیں جنہیں بعض دوسرے اہم سردار بسا اوقات مصلحت پسند اور مصالحت پسند ہونے کا طعنہ بھی دیتے ہیں۔ جیسا کہ میں چند روز پہلے لکھ چکا ہوں پارلیمانی کمیٹی کی اب تک کی پیش رفت ٹھوس نتائج کے حوالے سے بہت معمولی ہے اور ابھی بلوچ قوم پرست حلقوں کو مطمئن کرنے کے لئے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ پارلیمانی کمیٹی کی سفارشات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک ٹائم فریم کا تعین بہتر ہوگا لیکن افسوس کہ ہمارے جملہ چھوٹے بڑے حکمران بلدیاتی انتخابات کے مال غنیمت کی جستجو میں اس طرح الجھے ہوئے ہیں کہ انہیں کسی دوسرے کام کی طرف توجہ دینے کی بہت کم فرصت میسر ہے۔ آپ نواب بگٹی کے متذکرہ خیالات پر ایک نظر ڈالیں آپ کو فوراً اندازہ ہو جائے گا کہ بلوچ رہنماؤں کے خدشات اور اندیشے انتہائی سنگین نوعیت کے ہیں۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ یہ تمام خدشات اور اندیشے بجا اور درست ہیں لیکن مجرد یہ بات کہ یہ پائے جاتے ہیں اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کا سامنا کیا جائے، ان کا ازالہ کیا جائے اور متعلقہ حلقوں کو مطمئن کیا جائے۔ ہمیں پاکستان کی اور وفاق کی وحدت اور یکجہتی عزیز ہے تو زیر نظر مسئلے کو مزید پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ ہم ارباب اختیار سے دردمندانہ گزارش کریں گے کہ بلوچستان کے تنازعے کو پوری اور فوری توجہ دیں اور پارلیمانی کمیٹی کی کام کو بحسن وخوبی پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کریں۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ 7 جولائی 2005ء)

آج پاکستان تاریخ کے دوراہے پر کھڑا ہے اور یہ منظر بڑا واضح ہے کہ ایک راستہ سیدھا تباہی کی طرف جاتا ہے جبکہ دوسرا سلامتی کی طرف -- لیکن سلامتی کا راستہ ہمارے ارباب حکومت سے تحمل، بردباری، برداشت اور اپنے مخالفین کی عزت نفس کے احترام کا متقاضی ہے۔

یہ کوئی بہت مشکل کام نہیں۔ آخر ہم کب تک ملکی سلامتی کو اپنی انانیت کی بھینٹ چڑھاتے رہیں گے؟

سوچئے! اور کچھ ایسا کر گزریئے کہ مستقبل میں آپ کا شمار پاکستان کے خیرخواہوں میں ہو۔ یہ ملک لاکھوں قربانیوں کا حاصل ہے اور تاریخ موجود ہے کہ اس کا برا سوچنے والے خواہ وہ ''یہاں'' کے تھے یا ''وہاں'' کے -- مکافات عمل سے بچ نہیں پائے۔

کیا اب کوئی اور حجت باقی ہے؟

طارق اسمٰعیل ساگر

اگست 2005ء لاہور

طارق اسمٰعیل ساگر کی چونکا دینے والی کتاب

خفیہ ایجنسیوں کی دہشت گردی

طارق اسمٰعیل ساگر نے اپنی اس تحریر میں دُنیا کے مختلف ممالک کی معروف مگر
بدنام زمانہ خفیہ ایجنسیاں جن میں بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' امریکی ''سی آئی اے''
اسرائیلی ''موساد'' اور روسی ایجنسی ''کے جی بی'' کے علاوہ دیگر ممالک کی خفیہ
ایجنسیوں کے بارے میں مکمل تفصیل سے آگاہ کیا ہے۔ یہ ایجنسیاں بے پناہ
اختیارات اور وسائل کی حامل اور جدید ٹیکنالوجی سے لیس ہوتی ہیں۔ مصنف
نے بتایا ہے کہ ان ممالک کی حکومتیں کس طرح ان ایجنسیوں کی مدد اور ان کے
کاموں کی پردہ پوشی کرتی ہیں اور ان ایجنسیوں کے ارکان کو کس طرح تربیت
دی جاتی ہے۔ انہوں نے ان ایجنسیوں کی سازشوں کو بھی طشت از بام کیا ہے۔

قیمت -/300 روپے